جدید ادب جرمنی
www.jadeedadab.com
شمارہ: 13
گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں
گوری کی سگائی پر
حیدر قریشی
ڈاکٹر نذر خلیق
جدید ادب جرمنی
شمارہ: 13
مدیر: حیدر قریشی
ڈاکٹر نذر خلیق
JADEED ADAB Literary Urdu Journal (July To December 2009)
Haider Qureshi Rossertstr.6, Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.
اس شمارہ کے گوشہ نشین
عبداللہ جاوید
پروفیسر ناصر احمد
سلطان جمیل نسیم
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع شدہ حیدر قریشی کی
گیارہ کتابوں کی جملہ تخلیقاتِ نظم و نثر ایک جلد میں
عمرِ لاحاصل کا حاصل
عمرِ لاحاصل کا حاصل
حیدر قریشی
حصول کے لیے براہ راست رابطہ کریں
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com
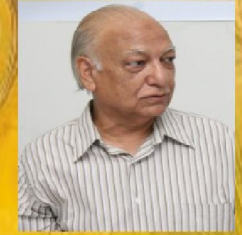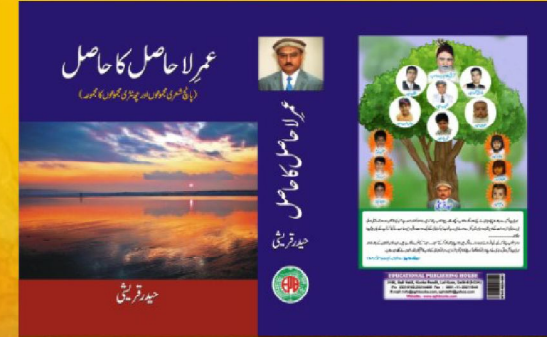
اردوستان: انٹرنیٹ کی دنیا کا ایک اہم نام۔اردو کی سب سے پرانی ویب سائٹ جو اردو سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔اردوستان نیٹ ورک کی بنیادی اور اہم ترین ویب سائٹ۔

کاشف الھدیٰ کی نفع و نقصان سے بے نیاز رہ کر اردو کی خدمت کی لگن

www.urdustan.com

حیدر قریشی کا کالم **منظر اور پس منظر** اور کالم **خبر نامہ** بھی ان لنکس پر موجود ہیں۔

http://www.urdustan.com/manzar/

http://urdustan.com/khabarnama/

کتاب گھر: مفت اردو کتب (E-Books) فراہم کرنے والی سب سے بڑی ویب سائٹ، جس میں مختلف موضوعات پر ۱۰۰۰ سے زائد کتب مطالعہ کے لئے آن لائن دیکھی جاسکتی ہیں یا ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہیں۔

www.kitaabghar.com

اردو دوست ڈاٹ کام : خورشید اقبال کی خوبصورت ویب سائٹ

www.urdudost.com

سہ ماہی ادبی رسالہ **کائنات**، ادبی خبر نامہ **اردو ورلڈ**، ادیبوں کی تصاویر پر مشتمل **ادبی البم**، ای بکس کا سلسلہ **اردو دوست لائبریری** اور دلچسپی کے متعدد دوسرے سلسلوں سے مزین ویب سائٹ۔

اردو ماہیا

http://www.urdudost.com/archive/old-mahya.html

حیدر قریشی کی تخلیقات کی ویب سائٹ اور تراجم کے لنکس

www.haiderqureshi.com

---

http://haiderqureshi.spaces.live.com/

حیدر قریشی کی شاعری کے تراجم کے مطالعہ کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshi.blogspot.com/

حیدر قریشی کے افسانوں کے انگریزی تراجم کے مطالعہ کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshisstories.blogspot.com/

بقول ڈاکٹر وزیر آغا: حیدر قریشی کی زندہ رہنے والی کتاب

گیارہ کتابوں کی کتاب **عمرِ لاحاصل کا حاصل** شائع ہوگئی

حیدر قریشی کی کتاب **عمرِ لاحاصل کا حاصل** کا لائبریری ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔میگزین سائز کی یہ ضخیم کتاب ۶۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں تخلیقی کام پر مشتمل حیدر قریشی کی یہ گیارہ کتابیں یکجا کی گئی ہیں۔۱۔**سلگتے خواب** (غزلیں)۔۲۔**عمرِ گریزاں** (غزلیں، نظمیں اور ماہیے)۳۔**محبت کے پھول** (ماہیے)۴۔**دعائے دل** (غزلیں اور ماہیے) ۵۔**درد سمندر** (غزلیں، نظمیں اور ماہیے) اور ان مجموعوں کے بعد کی شاعری۔۶ ۔**روشنی کی بشارت** (افسانے)۷۔**قصے کہانیاں** (افسانے) ۸۔**میری محبتیں** (خاکے)۔۹۔**کھٹی میٹھی یادیں** (یادیں)۔۱۰۔**فاصلے قربتیں** (انشائیے) ۱۱۔**سوئے حجاز** (سفرنامہ)اوران مجموعوں کے بعد کی تخلیقات۔ان مختلف شعری ونثری کتابوں میں ایسا ربطِ باہم ہے کہ گیارہ کتابیں ایک کتاب لگتی ہیں۔کتاب کے آخر میں ۲ صفحات پر حیدر قریشی کی اب تک کی جملہ تصنیفات (صرف تصنیفات) کی طویل فہرست کتابوں کے سالِ اشاعت اور پبلشر کے ادارہ کے نام کے ساتھ درج کی گئی ہے۔اور ایک صفحہ پر **پاکستان** سے ڈاکٹر وزیر آغا، **جرمنی** سے ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ، **انڈیا** سے دیوندر اسر، **روس** سے ڈاکٹر لڈمیلا، **انگلینڈ** سے ڈاکٹر ڈیرک لٹل ووڈ، **مصر** سے ہانی السعید اور **امریکہ** سے کساندرا راؤزن کے اردو یا انگریزی میں تاثرات کو شامل کیا گیا ہے۔**ڈاکٹر وزیر آغا** نے لکھا ہے ''حیدر قریشی نے اپنی اس زندہ رہنے والی کتاب کو ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کہا ہے۔غور کیجئے کہ اس عنوان میں لاحاصل سے حاصل تک کا سفر ایک ایسی اوڈیسی ہے جو کم کم دیکھنے میں آئی ہے۔'' **ڈاکٹر کرسٹینا** لکھتی ہیں کہ'' حیدر قریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہے''۔**دیوندر اسر** کے بقول'' حیدر قریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی ابتدا ہیں۔''**ڈاکٹر لڈمیلا** حیدر قریشی کی مجموعی ادبی صلاحیت کو معجزہ قرار دیتے ہوئے اس پر حیرت کا اظہار کر رہی ہیں تو **ڈاکٹر ڈیرک لٹل ووڈ** حیدر قریشی کو فلاسفیکل کہانی کار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

Haider Qureshi's splendid collection of short stories extends the range of contemporary Urdu writing available in English translation.

ہانی السعید نے حیدر قریشی کو جدید اردو ادب کا ایک بڑا شہسوار قرار دیا ہے تو **کساندرا راؤزن** نے حیدر قریشی کے بارے میں لکھا ہے کہ:Haider Qureshi is a breath of fresh air for our times

کتاب کا سرورق **مصطفیٰ کمال پاشا** (دہلی) نے بنایا ہے جبکہ منفرد نوعیت کا بیک ٹائٹل **خورشید اقبال** (۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال) کا بنایا ہوا ہے۔ **عمرِ لاحاصل کا حاصل** کو دہلی کے معروف وممتاز اشاعتی ادارہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔اس کے حصول کے لیے براہِ راست پبلشر سے یا پھر حیدر قریشی سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔دونوں کے ای میل ID یہ ہیں: **پبلشر**: ephdelhi@yahoo.com

مصنف: haider_qureshi2000@yahoo.com **اور** hqg786@arcor.de

ارشد خالد (اسلام آباد) کی جانب سے انٹرنیٹ پر یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے 11.05.2009 کو ریلیز کی گئی۔جہاں سے اردو کی کئی ویب سائٹس نے اسے شائع کیا۔

سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

کتابی سلسلہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com

شمارہ: 13 (جولائی تادسمبر 2009ء)

مشیرِ خاص: ڈاکٹر شفیق احمد (بہاول پور)

مدیر: حیدرقریشی

مدیر(اعزازی): ڈاکٹر نذر خلیق

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے ایڈریسز

1-Haider Qureshi Rossertstr.6 , Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.
2-Dr. Nazar Khaleeq Flat No.5, C.T. Center, Model Town A,
Khanpur-64100, Pakistan

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر ان ای میل ایڈریسز پر بھجوائیں۔شکریہ!

hqg786@arcor.de اور **khaliqkhanpur@yahoo.com**
haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: مصطفیٰ کمال پاشا

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,VAKIL STREET,KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6,(INDIA)
PH:23215162, 23214465, FAX: 011-23211540
E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

Jadeed Adab ist kostenlos,man muss nur die Versndkosten Übernehmen.

فہرست

گوشۂ سلطان جمیل نسیم

گوشۂ عبداللہ جاوید

غزلیں

افسانے

نظمیں

خصوصی مطالعہ

گوشۂ پروفیسر ناصر احمد

------☆-------

ماہیے

کتاب گھر

ڈاکٹر رضیہ حامد،فخر زمان،افتخار عارف،مقصود الٰہی شیخ،ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، مظفر حنفی،نعیم الرحمٰن،ارشد خالد،ارشد کمال۔سلیم آغا قزلباش۔احمد صغیر صدیقی،عبدالرحیم ارمان، عتیق احمد عتیق،محمد حامد سراج،ناصر ملک،منظور ندیم،مقبول احمد مقبول،اکبر حمیدی،محبوب راہی، فرحت حسین خوشدل،رؤف خیر،صادق باجوہ،تنہا تماپوری۔

چھپتے چھپتے: ہندوستان میں حکومت نے ڈاکخانہ کی Sea Mail اور Surface Mail سروسز بند کردی ہیں۔اب پاکستان اور باقی ممالک میں صرف Air mail سروس کام کررہی ہے،جو رسالہ کی ترسیل کے لیے بہت مہنگی ہے۔**اگر اگلے چھ ماہ تک بند سروسز بحال نہ ہوئیں تو** پھر طے کیا ہے کہ **جدید ادب** کی ضخامت میں مزید اضافہ کردیا جائے اور اسے سال میں صرف ایک بار شائع کیا جائے۔   **حیدر قریشی**

گفتگو!   اس بار ایک ذاتی گزارش

مغربی دنیا میں مقیم تمام ادیبوں کے بارے میں عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ بڑے امیر کبیر لوگ ہوتے ہیں۔اس تاثر کو مزید تقویت ہمارے ایسے شعرائے کرام اور ''دانشور'' حضرات نے پہنچائی جو بین الاقوامی شاعر اور ادیب کہلانے کے لیے نہ صرف اپنے خرچے پر برصغیر پاک و ہند تک جاتے ہیں بلکہ اپنے اعزاز میں ہونے والی تقریبات کا خرچ بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ طریق سے ادا کرتے ہیں۔اسی طرح مغربی دنیا سے اردو کے جو رسالے نکل رہے ہیں ان میں سے بیشتر ممالک کے رسائل سرکاری گرانٹس پر چل رہے ہیں۔یہ اچھی بات ہے کہ جو ممالک اردو رسائل کے لیے امداد دیتے ہیں ان سے اردو کے فروغ کا کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہتا ہے۔تاہم میرا معاملہ ان دونوں حوالوں سے صفر ہے۔

میں یہاں بہت ہی معمولی سا مزدور ہوں،محنت مزدوری کے ساتھ جتنا وقت اور توفیق میسر ہو کچھ نہ کچھ ادبی کام کر لیتا ہوں۔میری تنخواہ اتنی کم ہے کہ مجھے مکان کے کرایہ کے لیے حکومت سے جزوی امداد لینا پڑتی ہے۔جرمنی میں اردو کی کسی تنظیم کو کوئی گرانٹ ملتی ہے یا نہیں مجھے اس کا علم نہیں ہے۔میں نے ذاتی طور پر نہ کبھی اس کے لیے کوشش کی ہے اور نہ ہی اس جھنجھٹ میں پڑنا چاہتا ہوں۔یوں بھی انجمن سازی کا کام میرے لیے کبھی بھی اچھا نہیں رہا۔مزاج اس کام سے ہم آہنگ نہیں ہونے دیتا۔

جدید ادب کے لیے شروع میں ایک دوست اپنے ادارہ کا اشتہار دیا کرتے تھے،اس سے کچھ سپورٹ مل جاتی تھی۔لیکن مغربی دنیا اور بالخصوص جرمنی کے جعلی شاعروں اور چور لکھنے والوں کے خلاف مہم کے نتیجہ میں وہ اشتہار بھی بند کرادیا گیا۔رسالہ ایک طرح سے میری پاکٹ منی کے بل پر چل رہا ہے۔اب تک تیرہ شمارے شائع ہوئے ہیں تو مجموعی طور پر تیرہ دوستوں نے بھی اتنا تعاون نہیں کیا کہ صرف ڈاک خرچ کی رقم ہی نکل آتی۔

اس ساری روداد کا مقصد نہ تو اپنے مسائل کا رونا رو کر چندہ جمع کرنا ہے اور نہ ہی دوستوں کو اخلاقی طور پر اس طرف مائل کرنا ہے۔یہ ساری روداد اس لیے بیان کرنا پڑی ہے کہ بعض ادبی رسائل جو میرے نام بھیجے جاتے ہیں ایک عرصہ کے بعد ان کا سالانہ چندہ کا بقایا کا،بل بنا کر بھیج دیا جاتا ہے اور مجھ سے ادائیگی کا تقاضہ کیا جاتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ انڈو پاک کے ادبی رسائل کسمپرسی کی موجودہ حالت میں مالی تعاون کے مستحق ہیں تاہم میرا مسئلہ یہ ہے کہ یا تو **جدید ادب** کو بند کردوں اور ادبی رسائل سے مالی تعاون کرلوں یا پھر جو کچھ بچت کر سکتا ہوں اس سے **جدید ادب** نکالتا رہوں۔سو جن ادبی رسائل کے مدیران میرے ذمہ سالانہ چندہ کے بقایا جات بھیجتے ہیں،ان سے ادب کے ساتھ گزارش کرتا ہوں کہ میرے نام رسائل کی ترسیل بند فرمادیں۔عدم ادائیگی کے باعث مجھے شدید شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔امید ہے ایسے مدیران ادبی رسائل میری مجبوریوں کے باعث مجھ سے درگزر سے کام لیں گے۔۔۔۔۔!   **حیدر قریشی**

حمد باری تعالیٰ

ڈاکٹر محبوب راہی (اکولہ)

روشنی تیری، ترے جلوے افق تا بہ افق
گفتگو تیری،ترے چرچے افق تا بہ افق

بحر و بر،برق و شرر،شمس و قمر،جنّ و بشر
تیری مخلوق،ترے بندے افق تا بہ افق

ایک ہی رشتہ ہے بس خالق و مخلوق کے بیچ
تو سبھی کا،ہیں سبھی تیرے افق تا بہ افق

خواہشیں میری، مِرے خواب زمیں تک محدود
بخششیں تیری،کرم تیرے اُفق تا بہ افق

چاند کی چاندنی،سورج کی تمازت،یہ ہوا
ہیں مظاہر تری قدرت کے افق تا بہ افق

میری خواہش کہ سمیٹوں،تجھے یکجا دیکھوں
اے کہ بکھرے ہیں ترے جلوے افق تا بہ افق

تیرے راہؔی کو جو توفیقِ سفر ہو جائے
راستے ہیں ترے پانے کے افق تا بہ افق

حمدِ باری تعالیٰ

مرزا رفیق شاکر (اکولہ)

ترا رنگ و نور ہے کو بہ کو تری شان جلّ جلالہٗ
تو نہیں کسی کے بھی روبرو تری شان جلّ جلالہٗ

ہے تری رضا مِری آرزو تری شان جلّ جلالہٗ
ترا ذکر ہے،تری گفتگو،تری شان جلّ جلالہٗ

کہیں برگ وگل میں ثمر میں ہے،کہیں کہکشاں میں قمر میں ہے
جہاں دیکھیے وہیں تو ہی تو،تری شان جلّ جلالہٗ

وہ ہوں عرش پر کہ ہوں فرش پر،ترے عبد ہیں سبھی جن بشر
ہے ترا ہی عالَمِ رنگ و بو تری شان جلّ جلالہٗ

تو سمیع ہے تو بصیر ہے تو علیم ہے تو خبیر ہے
کہ دلوں کے راز بھی جانے تو تری شان جلّ جلالہٗ

ترے نیک بندوں میں اے خدا، رہے یہ بھی شاکرِ بے نوا
اسے کر دے ویسا ہی نیک خُو تری شان جلّ جلالہٗ

زیارتِ کعبہ

صادق باجوہ (امریکہ)

اپنی بخشش کی دعا کرتے رہے
ہم تری حمد و ثنا کرتے رہے
اَرمغانِ قلب نذرِ جاں رہی
آنسوؤں سے پُر خلا کرتے رہے
خَم جبینِ اِنس و جاں ہر دم رہی
عہد پا رینہ وفا کرتے رہے
ہر صدا ''لبیّک'' جسم و جاں کے ساتھ
مُنفعِل دل اِلتجا کرتے رہے
عظمت و ہیبت کا دل سے احترام
مدتوں سے با وفا کرتے رہے
ہیں وسیلہ، مدح خواں جن کے لئے
رات دن صلِّ علیٰ کرتے رہے
مرجَعِ عالم ہوا، جس کا طواف
انبیا و اصفیا کرتے رہے

ایک شعر

ہے حضوری میں گدائی، سروری
کاسۂ دل حمد سے بھرتے رہے

نعتِ پیمبرؐ

صادق باجوہ

نعت گوئی کا سلیقہ قدرتِ حق کی عطا
ہوں فنا حُبِّ پیمبرؐ میں تو ملتی ہے بقا
ہے غلامی و اسیری بادشاہی سے عزیز
تشنگانِ حق کو مل جاتاہے خود اپنا پتا
زندگی بھر اک نویدِ جانفِزا ملتی رہی
مانگنے والا بھی پائے گر اُٹھے دستِ دعا
اُسوۂ کامل ہوا، اَخلاق کی تکمیل بھی
جاں کے پیاسوں کیلئے بھی وہ مجسم تھا دعا
سن کے شانِ مصطفیٰؐ یوں انبیا گویا ہوئے
ہے تمنّا یہ ، خدایا !اُس کی امت سے اُٹھا
رحمۃُلِلعالمیںؐ، خیرالوریٰؐ، یکتا وجود
سب جہاں کے واسطے اُٹھتا رہا دستِ دعا
وَرطۂ حیرت میں ڈوبی تھی نگاہِ دشمناں
دشمنِ جاں ہو گئے کیونکر فِدائے مصطفیٰؐ
ہر گھڑی ہر آں ستم سہنے کا یارا تو ملا
اِبتلا میں دیکھ کر لیکن عدو کو دی دعا
ہے تمنّا گر کبھی دیدار ہو صادؔق تو پھر
ہو لبوں پر وِرد ہر دھڑکن کہے صلِّ علیٰ

نعتِ رسولؐ

ڈاکٹرمحبوب راہی

غلام جن کے ہیں سب،اک غلام میں بھی ہوں
کہ جاں نثارِ رسولِ انامؐ میں بھی ہوں

مِرا مقام ہے شاہِ رسلؐ کے قدموں میں
تو کائنات میں عالی مقام میں بھی ہوں

زباں پہ نامِ محمدؐ کا ورد ہے پیہم
سراپا وقفِ درودو سلام میں بھی ہوں

مِرے بھی دل میں ہے غم امتِ محمدؐ کا
تڑپ سے جس کی بہت شاد کام میں بھی ہوں

میں خاک پائے محمدؐ کا ذرّۂ ناچیز
سنو! کہ موجبِ صد احترام میں بھی ہوں

رواں ہے ساقیِ کوثرؐ کا فیض عام جہاں
وہیں پہ ایک طلب گارِ جام میں بھی ہوں

صلہ ہے نعتِ محمدؐ کا ورنہ اے راہیؔ
کہاں کا ایسا بھلا خوش کلام میں بھی ہوں

نعتِ رسولؐ

ڈاکٹرمحبوب راہی

اُنؐ کے افکار،عمل اُنؐ کاشریعت اُنؐ کی
رہنما جادۂ ہستی میں ہے سیرت اُنؐ کی

سارے نبیوں سے الگ شانِ نبوت اُنؐ کی
منفرد سارے رسولوں میں رسالت اُنؐ کی

رہبری انؐ کی،ہراک گام ہدایت انؐ کی
کامرانی کی بشارت ہے قیادت اُنؐ کی

خیر امّت ہے ہر اک دور میں اُمّت اُنؐ کی
ساری دنیا کے دلوں پر ہے حکومت انؐ کی

روزِ محشر جو ہو مطلوب شفاعت انؐ کی
ہم پہ لازم ہے بہر گام اطاعت انؐ کی

ایسا اُمّی جسے علموں کا سمندر کہیے
نکتہ سنجی،وہ فصاحت وہ بلاغت اُنؐ کی

انؐ کا ہر نقشِ قدم ہے مِرا رہبر راہیؔ
میری منزل ہے وہی جو بھی ہے سنّت اُنؐ کی

نعت پاک

فرحت حسین خوشدل (ہزاری باغ)

صدائے نعت سے یہ جسم و جان ہے روشن
نبیؐ کے ذکر سے اک اک مکان ہے روشن

تری عطا ہو تو حسانؓ کی طرح مولیٰ
میں کہہ سکوں گا کہ میری زبان ہے روشن

بس ایک نام کی خوشبو رہی ہے لب پہ مِرے
یہی وہ اسم ہے جس سے یہ جان ہے روشن

نکل کے غارِ حرا سے دیا تھا قوم کو جو
ابھی تک آپؐ کا اک اک بیان ہے روشن

نہ اُنؐ کے بعد نہ اُن جیسا کوئی پہلے ہوا
یہی سبب ہے کہ ہر آن بان ہے روشن

صراطِ خیر کا طالب رہا ہوں میں اب تک
اسی طلب کے سبب میری جان ہے روشن

یقین،صبر و رضا،علم و عدل دنیا میں
نبیؐ کے فیض سے خوشدلؔ ہر آن ہے روشن

مناجات

فرحت حسین خوشدل

لکھوں میں حمد تری روز نت نئی یارب
ملے مجھے بھی ہدایت کی روشنی یارب

صراطِ خیر کا طالب ہوں تجھ سے ربِّ کریم
تو اپنے فضل سے دے مجھ کو آگہی یارب

یہ تیرا فضل ہے خیرالامم میں ہوں شامل
بوقتِ مرگ رہے کلمۂ نبیؐ یارب

مجھے عطا ہو ذرا سی ضیاء بفیضِ نبیؐ
تو میری فکر کو دے اپنی روشنی یارب

یہ سب ہے تیرا کرم حمدو نعت لکھتا ہوں
افادیت سے ہو پُر میری شاعری یارب

زباں پہ ذکر ترا اور ترے نبیؐ کا رہے
میری دعا کا ہو مرکز یہ آخری یارب

یہ سچ ہے اپنے گناہوں پہ میں ہوں شرمندہ
گنہ سے پاک ہو خوشدلؔ کی زندگی یارب

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ (علی گڑھ)

اردو کے جلیل القدر ادیب وانشا پرداز، محقق اور ماہرِ لسانیات

پروفیسر مسعود حسین خاں

(پروفیسر مسعود حسین خاں کی نوے ویں سال گرہ پر خصوصی تحریر)

جب تک کہ یہ سطور شائع ہوں گی، اُردو کے جید عالم، جلیل القدر ادیب وانشا پرداز، ممتاز محقق، اور نامور ماہرِ لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں بحمداللہ نوے (۹۰) سال کے ہو چکے ہوں گے۔ انھوں نے اس دوران میں طویل علمی سفر طے کیا اور اردو زبان وادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں، نیز تحقیق وتدوین، تنقید و اسلوبیاتی تنقید، دکنیات وتاریخِ زبانِ اردو، اور لغت نویسی کے میدان میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیے، علاوہ ازیں اردو کے لسانیاتی ادب میں بھی گراں قدر اضافے کیے۔ انھوں نے ادبی صحافت میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا اور اردو تحریک کے بھی پرجوش حامی اور علم بردار رہے۔ اردو کے عصری مسائل سے انھیں گہری دلچسپی رہی اور اردو کے حقوق کے تحفظ کے لیے وہ ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ مسعود صاحب اگرچہ بنیادی طور پر ایک استاد ہیں، لیکن انھوں نے خود کو محض درس وتدریس تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ اردو زبان وادب کی ہمہ جہت ترقی کے لیے بھی وہ تمام عمر کوشاں رہے۔ ادب کی گراں مایہ خدمات کے ساتھ ساتھ انھوں نے لسانیات کی جانب بھی اپنی توجہ مرکوز کی اور اردو زبان کے حوالے سے دلچسپ لسانیاتی وصوتیاتی مطالعات پیش کیے۔ وہ اردو میں اسلوبیاتی تنقید کے بنیاد گذار بھی ہیں۔ مسعود صاحب نے کم از کم تین نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔ ان سے کسبِ فیض کرنے والے نہ صرف برِ صغیر، بلکہ مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور امریکہ میں بھی اپنی بساط قائم کیے ہوئے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں ۲۸/جنوری ۱۹۱۹ء کو اتر پردیش کے ضلع فرخ آباد میں واقع پٹھانوں کی ایک قدیم بستی قائم گنج میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ صرف دو سال دو مہینے کے ہی تھے کہ والدِ ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد سے ان کی پرورش وپرداخت ننہال میں ہوئی۔ تعلیم کی غرض سے انھیں دہلی جانا پڑا، چنانچہ ان کی ابتدائی تعلیم (دوسرے سے آٹھویں درجے تک) جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں ہوئی، لیکن ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات انھوں نے ڈھاکہ (اب بنگلہ دیش کا صدر مقام) میں رہ کر پاس کیے جہاں ان کے سب سے چھوٹے

چچا محمود حسین خاں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ پھر وہ دہلی آ گئے اور اینگلو عربک کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج، دہلی یونیورسٹی) سے انھوں نے بی-اے کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رُخ کیا جہاں سے ۱۹۴۱ء میں ایم-اے (اردو)، اور ۱۹۴۵ء میں پی ایچ-ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ ان کا پی ایچ-ڈی کا مقالہ کتابی صورت میں 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' کے نام سے کئی بار چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ مسعود صاحب مزید تحصیلِ علم کے لیے ۱۹۵۰ء میں انگلستان گئے اور لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے شعبۂ لسانیات میں داخلہ لیا۔ وہاں سے پھر وہ فرانس چلے گئے، اور ۱۹۵۳ء میں پیرس یونیورسٹی سے ڈی-لٹ (دکتورڈیونیورستے) کی سند حاصل کی۔ ان کا ڈی-لٹ کا مقالہ *A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu* کے نام سے کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ راقم الحروف نے اس کا اردو میں ترجمہ 'اردو لفظ کا صوتیاتی وتجز صوتیاتی مطالعہ' کے نام سے کیا جو شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مسعود صاحب کے اساتذہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ)، پروفیسر جے-آر-فرتھ (لندن) اور پروفیسر پیر فوشے (پیرس) کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ مسعود صاحب امریکہ بھی گئے۔ وہاں اپنے قیام کے دوران (۶۰-۱۹۵۹ء)، انھوں نے مشہور ماہرِ لسانیات آرکی بالڈ اے-ہل (ٹیکسس یونیورسٹی، آسٹن) کے لکچرز میں شرکت کی اور ان کے اسلوبیاتی نظریات وافکار سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کا تعلق قائم گنج (یو-پی) کے ایک نہایت معزز پٹھان گھرانے سے ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب آفریدی پٹھانوں سے ملتا ہے جو اٹھارویں صدی کے نصفِ اول میں صوبہ سرحد کے آزاد قبائلی علاقے تیراہ (بنوں کوہاٹ کے شمال میں واقع آفریدی پٹھانوں کا علاقہ) سے ترکِ وطن کر کے قائم گنج میں آباد ہو گئے تھے۔ مسعود صاحب کے پردادا غلام حسین خاں نے خاندانی روایت کے مطابق پیشۂ سپہ گری اختیار کیا اور حیدرآباد جا کر فوج میں ملازم ہو گئے۔ ان کے دادا فدا حسین خاں بھی طالع آزمائی کے لیے حیدرآباد پہنچے، لیکن فوجی ملازمت کے بجائے انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ پیشہ انھیں بہت راس آیا اور کچھ ہی برسوں میں ان کا شمار حیدرآباد کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ انھوں نے وہاں رہ کر خوب دولت کمائی اور شہر کے بیگم بازار میں ایک نہایت شاندار دو منزلہ کوٹھی تعمیر کرائی۔ ان کی کمائی ہوئی دولت سے قائم گنج میں بھی ایک عظیم الشان حویلی کی تعمیر عمل میں آئی جو 'محل' کے نام سے مشہور ہوئی۔ مسعود حسین خاں ۲۸/جنوری ۱۹۱۹ء کو اسی 'محل' کے ایک گوشے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مظفر حسین خاں ایم-اے-او کالج، علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ انھوں نے یہاں سے ایل ایل-بی کا امتحان بھی پاس کیا تھا اور ضلع وارنگل (ریاستِ حیدرآباد) کی عدالت میں مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور دِق کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر محض ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ مسعود صاحب کے بڑے چچا ذاکر حسین خاں (ڈاکٹر ذاکر حسین) نے جرمنی جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی، پھر

ملک کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے اور اتنی ترقی کی کہ ایک دن صدرِ جمہوریۂ ہند کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ وہ ایک ممتاز ماہرِ تعلیم بھی تھے اور گاندھی جی کے نظریۂ تعلیم سے بیحد متاثر تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کی 'بنیادی تعلیم' کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تعلیمی خطبات کے علاوہ بشمولِ 'ریاست' (افلاطون کی Republic کا اردو ترجمہ) کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ مسعود صاحب کے دوسرے چچا یوسف حسین خاں نے فرانس میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ وہ ایک ممتاز مورخ تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) میں کافی عرصے تک تاریخ کے پروفیسر رہے تھے۔ وہاں سے سبک دوش ہونے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوگئے تھے۔ انھیں اُردو ادب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ وہ فرانسیسی زبان سے بھی بہت اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ انھوں نے مولوی عبدالحق کی تحریک پر گارساں دتاسی کے خطبات کا فرانسیسی سے اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ 'یادوں کی دنیا' یوسف حسین خاں کی دلچسپ خودنوشت ہے۔ اس کے علاوہ 'فرانسیسی ادب'، 'اردو غزل' اور 'کاروانِ فکر' ان کی چند دیگر قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ مسعود صاحب کے سب سے چھوٹے چچا محمود حسین خاں بھی معروف شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ہائیڈل برگ (جرمنی) سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ جرمنی سے واپسی پر وہ ایک عرصے تک ڈھاکہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ وہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ تعلیمی مسائل اور تعلیم کے فروغ سے انھیں خصوصی دلچسپی تھی، چنانچہ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی طرز پر کراچی کے ملیر کے علاقے میں ایک درسگاہ قائم کی جو آج بھی قائم ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کا ننھیال بھی پٹھانوں کا ایک بھراپُرا، معزز اور خوش حال خاندان تھا۔ ان کے نانا جان عالم خاں کا شمار پتورہ (قائم گنج کی ایک بستی) کی ثروت مند شخصیات میں ہوتا تھا۔ مسعود صاحب کے چار ماموں تھے جن میں سب سے بڑے ماموں سلطان عالم خاں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ یہاں تک کہ جب کانگریسی رہنما سمپورنا نند یو-پی کے وزیرِ اعلیٰ بنے تو ان کی وزارت میں سلطان عالم خاں نائب وزیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ دوسرے ماموں قدوس عالم خاں (جو مسعود حسین خاں کے خسر بنے) خاندانی جائداد اور باغات وغیرہ کی دیکھ بھال پر مامور کیے گئے۔ مسعود صاحب کے تیسرے ماموں غلام ربانی تاباںؔ مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا، لیکن اس میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔ چوتھے ماموں خورشید عالم خاں بحمداللہ حیات ہیں اور مسعود صاحب کے ہی ہم عمر ہیں۔ ان کی اہلیہ سعیدہ، مسعود صاحب کے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین کی بیٹی ہیں۔ اپنے بڑے بھائی سلطان عالم خاں کی طرح، خورشید عالم خاں نے بھی عملی سیاست میں حصہ لیا اور خوب ترقی کی۔ اپنے طویل سیاسی کیریر میں وہ پارلیمنٹ کے رکن کے علاوہ مرکزی کابینہ میں بھی کئی اہم عہدوں پر فائز ہوئے اور بعض ریاستوں کے گورنر بھی بنے۔

مسعود صاحب پانچ بھائی بہن تھے — تین بھائی اور دو بہنیں۔ بڑے بھائی امتیاز حسین خاں تھے۔

ان سے چھوٹی خدیجہ بیگم تھیں، پھر ایک اور بہن رفیعہ بیگم تھیں، پھر مسعود حسین خاں تھے، اور سب سے آخر میں ایک اور بھائی شاہد حسین خاں تھے۔ رفیعہ بیگم اور شاہد حسین خاں کا انتقال تو عہدِ طفلی ہی میں ہوگیا تھا، البتہ امتیاز حسین خاں ادھیڑ عمر کو پہنچ کر فوت ہوئے۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) کے کامرس کے شعبے کے صدر تھے۔ بعدازاں سکندرآباد کالج کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوگئے تھے۔ خدیجہ بیگم نے عمرِ طبعی پائی اور چند سال قبل اللہ کو پیاری ہوئیں۔ مسعود حسین خاں بحمداللہ حیات ہیں اور انشاء اللہ العزیز ۲۸/جنوری ۲۰۰۹ء کو اپنی عمرِ عزیز کے نوے (۹۰) سال پورے کرلیں گے۔ مسعود صاحب نے نہایت خوشگوار متاہل زندگی گذاری۔ ان کی شریکِ حیات نجمہ بیگم (قدوس عالم خاں کی بڑی بیٹی)، جو مسعود صاحب کی ماموں زاد بہن بھی ہیں، زندگی کے سفر میں آج بھی ان کی شریکِ رنج وراحت ہیں، گویا ساٹھ سال پہلے "کہ چراغ راہ کے جل گئے" تھے، آج بھی روشن ہیں (۲/فروری ۲۰۰۸ء کو پروفیسر مسعود حسین خاں کی شادی کی ساٹھویں سال گرہ تھی!)۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد، جیسا کہ دستور ہے، مسعود حسین خاں کو بھی روزگار کی تلاش ہوئی، چنانچہ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں پروگرام اسسٹنٹ (انچارج اردو اور ہندی ٹاکس) کی ملازمت اختیار کرلی۔ وہاں ان کی ملاقات اردو ادب کی تین نامور شخصیات پطرس بخاری، ن-م- راشد اور میراجی سے ہوئی۔ لیکن یہ سرکاری نوکری انھیں ہرگز راس نہ آئی اور محض چھے ماہ کے اندر وہ وہاں سے مستعفی ہوکر گھر واپس آگئے۔ یہ ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے۔ اسی سال پروفیسر رشید احمد صدیقی کے لطفِ خاص سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی پوسٹ پر ان کا عارضی تقرر ہوگیا۔ گیارہ سال تک لکچرر رہنے کے بعد ۱۹۵۴ء میں وہ اسی شعبے میں ریڈر ہوگئے۔ لیکن ۱۹۶۲ء میں انھیں علی گڑھ چھوڑ کر حیدرآباد جانا پڑا، جہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کا تقرر بہ حیثیت پروفیسر وصدرِ شعبہ اُردو ہوگیا۔ یہاں انھوں نے چھے سال گذارے۔ ۱۹۶۸ء میں پھر ان کی علی گڑھ مراجعت ہوئی۔ اس بار انھیں لسانیات کے نئے شعبے کے پروفیسر وصدر کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہاں سے وہ ۱۹۷۷ء میں حسنِ خدمت پر سبک دوش ہوگئے۔ مسعود حسین خاں ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۸ء جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے وائس چانسلر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ علاوہ ازیں وہ ۸۲-۱۹۸۱ء کے دوران اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی (سری نگر) میں وزٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ مسعود حسین خاں کی غیر معمولی علمی ولسانی خدمات کے پیشِ نظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ۱۹۷۷ء میں شعبۂ لسانیات کے پروفیسر ایمی ریٹس (تاحیات) کے اعزاز سے نوازا۔

علاوہ ازیں پروفیسر مسعود حسین خاں کو اپنے علمی کیریر میں اور بھی کئی اعزازات حاصل ہوئے، مثلاً وہ ایسوسی ایشن آف ایشین اسٹڈیز، مشی گن (امریکہ) کے سینیر فیلوشپ سے سرفراز ہوئے، ڈپارٹمنٹ آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، برکلے (امریکہ) میں وزٹنگ ایسوسی ایٹ پروفیسر مقرر ہوئے، انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے قائم مقام سکریٹری رہے، ایک طویل عرصے تک جامعۂ اردو، علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کے

عہدے پر فائز رہے، ترقی اردو بیورو (وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند) کے وائس چیرمین مقرر ہوئے، اردو-اردو لغت (ترقیِ اردو بیورو) کے چیف ایڈیٹر کے فرائض انجام دیے اور اصطلاحات کمیٹی برائے لسانیات (ترقی اردو بیورو) کے صدر کی حیثیت سے کام کیا۔ مسعود صاحب ان دنوں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر کے عہدے پر فائز ہیں۔ انھوں نے ادارتی ذمہ داریاں بھی بہ خوبی سنبھالیں، مثلاً عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کے تحقیقی مجلّے 'قدیم اردو' کے ایک عرصے تک مدیر رہے، نیز انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے مجلّے سہ ماہی 'اردو ادب' اور ہفتہ وار اخبار 'ہماری زبان' کے مدیر کے فرائض بھی انجام دیے۔ علاوہ ازیں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علمی مجلّے 'فکر و نظر' کے بھی مدیر رہے۔ مسعود صاحب کو ان کی مجموعی علمی و ادبی خدمات پر ۱۹۸۲ء میں اتر پردیش اردو اکادمی کا خصوصی انعام پیش کیا گیا۔ وہ ۱۹۸۴ء میں اپنی گراں قدر تصنیف 'اقبال کی نظری و عملی شعریات' پر ساہتیہ اکادمی (نئی دہلی) کے اردو ایوارڈ سے بھی سرفراز ہوئے۔ علاوہ ازیں ۱۹۸۶ء میں انھیں کراچی (پاکستان) کا نیاز فتح پوری ایوارڈ بھی ملا۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے غالب انعام سے بھی نوازے گئے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کی علمی، ادبی، تنقیدی، لسانی، تحقیقی اور تدوینی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں اور اپنے مجموعۂ کلام 'دو نیم' کی وجہ سے ادبی حلقوں میں ایک زمانے میں خاصے مشہور بھی ہوئے، لیکن بنیادی طور پر وہ لسانیات اور لسانیاتی تحقیق کے مردِ میدان ہیں۔ ہند آریائی لسانیات پر انھیں کامل عبور حاصل ہے۔ علاوہ ازیں تاریخی لسانیات، صوتیات، اسلوبیات، دکنیات اور اقبالیات، نیز لغت نویسی اور زبان کے مسائل سے انھیں خصوصی دلچسپی رہی ہے، اور انھی علمی میدانوں میں انھوں نے قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ مسعود حسین خاں کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے ماہرینِ لسانیات میں ہوتا ہے جن میں سنیتی کمار چٹرجی، سید محی الدین قادری زورؔ، سکمار سین، ایس- ایم- کترے، دھیریندر ورما، بی ایچ- کرشنا مورتی، وی -آئی- سبرامنیم، پی-بی- پنڈت اور اشوک آر- کیلکر کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ مسعود صاحب اُن ممتاز اسکالرز میں ہیں جنھوں نے یورپ اور امریکہ میں رہ کر لسانیات کی باقاعدہ تربیت حاصل کی اور بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں ہندوستان میں لسانیاتِ جدید کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب ہندوستانی اسکالرز کو لسانیات بالخصوص توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) کی تربیت دینے کے لیے راک فیلر فاؤنڈیشن (امریکہ) کی مالی امداد سے پونا کے دکن کالج میں ۱۹۵۵ء میں مختصر مدتی سرما اور طویل مدتی گرما اسکولوں کا انعقاد ہوا تو مسعود صاحب ان کے اساتذہ میں شامل کیے گئے جن میں کئی امریکی ماہرینِ لسانیات بھی تھے، مثلاً فیربینکس، ایچ -اے- گلیسن (جونیر)، جان جے- گمپر ز، وغیرہ۔ لسانیات کا یہ تربیتی پروگرام پانچ سال تک جاری رہا۔ اس دوران میں کل ہند سطح پر یونیورسٹی کے جونیر اساتذہ اور نوجوان تحقیق کاروں کی کھیپ کی کھیپ تیار ہوگئی۔ انھی تربیت یافتہ ماہرینِ لسانیات کی کاوشوں سے ہندوستانی دانش گاہوں میں لسانیاتِ جدید کا فروغ عمل میں آیا۔

لسانیات کے میدان میں پروفیسر مسعود حسین خاں کا سب سے بڑا اور قابلِ قدر کارنامہ 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تھی، لیکن اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اُس وقت سے لے کر اب تک اس کے صرف ہندوستان میں ایک درجن سے زائد ایڈیشنز نکل چکے ہیں۔ اس کتاب میں اردو زبان کے آغاز اور اس کے ارتقا کی مکمل و مربوط تاریخ بیان کی گئی ہے اور ایک ایسے نظریے کی تشکیل کی گئی ہے جو اردو کے آغاز کا سب سے قابلِ قبول نظریہ (Most acceptable theory) ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں نہ صرف ٹھوس لسانی دلائل اور مستند تاریخی حوالے پیش کیے گئے ہیں، نیز مواد کی صحت کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے بلکہ قدیم مآخذ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ مزید برآں ہند آریائی لسانیاتی تحقیق سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے اور تاریخی لسانیات کے اصولوں کو مکمل طور پر برتا گیا ہے، تب کہیں جا کر ایک نئے اور مستند لسانی نظریے کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ مسعود صاحب کے اس نظریے کی رو سے اردو دہلی و نواحِ دہلی میں پیدا ہوئی۔ اس پر مختلف اوقات میں دہلی کے آس پاس کی چار بولیوں کے اثرات مرتسم ہوئے جن میں کھڑی بولی اور ہریانوی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو نے ابتدا میں اگرچہ کھڑی بولی کا ڈھانچا اختیار کیا، لیکن اس میں ہریانوی کے اثرات بھی نفوذ کر گئے۔ یہی زبان علائی حملے (۱۲۹۴ء) اور اس کے بعد محمد بن تعلق کے عہد میں انتقالِ آبادی (۱۳۲۷ء) کے ساتھ دکن پہنچی جہاں اس نے ادبی اعتبار سے خوب ترقی کی۔ جیسے جیسے ہریانوی اور دیگر مقامی لسانی اثرات زائل ہوتے گئے، اردو ایک ترقی یافتہ اور معیاری زبان کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی۔ مسعود صاحب سے پہلے اردو کے کسی عالم یا محقق نے اردو کے آغاز کا اتنا جامع، مفصل و مدلل اور لسانیاتی اعتبار سے مستند اور ٹھوس نظریہ پیش نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نصف صدی گذر جانے کے بعد بھی مسعود صاحب کے اس نظریے کو چیلنج نہیں کیا جا سکا ہے اور آج بھی یہ اردو کا سب سے قابلِ قبول نظریہ ہے۔ مسعود صاحب نے اپنے اس لسانی نظریے کی تشکیل، قبلاً پیش کیے گئے نظریات پر لسانیات کی روشنی میں خطِ تنسیخ کھینچنے کے بعد کی ہے۔ محمد حسین آزادؔ، حافظ محمود خاں شیرانی، سید شمس اللہ قادری، سید محی الدین قادری زورؔ، سید سلیمان ندوی اور گراہم بیلی وہ اہلِ علم ہیں جو مسعود صاحب سے پہلے اردو کے آغاز کے بارے میں اپنے اپنے نظریات پیش کر چکے تھے، لیکن ان میں سے کسی بھی عالم کا نظریۂ آغازِ زبانِ اردو مسعود صاحب کے نزدیک لائقِ اعتنا نہ تھا، کیوں کہ یہ تمام تر نظریات دہلی و نواحِ دہلی کی بولیوں اور ان کے باہمی رشتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے تشکیل دیے گئے تھے، نیز ہند آریائی کے ارتقا پر ان عالموں کی نظر گہری نہ تھی اور نہ وہ شورسینی اپ بھرنش کی اہمیت کو سمجھتے تھے جس سے ۱۰۰۰ سنہِ عیسوی کے بعد دہلی و نواحِ دہلی کی بولیاں معرضِ وجود میں آئیں۔ چنانچہ ان تمام نظریوں کو مسعود صاحب نے باطل قرار دے کر اردو کے آغاز کے ایک نئے نظریے کی تشکیل کی جس کی رو سے "زبانِ دہلی و پیرامنش اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے اور حضرتِ دہلی اس کا حقیقی مولد و منشا۔" ('مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو'

[۱۹۸۷ء ایڈیشن]، ص ۲۶۲)۔

لسانیات سے متعلق پروفیسر مسعود حسین خاں کا دوسرا علمی میدان صوتیات ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اردو کے حوالے سے قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ انھوں نے پہلی بار 'عروضی' (Prosodic) نقطۂ نظر سے اردو لفظ کا صوتیاتی مطالعہ و تجزیہ پیش کیا ہے۔ عروضی صوتیات (Prosodic Phonology) کا تصور سب سے پہلے برطانوی ماہرِ لسانیات پروفیسر جے۔ آر۔ فرتھ نے پیش کیا تھا جن کا تعلق لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے شعبۂ لسانیات سے تھا۔ مسعود صاحب کو قیامِ لندن کے دوران پروفیسر فرتھ سے استفادے کا کافی موقع ملا، چنانچہ انھوں نے اپنے ڈی۔ لٹ کے مقالے *A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu* کی بنیاد فرتھ کے اسی صوتیاتی نظریے پر رکھی اور اردو کے حوالے سے عروضی صوتیات پر قابلِ قدر تحقیقی کام کیا۔ ان کا یہ مقالہ پہلی بار ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے تیس سال بعد اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا (مترجم: مرزا خلیل احمد بیگ) جو اردو کے لسانیاتی ادب میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہاں 'عروض' (Prosody) سے مراد شاعری کا علمِ عروض نہیں ہے، بلکہ یہ ایک صوتیاتی اصطلاح ہے جس سے ماہرینِ لسانیات وہ ''صوتیاتی قوس'' مراد لیتے ہیں جو صوت رکن (Syllable)، لفظ یا جملے پر پھیلی ہوتی ہے۔ عروضی صوتیات دو طرح کے عناصر کے مجموعے کا نام ہے۔ اول صوتی اکائیاں، یعنی مصوتے (Vowels) اور مصمتے (Consonants)؛ دوم عروضیات (Prosodies)، یعنی وہ خصوصیات (مثلاً سر لہر، تان، طول، زور، نیز معکوسیت، مسموعیت، انفیت، وغیرہ) جو صوتی اکائیوں (مصوتوں اور مصمتوں) پر بہ صورتِ 'قوس' پھیلی ہوتی ہیں۔ صوتی اکائیوں سے ہی صوت رکن (Syllable) اور لفظ بنتے ہیں اور لفظوں سے جملے۔ یہی وجہ ہے کہ عروضیات یا عروضی خصوصیات (Prosodic features) صوت رکن، لفظ اور جملے تینوں پر محیط ہوتی ہیں۔ مسعود صاحب نے اپنے متذکرہ مقالے میں عروضی صوتیات کا نہایت جامعیت اور قطعیت کے ساتھ مطالعہ پیش کیا ہے جو اردو کے حوالے سے توضیحی لسانیات کا فقید المثال کارنامہ ہے۔ صوتیات سے متعلق مسعود صاحب کا دوسرا اہم تحقیقی کارنامہ ان کا مقالہ ''اردو صوتیات کا خاکہ'' ہے جو اردو کی ممیّز آوازوں (Phonemes) کا اولین توضیحی مطالعہ ہے۔ اس مطالعے میں مسعود صاحب نے نہ صرف معیاری اردو کے مصوتوں اور مصمتوں کا تعین کر دیا ہے اور ان کی تعداد مقرر کر دی ہے، بلکہ انفی آوازوں کی خصوصیات، کوزی اور ہائیہ آوازوں کی تقسیم (Distribution)، نیز مصوتوں اور مصمتوں کی کمیت (Quantity) کا بھی توضیحی نقطۂ نظر سے محاکمہ کیا ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کو ادبی تنقید سے بھی خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ ابتدا میں انھوں نے مصحفی، اقبال، اصغر گونڈوی، جوش ملیح آبادی، اور بعض دیگر ادبی موضوعات پر تنقیدی مضامین لکھے جو تاثراتی تنقید کے ذیل

میں آتے ہیں، لیکن تنقید کے اس انداز سے وہ مطمئن نہ تھے۔ بہ حیثیتِ مجموعی وہ ادبی یا تاثراتی تنقید کو ''فقرے بازی'' اور ''قولِ محال'' سمجھتے تھے اور اس سے ''بیزار'' ہو چکے تھے۔ جن تنقیدی فقروں (مثلاً ''ہندوستان کو الہامی کتابیں دو ہیں — مقدس وید اور دیوانِ غالب'' یا ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے''، وغیرہ) پر لوگ سر دھنتے تھے، مسعود صاحب کی سمجھ میں ان کا مفہوم نہ آتا تھا۔ وہ انھیں محض ''انشا پردازی'' تصور کرتے تھے، تنقید نہیں۔ چنانچہ انھیں تنقید کے کسی نئے نظریے کی تلاش تھی جس میں داخلی و تاثراتی انداز کے بجائے معروضیت اور قطعیت پائی جاتی ہو۔ امریکہ میں اپنے قیام کے دوران انھیں جب پروفیسر آرکی بالڈ اے۔ ہل، جن کا شمار تفہیمِ ادب پر لسانیات کا اطلاق کرنے والوں میں ہوتا تھا، کی درسیاست سے خاطر خواہ استفادے کا موقع ملا، تب انھیں یہ محسوس ہوا کہ انھوں نے وہی پایا جس کی انھیں تلاش تھی، ''یعنی لسانیات اور ادب کو کس طرح ہم دگر کیا جا سکتا ہے۔'' مسعود صاحب کو لسانیات کا ادب پر اطلاق کرنے کی تحریک گویا یہیں سے ملی۔ ادب کی تنقید کے اس نئے نظریے کو 'اسلوبیات' (Stylistics) کا نام دیا گیا تھا جو اطلاقی لسانیات کا ایک اہم شعبہ ہے۔ اہلِ ادب نے اسے 'اسلوبیاتی تنقید' کے نام سے موسوم کیا۔ ۱۹۶۰ء میں امریکہ سے واپسی پر مسعود صاحب نے اسلوبیاتی مضامین لکھنے کا کام شروع کیا۔ اس سلسلے کا ان کا سب سے پہلا مضمون ''مطالعۂ شعر (صوتیاتی نقطۂ نظر سے)'' ہے۔ مسعود صاحب نے اسلوبیات کی نہ صرف نظری بنیادیں فراہم کیں، بلکہ اس کے اطلاقی نمونے بھی پیش کیے۔ اس ضمن میں انھوں نے غالب، اقبال اور فانی بدایونی کے کلام کے حوالوں سے جو اسلوبیاتی مضامین تحریر کیے ہیں وہ ہیئتی و لسانیاتی تنقید کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتح پوری کے نثری اسلوب کا بھی لسانیاتی تجزیہ پیش کیا ہے جو اردو کے انتقادی ادب میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسعود صاحب ہی سے تحریک پا کر گوپی چند نارنگ، مغنی تبسم اور راقم الحروف نے اردو میں اسلوبیاتی مضامین لکھے اور کتابیں تصنیف کیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو میں اسلوبیاتی تنقید کے بنیاد گذار کی حیثیت سے مسعود حسین خاں کا نام ہمیشہ لیا جاتا رہے گا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں ادبی تحقیق و تدوین کے بھی مردِ میدان ہیں۔ ان کی ادبی تحقیق قدیم مصنفین مثلاً محمد افضل افضلؔ، فیروز بیدری، روشن علی، عبدل دہلوی اور عیسوی خاں بہادر وغیرہ کے حالاتِ زندگی، وطن اور ان کے ادبی کارناموں کی چھان بین سے متعلق ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے پریم چند کے ناول 'گئودان' سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ادبی تحقیق کا ایک اہم حصہ ہے۔ مسعود صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ 'گئودان' تصنیف ہے یا ترجمہ؟ وہ برسوں کی چھان بین اور تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو ناول 'گئودان' پریم چند کا لکھا ہوا نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے ہندی ناول 'گودان' کا اردو ترجمہ ہے جسے اقبال بہادر ورما سحرؔ ہتگامی نے پریم چند کی وفات کے بعد کیا، لہٰذا 'گئودان' کو اردو کے طبع زاد ناولوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا، نیز اس کا اردو ناول نگاری

کی تاریخ میں کوئی مقام نہیں۔ مسعود صاحب کی اس ادبی تحقیق نے اردو دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ اردو کے ادیب یہ بات تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہ تھے کہ 'گئودان' اردو ناول نہیں۔ بعض اہلِ علم نے تو مسعود صاحب کی نیت پر ہی شک کرنا شروع کر دیا۔ گیان چند جین نے تو یہ تک کہہ دیا کہ یہ مسعود صاحب کا ''پریم چند کے خلاف...ادبی جہاد'' ہے (ملاحظہ ہو 'نذرِ مسعود'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ، ص ۱۲۰)۔ پریم چند کے ایک محقق مانک ٹالا نے بھی مسعود صاحب پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ ''پریم چند کو بہ طورِ اردو ادیب Disown کرنے کے درپے ہیں'' (بہ حوالۂ سابق، ص ۱۵۶)۔ لیکن اس سلسلے میں مسعود صاحب کی داخلی وخارجی شہادتیں اور دلیلیں اتنی درست، معقول اور ٹھوس تھیں کہ یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہ تھا کہ ہندی 'گودان' کے اردو میں ترجمے کا کام سحر ہنگامی نے پریم چند کے انتقال کے بعد شروع کیا۔ مسعود صاحب کی اس ادبی تحقیق کا سلسلہ ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۴ء تک جاری رہا جب 'مقالاتِ یومِ پریم چند' (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۴ء) میں شائع شدہ اپنے مقالے ''گودان تا گئودان'' میں مسعود صاحب نے اس تحقیق کا خلاصہ پیش کیا۔

مسعود صاحب کی تدوینی خدمات بھی لائقِ تحسین ہیں۔ انھیں تدوینِ متن سے دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب وہ ۱۹۶۲ء میں عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد) کے شعبۂ اردو میں پروفیسر اور صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے 'قدیم اردو' کے نام سے ایک تحقیقی مجلّہ جاری کیا جس میں قدیم متوں کو تدوینِ متن کے اصولوں کے مطابق مرتب کر کے شائع کیا جاتا تھا۔ 'قدیم اردو' کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۷۲ء تک جاری رہا جس میں مسعود صاحب کے مرتب کردہ چار قدیم متون شائع ہوئے: 'پرت نامہ' (فیروز بیدری)، 'بکٹ کہانی' (محمد افضل افضلؔ)، 'ابراہیم نامہ' (عبدل دہلوی)، اور 'عاشور نامہ' (روشن علی)۔ یہ چاروں قدیم مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ مسعود صاحب نے ایک داستان 'قصۂ مہر افروز ودلبر' (عیسوی خاں بہادر) بھی مدون کر کے شائع کی ہے۔ ان تمام متون کی تدوین میں مسعود صاحب نے اصولِ تدوین کا پوری طرح خیال رکھا ہے اور انھیں اپنے تعارفی تحقیقی مقدموں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ تدوینِ متن کے سلسلے میں مسعود صاحب کا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ وہ سب سے پہلے مصنف کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں اور قدیم تذکروں اور دستاویزات سے جو بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں انھیں وہ تحقیقی نقطۂ نظر سے پرکھنے کے بعد یکجا کر دیتے ہیں۔ پھر وہ دریافت شدہ نسخے کا تعارف پیش کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ کہاں سے اور کیسے دستیاب ہوا، اور اگر دو یا دو سے زیادہ نسخے دریافت ہوئے ہیں تو وہ اختلافِ نسخ بھی دیتے ہیں نیز متن کی ادبی قدر و قیمت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور لسانیاتی خصوصیات کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ وہ فرہنگیں بھی دیتے ہیں۔ تدوینِ متن کی راہ میں حائل سب سے بڑی دشواری قلمی نسخوں کی صحت کے ساتھ قرأت ہے۔ مسعود صاحب اس مشکل مرحلے سے بہ آسانی عہدہ برآ ہو جاتے ہیں اور مصنف کے متن تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کی دکنیات سے بھی خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ دکنی زبان و ادب کا ذکر ان کی تحقیقی تصنیف 'مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو' میں کثرت سے ملتا ہے۔ انھوں نے تشکیلی نقطۂ نظر سے اردو زبان کے ارتقا کو چار ''واضح ادوار'' میں تقسیم کیا ہے جن میں سے دورِ اول و دوم کا تعلق قدیم اردو سے ہے۔ مسعود صاحب دورِ اول میں قدیم اردو کا ارتقا شمالی ہند میں ۱۲۰۰ تا ۱۴۰۰ء دکھلاتے ہیں اور دورِ دوم میں قدیم اردو کا ارتقا دکن میں ۱۴۰۰ تا ۱۷۰۰ء بتاتے ہیں۔ بہ قولِ مسعود حسین خاں، ''قدیم اردو کے دوسرے یعنی دکنی دور تک آتے آتے اردو کی قواعدی شکلوں اور رسمِ خط دونوں میں استقامت آ جاتی ہے۔'' ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ''تین سو سال کے اس [دکنی] دور میں تصانیف کی اس قدر بہتات ہے کہ ہم ان کی بنیاد پر قطعی لسانی فیصلے کر سکتے ہیں۔'' ('اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر'، ص ۱۲ تا ۲۰)۔ مسعود صاحب 'دکنی' کو اردوئے قدیم یا قدیم اردو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے دو مضامین قابلِ توجہ ہیں: ''دکنی یا اردوئے قدیم؟''، اور ''قدیم و جدید اردو کی کشمکش سرزمینِ دکن میں''۔ مسعود صاحب نے دو دکنی متون 'پرت نامہ' اور 'ابراہیم نامہ' کو بھی ایڈٹ کر کے اپنے تحقیقی اور سیر حال مقدموں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے 'دکنی اردو کی لغت' کی ترتیب کا کام بھی انجام دیا ہے۔ یہ ۲۶۷ شعری ونثری تصانیف کی سندوں پر مشتمل لغت ہے جن میں سے بہت سے قلمی نسخے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے جسے ایک غیر دکنی اہلِ علم نے ترتیب دیا ہے۔ اس میں لغت نویسی کے اصولوں کی سختی کے ساتھ پابندی کی گئی ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے ادبی صحافت میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا ہے اور اردو تحریک کے بھی فعال قلم کار رہے ہیں۔ وہ ۷۰-۱۹۶۹ء کے دوران انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے قائم مقام سکریٹری رہے اور اس حیثیت سے انھوں نے انجمن کے ہفت روزہ ترجمان 'ہماری زبان' اور سہ ماہی رسالے 'اردو ادب' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ۱۹۷۱ تا ۱۹۷۳ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علمی و تحقیقی مجلّے 'فکر و نظر' کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ 'ہماری زبان' میں انھوں نے جو اداریے قلم بند کیے وہ راقم الحروف نے 'اردو کا المیہ' کے نام سے مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیے ہیں۔ یہ اداریے نہ صرف اردو کی لسانی صورتِ حال اور اردو کے مسائل و مطالبات کی ترجمانی کرتے ہیں، بلکہ اردو تحریک کو جلا بخشنے میں بھی ان کا اہم کردار رہا ہے۔ ان اداریوں سے اردو کے بارے میں مسعود صاحب کے موقف کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ 'اردو ادب' اور 'فکر و نظر' کے مدیر کی حیثیت سے انھوں نے اردو کی ادبی صحافت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کی ان خدمات کو اہلِ اردو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ مسعود صاحب ایک کامیاب آپ بیتی نگار بھی ہیں۔ ان کی خودنوشت سوانح حیات 'ورودِ مسعود' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی پیدائش (۱۹۱۹ء) سے لے کر خودنوشت کی تصنیف (۱۹۸۸ء) تک کے حالات و واقعات نہایت کھرے اور دوٹوک انداز میں قلم بند کر دیے ہیں، اور سچائی

اور صدق گوئی کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ 'ورودِ مسعود' کو اردو کی ''بہترین'' خودنوشت کہا گیا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی پریس کے لیے تیار ہے۔

میں راقم الحروف، شفیقِ محترم پروفیسر مسعود حسین خاں کی نوے ویں (۹۰ ویں) سال گرہ پر اپنی اور تمام اہلِ اردو کی جانب سے ان کی خدمت میں پُرخلوص ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور خدائے عز و جل سے ان کی صحت و تندرستی اور مزید درازیِ عمر کے لیے دعا کرتا ہوں۔ ان دنوں اُن کی عام صحت اگرچہ بہت گر چکی ہے، لیکن ان کا ذہن اب بھی چاق و چوبند اور حافظہ رواں دواں ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہتے ہیں اور اپنی زندگی حتی المقدور معمول کے مطابق گذارتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ ضعفِ بینائی نے ان کے سارے حوصلے پست کر دیے ہیں اور ان کے تمام علمی منصوبوں پر پانی پھیر دیا ہے، اور وہ یاس و حرماں نصیبی کے احساس سے شدید طور پر دوچار ہیں۔ ان کی حالیہ نظم ''سخنِ واپسیں'' ان کے حزن و ملال اور داخلی کیفیات کی مکمل ترجمانی کرتی ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

دوا سے کچھ نہ ہوا، اور دعا سے کچھ نہ ملا   بشر نے کچھ نہ دیا اور خدا سے کچھ نہ ملا
زوال میرا مقدر بنا کے چھوڑ دیا   مجھے خیال و حدیثِ بقا سے کچھ نہ ملا
یہ تو نے دیدۂ بینا کی روشنی لے لی!   کہوں میں کس سے، تری اس ادا سے کچھ نہ ملا
میں خالی ہاتھ چلا آ رہا ہوں تیری طرف   تجھے بتانے کہ تیری عطا سے کچھ نہ ملا

کتابیات:

۱- اکبر رحمانی، 'گفتگو' (جلگاؤں: ایجوکیشنل اکادمی، ۲۰۰۱ء)، [پروفیسر مسعود حسین خاں سے اکبر رحمانی کی بات چیت]

۲- خلیق انجم، 'پروفیسر مسعود حسین خاں: ایک جامع حیثیات شخصیت' (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو [ہند]، ۱۹۹۶ء)۔

۳- ریحانہ سلطانہ، 'پروفیسر مسعود حسین خاں کی ادبی خدمات' (حیدرآباد: دکن پبلشرز، ۱۹۹۵ء)۔

۴- ماہنامہ 'کتاب نما' (نئی دہلی)، ''گوشۂ مسعود حسین خاں'' مرتبہ ایم- حبیب خاں (اکتوبر ۱۹۹۲ء)۔

۵- مرزا خلیل احمد بیگ، 'نذرِ مسعود' [مجموعۂ نگارشات جو پروفیسر مسعود حسین خاں کو ان کی سترویں سال گرہ پر پیش کیا گیا]، (علی گڑھ: تعلیمی مرکز، ۱۹۸۹ء)۔

۶- مسعود حسین خاں 'ورودِ مسعود' [خودنوشت سوانحِ حیات]، (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۸۸ء)۔

☆☆☆

ڈاکٹر نذر خلیق (خان پور)

فکرِ اقبال

(اقبال کی نثر کے حوالے سے)

عام طور پر علامہ اقبال کو ایک شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ہمارے محققین اور نقاد جب بھی اقبال کی کسی فکری کاوش کا جائزہ لیتے ہیں تو حوالے اشعار سے دیتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال عہد ساز اور صاحبِ طرز نثر نگار بھی ہیں۔ اقبال کی نثر کے اسلوب کو رومانی اسلوب کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان کے اسلوب میں تخیل کی آمیزش موجود ہے حالانکہ عصرِ اقبال کا تقاضا یہ تھا کہ عقلیت اور استدلالیت پر زور دیا جائے۔ جس کی جھلکیاں سر سیّد احمد خان اور ان کے بیشتر ساتھیوں کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ اقبال کی نثر موضوعاتی سطح پر بے شک استدلالیت، عقلیت اور منطقیت کا مجموعہ ہے تاہم نثر میں اسلوب کا وہی انداز ہے جو ان کے کلام میں موجود ہے۔

علامہ اقبال نے شاعری تو عہدِ سیالکوٹ سے ہی شروع کر رکھی تھی مگر نثر کا آغاز لاہور میں ہوا۔ ان کا پہلا مقالہ عبدالکریم الجیلی کے بارے میں ہے اور ان کی پہلی کتاب معاشیات سے متعلق ''علم الاقتصاد'' ہے۔ ان دونوں نثری تخلیقات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا رجحانِ طبع کس طرف ہے۔ مذہب اور معاشی صورتِ حال پر نظر۔ 'علم الاقتصاد' اگرچہ محض تدریسی مقاصد کے لیے تصنیف ہوئی تاہم اس کتاب کے مطالعے سے اقبال کی فکری صورتِ حال کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے بیشتر مقالات معاشرتی، سماجی، قومی اور مذہبی اصلاح کے لیے تحریر کیے۔ ان کی کتاب 'تاریخِ تصوف' مذہب میں تصوف کے تصور پر مبنی ہے جو ڈاکٹر صابر کلوروی نے ۱۹۸۷ء میں ترتیب دی۔ علامہ اقبال اس کتاب کو مکمل نہیں کر پائے تھے۔ ڈاکٹر صابر کلوروی کی کوششوں سے یہ اہم کتاب دریافت ہوئی جسے مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار لاہور نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کے علاوہ علامہ اقبال نے انگلستان کے قیام کے دوران میں جو مضامین اور لیکچرز دیئے تھے وہ انگریزی زبان میں تھے۔ ان کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ علامہ اقبال کے موضوعاتِ نثر پر روشنی ڈالنے سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے بھی دیکھ لیتے ہیں جو ان کے نثری اسلوب کے متعلق ہے۔

''اقبال کے ان مضامین کا سلسلہ ۱۹۰۲ء سے شروع ہوتا

ہے۔ پہلے چند مضامین مخزن کے لیے لکھے گئے تھے۔مخزن کا دور اردو نثر
نگاری کی تاریخ میں دبستانِ سرسیّد کی نثر کے بعد لطیف رومانی ردِعمل کا
دوور ہے۔سرسیّد کے دور میں مدعا پر خاص زور تھا مخزن سے تعلق رکھنے
والے ادیبوں نے مدعا نگاری کی نہ رسائی کا احساس کرتے ہوئے
اظہار میں تخیل کی آمیزش کو ضروری خیال کیا اور سلاست کے ہمراہ
لطافتِ بیان کا عنصر نثر میں داخل کیا اور ہلکے پھلکے مضمون لکھ کر ایک نئے
ذوق کی بنیاد ڈالی۔مجموعی لحاظ سے اقبال کے ان اولین مضامین میں بھی
سلاست و لطافت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔اقبال کا ذوق مختلف
ہے۔اقبال کا ذہن دو عناصر سے مرکب ہے۔اول حقائق حکمیہ سے
خاص شغف دوم شدید جذباتی کیفیتوں سے وابستگی۔حقائق کے بیان
کے سلسلے میں ان کا مقصد مطلب کو عقلی انداز میں سمجھانا ہے اور ان کے
بعض مضامین میں یہی رجحان کارفرما ہے لیکن اقبال کے اکثر مضامین
(خواہ وہ علمی ہوں یا ادبی) تخیل اور جذبات کی مدد لیے بغیر آگے نہیں
بڑھتے۔ان کا اسلوب ایک حکیم کا اسلوب بھی ہے مگر ایسے حکیم کا جو
حکمت میں شعر کا سارس پیدا کرنا ضروری سمجھتا ہے۔'' (۱)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی اس رائے سے اقبال کے اسلوب اور موضوعات پر روشنی پڑتی ہے۔اقبال کی تربیت جس ماحول میں ہوئی اور وہ جس دور میں سنِ شعور کو پہنچے،اس پر توجہ دیئے بغیر تفہیم اقبال مشکل ہے۔اقبال کے والد صوفی نور محمد اگرچہ رسمی تعلیم سے نابلد تھے لیکن علماء اور فضلاء میں اٹھتے بیٹھتے تھے اور علمی استعداد کا یہ عالم تھا کہ ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحاتِ مکیہ'' کے بہت سے حصے ازبر ہو گئے تھے۔روحانی مقام میں بھی وہ بہت بلندی پر تھے۔گویا مذہبی رجحان پایا تھا۔اقبال کی والدہ بھی مذہبی اور دینی خاتون تھیں۔اللہ اللہ کرنا ان کا وِرد تھا۔اقبال خود پہلے مولوی غلام حسین کے مدرسے میں داخل ہوئے اور پھر مولوی میر حسن کے ہاں پڑھنے لگے۔یہ دونوں حضرات سیالکوٹ میں مذہبی سکالرز تھے۔خصوصاً مولوی میر حسن مولوی کے مولوی اور دنیادار کے دنیادار تھے۔مولوی میر حسن اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات سے بھی واقف تھے یہاں تک کہ سرسیّد احمد خان اور ان کے رفقاء سے بھی تعلق خاطر تھا۔علامہ اقبال کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی۔جب اقبال لاہور آئے تو فلسفے کے بہت بڑے استاد آرنلڈ سے ملاقات ہو گئی گویا فلسفہ بھی ان کے علمی میدان میں شامل ہو گیا۔ان تمام حالات کو مدِنظر رکھیں تو اقبال کے موضوعات کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا۔اقبال کے موضوعات میں تین موضوعات نہایت اہم ہیں۔

(۱)مذہب (۲)فلسفہ وحکمت (۳) اور عصرِ حاضر (اقبال کے دور) میں مسلمانوں کی حالتِ زار اور مسلمانوں کے اسلاف کے کارنامے۔

علامہ اقبال نے مذہب کے متعلق جہاں شاعری میں اظہارِ خیال کیا ہے وہاں نثر میں بھی ان کا موضوع مذہب رہا ہے۔علامہ اقبال مذہبِ اسلام کو ایک ایسا مذہب سمجھتے ہیں جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔انسانی فطرت کے تقاضے اور انسانی فطرت کی جبلتوں کے دباؤ کو مدِنظر رکھ کر مذہبِ اسلام کی تشکیل ہوئی ہے۔اس سلسلے میں ان کی نثری کتاب ''تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ'' نہایت اہم کتاب ہے۔علامہ اقبال نے اس کتاب میں مذہبِ اسلام کو فلسفے کی روشنی میں پیش کرنے کی سعی کی ہے اور اس سلسلے میں منطقیت کا سہارا بھی لیا ہے۔اسی طرح تصوف پر ان کی ادھوری کتاب 'تاریخِ تصوف' بھی اہمیت رکھتی ہے۔یہ کتاب اگر علامہ کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو شاید بہت اہم کام ہوتا لیکن ڈاکٹر صابر کلوروی نے اسے حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کر کے علامہ اقبال کا تصوف سے متعلق نقطہ نظر واضح کر دیا ہے۔علامہ اقبال کے دیگر اہم مقالات ''خلافتِ اسلامیہ''، پین اسلام ازم، دیباچہ مثنوی اسرارِ خودی، اسرارِ خودی اور تصوف، سرِ اسرارِ خودی، تصوف وجودیہ، جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ، دیباچہ مثنوی رموزِ بے خودی، دیباچہ مثنوی اسرارِ خودی دوم، محفل میلاد النبیؐ، اسلام اور علومِ جدیدہ، خطبہ عیدالفطر، اسلام اور تصوف، اسلام ایک اخلاقی خیال کی حیثیت میں، شریعتِ اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ، حکمرانی کا خداداد حق اور اسلام کا مطالعہ زمانہ حال کی روشنی، ہیں۔(یہ تمام مقالات، مقالاتِ اقبال، مرتبہ سیّد عبدالواحد معینی میں چھپ چکے ہیں۔)ان مقالات کی روشنی میں علامہ اقبال کا مذہب سے رجحانِ طبع واضح ہوتا ہے۔اس سلسلے میں صرف ایک مقالے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اسلام ابتداء ہی سے اس اصول کو تسلیم کر چکا تھا کہ فی
الواقع اور عملاً سیاسی حکومت کی کفیل و امین ملتِ اسلامیہ ہے نہ کہ کوئی
خاص فردِ واحد، ہاں جو عمل انتخاب کنندگان اس معاملے میں کرتے ہیں
اس کے معنی صرف یہی ہیں کہ وہ اپنے متحدانہ و آزادانہ عملِ انتخاب سے
اس سیاسی حکومت کو ایک ایسی مختصر و معتبر شخصیت میں ودیت کر دیتے
ہیں جس کو وہ اس امانت کا اہل تصور کرتے ہیں۔یوں کہو کہ تمام ملت کا
ضمیر اجتماعی اس ایک فرد یا شخصیت منفردہ کے وجود میں عمل پیرا ہوتا
ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں حقیقتاً اور صحیح معنوں میں فردِ تمام کی تمام قوم
کا نمائندہ کہلا سکتا ہے لیکن ایسے فرد کا مسندِ حکومت پر متمکن ہونا شریعت
کے نزدیک اسے کسی برتری یا ترجیح کا مستحق ہرگز نہیں بناتا۔شریعتِ حقہ
کی نگاہ میں اس کی شخصی و ذاتی حیثیت بالکل وہی رہے گی جو ایک

مسلمان کی ہے۔'' (۲)

علامہ اقبال مذہبِ اسلام کو ایک ایسا نظام بھی تصور کرتے ہیں جو ہمارے سماجی اور معاشرتی معاملات کا احاطہ کرتا ہے جو دانشور یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبِ اسلام صرف ''ذاتی معاملہ'' ہے اور سماجی اور معاشرتی معاملات کچھ اور ہیں وہ درحقیقت منافقت یا مصلحت کا شکار ہیں۔ علامہ اقبال نے مذہبِ اسلام کے حوالے سے بتایا ہے کہ زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس کے بارے میں اسلام نے رہنمائی نہ فرمائی ہو۔

علامہ اقبال کا دوسرا اہم موضوع ''فلسفہ وحکمت'' ہے۔ اس سلسلے میں ان کے خطبات اہمیت رکھتے ہیں جو ''تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ'' کے نام سے چھپ چکے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی علامہ اقبال کے دیگر نثری مقالات موجود ہیں جن میں اقبال کے دو خطوط ایڈیٹر ''وطن'' کے نام، ''تصوفِ وجودیہ''، دیباچہ پیامِ مشرق، علم ظاہر و باطن، حکمائے اسلام کے عمیق مطالعے کی دعوت، حکمرانی کا خداداد حق، لسان العصر اکبر کے کلام میں ہیگل کا رنگ اہم ہیں۔ ان مقالات کی روشنی میں ان کے فلسفہ وحکمت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''حضرت مجدد الف ثانی اپنے مکتوبات میں کئی جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تصوف شعائر حقہ اسلامیہ میں خلوص پیدا کرنے کا نام ہے۔ اگر تصوف کی یہ تعریف کی جائے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض کرنے کی جرات نہیں ہو سکتی۔ راقم الحروف اس تصوف کو جس کا نصب العین شعائر اسلام میں مخلصانہ استقامت پیدا کرنا ہو۔ عین اسلام جانتا ہوں اور اس پر اعتراض کرنے کو بدبختی اور خسران کا مرادف سمجھتا ہوں۔'' (۳)

علامہ اقبال نے تصوف کی فلسفیانہ اور حکیمانہ تعریف اور توضیح کی ہے۔ یہ ایک فلسفی کا ہی کام ہے ورنہ تصوف کو ترکِ دنیا سمجھ لیا گیا تھا۔ علامہ اقبال کے موضوعات میں عصرِ حاضر (علامہ اقبال کا دور) کے مسلمانوں کے حالات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال کا دور ادبار اور زوال کا دور تھا۔ پورے برِصغیر پاک و ہند پر ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام پر کفر کا غلبہ تھا۔ مسلمان نہ صرف انتظامی اعتبار سے مغلوب ہو چکے تھے بلکہ اخلاقی اور سماجی لحاظ سے بھی قلاش ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے اس زوال پذیر دور میں دو طرح کے لوگ موجود تھے ایک وہ جو کفر کا اعلانیہ مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ ایک وہ جو خاموش انقلاب کے ذریعے کفر کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ جو اعلانیہ مقابلہ کرنا چاہتے تھے وہ علماء کا طبقہ تھا جنہوں نے انگریزی تعلیم اور انگریزی معاشرت سے دور رہنے کی تلقین کی۔ دوسرا طبقہ جو خاموش انقلاب کا حامی تھا وہ انگریزی تعلیم اور انگریزی ترقی کا حامی تھا۔ علامہ اقبال آخری طبقے کا حامی تھا۔ انتہا پسندی اور تشدد کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ علامہ اقبال جانتے تھے کہ کفر یعنی یورپ نے بھی ترقی اسی خاموش انقلاب کے ذریعے کی ہے۔ علم کو مسلمانوں کی میراث سمجھتے تھے۔ علم نہ تو انگریزی ہوتا ہے نہ عربی، علم تو علم

ہوتا ہے، زبان صرف اظہار کا ذریعہ ہے، لباس بھی لباس ہوتا ہے، اس سے روحانیت یا باطنیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کے مقالات میں سے ایک مقالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''قوموں کی تاریخ میں یہ ایک بڑا نازک وقت ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ ہر قوم نہ صرف اپنی موجودہ حالت پر غور کرے بلکہ اگر اسے اقوامِ عالم کے دفتر میں اپنا نام قائم رکھنا منظور ہے تو اپنی آئندہ نسلوں کی بہبودی کو بھی ایک موجودہ واقعہ تصور کرے اور ایسا طریقِ عمل کرے جس کے احاطہ اثر میں اس کے خلاف کا تمدن بھی شامل ہو۔ ایک زمانہ تھا جب کہ اقوامِ دنیا کی باہمی معرکہ آرائیوں کا فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا تھا اور یہ فولادی حربہ دنیائے قدیم کی تاریخ میں ایک زبردست قوت تھی مگر حال کا زمانہ ایک عجیب زمانہ ہے جس میں قوت کی بقاء ان کے افراد کی تعداد، ان کے زورِ بازو اور ان کے فولادی ہتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی بلکہ ان کی زندگی کا دارومدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔'' (۴)

علامہ اقبال قلم سے مراد علم لیتے ہیں اور علم سے مراد آگاہی، چاہے وہ کسی بھی زبان میں ہو۔ زبان ایک ذریعہ ہے، ایک وسیلہ ہے۔ یہ کسی کے مذہب کو یا کسی کی باطنی صلاحیت کو تبدیل کرنے کا نام نہیں ہے۔ علامہ اقبال خاموش انقلاب کے حامی تھے اور یہ خاموش انقلاب علم کا انقلاب تھا۔ (اس انقلاب کی ابھی تک ضرورت ہے) علامہ اقبال کو ہم اپنا مفکر ضرور سمجھتے ہیں اور ہر سال ان کے مزار پر گارڈز بھی تبدیل کرتے ہیں یونیورسٹیز اور بڑے بڑے اداروں کے نام بھی ان کے نام پر رکھے ہوئے ہیں لیکن افسوس کہ علامہ اقبال کی فکر کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے حالانکہ علامہ اقبال کے افکار کا باریک نظر سے مطالعہ کیا جائے اور ان کو عملی صورت دی جائے تو ہمارا نظامِ حکومت بھی درست ہو جائے اور ہم اقوامِ عالم میں بھی ترقی یافتہ قوم کے طور پر ابھر سکیں۔ علامہ اقبال کی شاعری کے ساتھ ساتھ اقبال کے نثری کارناموں پر بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جس پر بدقسمتی سے توجہ نہیں دی جا رہی۔

حوالہ جات

(۱) مقالاتِ اقبال مرتبہ سیّد عبدالواحد معینی، ص۱۰، آئینہء ادب چوک مینار، انارکلی لاہور، ۱۹۸۸ء (دوم)
(۲) مقالاتِ اقبال مرتبہ سیّد عبدالواحد معینی، ص۱۲۷، آئینہء ادب چوک مینار، انارکلی لاہور، ۱۹۸۸ء (دوم)
(۳) مقالاتِ اقبال مرتبہ سیّد عبدالواحد معینی، ص۲۸۹، آئینہء ادب چوک مینار، انارکلی لاہور، ۱۹۸۸ء (دوم)
(۴) مقالاتِ اقبال مرتبہ سیّد عبدالواحد معینی، ص۴۷، آئینہء ادب چوک مینار، انارکلی لاہور، ۱۹۸۸ء (دوم)

عبدالرب استاد (گلبرگہ)

حیدرآباد کرناٹک میں اردو تنقید

حیدرآباد کرناٹک جوصرف تین اضلاع تک محدود تھا اب وہ پانچ اضلاع میں پھیل گیا ہے۔اس کی وسعت اضلاع کے اعتبار سے پھیل تو گئی ہے مگر جغرافیائی لحاظ سے آج بھی اتنی ہی ہے جتنی پہلے تھی۔ان میں ادب کی آبیاری جس طرح پہلے ہورہی تھی آج بھی ہورہی ہے۔علم کا دامن وسیع ہوتا جارہا ہے۔Specialisation کے اس دور میں Globlization نے جہاں دنیا کو سمیٹ کر Global Village بنادیا ہے وہیں میڈیا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی نے صرف ڈاک ہی کو نہیں بلکہ Knowledge کو بھی Door to Door کردیا ہے۔اب اس سے کس کو ملا یہ مقدر کی بات ہے۔

علاقہ حیدرآباد کرناٹک میں ضلع گلبرگہ ہرطرح سے ادبی سطح پر زرخیز نظر آتا ہے۔میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ دوسرے اضلاع زرخیز نہیں ہیں۔یہ اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ یہ شہر نہ صرف ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے بلکہ حصول علم کی خاطر دیگر اضلاع اور مقامات کے افراد گلبرگہ ہی کا رخ کرتے ہیں کیونکہ تعلیمی اداروں کا یہاں گویا ایک جال سا ہے اور فی زمانہ پڑھے لکھوں کا ذریعہ معاش سرکاری ملازمت ہی بنا ہوا ہے اس لئے ملازمین پیشہ حضرات نے نہ صرف یہاں سکونت اختیار کرنے کو ترجیح دی بلکہ اسے اپنا وطن ثانی بھی بنالیا ہے۔

ادب کی آبیاری میں اس علاقہ نے اہم رول ادا کیا ہے۔مجھے ماضی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔سقوط حیدرآباد کے بعد لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل جدید نے مملکت آصفیہ کو کرناٹک، آندھرا اور مہاراشٹرا میں ضم کردیا۔اس طرح کرناٹک کا یہ شمالی حصہ جیسے حیدرآباد کرناٹک کا نام دیا گیا ہے، مرکز اردو، حیدرآباد کے اثرات اپنے جلو میں لئے، ان یادوں کو نہ صرف زندہ رکھنے کی کوشش بلکہ اس وقار اور معیار کو برقرار رکھنے کی سعی میں سرگرداں نظر آتا ہے۔اس لئے یہاں کے شعراء وادباء نے ہمیشہ ادب کی نئی جہتوں کو نہ صرف انگریز کیا بلکہ انھیں برتتے اور اس کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے بڑی سادہ دلی اور کشادہ قلبی کے ساتھ ادب کی آبیاری میں جٹ گئے۔اور اچھے سے اچھا شعری اور افسانوی ادب و نیز دیگر اصناف کی تخلیق کرتے ہوئے اپنے وجود کا احساس دلاتے رہے۔جس کا اعتراف بیشتر نقادوں نے بھی کیا ہے۔یہ ادب غمازی کرتا ہے ان کی اعلیٰ تنقیدی صلاحیتوں کا، کیونکہ معیاری اور اعلیٰ ادب عمدہ تنقیدی بصیرت اور صلاحیت کے باوصف ہی تخلیق پاتا ہے۔

ہاں یہ بات بھی مسلم ہے کہ اچھی تنقید بھی کسی عمدہ تخلیق سے کم نہیں ہوتی۔چنانچہ اس علاقہ کے ادب پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی تنقیدیں لکھی گئیں ہیں مگر ان میں عجز والے بھی ہیں، مست مئے پندار بھی ہیں۔کامل بھی ہیں غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں اور کئی ہیں کہ اس نام سے بیزار بھی ہیں۔

ان میں کئی نام آپ کو ملیں گے جنھوں نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ان تنقیدوں میں تحقیقی مضامین بھی ہیں، تجزیاتی مضامین بھی، تاثراتی مضامین بھی ہیں اور واقعی تنقیدی مضامین بھی۔بعضوں نے اکیڈمک ضرورتوں کی تکمیل کیلئے بھی مضامین قلم بند کئے جو لکچر نوٹس کے مماثل نظر آتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ تنقید یقیناً لکچر نوٹس تو بن سکتے ہیں مگر لکچر نوٹس ہرگز تنقید نہیں بن سکتے۔چنانچہ یہاں تنقیدی مضامین لکھنے والوں میں رزاق فاروقی، لئیق صلاح، قیوم صادق، طیب انصاری، مجیب الرحمٰن، وہاب اعندلیب، فضل الرحمٰن شعلہ، حمید سہروردی، خالد سعید، صغریٰ عالم، شمیم ثریا، حشمت علی، انیس صدیقی، فوزیہ چودھری، خلیل مجاہد، پیرزادہ فہیم الدین، خالدہ بیگم، حامد اشرف، انیس ہاشمی، عبدالرب استاد، غضنفر اقبال، وحید انجم، عبدالباری، سید اکبر حسینی، واجد اختر صدیقی، ہاجرہ پروین، منظور احمد دکنی، اطہر معز وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

قبل اس کے کہ اس علاقہ کے تنقید نگاران پر اظہار خیال ہو، مناسب یہ ہوگا کہ تنقید کی تعریف، علمائے ادب نے جس انداز سے کی ہے اس کا ذکر کرتا چلوں تا کہ بات واضح ہوجائے۔ہڈسن نے تنقید کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

''تنقید وہ ادب ہے جو ادب کے متعلق لکھا گیا ہو اور جس میں خواہ ترجمانی کرنے کی کوشش کی گئی ہو، خواہ تعریف و توصیف یا تجزیہ و تشریح کی۔شاعری، ناول، ڈرامہ اور افسانہ زندگی کی تشریح کرتے ہیں''۔ [۱]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنقید ادب پارہ یا فن پارہ کو زندگی اور معاشرے کی خوب وزشت اور اتار چڑھاؤ سے تقابل کرتے ہوئے یا زندگی میں ہونے والے عوامل سے انسلاک کرتے ہوئے جائزہ لینے کا کام کرتی ہے۔جبکہ اردو ادب کے معتبر نقاد پروفیسر آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ۔

''اچھی تنقید ذہن کی تنظیم کر کے مہذب اور باشعور قاری پیدا کرتی ہے'' [۲]

دراصل فن پارہ نقاد سے سنجیدگی کا تقاضہ کررہا ہوتا ہے کہ جانبداری اور یکبارگی میں دوٹوک فیصلہ نہ لیا جائے۔تنقید نگار کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی بھی فن پارہ کا جائزہ انتہائی سوچ بچار کے بعد لے اور فن کی کسوٹیوں پر پرکھے۔جس سے اس تنقیدی مضمون کی اہمیت بڑھ جائے گی۔تنقیدی مضمون سے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ۔

''تنقیدی مضمون میں جتنی دماغی قوت اور جتنا وقت اور جس طرح کی محنت درکار ہوتی ہے وہ ایک غزل یا نظم کی محنت اور وقت اور دماغی قوت سے زیادہ ہوتی ہے''۔ [۴]

ان اقتباسات کے تناظر میں حیدرآباد کرناٹک کے تنقید نگاروں کا جائزہ لیں تو سب سے پہلے نظر

پڑتی ہے سید مجیب الرحمٰن کی شخصیت پر اور ان کی تنقیدی کاوش ماورائے شعور پر۔

سید مجیب الرحمٰن : ماورائے شعور گو کہ سید مجیب الرحمٰن صاحب کی ایک ہی تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب منظر عام پر آتی ہے۔ مگر اس میں ان کی علمیت اور ذہانت جھلکتی ہے۔ ان مضامین میں ان کا علم، فلسفہ، منطق، جمالیات اور دیگر زبانوں سے ان کی واقفیت عیاں ہوتی ہے۔ ان میں بیشتر مضامین ان کے گہرے علم اور وسیع مطالعہ کی غمازی کرتے ہیں۔ غالبؔ پر آج تک بہت بہت لکھا گیا، تحقیقیں ہوئیں، تنقیدیں کی گئی اور ہر پہلو سے ان پر لکھا گیا اور یہ عمل جاری ہے۔ مگر سید مجیب الرحمٰن نے غالبؔ کو علم النفسیات اور تاریخی تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ ''غالبؔ ایک Genious'' کے عنوان سے مضمون ملتا ہے، جس میں وہ Genious کی تعریف اپنے انداز میں یوں کرتے ہیں۔

''Genious کی ایک تعریف یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے سارے ماضی کے تاریخی، ارتقائی عمل کا حصہ ہوتا ہے، جب ہی تو وہ زماں و مکاں کے بندھنوں کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ماضی کی بہترین قدروں کا وارث اور نئے Ethos کا پیغامبر ہوتا ہے''۔ ۵

اس طرح ان کے بیشتر مضامین میں شعور اور لاشعور کی بحث ملتی ہے اور انسانی فکر کا دار و مدار دراصل اس کے شعور و لاشعور کے گرد ہی محسوس ہوتا ہے جس سے وہ نہ صرف فن کار کو بلکہ اس کے عہد اور فن پارہ کو بھی پرکھتے نظر آتے ہیں۔

ایک اور مضمون، ہندوستانی زبانوں کیلئے مشترک اکائی عروض اس میں جہاں وہ عربی، فارسی اور ویدک سنسکرت کی عروضیات کا احاطہ کرتے ہوئے ہندی پنگل کی وضاحت کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ آج کا شاعر انھیں مشکل جان کر ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے، اس کے بالمقابل انھیں انگریزی عروض آسان لگتے ہیں۔ اس تناظر میں انھوں نے اردو کے ابتدائی زمانے کے شعراء کے اشعار کے ساتھ ساتھ عصری شعراء کی شاعری سے مثالیں بھی دی ہیں۔ اور یہ رائے دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ تمام زبانوں کے لئے خواہ وہ دراوڑی ہوں کہ آریائی، ایک مشترکہ نظام ترتیب دیا جائے، جو تمام کیلئے آسان بھی ہو۔ اس سلسلے میں انھیں دراوڑی عروض کسی حد تک آسان لگتی ہے، کہ دراوڑیوں نے بجائے ریاضی کے موسیقیت کو ترجیح دی ہے۔ یہاں ریاضی سے مراد (غالباً) عربی یا فارسی کا وہ عروضی نظام ہے یا سنسکرت کا وہ چھند شاستر ہے جو افاعیل، ارکان اور ماتراؤں کی تعداد پر منحصر ہوتا ہے۔ حالانکہ شاعری بنیادی طور پر غنائیت لئے ہوئے ہوتی ہے۔ جس میں نغمگی اور شیرینی کا عمل دخل ہوتا ہے خواہ وہ دراوڑی ہو کہ آرائی، مغربی ہو کہ مشرقی، مگر ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے، اس کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ بہر حال میری دانست میں یہ ممکن تو نظر نہیں آتا کہ تمام ہندوستانی زبانوں کیلئے مشترکہ اکائی کا عروض ترتیب دیا جائے اور مجھے یہ ماورائے شعور لگتا ہے۔ اسی طویل مضمون میں آپ نے قاضی سلیم کی آزاد نظم اور عادل منصوری کی نظم بطور نمونہ دی ہیں اور ان کی تقطیع بھی فرمائی ہے۔ جبکہ قاضی سلیم کی نظم ''دردمندی'' جو فاعلن کے

وزن پر مبنی ہے اور عادل منصوری کی نظم میں آہنگ اور موزونیت ہے۔ ویسے میرؔ اور ناصر کاظمی کے یہاں بھی ہندی عروضیات میں غزلیں ملتی ہیں۔

سید مجیب الرحمٰن کے دیگر مضامین میں عملی تنقید کے بارے میں، لاشعور کی منظّم بدنظمی، انا کی نفسیات اور اس کی تہذیب، تلسی داس کے آس پاس وغیرہ ہیں۔ بہر حال ان کی تنقید میں جمالیات، نفسیات، فلسفہ، منطق، اور دیگر زبانوں کے متعلق معلومات ملتے ہیں جو ایک قاری کے ذہن کی تنظیم کرنے، انھیں مہذب اور باشعور کرنے و نیز شعور و ادراک میں ہل چل پیدا کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔

وھاب عندلیب:

علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے شہر گلبرگہ ہی سے تعلق رکھنے والی ایک اور معتبر شخصیت ہیں۔ جو پیشہ تدریس سے وابستہ رہے۔ تاہم انھوں نے خاکے بہت عمدہ لکھے۔ جبکہ تنقیدی مضامین ان کی بصیرت اور فکر کی غمازی کرتے ہیں۔ مضامین زیادہ تر تحقیقی طرز پر ہیں اس لئے انھوں نے اپنے مجموعہ مضامین کا عنوان تحقیق و تجزیہ رکھا۔ گو کہ انھوں نے تنقید کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ مگر تحقیق ہو کہ تجزیہ، تنقیدی شعور کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ ان مضامین میں ان کی تنقیدی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

حمید سھروردی:

اسی شہر گلبرگہ سے علاقہ رکھنے والی ایک اور شخصیت جس نے دنیائے ادب میں اپنی شناخت بحیثیت افسانہ نگار کے تعین کرچکی ہے۔ یہ بھی پیشہ درس و تدریس سے منسلک رہے اور افسانوں کے ساتھ ساتھ قصر شعری بھی تعمیر کیا۔ اس طرح افسانوں میں تین مجموعہ، عقب کا دروازہ، ریت ریت لفظ، بے منظری کا منظر نامہ اور شاعری میں ''شش جہت آگ'' موجود ہے۔

تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''بین السطور'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ جس میں نصف حصہ تنقیدی مضامین اور نصف حصہ تجزیوں پر مشتمل ہے۔ یہ تنقیدی مضامین دراصل اردو فکشن پر معلومات افزاء مضامین ہیں۔ کہ افسانہ نگار نے اپنے معاصر افسانوی ادب و نیز فکشن نگار قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری پر اپنی تجر علمی سے احاطہ کیا ہے۔ ان مضامین سے ہی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ کسقدر تنوع ہے، عنوانات یہ ہیں۔

مختصر افسانہ۔ فعال صنف نثر، کرناٹک میں اردو افسانہ، آزادی کے بعد، مراٹھواڑا میں عصری ادب، آزادی کے بعد اردو افسانہ، سمت و رفتار، اردو ناول۔ پیشرفت، قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری، یہ مضامین یقیناً اپنے قاری کو مطالعہ کیطرف مائل کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔

افسانہ کے متعلق ان کا خیال ہے کہ:

''عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اردو افسانہ مغربی ادب کی دین ہے۔ مگر یہ بات مکمل طور پر درست نہیں ہے۔ کیونکہ اردو ادب میں افسانے سے پہلے داستانوں کا رواج عام رہا ہے۔ خود پریم چند جو اردو کے اولین افسانہ

نگار تصور کئے جاتے ہیں۔انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھیں افسانہ لکھنے کی تحریک طلسم ہوشربا کو پڑھنے کے بعد ہوئی۔اس کے یہ معنی ہوئے کہ اردو افسانے کا پس منظر دراصل داستان ہے، تاہم یہ بات کہے بنا نہیں رہی جاسکتی کہ مغربی افسانے سے اس کو تقویت پہنچی ہے۔'' ۶

''قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری'' کے تحت حمید سہروردی نے جہاں ان کے دیگر ناولوں سے متعارف کروایا وہیں شہرۂ آفاق ناول آگ کا دریا پر مختصر مگر جامع تجزیہ پیش کیا اور یہ بتایا کہ قرۃ العین نے دریا کو وقت کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''آگ کا دریا کو پڑھتے ہوئے زندگی کی بے معنویت اور شئے کے فنا ہونے کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔اس کے برعکس وقت کبھی مرتا نہیں۔قرۃ العین حیدر نے دریا کو وقت کی علامت بنا کر پیش کیا ہے''۔ ۷

خالد سعید:

خالد سعید نے شاعری بھی کی، افسانے بھی لکھے اور تنقیدی مضامین بھی۔شاعری میں ایک مجموعہ ''شب رنگ نمو'' اور تنقیدی مضامین کے تین مجموعہ تعبیرات، ''پس تحریر'' اور ''بارہ مضامین'' قابل ذکر ہیں۔ان مضامین سے خالد سعید کی تنقیدی فکر کا اندازہ ہوتا ہے کہ جس موضوع پر بھی انھوں نے قلم اٹھایا اسے بڑے ہی سائنٹفک انداز سے جانچا، پرکھا اور پیش کیا۔میری دانست میں اس علاقہ کا عمدہ تنقیدی ذہن رکھنے والی شخصیت کا نام خالد سعید ہے۔

تعبیرات گو کہ 80 کے دہے میں لکھی ہوئی کتاب ہے۔جس میں متنوع موضوعات پر پانچ مضامین ہیں جو اپنے قاری کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔پہلا مضمون ''نثری نظم کے باپ میں کچھ گفتگو'' ہے۔یہ اس وقت کے اعتبار سے موضوع بحث مضمون رہا۔کہ نثری نظم کی اردو ادب میں آمد آمد تھی اور بطور تجربہ کے در آئی تھی۔کچھ نے خوش آئند تصور کیا تو کچھ نے مخالفت کی، بہر حال وقت گذرتا گیا اور نثری نظم اردو شعر و ادب میں بڑی رد و قدح کے بعد راہ پا گئی اور آج کئی شعراء نے اس صنف کو وسیلہ اظہار بنالیا ہے۔اس عنوان کے تحت مضمون نگار نے نثری نظم کے آہنگ، عروض اور افاعیل سے بحث کرتے ہوئے جو مثالیں دی ہیں ان کی خوبی یہ ہے کہ حیدر آباد کرناٹک کے شعراء کی نظموں کو ہی منتخب کیا جن میں حمید الماس اور اکرام باگ ہیں۔اور بڑی مدلل بحث کی ہے۔آخر میں نثر پارے اور نثری نظم کے فرق کو اس طرح سے واضح کرتے ہیں۔

''رکن کے تواتر اور تسلسل سے پیدا ہونے والی صوتی کیفیت کو میں موزونیت کہتا ہوں۔اور ایک بار یہ بھی دہرادوں کہ نثری نظم میں موزونیت اور بیشتر موزونیت والی نشانی نثری نظم کی شناخت کرنے کا ذریعہ، Tool ہے۔جس کی مدد سے ہم نثری نظم کو نثر پارے سے علاحدہ کرسکتے ہیں''۔ ۸

ان کے اور مضامین میں ''میلی چادر کے تانے بانے'' جو راجندر سنگھ بیدی کے مشہور ناولٹ ایک چادر میلی سی کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے۔جبکہ تیسرا مضمون اردو کی معروف فکشن نگار، گیان پیٹھ ایوارڈی، قرۃ العین

حیدر کے شہرہ آفاق ناول آگ کا دریا پر ہے۔اس ناول پر دنیا بھر کے نقادوں نے لکھا، سراہا اور داد و تحسین سے نوازا مگر خالد سعید کا اپنا انداز ہے، لکھتے ہیں:

''......تھوڑی سی خامیوں اور ڈھیر ساری خوبیوں کے ساتھ قرۃ العین کا یہ ناول اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے اردو ادب میں ایسے ناول نہیں لکھے گئے تھے۔اس ناول کو پڑھنے کے بعد سنجیدہ قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے کچھ پایا ہے اور یہ کچھ پانے کا احساس قاری کیلئے کچھ کم مسرت خیز نہیں۔ ۹

ان مضامین میں ایک اہم اور اچھا مضمون ''خلا میں بکھرے ہوئے حروف کی پہچان'' ہے۔جو حیدر آباد کرناٹک سے وابستہ، کرناٹک میں جدیدیت کے روح رواں اور اردو ادب کا ایک اہم شاعر حمید الماس کی شاعری پر لکھا ہوا مضمون ہے، جس میں خالد سعید نے حمید الماس کی شاعری اور نظموں کا احاطہ کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ حمید الماس نے اپنے عہد کی ناہمواریوں، تجربات اور حادثات کا ذکر اپنی نظموں کے ذریعہ کیا ہے۔مگر کہیں بھی لہجہ درشت یا ادق نہیں ہوا۔اور ان کی نظم کی تعریف کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

''وہ نظموں کو بتدریج بڑھاتے ہوئے انتہا پر لاکر ختم کردیتے ہیں۔جس کی وجہ سے قاری مکمل طور پر نظموں کی گرفت میں رہتا ہے۔اس لئے ان کی نظمیں مختصر ہوں یا طویل تاثر سے بھرپور ہوتی ہیں۔'' ۱۰

اسطرح نظم کی دوسری خصوصیت کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

''دوسری بڑی خصوصیت ان کا لہجہ ہے۔ان کی نظمیں غنائیت سے بھرپور اور نرم لہجے کی مالک ہوتی ہیں۔ ....انہوں نے سب سے زیادہ جو بحر استعمال کی ہے۔وہ بحر متقارب ہے، جو کہ رواں دواں، مترنم بحر ہے۔یہی وہ روانی اور ترنم کی کیفیت ان کی ساری نظموں میں پائی جاتی ہے، دراصل فنکار اظہار کیلئے وہی واسطے ڈھونڈتا ہے جو اس کی طبیعت کے متقاضی ہوتے ہیں''۔ ۱۱

ان خیالات کے اظہار کے ساتھ خالد سعید نے غزل کے اشعار پیش کرتے ہوئے نظم گو حمید الماس اور غزل گو حمید الماس کا تقابل کرتے ہوئے نظم گو حمید الماس کے حق میں یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ وہ غزل کے نہیں بلکہ نظم کے شاعر ہیں۔تجزیوں میں بلراج کومل کی نظم ''آخری چاند اور سورج'' اور محمود ایاز کی نظم ''نیا سسی فس'' بہت عمدہ ہیں۔دوسری تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ہے پس تحریر، خود ان کے اپنے بیان کے مطابق مختلف موقعوں پر دیئے گئے لکچرز ہیں۔ ان میں بعض مضامین واقعی بہت عمدہ ہیں جن سے ان کی تنقیدی بصیرت چھلکتی ہے۔بہر حال خالد سعید اچھی تنقیدی نظر رکھنے والے ہیں۔سائنٹفک انداز سے سوچتے، غور کرتے اور نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔زبان و بیان پر گرفت مضبوط ہے، الفاظ کی شستگی و چستگی، گھٹی ہوئی عبارت اور ان کی سلجھا ہوا ذہن ان کے تنقید میں بولتا ہوا نظر آتا ہے۔

صغریٰ عالم:

صغریٰ عالم اس علاقہ کی نہ صرف شاعرہ ہیں بلکہ انھیں اولین شاعرہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

اب تک شاعری میں چھ مجموعہ منظر عام پر آئے ہیں۔ جب کہ نثر میں ایک تحقیقی مقالہ اور تبصروں پر مشتمل ایک کتاب چھپ چکی ہے۔

کف میزاں جس میں سات (۷) تبصرے اور (۱۱) گیارہ مضامین اظہار خیال کے تحت ملتے ہیں۔ ان مضامین سے صغریٰ عالم کی تنقیدی فکر عیاں ہوتی ہے۔ کف میزاں کے مشمولہ تمام مضامین شاعری کا احاطہ کرتے ہیں۔ جس سے محسوس ہوتا ہے کہ محترمہ کا شاعرانہ مزاج ان مضامین سے چھلک رہا ہے۔ شاعری اور اس کے رموز واوقاف، خواہ وہ علم بیان ہو کے، علم عروض، علم معانی ہو کے علم قافیہ پر کافی دسترس رکھتی ہیں۔ ساتھ ہی زبان و بیان کی جہاں تک بات ہے، اس پر اچھی گرفت ہے۔ ان مضامین کے علاوہ ان کا تحقیقی مقالہ بعنوان ''پروفیسر عنوان چشتی محقق، ناقد اور شاعر'' بہت عمدہ اور معیاری ہے۔ ان کو پڑھنے سے تخلیق اور تنقید، تنقید اور تحقیق اور تحقیق اور تخلیق کے آپسی انسلاکات سمجھ میں آسکتے ہیں۔ ان مضامین اور اس تحقیق سے صغریٰ علم کی تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور قاری محترمہ کی معیاری تحقیقی ذہانت، عمدہ تنقیدی بصیرت اور اعلیٰ تخلیقی ذکاوت کا قائل ہوجاتا ہے۔

جلیل تنویر:

جلیل تنویر افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ جبکہ انھوں نے بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''فکر ونظر'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا ہے۔ جس میں ۲۵ر مضامین مختلف شخصیتوں اور ان کے فن کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جلیل تنویر نے ان شخصیتوں اور ان کے فن کو اپنے انداز سے پیش کیا ہے جس سے ان کی تنقیدی کاوش کا اظہار ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی تنقید نگار موجود ہیں۔ ان کیلئے ضروری ہے کہ اس علاقہ کے ادب پر نہ صرف لکھنا چاہئے بلکہ بھر پور لکھنا چاہئے۔ اور ان کے فن کی قدر کا تعین کرنا چاہئے۔ پھر دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا، آنے والے دنوں میں یقیناً یہاں کے فن اور فنکار کو وقار، معیار اور مرتبہ ملے گا اور ضرور ملے گا۔

بقول آل احمد سرور:

ادب کا عجوبہ یہ ہے کہ اس میں اکثر فوری انصاف نہیں ہوتا۔ مگر بالآخر ضرور ہوتا ہے۔ اقبالؔ نے غلط نہیں کہا ہے کہ۔ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو اس کے دور کی آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ اور جب شاعر کی آنکھ بند ہوجاتی ہیں تو اس دور کی آنکھ کھلتی ہے۔[۱۲]

آخر پر میں سابق مدیر شاعر جناب اعجاز صدیقی کا اقتباس جو طویل ہے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو اردو ادب کے تناظر میں 70 اور 80 کے دہے میں لکھا گیا ہے۔ جو اس علاقہ کی کے ادب پر بھی چسپاں ہوتا نظر آتا ہے۔ اقتباس:

''یا تو ملکی اور عالمی زبانوں میں اردو شعر و ادب کا کوئی درجہ و مقام سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو ہمیں اس مجرمانہ غفلت پسندی کا اعتراف کرنا ہوگا کہ ہم ایماندارانہ خود احتسابی سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ ہمارا

وقت کیچڑ اچھالنے میں ضائع ہوتا رہا ہے۔ اور ادھر دس سال میں پہلے سے کچھ زیادہ ہی ضائع ہوا ہے۔ اب تو ہم عالمی ادب میں مقام اقبال کے بھی منکر ہیں۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا۔ تو کیا اردو شعر و ادب محض بکواس ہے؟ ترقی پسندی اور جدیدیت کی آویزش بڑھتے بڑھتے گالی گلوچ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ اصطلاحیں تو ایک دوسرے کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے اور اپنی اپنی ہمہ دانیوں کے اظہار کے بہانے ہیں۔ اردو شعر و ادب کی قدر و قیمت کا تعین ہم کہاں کر پائے ہیں، اس کے شہ کاروں کو عالمی ادب میں کوئی درجہ و مقام دلانے کی بات تو الگ رہی، اس کے محض اعتراف کی بھی جذباتی سطحیت رکھنے والوں سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ جب بھی اظہار خیال ہوتا ہے تو مغربی ادب و شعر سے تقابل کر کے اردو شعر و ادب کی کمتری پر مہر تصدیق ثبت کردی جاتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ زبانوں کا مزاج، ان کا آہنگ، ان کی ساخت، اصوات و الفاظ و اسالیب، طریقہ ہائے اظہار سب الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور خود ان پر زبانوں کی اپنی پہچان، ان کی اپنی انفرادیت پھر یہ اصرار کیوں، کہ اردو میں کوئی شیلے، کٹیس اور بائرن پیدا نہیں ہوا۔ اور بھی بہت سے مغربی شاعروں اور افسانہ نگاروں سے اردو شاعروں اور افسانہ نگاروں کا موازنہ و مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اردو ایک جدید زبان ہے اور وہ بھی ایسی زبان جو صرف ہندوستان تک محدود رہی (اور اب پاکستان ہے) انگریزی زبان اردو سے کہیں زیادہ قدیم اور بین الاقوامی زبان ہے۔ پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ اردو تو ایشیا کی بھی بعض زبانوں سے جدید تر ہے۔ اس کے باوجود (یہ خوش فہمی نہ سمجھی جائے) اردو میں ایسا ادبی و شعری سرمایہ ضرور موجود ہے، جس کا ذکر عالمی سطح کے اچھے ادب کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ [۱۳]

اس حوالے سے میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمیں بھی نہ احساس برتری میں مبتلا ہونا چاہئے اور نہ احساس کمتری بلکہ پورے یقین و اعتماد کے ساتھ اپنے ادب کو پیش کرنا ہے اور وقار و معیار و مرتبہ تو بہر حال حاصل ہوگا۔ انشاءاللہ۔

۱ شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر ۷۷ ۱۹، ص ۶۴۔
۲ شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر ۹۸۔۱۹۹۷ء، ص ۲۳۴
۳ تنقید کیا ہے۔ آل احمد سرور، بحوالہ ادیب جنوری تا مارچ ۱۹۸۰ء، ص ۹۔
۴ شاعر، ہم عصر ادب نمبر ۹۸۔۱۹۹۷ء، ص ۲۶۳۔
۵ ماورائے شعور، سید مجیب الرحمٰن، ص ۴۳۔
۶ بین السطور از حمید سہروردی، ص ۷۔۶۔ ۷ بین السطور از حمید سہروردی، ص ۶۵۔
۸ تعبیرات از خالد سعید، ص ۳۲۔ ۹ تعبیرات از خالد سعید، ص ۶۱۔
۱۰ تعبیرات از خالد سعید، ص ۶۶۔ ۱۱ تعبیرات از خالد سعید، ص ۶۹۔
۱۲ شاعر ہم عصر ادب نمبر ۱۹۹۹ء، ص ۲۳۵۔
۱۳ شاعر ہم عصر ادب نمبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۔

رفیق شاہین (علی گڑھ)

'روح کا عالمی تصور'

حال ہی میں سید محمد رضی اُلدین کی ۲۵۵ صفحات پر محیط ایک ہمہ گیر دلچسپیوں اور اپنی افادیت و انفرادیت سے بھر پور کتاب ''روح کا عالمی تصور'' نے منصّہ ءشہود پر جلوہ افروز ہوئی ہے۔ جس نے جہاں اردو دنیا کے علماء، وحکماء کو چونکا کر رکھ دیا وہیں مجھ جیسے بے مایہ اور ہیچ مداں کو بھی شدت سے متاثر کیا۔ دوران مطالعہ سطر بہ سطر ظہور پذیر ہونے والے نئے انکشافات نے جہاں مجھے ورطہء حیرت میں ڈال دیا وہیں مجھے بے پایاں مسرت سے مالا مال بھی کیا۔ دل میں خواہش نے سر اُبھارا کہ اس کتاب پر مضمون لکھوں مگر علم سائنس سے نابلد مجھ جیسے ادیب وشاعر کے لئے یہ کام اتنا سہل نہ تھا کہ سائنسی اصطلاحات کے درون وبطون میں اتر کر حدّ ا روح اور فطرت و کائنات کی ہیت و ماہیت ان کے عمل اشتراک کے اسرار ورموز کی افہام وتفہیم کے بعد انہیں صحیح طور پر مضمون کی شکل میں پیش کر سکوں۔ چنانچہ ترغیب وتحریک کے باوجود بھی قلم اٹھانے کی جراءت نہیں ہوئی۔

خدا کیا ہے؟ روح کیا ہے اور کائنات کیا ہے؟ یہ ایسے بنیادی سوالات ہیں جو ازل سے لے کر آج تک ہر متجس انسانی ذہن کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ رضی الدین ہدیہ ءتبریک اور داد وستائش کے سچّے حقدار ہیں کہ انہوں نے انہیں مذکورہ سوالات اور ان کے حل کو اپنی لازوال و بے مثال کتاب کا موضوع بنایا ہے۔ موصوف نے کتاب کو منطقیانہ اور فلسفیانہ اعتبار کی سطح پر رکھ کر یونانی مفکرین سقرط، ارسطو، طامس اکوائنا، پوٹونس اور سنت آگسٹائن کے روح سے متعلق منطقیانہ نظریات مختصر طور پر پیش کر دیے ہیں۔ ان کے علاوہ موصوف نے نظریہ روم اور مغربی نئے نظریات کے مالک فلاسفہ ڈیکارٹ، اسپینوزا لیپن ٹنر، جون لاک، برکلے، ڈیوڈ ہیوم اور کانٹ کے بھی روح سے متعلق فلسفیانہ خیالات اختصار میں بیان کر دیئے ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی تہذیب کے مظہر اپنشدوں ویدوں اور گیتا میں موجود روح کے بنیادی تصور کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے اُجاگر کیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے نیا سوتر نیا وشیشکا اور سانکھیا کے فلسفہء روح کو بھی نمایاں کرنے کی سعی جمیلہ فرمائی ہے۔ نیز یہ بھی واضح کیا ہے کہ جین مذہب میں روح کا مقام کیا ہے؟ بدھ کے پیرو روح کو کن درجات میں رکھتے ہیں؟ سائنس اور نظریہ روم، اسلام اور تصور روح، اور روم کا ہمہ گیر تصور بھی کتاب میں ذیلی عنوانات کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان تمام عنوانات کا تعلق حصہ اول

سے ہے جبکہ حصہ دوم میں اسلامی نقطہ ءنگاہ سے اور کسب کلام الٰہی کی آیات سے کائنات کے سائنسی حقائق اور خداو روح کے وجود اور ان کی ہیت و ماہیئت کی تفہیم وتصریح اور تعبیر وتفسیر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آیئے اب مختصر طور پر جائزہ لیا جائے کہ ہمارے مفکرین وفلاسفہ، حکماء وعلماء، مذہبی رہنما اور ہمارے مذہبی مقدس صحیفے روح کے تصور کو کس رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ یونانی مفکر افلاطون (PLATO) تسلیم کرتا ہے کہ روح جو ماورائی اور تجریدی ہے اس کو فنا نہیں بلکہ بقائے دوام حاصل ہے۔ وہ روح اور روحِ کل پر موجودات کائنات میں یکسانیت کا شاہد ہے۔ اس کا فرمان یہ بھی ہے کہ روح غیر منقسم ہے اور ہمارے شعور ولاشعور، افکار و خیالات اور ہمارے سبھی حرکات وسکنات کی محرک ومالک خود ہماری روح ہے۔

یونان کا ایک اور فلسفی ارسطو بھی روح کو سدا بہار (Eternal) اور لافانی (Immortal) قرار دیتا ہے۔ بقول اُس کے روح مطلق (Absolute) ہے۔ لامحدود اور بسیط ہے جو خالق کل (اللہ) کی طرف سے آتی ہے اور جب مادہِ جسم بعدِ قضا مادّے میں مل جاتا ہے تو یہ جہاں سے آتی ہے وہیں واپس چلی جاتی ہے۔ وہ انسانی روح کو ہمہ گیر روح (UNIVERSAL SOUL) کا ہی ایک جز مانتا ہے۔ طامس اکوائنا کے نظریے کے مطابق روح اپنے کل سے جدا نہیں ہے اور جو صفات شعور کی ہیں وہی روح کی بھی ہیں۔ ہمہ گیر شعور اور روح دونوں ایک ہیں۔ اس کے نظریے کے مطابق مادہ بے شکل اور تغیر پذیر ہوتا ہے مگر جب روح کائنات (UNIVERSAL SOUL) مادّے پر عکسریز ہوتی ہے تو یہی مادہ حسن ازل (خدا) کے پرتو سے انسانوں، رنگارنگ چرندوں پرندوں اور صحنِ چمن کے خوش رنگ وخوشنما پھولوں میں ڈھل کر اپنی بہار دکھانے لگتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام حسنِ کائنات کا اصل ماخذ حسن ازل یعنی اللہ کی ذات ہے اور دنیا کی ہر روح اپنے روحِ کل سے مربوط ہے۔

پلوٹونس (PLOTINUS) روح کو روح کائنات تو مانتا ہے مگر یہ بھی کہتا ہے کہ روح جب کسی نئے جسم میں دخول کرتی ہے تو حیات سابقہ کو فراموش نہیں کر پاتی نیز ابتدا میں عکسِ الٰہی کی تازگی سے روح پاک وصاف ہوتی ہے مگر دنیاوی بُرے اثرات قبول کرنے پر اپنی طہارت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس طرح غلیظ جسم کے زنداں میں روح آزادی کے لئے بری طرح تڑپتی رہتی ہے۔ اس کے عقیدے کے مطابق مرنے والے کی روح پھر کسی نئے جسم میں داخل ہو کر اپنے فطری تسلسل کو برقرار رکھتی ہے۔ یہ نظریہ ہندوستانی پُنر جنم سے میل کھاتا ہے معلوم ہوتا ہے۔ پلوٹونس طہارت نفسی کے لئے جسمانی ایذا رسانی کی تبلیغ کرتا ہے۔ عیسائی مذہب کی رہبانیت، ہندوؤں کا جوگ اور سنیاس لینا اسی کے نظریے کی کڑی معلوم ہوتے ہیں۔ جین دھرم بھی حصول نجات کے لئے سخت گیر اور اذیت کوش زندگی بسر کرنے پر زور دیتا ہے۔

آگسٹائن (SAINT AUGUSTINE) کے نزدیک نر اور مادہ کے جنسی ملاپ سے جو جاندار ظہور پذیر ہوتا ہے وہ شعور سے متصف ہوتا ہے اور اس کی تمام حرکات وسکنات اس شعور کے تابع ہوتی ہیں اور یہ

شعور روح کے تابع ہوتا ہے۔ مگر روح کہاں سے اور کیسے آتی ہے وہ اس اہم نکتے کو نظر انداز کر دیتا ہے لہذا یہ نظریہ بے روح اور ناقص معلوم ہوتا ہے۔

ڈیکارٹ (DESCARATE) روح کا ماخذ دماغ کے ایک غدود کو بتا کر مایوس کرتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے روح کے بغیر غدود کہاں سے آ گیا۔ اسپینوزا (BENDICT SPINOZA) کو کائنات کے سبھی وجودات (جمادات، نباتات اور حیوانات) کی تشکیل میں یکساں طور پر ایک ہی خمیر کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ جسم اور روح کو ایک ہی شئے سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے قول کے مطابق مادہ ہی خدا ہے ظاہر ہے کہ یہ تصور وجود الٰہی کی نفی کرتا ہے۔

لائی بن تس (LEIBNITZ) آفاقی دماغ (UNIVERSAL MIND) یا ہمہ گیر روح کو وحدت کل سے تعبیر کرتا ہے۔ بقول مذکور فلسفی یہ جو ہر منفرد جسم سے آزاد ہو کر روح کُل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ ویدانت کا بھی یہی نظریہ ہے کہ ہر آتما شدھ اور پاک وصاف ہو کر پرماتما میں '''' ہو جاتی ہے۔ جوہن لاک خدا اور روح کے وجود کو کوئی ٹھوس شے نہیں مانتے۔ جو شے حواس وحسّیات سے بالاتر ہو، ماورائی غیر مرئی اور تجریدی ہو۔ اسے وہ گمانِ محض مانتے ہیں۔ گمان ٹھوس علم کی بنیاد بننے سے قاصر ہے۔ وہ روح اور جسم کو دو الگ شئے اور ایک دوسرے کی ضد مان کر Dualism کے تصور کو ابھار دیتے ہیں اور اس طرح روح کے بنیادی تصور کا مسئلہ بُری طرح اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ مادے کی مدد سے روح تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ برکلے (BURKEYLEY) روح کے تصور کو مادے سے جوڑتے ہیں۔ چونکہ مادہ اور روح ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے روح تک رسائی کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ ڈیوڈ ہوم (Devid Hume) کے نظریے کے مطابق مجموعہء مشاہدات کی روشنی میں ہمارا ذہن جو نتیجہ اخذ کر لے وہی روح ہے۔ پھر آگے چل کر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بعد مرگ روح حیات رہتی ہے اس کا ثبوت آج تک کوئی بھی پیش نہ کر سکا۔ دلائل کی کسوٹی پر روح فریبِ محض کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

رضی الدین نے نہ صرف مغرب کے فلسفیوں کے نظریات کا مطالعہ کیا ہے بلکہ روح کے تعلق سے انہوں نے ہندوستانی قدیم سنسکرتی کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہوئے ۶۰۰ سال ق۔م کے فلسفہ ویدانت میں بھی وحدانیت روح اور جنت وجہنم کے تصور کو دریافت کیا ہے اور اُپنشدوں سے پُنر جنم کے ابتدائی تصور پر روشنی ڈالی ہے اور برہم واد کے فلسفۂ وحدت الوجود کا کثرت میں مشاہدہ جیسے قدیم طرز فکر کو بھی کتاب میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے بُدھ کی تعلیمات میں نجات کے نظریے اور جین دھرم کے عمل تنسیخ پر اعتقادات اور ان کے پیش کردہ دلائل کو بھی احاطہ تحریر میں داخل کیا ہے۔

موصوف نے کلام پاک کی آیات سے بھی روح کے تصور کو اجاگر کیا ہے لیکن کلام پاک میں چونکہ روح کی کوئی خاص وضاحت نہیں ملتی اور اسے حکمِ الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے باوصف چونکہ اسلام تصور آخرت

سے وابستہ ہے اس لئے روح کے وجود کی یقین دہانی خود بخود ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ خدا نے خود بھی روح کے بارے میں محتاط سا اشارہ بھی کیا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

'' اُس کو یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ جب میں اس کو درست کروں اس میں اپنی روح پھونک دونگا۔ تم اُس کے سامنے سجدے میں گر جانا۔ اس طرح سارے ملائک سجدے میں گر گئے۔'' (سورۃ ص)

سید محمد رضی اُلدین نے اور بھی قرآنی سورتوں سے آیات کے ترجمے بطور حوالہ پیش کئے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے عہدِ وسطیٰ کے، مسلم فلسفہ دانوں میں سے ابن سینا، ابن رشد، الکندی انفاداجی اور ابن مسکوۃ جیسے مشاہیر کے رشحات قلم سے استفادہ کرتے ہوئے خدا اور روح کی حقیقت کے تصور کو روئیدگی و بالیدگی عطا کی ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انہوں نے خود کچھ نہیں کیا اور صرف افلاطون اور ارسطو کی فکر پر تکیہ کئے رہے اور باہمی تضادِ رائے کا شکار ہو گئے۔ البتہ روح کے تصور کو مستقر و مستحکم کرنے میں صوفیائے کرام نے نہایت اہم کردار انجام دیا ہے۔ ان اولیاء واصفیاء میں انہوں نے خصوصی ذکر مولانا جلال الدین رومؔی کا کیا ہے اور ان کی مثنوی کے اشعار کے حوالے سے روح کی عظمت کو آشکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا رومؔی روح کا رشتہ عالم ارواح سے استوار کرتے ہوئے اسے حیات کی گرفت سے آزاد غیر مرئی و ماورائی اور نادیدہ وناشنیدہ حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اسے عقل وشعور کی گرفت سے بالاتر اور فانی قرار دیتے ہیں۔

مولاؔنا فرماتے ہیں اگر روح انسانی جسم کی نشونما سے ہاتھ کھینچ لے تو انسانی جسم کی حقیقت مٹی کے ڈھیر سے زیادہ نہیں ہے۔ جسم از جاں روزافزوں مے شہود

مولاؔنا کا کہنا یہ بھی ہے کہ اطہر جزو اپنے کُل یعنی عالمگیر روح سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو اس پر اسرار الٰہی منکشف ہونے لگتے ہیں اور یہ روح انسانی کی معراج ہوتی ہے۔

ایں تفانی اضد آید ضدرا
چوں بناشد ضد، نبود جُز بقا

تفرقہ در روح حیوانی بود
نفس واحد روح انسانی بود

یعنی نفس خاص ہی اصل میں روح انسانی ہے۔ روح کے حوالے سے سید رضی اُلدین فرماتے ہیں۔

''روح میں انسانی جسم کے لئے وہ توانائی ہے جس کو آسمانی برقیاتی لہریں زمین پر اُتار کر کسی بھی جسم کو حرکت میں لے آتی ہیں یہی لہریں تمام جسم اعصاب، خلیات، اور سارے اعضاء ایک دوسرے سے مربوط کر کے

محرک بنا دیتی ہیں جب ہر چیز اس نظریہ مقاحرہ (Reductionism) کے اعتبار سے غیر مادی بن جاتی ہے اور روح کو ہر نظریے نے غیر مادی قرار دیا ہے۔ سائنس اس کو پھر کس طرح تسلیم نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ مشاہدے سے باہر ہے لیکن توانائی کی برقی ترنگیں جو خلا (VOID) سے آتی ہیں لیکن ہمارے حواس اس کا مشاہدہ کرنے سے عاجز ہیں۔ پھر یہی ترنگیں پھر سے خلا میں گم ہو جاتی ہیں۔ روح جو جسم کی محرّک توانائی ہے یہ سماوی (Void) ہے جسے آسمانی طاقت واپس لے لیتی ہے۔ پھر روز مقررہ یہ گم شدہ توانائی پھر سے مادی جسم کے پیکر میں ڈھل کر خالق کُل کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ یہ مذہبی خیال جو کچھ مذاہب کے پیروؤں کا عقیدہ ہے محض ایک تصور نہیں ہے بلکہ یہ سائنسی نظریہ مقاحرہ سے بھی کسی حد تک ثابت ہو جاتا ہے۔''

سیّد محمد رضی الدین آگے چل کر یہ بھی فرماتے ہیں۔

''اگر مذہب اور سائنس ایک دوسرے کی حقیقت کو تسلیم کر کے باہم مل جائیں تو ایک کی کمی دوسرا پوری کر دیگا۔ سائنس کو روح اور خدا دونوں کو تسلیم کرنا ہوگا اور یہ مذہب کو فطرت اخذ قوانین کے تحت ماننا ضروری ہے جو باری تعالیٰ نے بنائے ہیں۔ اس طرح روح جو باطنی طاقت ہے محض مفروضہ نہیں بلکہ حقیقت ہے یہ غیر مادی ہے مگر اس کا عمل توانائی کی شکل میں ہر چیز میں موجود ہے۔ روحانی عمل یا رجحان ہمیں مثبت تحریک دیتا ہے اور ہماری قوت کارکردگی کو قائم رکھتا ہے۔''

سید محمد رضی الدین نے خود بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں سائنسدانوں اور فلسفیوں کے نظریات جوں کے توں پیش کر دیے ہیں اور ان میں ترمیم و تنسیخ سے کام نہیں لیا ہے اتنا ہی نہیں انہوں نے کائنات کے طلسم خانہء حیرت میں مزید حیرتوں کا اضافہ کرنے والی جدید دور کی کرشماتی اور حیرت انگیز نئی نئی دریافتوں کے ذکر کو بھی نظر انداز کر دیا ہے جس سے مذہب اور سائنس کے مابین بعد المشر قین کا نظریہ اپنی جگہ برقرار رہا ہے۔ جبکہ ان دو نظریوں کے درمیان دشمنی اور ان کے باہمی تصادم کو حیدر قریشی ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں اپنی ادارت میں جرمنی سے شائع ہونے والے ششماہی ''جدید ادب'' کے شمارہ نمبر آٹھ اور نو میں جدید سائنسی انکشافات کو مذہب دشمنی سے تعبیر کرنے کے بجائے انہوں نے ثابت کیا کہ ان کے معرض وجود میں آجانے سے انہیں کے ذریعے یہ بات پائے استناد کو پہنچی ہے کہ خدا، روح اور آخرت کا تصور بے بنیاد نہیں ہے۔ حیدر قریشی جدید ادب شمارہ نمبر ۸ کے اپنے مضمون کے صفحہ نمبر ۱۵۹ پر یوں رقمطراز ہیں۔

''سائنسی ترقی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کمپیوٹر سے کلوننگ کے عہد تک آ گئی ہے۔ ابھی آئرن ایج تھا۔ ''لوہے کے پر اُگ آئے تھے۔ ہم اسی عہد کے سحر میں تھے کہ ڈیجیٹ ایج شروح ہو گیا۔ ابھی کمپیوٹر کے چپ کی جادوگری کی حیرتیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ کلوننگ کا زمانہ بھی شروع ہو گیا۔ اور بھی پتہ نہیں کیا سے کیا ہو جائے گا۔ نئی سائنسی ترقیات سے ایک سطح پر مذہبی تصورات میں ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے تو ایک بڑی سطح پر مذہب کا اثبات بھی

ہو رہا ہے۔''

سائنٹفک نیوڈسکوریز کو لے کر حیدر قریشی کا اہم اختصاص یہی ہے کہ وہ سائنس کو جو مادے کی ہیت و ماہیت کی تحقیق کا علم ہے قابل قدر علم مانتے ہیں ایسا علم کہ جس کی تحصیل کے لئے بابل و بخارا اور مصر و چین بھی جانا پڑے تو تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔ وہ سائنس کو مذہب کا دشمن قرار دینے کے بجائے اس کی دریافتوں کو مذہبی عقائد کی مزید پختگی کا موثر وسیلہ مانتے ہیں۔ بقول ان کے۔ جب وسیع ترین کائنات کے کسی بھی سرے، کسی بھی خطے اور گوشے میں بیٹھا انسان ہمارے کمپیوٹر اسکرین پر جلوہ گر ہو کر ہم سے ہم کلام ہو سکتا ہے تو کیا ہم خدا کے کمپیوٹر اسکرین پر نہ رہتے ہونگے۔ جو کام ہم کر سکتے ہیں تو وہ جو ہمارا خالق مالک ہے ہمارے اعمال اپنے کمپیوٹر میں محفوظ کرنے پر قادر کیوں نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کمپیوٹر جو سائنس ہی کی دین ہے جب ہمارے آخرت اور روز حساب کے عقیدے کو تقویت دیکر مزید مستحکم کرتا ہے۔ تو یہ ہمارا وفادار دوست ہی تو ہوا نہ کہ دشمن۔ یہ ہمارے مذہبی عقائد اور دینی فرائض کی تعمیل میں کوئی رخنہ بھی نہیں ڈالتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ علم چاہے سائنس ہو یا کوئی دیگر فن وہ کبھی خلاف مذہب نہیں ہو سکتا ہے۔ حال ہی میں سائنس کا ایک اور ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز اور کامیاب ترین تجربہ ''ڈولی'' نامی بھیڑ پر اسکاٹ لینڈ میں سامنے آیا ہے جس نے نہ صرف دنیا کو انگشت بدنداں کر کے رکھ دیا بلکہ ہنگامہ بھی برپا کر دیا جس کے فروغ پر قانونی پابندیاں عائد کرنے میں امریکہ پیش پیش ہے۔ یہ کلوننگ کا تجربہ ہے۔ اس پر حیدر قریشی کا ردّعمل ذیل کے اقتباس میں منکشف ہے۔

''اس کے باوجود کہ سائنسی ایجادات کے اس تیز رفتار دور میں کوئی ایجاد کسی ایسی تباہی کا باعث بن سکتی ہے جو انسان کو پھر سے پتھر کے زمانے میں لے جائے پھر بھی میں مذہب کی طرح سائنس کی بھی خود مختاری کا حامی ہوں۔ کلوننگ کے تجربے کی کامیابی سے ایک چھوٹی سطح پر مذہبی افکار پر ضرب تو لگی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ بڑی سطح پر مذہب کا اثبات ہوا ہے اگر کوئی سائنسداں کسی جاندار کے ایک سیل سے بالکل ویسا ہی جاندار بنا سکتا ہے تو حیات بعد الموت کا مذہبی عقیدہ سائنسی طور پر ثابت ہو گیا کہ خدا کے لئے ہماری خاک یا راکھ میں سے کسی ایک سیل کو نکال کر اس سے ہمیں دوبارہ زندہ کر دینا کونسا مشکل کام ہوگا۔ قرآن شریف میں کئی مقامات پر معترضین کے الفاظ آئے ہیں کہ ''جب ہم مر کر خاک ہو جائنگے تو پھر ہمیں کیسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔'' اللہ کی قدرتوں کا تو الگ ہی انداز ہے لیکن کلوننگ کا تجربہ بجائے خود حیات بعد الموت کے اعتراض کا سائنسی جواب۔''

حیدر قریشی دہریوں کو بھی فرمان خداوندی سے خدا پرست ثابت کر دیتے ہیں۔

''**لاتسبو الدھر**'' والی، حدیث قدسی میں اللہ خود فرماتا ہے کہ زمانے (دہر) کو برا مت کہو۔ اس رو سے جبکہ دہر خدا سے بعید نہیں تو دہریے کا مطلب بھی خدا پرست ہی تو ہوا۔

سید محمد رضی الدین نے برسہا برس کے مطالعے کے بعد اس کتاب کو ترتیب دینے سے پہلے اگرچہ

اپنے دانشور احباب سے مشورے بھی طلب کئے اس کے باوجود بھی جدید سائنسی فتوحات اور معرکتہ الآرا تجربات کا ذکر کتاب میں آنے سے رہ گیا اگر انہوں نے حیدر قریشی سے بھی اس ضمن میں مشورہ طلب کیا ہوتا تو کتاب میں یہ کسر بھی پوری ہوگئی ہوتی۔اس کے باوصف بھی کتاب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے جو ہمیں سائنسدانوں، فلسفیوں اور مذہبی پیشواؤں کے نظریات اور افکار و خیالات پر ازسرِ نو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔
مجھے یقین ہے کہ سید محمد رضی الدین کوان کی کتاب ''روح کا عالمی تصور'' کے سبب شرف قبولیت حاصل ہوگا۔

روح کیا ہے؟اس بارے میں دو تصورات پائے جاتے ہیں۔
ایک تصور یا عقیدہ کے مطابق حمل ٹھہر جانے کے کچھ عرصہ کے بعد آسمانِ ارواح سے رُوح بچہ میں داخل ہوتی ہے۔جبکہ دوسرے تصور یا عقیدہ کے مطابق رُوح ایک لطیف نُور ہے، یہ نور نطفہ کے اندر ہی موجود ہوتا ہے اور نطفہ کی نشو و نما کے ساتھ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔'اسلامی اصول کی فلاسفی' میں اس پر سیر حاصل بحث موجود ہے اور میرا یہی عقیدہ ہے کہ جسم اور روح لازم و ملزوم ہیں۔علامہ اقبال بھی فلسفیانہ سطح پر اسی تصور کے قائل تھے۔تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں وہ روح اور مادہ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے اور انسان کو ایک ایسی وحدت قرار دیتے ہیں جس کے اعمال و افعال کا مشاہدہ عالم خارجی کے حوالے سے کیا جائے تو اسے بدن کہیں گے اور جب ان کی حقیقی غرض و غایت اور نصب العین پر نظر رکھی جائے تو اسے روح کہیں گے۔
عقیدہ اور فلسفہ سے ہٹ کر سائنس میں کلوننگ کے تجربہ سے اس عقیدہ اور تصوّر کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔روح ہمارے ہر سیل میں سرایت کئے ہوئے ہے۔اس کا مطلب ہے پانی کی طرح روح کے نور کو بھی توڑا نہیں جاسکتا۔ جتنا اسے توڑا جائے گا ہر قطرہ کی طرح روح کے نور کا ہر قطرہ بھی اپنی اصل کی پوری بنیاد کے ساتھ اپنی جگہ موجزن رہے گا۔اب کلوننگ سے جس بات کی تصدیق ہو رہی ہے، ہمارے صوفیائے کرام تو ایک عرصہ سے صوفیانہ سطح پر اسی بات کو قطرہ میں دجلہ اور دجلہ میں قطرہ دیکھنے کی صورت بیان کر چکے ہیں۔یوں میرے نزدیک جسم اور روح دونوں لازم و ملزوم ہیں، موت کے بعد بھی یہ تعلق کسی نہ کسی سطح پر قائم رہتا ہے اور قیامت کے دن ہمیں ہمارے جسم دوبارہ دے دیئے جائیں گے۔اور انہیں جسموں کو ہی جزا، سزا سے گزرنا ہوگا، ظاہر ہے یہ جسم اپنی اپنی روح سمیت ہوں گے۔کلوننگ کے تجربے کا گہرا جائزہ لیا جائے تو قیامت کے دن انہیں جسموں کے ساتھ دوبارہ زندہ کئے جانے کا عقیدہ، عقلی لحاظ سے بھی مزید واضح اور روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔

(**حیدر قریشی** کا اقتباس از **کھٹی میٹھی یادیں** باب **روح اور جسم**
مطبوعہ **جدید ادب** شمارہ:۹ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء)

اطہر معز (گلبرگہ)

اُردو ناولٹ کا مقام و منصب

ناول کی طرح ناولٹ بھی اُردو میں مغربی ادب سے آیا ہے۔ارباب نقد و نظر کے نزدیک ابھی اس بات پر فیصلہ نہیں ہو پایا ہے کہ ناولٹ اور ناول میں فرق کس طرح پیدا کیا جاسکے۔اکثریت ان دونوں بیانیہ اصناف میں موجود طوالت کو پیمانہ بناتے ہوئے ناولٹ یا ناول قرار دیتی ہے۔چونکہ یہ صنف بھی مغربی ادب سے اُردو میں آئی ہے چنانچہ اس کے اُردو نام کے بجائے اسے بھی اس کے مروجہ مغربی نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔ویسے یہ ضروری نہیں کہ ہم اسے ناولٹ کے نام ہی سے یاد کریں ہم اسے ناولچہ بھی کہہ سکتے ہیں اور یے ناولٹ سے نسبتاً آسان بھی ہے۔ناول کے سلسلے میں اس کا اُردو نام مروج نہ کیا جاسکا۔تاہم ناولٹ کے سلسلے میں جو اُلجھن پیدا ہو رہی ہے اسے رفع کرنے کی خاطر ہم اس کو ناولٹ کے بجائے ناولچہ کہہ دیں تو کوئی قباحت نہ ہوگی۔ناولچہ(ناولٹ) کی تعریف مفکر کڈون نے اس طرح بیان کی ہے۔

> ''فکشن کی وہ تخلیق جو ناول سے طوالت کے اعتبار سے کم
> ہو اور افسانے سے بڑی ہو جس میں معمولی قسم کا فکشن ہو
> اور معروف طریقۂ کار سے مدد لی گئی ہو اور اس میں
> واقعات کی مدد سے سسپنس پیدا کیا گیا ہو مگر ادبی معیار کم
> ہو۔امریکہ میں اس قسم کے فکشن کو طویل افسانہ اور کہیں
> اسے افسانہ اور ناول کی درمیانی کڑی کے نام سے موسوم
> کیا جاتا رہا ہے''[1]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فکشن میں ناولچہ کی تخلیق کی ضرورت کیوں کر محسوس کی گئی جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ناولچہ اُردو ادب میں مغرب سے آیا ہے اور اس کے تخلیقی جواز کو مغربی ادب کے پیش منظر میں دیکھا جانا مناسب اور استدلالی طور پر صحیح ہوگا۔

سولہویں صدی میں جب مغرب اپنے انقلابی دور سے گذر رہا تھا تب مغربی معاشرے میں زندگی کے

ہر شعبہ میں اس کے اثرات مرتسم ہونا شروع ہوئے جس کے نتیجے میں تہذیب و ثقافت، سیاست، معاشرت اور مذہب میں بے شمار تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ سوچ و فکر کے دھارے بدل گئے۔ ادب کا منظر نامہ بدل گیا۔ انگریزی ادب رومانس کی خیالی اور فرضی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا سے روشناس ہوا۔ موضوعات کے تنوع، داخلیت کا اظہار، خارجیت کا عکس اور انسانی زندگی سے جڑے مسائل کو فکشن میں جگہ ملی۔ جس نے اس کی تخلیقی روایت کو استحکام بخشا اور متعدد لافانی ناول معرض وجود میں آئے جس نے انگریزی فکشن نگاری کو اعتبار بخشا۔ سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی تک آتے آتے بعد کو آنے والے ناول نگاروں نے اپنے پیش روؤں کی روایت کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انگریزی فکشن نگاری کو تقویت عطا کی۔ اظہار بیان، نت نئے اسالیب، ہئیت و تکنیک اور موضوع و مواد کے بے شمار پیرائے بیان نے ناول کے امکانات کو فزوں تر کر دیا۔ مغربی ادب بالخصوص فکشن کے فروغ کے بارے میں ڈاکٹر صدیق محی الدین لکھتے ہیں

''مغربی ادب اور بالخصوص فکشن میں نمایاں تبدیلی اور تغیر
نشاۃ الثانیہ کے بعد رونما ہوتا ہے۔ نشاۃ الثانیہ مغرب میں
ایسا پراسرار سماجی وقوعہ ہے کہ جس نے زندگی کے ہر طرح
کے شعبہ میں ایک طرح کی ہلچل مچادی اور یہیں سے
سماجی اور ادبی سطح پر بھی رجحانات اور تحریکات کا آغاز ہوتا
ہے''[۲]

ڈاکٹر صدیق محی الدین نے مغربی ادب میں ہوئی تبدیلی کا نشاۃ الثانیہ سے جوڑتے ہوئے اسے وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل مغربی نشاۃ الثانیہ کا زندگی کے ہر شعبہ پر اثر پڑا اور مغرب میں سیاسی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی و تہذیبی زندگی کی کایا پلٹ ہوگئی۔ مغربی ناول نگاروں نے ان تبدیلیوں کو وسیع پیمانے پر اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں

''ناول ادب کی جدید صنف ہے مغرب میں اس کا آغاز
اٹھارویں صدی کے ربع اول میں اُس وقت ہوا جب کہ
جاگیردارانہ نظام دم توڑ چکا تھا اور اس کی جگہ جدید صنعتی
عہد نے لے لی تھی جسے نشاۃ الثانیہ کے نام سے پکارا جاتا
ہے۔ چنانچہ ناول کے ایک سرے پر اگر قدیم رومانس
ہیں تو دوسرے سرے پر جدید افسانہ ہے ناول ان دونوں
کے درمیان کی کڑی ہے اگرچہ ناول کا سفر آج بھی جاری

ہے اور اس کا فن اخذ و قبول کے مراحل سے گذر رہا ہے
لیکن اس میں ٹھہراؤ کی کیفیت واضح طور پر نظر آنے لگی
ہے جسے کسی فن کا نقطۂ عروج کہہ سکتے ہیں''[۳]

مغربی نشاۃ الثانیہ کو اگر بقول ڈاکٹر صدیق محی الدین دو بڑے حصوں میں منقسم کر کے دیکھا جائے تو اس کا پہلا بڑا حصہ انقلاب فرانس اور دوسرا حصہ صنعتی انقلاب محیط نظر آئے گا۔ فرانس کا انقلاب ایک تاریخی واقعہ ہے جس کی یوروپی سیاست میں بڑی اہمیت ہے۔ اس واقعہ میں یوروپ کی سیاسی و جغرافیائی سطح کو نئی جہت ملی اس کے اثرات ساری دنیا میں محسوس کیے گئے۔ اس انقلاب میں برطانوی سیاست کی چولیں ہلا ڈالیں۔ دنیا بھر میں سلطنت برطانیہ کے خلاف ہنگامے ہونے لگے۔ انقلاب فرانس نے آزادی و بھائی چارہ کا جو پیغام دیا اس کی بازگشت ساری دنیا میں سنی گئی۔ دوسری طرف یوروپ میں صنعتوں میں مشینوں کے استعمال اور اس کے سماج و معاشرے پر پڑنے والے طاقتور اثرات اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل نے مغربی ادبیات میں جگہ بنائی اور مغربی ناول نگاروں نے اپنے عہد کی بھرپور زندگی کو پیش کیا اور اس کی صحیح عکاسی کی۔ صنعتی ترقی نے انسان کی سوچ و فکر کے دھارے کو یکسر بدل کر رکھ دیا جیسے جیسے علوم و فنون میں ترقی ہوئی اس کے ساتھ ساتھ انسانی ذہنی و فکری رویے بھی حالات کے مطابق تبدیل ہونا شروع ہوئے۔ بیسویں صدی میں کارل مارکس کے اشترا کی نظریات نے عالمی سطح پر اپنے اثرات چھوڑے جس کے زیر اثر مزدوروں میں اپنے حقوق کے دفاع اور زمیندار طبقے کے خلاف بیداری کی زبردست لہر اٹھی نے معیشت اور معاشرتی نظام کو تبدیلی سے دوچار کر دیا۔ بعد ازاں دنیا نے دو عالمگیر جنگوں کو بھگتا جس کی خوفناکیوں اور ہولناکیوں نے کئی دہوں تک ذہن انسانی کو دہلائے رکھا۔ مابعد جنگوں جن مختلف معاشی و سیاسی بحرانوں سے دنیا گذری اس کے اثرات بالخصوص جس طرح جنگ زدہ اور تباہ حال ایشیائی ممالک پر پڑے اسے بھی عالمی ادب میں بڑی فن کاری سے پیش کیا گیا۔

اوپر بیان کردہ حالات کے نتیجے میں ادیب کا متاثر ہونا فطری امر ہے۔ ادب میں کئی رجحانات اور تحریکیں آئے جس کے تحت ادیبوں نے اپنے اپنے نقاط نظر اور فن کاری و مشاہدات کو ادب کے حوالے سے پیش کیا۔ ادب کی تقریباً ہر صنف میں تجربے ہوئے۔ مغربی ادب چونکہ زیادہ مستعد اور ترقی یافتہ ہے چنانچہ ان تبدیلیوں کو میڈیا اور ٹکنالوجی کی مدد سے دنیا بھر میں محسوس کیا گیا اور مختلف زبانوں میں ادب کی مختلف اصناف میں مغربی اصناف کے طرز پر تجربے ہوتے گئے۔ یہی وہ اسباب و محرکات ہیں جنھوں نے اُردو میں ناولٹ یا ناولچہ کی راہیں ہموار کیں۔

اُردو ادب میں بھی اس صنف کو فراخ دلی سے اپنایا گیا۔ متعدد فن کاروں نے ناولچہ یا ناولٹ میں طبع آزمائی کی۔ سرشار، نیاز فتحپوری، سجاد ظہیر، عزیز احمد، کرشن چندر، منٹو عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم

آبادی، شوکت صدیقی، راجندر سنگھ بیدی، رام لعل، قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، جمیلہ ہاشمی، جوگندر پال، آمنہ ابوالحسن، اقبال متین، شفق، مظہر الزماں خاں، سلیم شہزاد وغیرہ نے بہترین ناولچے لکھے۔

ناقدین ادب نے ناولچہ کے تخلیقی جواز میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ عالمی سطح پر سیاسی، معاشرتی، صنعتی، نظریاتی اور طبقاتی انقلابات آئے جس کے نتیجے میں ادبی رجحانات میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں یہ ادبی تبدیلیاں صرف برائے نام نہیں رہیں بلکہ ان کا دائرہ کار موضوعاتی، تجرباتی، ہئیتی، تکنیکی، اُسلوبی، اور لسانی سطح تک پھیل گیا۔ چنانچہ محولہ بالا اسباب و محرکات کی بنا پر ناولچہ جیسی صنف نے جنم لیا۔ فکشن لکھنے والوں نے بھی ناول کے مقابلے ناولچہ کو ترجیح دی اور ناقدین کے مطابق قاری بھی وقت کی کمی کے باعث ناولچہ کو ہی اہمیت دینے لگا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صدیق محی الدین کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے

"خود فکشن کے تخلیق کار بھی وقت کی کمی کے باعث بسا اوقات
ایک کامل تشکیل شدہ ناول لکھنے کی بجائے ناولٹ کی تخلیق کو
اہمیت دینے لگے اور دوسری طرف اس برق رفتار اور مشینی دور میں
قاری بھی طویل ناول کے مطالعے سے خود کو قاصر سمجھنے لگا
، دراصل یہ وقت کا ایک فطری اور لازمی تقاضہ ہے۔ جس طرح
ناول کے آغاز کے وقت رومانس (داستان) کا رجحان ختم ہوا اور
ناول نے ادب میں اپنی جگہ محفوظ کر لی تھی ٹھیک اسی طرح
بیسویں صدی کے نصف آخر میں ناول نے اپنے نقطۂ عروج کو
حاصل کر لیا تو ناول کا رجحان عام ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی
مختصر افسانے نے بھی اپنے ارتقائی مراحل کو بہت سرعت کے
ساتھ طے کر لیا اور ایک نئی صنف افسانچہ یا منی افسانہ بھی سامنے
آیا۔ اُردو کے جدید افسانہ نگاروں میں جوگندر پال نے اس
صنف کو تخلیقی اعتبار بخشا۔ غرض ناولٹ کا وجود اور تخلیقی جواز بڑی
حد تک مذکورہ مضمرات میں دکھائی دیتا ہے" [۳]

۳: ڈاکٹر صدیق محی الدین، اُردو ناولٹ کا مطالعہ ص ۲۹۔۳۰

ڈاکٹر صدیق محی الدین نے ناولچہ کے تخلیقی جواز کے لیے فکشن نگار اور قاری کے ہاں وقت کی کمی کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ یہ دلیل کچھ دیر کے لیے قبول کی جاسکتی ہے تاہم کسی صنف کے تخلیقی جواز کو ثابت کرنے میں ناکام نظر آتی ہے اگر ڈاکٹر صدیق محی الدین کی اس دلیل میں صداقت ہے تو پھر ہم جوگندر پال، قاضی

عبدالستار، غیاث احمد گدی، عبداللہ حسین، عبدالصمد، غضنفر، شفق، مشرف عالم ذوقی، پیغام آفاقی، احمد صغیر و دیگر ناول نگاروں کے ناولوں کی مقبولیت کو کس خانے میں رکھیں؟ جن کے ناولوں کی آج بھی پذیرائی کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر صدیق محی الدین ہوں یا ناولچہ کے دیگر نقاد، کسی نے بھی ناول، افسانہ، اور ناولچہ کے درمیان حد فاضل کھینچنے کی شعوری کوشش نہیں کی۔ ناول اور ناولچہ یا پھر مختصر افسانہ میں فنی اعتبار سے متعدد مماثلتیں اور اختلافی اُمور ہیں۔ مثلاً اگر ہم ناول کے اجزائے ترکیبی پر نظر ڈالیں تو ہمیں ناول میں کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمے، زماں و مکاں، نظریہ حیات اور اُسلوب ملتے ہیں۔ مذکورہ بالا عناصر میں اگر کوئی عنصر ناول کی تخلیق کے دوران حذف ہو جائے تو اس سے قصہ، ناول کے زمرے سے خارج نہیں ہوتا۔ مشہور انگریزی ناول نگار ورجینا وولف کے مطابق ناول کی صنف شتر مرغ کی طرح ہر چیز ہضم کر جاتی ہے۔ ناول میں زندگی کی سی لچک اور وسعت ہوتی ہے۔ اس کا کینوس بے حد وسیع ہوتا ہے۔ افسانے اور ناول میں یہ ایک بڑا فرق ہے۔ چونکہ ناول ایک منتشر صنف ادب ہے اور افسانہ اپنی کیفیت، در و بست اور ہئیت کے اعتبار سے منضبط ہوتا ہے اور وحدت تاثر کو پیش کرتا ہے۔ ناول اور افسانہ کا دوسرا اہم فرق کرداروں کی پیش کش سے ہوتا ہے۔ افسانے میں کردار کے کسی ایک پہلو کو پیش کیا جاتا ہے اس کے لیے مختلف واقعات کی مدد سے کردار کے مخصوص پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس خصوص میں کرشن چندر اور منٹو کے افسانوں کے مختلف کرداروں کی پیش کشی اور اُنکے کرداروں کو نمایاں کرنے کے لیے پیش کردہ معاون واقعات کا سہارا لینے کی کوششوں کا ذکر ہی کافی ہے۔

افسانہ اور ناول کے مابین مذکورہ بالا فرق کی وضاحت کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ ان دونوں کے بین بین ناولچہ کی حدود کا تعین کیا جا سکے۔ افسانے اور ناول کے اس فرق کو اگر تجزیاتی مطالعہ کی غرض سے دیکھا جائے اور اس کی مدد سے ناولچہ میں اُن مماثلتوں کو تلاش کیا جائے تو ہمیں بہ آسانی اندازہ ہو جائے گا کہ آخر ناولچہ کا تخلیقی جواز کیا ہو سکتا ہے۔ کیا ناولچہ کردار، ہئیت اور فنی اعتبار سے افسانے اور ناول سے مماثل ہو سکتا ہے یا درمیان کی کوئی شئے بن کر رہ جاتا ہے۔ کردار، پیش کش اور تاثر کے لحاظ سے افسانے اور ناول کا اپنا اپنا مزاج ہوا ہے اور اگر ہم اس میں مماثلتیں تلاش کرتے ہیں تو یہ ہمیں اس اعتبار سے کبھی افسانے کے زمرے میں نظر آتا ہے اور کبھی ناول کے۔ مگر افسانے اور ناول میں کچھ الگ بات ہوتی ہے اور ناولچہ ان کے بیچ اپنے جداگانہ انداز سے اپنی الگ پہچان قائم رکھا محسوس ہوتا ہے۔ ان عناصر ترکیبی کا لحاظ کرتے ہوئے اگر ہم دیکھیں گے تو ہمیں افسانے اور ناول میں واضح فرق ملے گا اور رہا ناولچہ کے مقام کا تعین کا سوال تو ہمیں چاہیے کہ ہم اسے ناولٹ کے بجائے ناولچہ کا نام دیں جس سے لفظ ناولٹ سے پیدا ہونے والی الجھن کا ہی خاتمہ ہو جائے گا اور ہم بہ آسانی ناولچہ کو افسانے اور ناول کے بین بین پنپنے والی صنف متصور کر سکتے ہیں اور شاید اس کا مقام بھی یہی ہے۔ ناول کی حتمی تعریف کے لیے ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ کسی حقیقی زندگی کی عینی کسی خاص زماں و مکاں کی عکاسی کرتا ہے یا نہیں اور اس کا مرکزی قصہ شروع

سے آخر تک ایک ہے یا نہیں اور اس کے مرکزی کردار اپنے آغاز سے کن کن ارتقائی مراحل سے گذرتے ہیں۔

ناولچے پوری انسانی زندگی کو جیسا کہ ناول کی صفت رہی ہے پیش کرنے سے قاصر ہیں اور پھر ناولچوں میں دو چار سے زیادہ کردار نہیں ہوتے جن کے گرد قصہ بنا جاتا ہے باقی سب ذیلی بلکہ ضمنی کردار ہوتے ہیں۔ ناول کے ناقدوں کی جانب سے ناولچہ اور ناول میں وسعت میں کمی و بیشی کو اور تیز رفتار زندگی کی بدولت قاری کو کم سے کم وقت میں مناسب ادب دینے کا جواز پیش کرتے ہوئے جو فرق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ ٹھوس نہیں ہے بلکہ مذکورہ بالا گفتگو کی روشنی میں کمزور ثابت ہوتی ہے۔ ناول اور ناولچہ کی حدود کا تعین کرنے کے لیے ہمیں زیادہ ٹھوس اور سائنٹفک پہلو تلاش کرنے ہوں گے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے بالکل صحیح لکھا ہے

''ناولٹ نہ تو افسانے کی سی سادگی اور بلا واسطہ طریق کا غماز ہے اور نہ اس میں ناول کی سی پیچیدگی اور پھیلاؤ ہی پیدا ہوتا ہے لیکن انداز تشریح سے ایک نئی صنف کا وجود تو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ناولٹ کے بارے میں تھامس اُذل کی پیش کردہ شکل بھی زیادہ سے زیادہ اسے ناول کی ایک صورت قرار دے سکتی ہے اور بس! وہ اس طرح کہ کہانی میں اگر اثرات مرکز پر بلا واسطہ طریق سے پہنچیں تو یہ افسانے کا روپ ہوگا اور اگر بالواسطہ طریق سے پہنچیں تو ناول کا۔ چونکہ اُذل کے قول کے مطابق ناولچہ میں اثرات بالواسطہ طریق اختیار کرتے ہیں لہٰذا ہم زیادہ سے زیادہ اسے مختصر ناول کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح بلا واسطہ طریق کی حامل کسی ایک کہانی کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک طویل مختصر افسانے کا روپ دے سکتے ہیں پس بطور ایک علاحدہ صنف ادب کے یہ تا حال کھٹائی میں ہے اور اس کی حدود کا تعین کرنے سے پہلے ایک لحظہ کے لیے رکنے اور سوچنے کی اشد ضرورت ہے''۵

۵: ڈاکٹر وزیر آغا، ناولٹ کا مسئلہ، مطبوعہ ماہ نامہ شاہ کار الٰہ آباد، ناولٹ نمبر شمارہ ۵۵ ص ۱۲، مدیر محمود احمد ہنر

طویل افسانے یعنی ناولچہ میں ناول کی طرح مختلف واقعات کی مدد سے مختلف اور متنوع اثرات مرتب

نہیں ہوتے۔ ناول ایک ایسی ٹرین کے پہیوں کی مانند ہوتی ہے جو پٹریوں پر دوڑتے ہوئے مختلف قسم کی آوازیں پیدا کرتے ہیں جنھیں شمار کرنا تو مشکل ہوتا ہے لیکن اس میں نہ صرف یکسانیت ہوتی ہے بلکہ ردھم بھی محسوس ہوتا ہے اور ناول میں کہانی کا ٹیمپو بھی کسی قدر تیز ہوتا ہے۔ واقعات کی تیزی ماجرے کو تار عنکبوت کی طرح جکڑتی ہے اور کرداروں کے مختلف پہلوؤں کو اپنے زماں و مکاں کے تناظر میں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ جب کہ ناولچہ کا ٹیمپو قدرے سست رفتار ہوتا ہے۔ اس میں اگرچہ کردار ایک سے زائد ہوتے ہیں تاہم اس میں ناول کی طرح کرداروں کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ممکن نہیں، بلکہ اُن کے چند پہلوؤں کو ہی پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اُردو ادب کی ناولاتی تاریخ کی عمر لے دے کے ڈیڑھ سو برس یا اس سے اوپر ہوگی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ناولچہ کی عمر کا شمار کرنا طفلانہ کوشش کے مترادف ہوگا۔ پھر بھی اُردو میں جتنے ناولچے لکھے گئے وہ اپنی جگہ نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ اثر انگیز بھی ہیں۔

جوگندر پال کی ناولچہ نگاری کی اپنی جاندار اور شاندار روایت ہے جس کے مطالعہ سے قاری کے دل میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ ادب نہ خارجی زندگی کا عکاس ہے اور نہ مصور، وہ تو باطنی الجھنوں اور محرومیوں کا علامتی اظہار ہے اور کہیں پیکری اظہار۔ ادب کبھی بھی خارجی زندگی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کر سکتا اور ایسا کرنا اس کے لیے سزاوار نہیں۔ کیونکہ خارج کے تضادات و تصادمات ہی داخلی زندگی میں ہلچل مچا دینے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور اس طرح ادب ایک خاموش احتجاج بن جاتا ہے۔

''آمد و رفت'' میں جوگندر پال نے اُن مہاجر اور دوغلی نسل کے لوگوں کا ماجرا بیان کیا ہے جو دوہری شخصیت رکھتے ہوئے اپنے اندرون اور اصل کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جوگندر پال نے اس ناولچہ میں مشرق کے عشق کی داستان ہیرو کی زبانی بیان کی ہے۔ سارے ناولچہ میں پروفیسر مارگن کی شخصیت ایسی ہے کہ پردے کے پیچھے بیٹھے راوی کی نظر سے کسی موقع پر بھی ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ راوی خلوت، جلوت، محفل، بزم غرض ہر جگہ مارگن کے ساتھ ہے۔ راوی کس کا کرب بیان کر رہا ہے۔ مارگن کا یا مارگن کی زبانی اپنا؟ یہ سوال اس پورے ناولچہ میں قاری کے ذہن میں گردش کرتا رہتا ہے۔

جوگندر پال کے ناولچوں میں اُن کا اُسلوب سب سے توانا ذریعہ ترسیل ہے۔ اس کی روانی اور تیزی قاری کو بہا کر لے جاتی ہے۔ بیانیہ میں ہر چند کہیں کہیں انسلاکاتی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے لیکن معتدل ٹیمپو اس ناگوار اثر کو ختم کر دیتا ہے۔ اُن کے ناولچہ ''آمد و رفت'' سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے

''میرے لیے میرا باپ اپنا بھوت سا ہے جس کی پوری شکل مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ اب بڑی بڑی مونچھیں دکھائی دے رہی ہیں، اب کٹے ہوئے ہاتھ ہوا میں لہرا

رہے ہیں، اب صرف ناک اُبھر آئی ہے۔ میرا باپ مجھے
آدھا بھی دکھائی نہیں دیتا۔ آدھا باپ کم از کم دیکھنے میں تو
پورا تھا''

حوالہ: جوگندر پال: آمد و رفت باب مارگن، ناشر انڈین بکس پبلیکیشنز، اورنگ آباد 1975 ص4

جوگندر پال نے طنز سے جا بجا کام لیا ہے۔ ان کے طنز میں خنجر کی کاٹ تو نہیں لیکن سرکنڈوں جیسی چبھن ضرور ہے دیکھیے یہ اقتباس

''ہمارے ہندوستان کی جمہوریت دنیا کی سب سے بڑی
جمہوریت ہے میڈم، پوری ہتھنی کی ہتھنی ہے جنگلوں سے
نکل کر ہماری شاہ راہوں کے عین درمیان آ کھڑی ہوئی
ہے، ہماری ساری ٹریفک رکی پڑی ہے کہ یہ ہتھنی ذرا پالتو
سی معلوم ہونے لگے اور ایک طرف ہٹ جائے تو آمد و
رفت شروع ہو''

حوالہ: جوگندر پال: باب بدستور فادر لینڈ، در باب ایک

ناولچہ ''آمد و رفت'' کہانی کی بُنت کے معاملے میں عام قاری کے لیے شاید باعث الجھن ہو۔ اس میں ڈرامائی یا اچانک وقوع ہونے والے واقعات کا تصادم بھی نہیں ہے بلکہ خود کو تلاش کرنے والے ایک ایسے ہندوستانی کا ماجرا ہے جو بیک وقت ہندوستان کو تلاش کر رہا ہے اور اپنی تہذیب کو ڈھونڈ رہا ہے یا اس میں خود کو پتہ کر رہا ہے۔ پورا ناولچہ فکر انگیز الفاظ میں ڈوب کر لکھا گیا ہے جس میں ہجرت کے کرب کی ٹیسیں رہ رہ کر اُٹھتی ہیں۔ جوگندر پال کے دو مزید ناولچے ''بیانات'' اور ''خواب رو'' شائع ہو چکے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی، اُردو ناولچہ نگاری میں منفرد نام ہے۔ ''ایک چادر میلی سی'' میں انھوں نے رانو کے کردار کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے قصے کے تانے بانے کو بُنا ہے۔ رانو کے اطراف تلوکا، منگل، جنداں اور بڑی ہیں۔ منگل کے اطراف سلامتے، نواب اور اسمعیل ہیں۔ بیدی نے کردار رانو کے جنسی پہلو، اور شوہر کے چھوٹے بھائی سے شوہر کی موت کے بعد شادی کے لیے مجبور کیے جانے کے بعد ایک ہندوستانی عورت کی نفسیاتی کیفیت کو خوبی سے پیش کیا ہے۔

شوکت صدیقی نے ''کمین گاہ'' میں رام بلی کو مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ رام بلی کا کردار ایک عجیب نفسیاتی تضاد کو پیش کرتا ہے۔ جسے Psychalogical Irony کہا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ ایک جیالا اور نڈر ٹرک کلینر ہے جو اکیلا ہی کئی پر بھاری پڑتا ہے جو کبھی کبھی حقیقت سے دور لگتا ہے۔ دوسری طرف وہی

جیالا ایک بڑے سیٹھ ترلوکی چند کے اشاروں پر ناچنے والا معمولی گرگا یا خودی کو بیچنے والا کرائے کا ٹٹو بن جاتا ہے۔ شوکت صدیقی کے اس ناولچہ ''کمین گاہ'' میں پلاٹ رام بلی اور اس کی سرگرمیوں اور ذیلی کرداروں کے گرد گھومتا ہے۔ تاثر کے اعتبار سے یہ ماجرا بھی اپنی طوالت اور کرداروں کی بنا پر افسانے کی سرحد سے مس ہو کر ناولچہ کے زمرے میں جا داخل ہوتا ہے۔

تاثر اور کرداروں کے اعتبار سے اقبال متین کا ناولچہ ''چراغِ تہہِ داماں''، ناول اور افسانے کے درمیان اپنی علاحدہ شناخت بنانے میں نہ صرف کامیاب ہے۔ بلکہ موضوع اور اُسلوب کی بن اپرا سے اُردو کے چند بہترین ناولچوں میں شمار کیا جائے گا۔ اس ناولچے کے کردار مختلف حیثیتوں سے ایک دوسرے کے مماثل تو نہیں ہیں تاہم ہمسری ضرور کرتے ہیں۔ شانوجہ، کوشلیا، ڈیئر بالڈ اور پیارے لال کے کردار تاثر اور کمیت کے اعتبار سے خوب ہیں جن پر فن کار ن کافی محنت کی ہے۔

''کیمیائے دل'' جیلانی بانو کا کامیاب ناولچہ ہے۔ جس میں شہزاد آپا کے کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ موضوع میں نیا پن کچھ بھی نہیں ہے لیکن جیلانی بانو نے یہاں اپنی فن کاری کے جوہر دکھاتے ہوئے ملتانی مٹی میں پچی کاری کا شاندار مظاہرہ کیا ہے۔ اس ناولچہ کے اختتام پر عورت کی ضد اور نئی قدروں کی آزادروی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے ساری کہانی سلمٰی کی زبانی بیان کی ہے۔

''تین بتی کے راما'' علی امام نقوی کا ناولچہ ہے جو فن اور اسلوب کے اعتبار سے بے حد انوکھا اور موضوع کے لحاظ سے سب سے جدا ہے۔ علی امام نقوی نے اس میں ممبئی کے گھریلو پیشہ افراد کی زندگیوں کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ یہ لوگ گھروں میں خانساماں کا کام کرتے ہیں اور اوپر کے کام کاج بھی انھی کے ذمہ ہوتے ہیں ان لوگوں کو ممبئی کی زبان میں ''راما'' کہا جاتا ہے۔ نقوی نے اس ناولچہ میں ممبئی کی عام بول چال کو کرداروں کے ذریعے بیان کیا ہے جو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ طرز بیان حقیقت سے قریب نظر آتا ہے۔ یہ کہانی بھی افسانے اور ناول میں فرق پیدا کرتی ہے۔ اس میں وحدت تاثر نہ ہوتے ہوئے بھی غیر محسوس انداز میں پایا جاتا ہے۔ غریب راماؤں کی ایک دوسرے کے تئیں ہمدردی، دکھ درد میں کام آنے اور محبت و خلوص کو انھوں نے خوبی سے درشایا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ ایک کامیاب اور متاثر کن تخلیق ہے۔

غرض اپنی ماہئیت اور حدود سے بے خبر ناولچہ کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ ناولچہ کی حدود اور اس کے فنی لوازم، ناول اور افسانے سے کس قدر مختلف ہو سکتے ہیں یہ طے کرنا ناقدین کا کام ہے۔ کہانی کا کام بہر حال سفر کرنا ہے اور وہ اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برا ہو رہی ہے۔ کہانی انسان کی آخری سانس تک جاری رہے گی اس کی حیثیت بیک وقت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی، وہ مقامی بھی ہے اور آفاقی بھی۔ اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔

☆☆☆☆☆

صبیحہ خورشید (کامٹی)

ماہیا کا آغاز وارتقاء

اور

اردو میں ماہیا نگاری

ماہیا سرزمین پنجاب اور ہزارہ کا لوک گیت ہے۔ یہ پنجاب کے ہر علاقے: سرائیکی، ملتانی۔ گوجری، دوگری، ہندکو، پوٹھوہاری، ماجھی، لہندے اور بار کے علاقوں میں گایا جاتا ہے۔ اور عوام میں مقبولیت کا درجہ بھی رکھتا ہے ماہیا چونکہ ایک لوک گیت ہے۔ اور لوک گیت کی ابتداء کسی پلاننگ کے تحت نہیں ہوتی بلکہ عام لوگوں کے جذبات اور امنگوں کی عکاسی کر کے خودرو پودے کی طرح تخلیق ہوکر زبان زد عام ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اسکے مصنف ہونے کا دعوی کوئی نہیں کرسکتا بلکہ یہ پورے سماج کا مشترکہ اثاثہ ہوتا ہے۔ پورے معاشرے کی مشترک میراث ہے۔ ظاہری صورت میں منفرد ہونے کے باوجود اپنی سوسائیٹی کا اجتماعی ترجمان ہے۔۔ ماہیے کے آغاز وارتقاء کے بارے میں اگرچہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس کی تخلیق ہے لیکن اسکے بارے میں چند اسکالرز کی رائیں یہ ہیں۔

ماہیا فن تے بنتر؛ میں تنویر بخاری صاحب یوں رقم طراز ہیں:

ماہیا؛ لفظ ماہی کے ساتھ الف ندائیہ ملا کر بنایا گیا ہے۔ جن کے مرادی معنی ہیں۔ اے ماہی، اے ساجن، اے ساتھی، اے محبوب اور اے میرے معشوق وغیرہ۔

لفظ؛ ماہیا؛ کی وضاحت کرتے ہوئے امین خیال لکھتے ہیں:

''ماہیا'' کے لفظی معنی ہیں۔ مہیں۔ یعنی بھینسیں چرانے والا وہ شخص جو جنگل بیلے میں بھینسیں چرانے کا کام کرے؛ مہیں (مہی) یا مینہہ کو مجھ بھی کہتے ہیں۔ اس لفظ کی کچھ اور زبانوں میں شکل دیکھیں

پنجابی،	سندھی،	بلوچی،	کشمیری،	پراکرت،	سنسکرت،	اردو،
مینہہ،	مینہن،	میہی،	مینش،	مہسی،	مہشی،	بھینس

ف ۱

امین خیال کی طرح تنویر بخاری صاحب ''ماہی'' کے معنی کو بھینس چرانے والا قرار دیتے

ہیں اور اسکے ثبوت میں انھوں نے ڈھیر ساری دلیلیں پیش کی ہیں۔ جن میں سے چند ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) میری تے ماہی دی پریت چروکی، جاں سر آہے چھتّے

(مادھولال شاہ حسین ۹۴۵ھ تا ۱۰۰۸ھ، بمطابق ۱۵۳۹ء تا ۱۵۹۹ء)

(۲) حیدؔر نال ماہی دے پھرساں جھنگ وِجن بھاویں شور وِجن

(علی حیدر ملتانی ۱۱۰۱ھ تا ۱۱۹۹ھ بمطابق ۱۶۹۰ء تا ۱۷۸۵ء)

(۳) وے ماہی! میں سمجھ نہ لایا نینہہ

(حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائی ۱۱۰۲ھ، تا ۱۱۶۵ھ)

(۴) میں ماہی دی مستانی وَسدا دِل وِچ دِلبر جانی

(حضرت سچل سرمست ۱۱۵۳ھ ، ۱۷۴۰ء جنم)

(۵) ماہی ڈھونڈ کے بابلا اسیں آندا صفت ایسدی کہی نہ جاوندی اے

(ہیر دا قصہ از شاہ جہان مقبل تحریر کردہ: ۱۷۴۷ء/۱۱۶۰ھ)

(۶) جوہ وِچ ماہی مجھیں چاردے سَن رانجھے ہیر وَل کردھیان میاں

(حضرت وارث شاہ۔ لکھت: ۶۷۔۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ) ف۲

مذکورہ بالا مثالیں ماہی بمعنی بھینس چرانے والے کے ثبوت میں چند اسکالرز کی رائیں تھیں۔ اسکے علاوہ پنجابی ماہیے کے آغاز کے بارے میں درج ذیل روایتیں مشہور ہیں:

(۱) پنجابی عشق معاشقے کی دنیا میں دو عاشق ایسے سامنے آئے ہیں جو اپنے اپنے محبوب کی بھینسیں چرانے پر ملازم ہوئے۔ ایک گجرات کی سوہنی کا عاشق عزت بیگ تھا جو بھینسیں چرانے کے باعث مہینوال کہلایا اور دوسرا تخت ہزارے کا دھید و رانجھا جس نے اپنی محبوبہ ہیر کی بھینسیں چرائیں۔ یہ داستانیں جب مشہور ہوئیں تو محبوب کی بھینسیں چرانے والا ماہی محبوب کے معنوں میں واضح طور پر سامنے آیا اور آہستہ آہستہ ماہی کا لفظ اپنے لفظی معنوں سے ہٹ کر اصطلاحی معنوں میں فروغ پاتا چلا گیا۔ اب کسی عورت کا محبوب بھینس نہ بھی چراتا ہو تب بھی ماہی کہلاتا ہے۔ شعرائے کرام نے اس لفظ کو محبوب کی علامت بنادیا اور صوفیانہ خیالات رکھنے والے شعرائے کرام اسے مجازی محبوب سے حقیقی محبوب تک لے آئے۔'' ف۳

(۲) لفظ ماہیا کی شہرت کا ایک اور سبب ماہیا اور بالو بھی ہے۔

''کہا جاتا ہے کہ محمد علی نام کے ایک شخص کو اقبال بیگم نام کی عورت سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ اسے اغوا کر کے لے گیا پھر دونوں پکڑے گئے۔ محمد علی گجرات کی جیل میں قید ہوگیا۔ عورت بھی عشق کے معاملے میں نڈر تھی۔ وہ اپنے عاشق سے جیل میں ملتی تو بڑی بہادری سے سوال و جواب کرتی۔ اس مقدمے میں لوگوں نے بہت زیادہ دلچسپی

لی تو اس کا چرچا دور دور تک ہوگیا۔ دونوں چاہنے والے جب کچہری اور حوالات میں ماہیا کی دھن پر سوال و جواب کرتے تو سارے پنجاب میں اس غنایئے پر سر دھنا جاتا۔ محمد علی' ماہیا کے نام سے مشہور ہوا اور ماہیا کے مقابلے میں بالو ایک محبوبہ کی علامت بن گئی۔ پھر بالو اور محمد علی نہ رہے بلکہ ہر پیار کرنے والا اپنی محبوبہ کو بالو کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔'' **ف۴**

(۳) کہا جاتا ہے کہ ماہیا کا نام ''ماہیا'' بہت زیادہ پرانا نہیں ہے بلکہ ماہیا سے قبل اسے ٹپہ بھی کہا جاتا تھا جس کا ثبوت ماہیے کے اس ٹکڑے سے بھی ملتا ہے۔

آری نوں دَندا کوئی نہ
آجا ماہیا ٹپے گایئے
ویڑھے وچ بندا کوئی نہ

(۴) ٹپے کے عنوان کے تحت ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار اپنی کتاب ''رکھتاں ہرے بھرے'' میں فرماتے ہیں:

''ٹپہ (ماہیا) ہمارے لوک گیتوں کی سب سے پرانی صنف ہے۔ جسے شوق سے گایا جاتا ہے۔ ڈیڑھ مصرعے کی اس چھند کا آدھا حصہ مصرعہ ''تک'' ہوتا ہے اور اس کا کام صرف دوسرے مصرعہ کو وزن، قافیہ اور ردیف مہیا کرنا ہے۔۔ اس میں پنجاب کے دلکش مناظر، درختوں، فصلوں، جانوروں غرض یہ کہ ہر اس چیز کا ذکر ہوتا ہے جو ہماری زندگی اور رہن سہن کا حصہ ہے۔ جن کو ہم روزانہ اپنے اردگرد کے ماحول میں دیکھتے ہیں۔۔ الگ الگ علاقے میں ٹپے کا نام بھی الگ الگ ہے۔ ساندل بار میں اسے ماہیا، کانگڑے میں سّمی، ایبٹ آباد میں قینچی اور دیگر مقام پر اسے بھنگڑے بھی کہتے ہیں۔

ٹپہ گانے کا کوئی موقع محل نہیں ہوتا بلکہ خوشی و غم ہر موقع اور ہر جگہ پر گایا اور سنا جاتا ہے۔ لڑکے بالے بھی گاتے ہیں اور مرد عورت بھی۔۔۔ ان بولوں کا سارا حسن ان کے اختصار اور بے ساختگی میں ہوتا ہے۔''

(۵) ماہیا کا ایک نام بگڑو بھی ہے۔ جس کے متعلق مختلف ماہرین کی آراء الگ الگ ہیں:

افضل پرویز کا کہنا ہے کہ ''بگڑو نام کی ایک طوائف بہت اچھا گیت گاتی تھی۔ اسلئے ماہیا اس طوائف سے منسوب ہے۔'' **ف۵**

(۶) بقول امین خیال:

''بگڑو لفظ بگا سے نکلا ہے۔ بگا سفید اور گورے رنگ کو کہتے ہیں۔ بگڑو کا مطلب ہے سفید رنگ والی بہت گوری عورت اس طرح اپنے خوبصورت گورے چٹے رنگ کے باعث وصفی نام کی بدولت محبوبہ کی علامت بن گئی ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس گیت میں محبوب کو مخاطب کرنے کے لئے (بالو کی طرح) بار بار لفظ بگڑو آنے کے سبب اسے بگڑو (گیت) کا نام دے دیا گیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بالو کی طرح واقعی بگڑو نام کی کوئی عورت موجود ہو۔

لیکن ہمیں ایسی کوئی مثال حاصل نہیں ہوسکی جس میں بگڑو کا لفظ موجود ہو۔'' **ف۶**

(۷) ڈاکٹر احمد حسین قلعداری کے مطابق:

''ماہیا یہ لوک گیت عاشق اور معشوق کے مکالمے کے طور پر گایا جاتا ہے۔ یہ گجرات کے مشہور عاشق اور معشوق 'ماہیا اور بالو' کی ایجاد ہے۔'' ف ۷

(۸) یوسف علی لائق اپنے مقالے ''ماہیا کی بازیافت'' میں اس دوہے کو بنیاد بنا کر فرماتے ہیں:

تورے پورب مہیں میں بپھا تنکو، نا
تورے کجن سے مواتن میں جیا تنکو، نا

(معنی: تمہارے پورب کے مہ نشینوں میں ذرا بھی وفا نہیں ہے۔ تمہارے غمزوں کے مارے جسم میں بھی جان باقی نہیں ہے)

اس شعر سے دو رموز بھی آشکار ہوئے۔ پہلا یہ کہ پورب کا رہنے والا مہیں میں نون غنہ ہے اور دوسرا یہ کہ پورب کا رہنے والا مہیں کہیں اور جا کے آنکھ لڑا بیٹھا ہے۔ جہاں اس کی محبوبہ اسے بے وفا ہونے کا طعنہ دے رہی ہے۔ اب اس بانکے سجیلے لفظ کے معنی دیکھئے اور دیکھتے ہی رہ جایئے۔ پوربیا، پُربیا، پُربِیا (پورب کا رہنے والا) پی، بلم، خاوند، خصم، پربیا سائیں، چرویدار، چشم بددور کون سی صفت ہے۔ جو اس میں نہیں جو اسے دیکھتا ہوگا۔ یہی کہتا ہے۔ ع جسکا عاشق ہے یہ، معشوق وہ کیسا ہوگا **(ناطق لکھنوی)**

اس پر ظالم نے چار چاندیوں لگا دیئے کہ بیری ہوگیا۔ بے وفا بھی، اور تو اور پردیسی بھی بن گیا۔ یعنی کریلا اور نیم چڑھا کہ پردیس اور پریت لازم وملزوم ہے۔ یقین نہ آئے تو دوہے کے اس شلوک کو دل کی زبان سے گنگنایئے اور قربان جایئے۔ ع

پردیسی کی پیت کو سب کا من للچاوے
دوہی بات کا کھوٹ ہے رہے نہ سنگ جاوے''

امین خیال اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''لائق صاحب دور کی کوڑی لائے ہیں اور پوربی زبان کے لفظ مہیں کو ماہیا کا ماخذ قرار دیا ہے اور اس کے معنی چرواہا بتاتے ہیں۔ اور مہینوال، مجھیوال اور رانجھا کو صرف بھینسوں کا چرانے والا ہی کہا ہے۔ جبکہ رانجھا اور عزت بیگ مویشی چرانے پر نوکر ہوئے تھے۔ اور اس وگھ میں بھینسوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ویسے بھی افادی نقطہ نظر سے پنجاب میں بھینس کو گائے پر ترجیح دی جاتی ہے۔ جبکہ گائے بھینسوں کے وگھ کو وارث شاہ نے منگو بھی کہا ہے۔

تیرے جھے معشوق جے تھیں راضی منگو
نیناں دی دھار وچ جاریئے نی

لہٰذا چرواہا یا ماہی رانجھا اور مہینوال بن کر محبوب کی علامت بن چکے ہیں۔'' ف۸

(۹) مقصود ناصر چودھری اپنی کتاب ''پنجاب دے لوک گیت'' میں فرماتے ہیں۔

''ماہیا لوک گیتوں کی ایک مثال ہے۔ ماہیا معشوق کو کہا جاتا ہے۔ پنجابی شاعری میں مرد معشوق اور عورت عاشق ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہجر، فراق اور پیار محبت کی لہریں ٹھاٹھیں مارتی نظر آتی ہیں۔''

(۱۰) کتاب ''پنجابی ادب دی کہانی'' میں عبدالغفور قریشی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ دیس پنجاب کا ایک مقبول ترین گیت ہے جو ٹپے کی طرح ڈیڑھ مصرعہ کا گیت ہے۔ پہلا مصرعہ چھوٹا اور دوسرا مصرعہ بڑا ہوتا ہے۔ جس میں شعر کی جان ہوتی ہے۔ اس کا موضوع برہا اور دکھ درد ہے۔'' **ف۹**

(۱۱) ساتھ ہی حیدر قریشی صاحب اپنی کتاب ''اردو میں ماہیا نگاری'' میں فرماتے ہیں:

''ماہیا سرزمین پنجاب کا لوک گیت ہے۔ ماہیا کا لفظ ماہی سے نکلا ہے۔ لیکن یہ اردو والا ماہی نہیں ہے۔ ویسے ماہیا میں محبّ اپنے محبوب کی جدائی میں ماہیٔ بے آب کی طرح بھی تڑپتا دکھائی دیتا ہے۔ پنجابی میں بھینس کو مہیں کہتے ہیں۔ بھینسیں چرانے والے کو اسی نسبت سے ماہی کہا جاتا ہے۔ ان چرواہوں کو بھینسوں پر نظر رکھنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا تھا اس لئے دیہاتی ماحول کے مطابق انہوں نے کسی مشغلے کے ذریعے وقت گذاری کا راستہ نکالا۔ بانسری بجانے اور گیت گانے کا مشغلہ ایسا تھا کہ بیک وقت چرواہے کا فرض بھی ادا کیا جاسکتا تھا اور اپنے دل کو بہلایا بھی جاسکتا تھا۔ بانسری اور اچھی آوازوں کے جادو نے بھی بعض چرواہوں کو اپنے اپنے دیہاتوں میں مقبولیت عطا کی ہوگی۔ لیکن جب محبت کے قصوں میں رانجھے اور مہینوال کو اپنے اپنے محبوب تک رسائی حاصل کرنے کے لئے چرواہا بننا پڑا تو ان کرداروں کی رومانوی کشش نے لفظ ماہی کو چرواہے کی سطح سے اٹھا کر نہ صرف ہیر اور سوہنی کا محبوب بنا دیا۔ بلکہ ہر محبت کرنے والی مٹیار کا محبوب ماہی قرار پایا۔ اسی ماہی کے ساتھ اپنے پیار کے اظہار کے لئے ماہیا عوامی گیت بن کر سامنے آیا۔ ف۱۰

خلاصۂ کلام یہ کہ ماہیا پنجاب کا عوامی گیت ہے جو لفظ ماہی سے بنا ہے۔ جس کے معنی بھینس چرانے والا کے ہوتے ہیں۔ لیکن پنجاب کی دو مشہور عشقیہ داستانوں کے بعد ماہیا لفظ اپنی لفظی معنوں سے ہٹ کر اصطلاحی معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جس کے معنی اے میرے معشوق، اے میرے ساجن، اے میرے محبوب، پیارے، ڈھولا وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ ماہیا میں محبّ اپنے محبوب کے فراق میں تڑپتا دکھائی دیتا ہے۔ جس میں مخاطب کرنے والی ہستی عورت ہوتی ہے، یعنی عورت کی طرف سے مرد کے حضور میں اپنی محبت کا اظہار۔ برہا اور دکھ درد اس کے خاص موضوع ہوتے ہیں۔

ماہیا سے قبل ماہیا کا نام ٹپہ اور بگڑو بھی تھا لیکن ماہیا نام زیادہ مشہور ہوا اور آج ہم اس سہ مصری صنف شاعری کو ماہیا کے نام سے ہی جانتے ہیں۔

حوالہ جات:

(۱) امین خیال۔ پنجابی ماہیا۔ مطبوعہ گلبن دو ماہی احمد آباد ماہیا نمبر ۱۹۹۸ صفحہ ۲۷

(۲) ماہیا فن تے بنتر از تنویر بخاری۔ انتخاب اشعار از صفحہ نمبر ۱۰ تا ۱۵)

(۳) امین خیال۔ پنجابی ماہیا۔ گلبن ماہیا نمبر صفحہ ۲۸

(۴) ایضاً صفحہ ۲۹

(۵) افضل پرویز۔ بن پھلواری۔ صفحہ ۵۵

(۶) امین خیال۔ پنجابی ماہیا۔ مطبوعہ گلبن دو ماہی احمد آباد ماہیا نمبر ۱۹۹۸ صفحہ ۲۹

(۷) بحوالہ ایضاً صفحہ ۳۳

(۸) ایضاً صفحہ ۳۲

(۹) ایضاً صفحہ ۳۳

(۱۰) حیدر قریشی۔ اردو میں ماہیا نگاری۔ صفحہ نمبر ۹

اردو میں ماہیا نگاری کی ابتدا

اردو میں فن ماہیا نگاری پنجاب کی دین ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ ایک ۱۶۔۱۷ سال کے نوجوان شاعر ہمت رائے شرما نے پنجابی ماہیے کے مزاج اور وزن پر سہ مصرعی شاعری کی تخلیق کی جو کہ اردو ماہیا کہلائی جس کی روایت ۱۹۳۶ء میں بننے والی فلم خاموشی سے ملتی ہے۔

فلم خاموشی کے ماہیے:

(۱) ایک بار تو مل ساجن
آ کر دیکھ ذرا
ٹوٹا ہوا دل ساجن

(۲) سہمی ہوئی آہوں نے

سب کچھ کہہ ڈالا
خاموش نگاہوں نے

(۳) کچھ کھو کر پائیں ہم
دور کہیں جا کر
ایک دنیا بسائیں ہم

(۴) یہ طرزِ بیاں سمجھو
کیف میں ڈوبی ہوئی
آنکھوں کی زباں سمجھو

اس طرح ماہیا نگاری میں اولیت کا سہرا مشہور فلم آرٹ ڈائرکٹر، کہانی نویس اور نغمہ نگار ہمت رائے شرما جی کے سر بندھتا ہے۔

اس بات کی تصدیق جناب ہمت رائے شرما جی کے خط جو انہوں نے حیدر قریشی صاحب کے نام قلم بند کیا تھا سے ہوتی ہے۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کے خط میں ہمت رائے شرما جی کی تحریر اس طرح سے ہے۔

''آج سے ساٹھ باسٹھ سال پرانی فلم ''خاموشی کی Booklet جو پرانے گودام کے ایک اسٹور سے پھٹی پرانی حالت میں مل گئی ہے۔ یہ اُسی رنگدار سرورق کی فوٹو کاپی ہے۔ اس میں وہ سب کچھ درج ہے جس کی تلاش تھی۔ یہ فوٹو کاپی بے حد اہم اور نایاب ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے بہت محنت کرنا پڑی۔ کافی رقم خرچ ہوئی کیونکہ اسے حاصل کرنے کے لیے ایک خاص آدمی کو کلکتہ بھیجنا پڑا۔''ف۱

آگے حیدر قریشی صاحب Booklet کے سرورق کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''سرورق پر ہیروئین رمولا کی تصویر ہے۔ دائیں طرف انگریزی میں، درمیان میں ہندی میں اور نیچے اردو میں فلم کا نام ''خاموشی'' لکھا ہوا ہے۔ آخر میں صرف انگریزی میں ڈائرکٹر آر۔ سی۔ تلوار کا نام لکھا ہے۔ سرورق کے اوپر کی طرف فلم کے پروڈیوسر، ڈائرکٹر، کاسٹ اور اہم ٹیکنیشیز وغیرہ کے نام درج ہیں۔ یہ سارے نام انگریزی میں درج ہیں۔ پروڈیوسر ایل۔ آر۔ پراشر ہیں۔ (ایل۔ آر= لاہوری رام)''پروڈیوسر انڈر دی بینر آف تلوار پروڈکشنز (انڈر نیو مینیجمنٹ) مئی ۱۹۳۶ء'' درج ہے۔ انگریزی کے اصل الفاظ ہی یہاں درج کر دیتا ہوں۔

Producer under the banner of
TALWAR PRODUCTIONS
(Under new management) May1936

ف۲

فلم خاموشی کی بک لیٹ پر ۱۹۳۶ درج ہونے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اردو میں ماہیا نگاری کی ابتداء فلم خاموشی ۱۹۳۶ء کے ذریعے ہمت رائے شرما جی کے نوک قلم سے ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ شرما جی کا اپنا بیان ہے کہ ''میں نے پہلی بار اردو ماہیے پر فلم ''خاموشی'' میں گانا لکھا۔ اس وقت میری عمر کوئی سولہ سترہ برس کی ہوگی۔''ف۳

فلم خاموشی کی بک لیٹ پر مئی ۱۹۳۶ کے اندراج سے ہمت رائے شرما جی کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ شرما جی کی تاریخ پیدائش ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ ہے۔ ف۴

لہٰذا ۲۳ نومبر ۱۹۳۵ کو ان کی عمر ۱۶ برس اور مئی ۱۹۳۶ کو ساڑھے سولہ برس کی ہوتی ہے۔ اس طرح سے ان کی عمر کا ۱۶واں، ۱۷واں سال ۱۹۳۶ کا ہوتا ہے۔ خاموشی کی بک لیٹ اور شرما جی کا بیان تاریخ پیدائش کی روشنی میں اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شرما جی نے فلم خاموشی کے لئے اردو ماہیے ۱۹۳۶ میں لکھے جو اردو ماہیا نگاری کا پہلا تجربہ تھا اور یہیں سے اردو میں ماہیا نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں عام روایت یہ بھی ہے کہ مولانا چراغ حسن حسرت نے اردو میں ماہیا نگاری کا تجربہ فلم باغبان ۱۹۳۷ میں کیا اور تین مصرعوں پر مشتمل ماہیا نما گیت لکھا۔

فلم باغبان:

(۱) راوی کا کنارہ ہو
ہر موج کے ہونٹوں پر
افسانہ ہمارا ہو

(۲) باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

(۳) ساون کا مہینہ ہے
ساجن سے جدا ہو کر
جینا کوئی جینا ہے

(۴) دل میں ہیں تمنائیں
ڈر ہے کہ کہیں ہم تم
بدنام نہ ہو جائیں

(۵) یہ رقص ستاروں کا

افسانہ کبھی سن لو
تقدیر کے ماروں کا

(۲) اب اور نہ تڑپاؤ
یا ہم کو بلا بھیجو
یا آپ چلے آؤ

ڈاکٹر بشیر سیفی لکھتے ہیں:

''اردو میں ماہیا کو تخلیقی سطح پر اپنانے والوں میں چراغ حسن حسرتؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ حسرت کے ماہیوں پر ماہیے کے بجائے ایک گیت کا عنوان چسپاں ہے۔'' **ف۵**

اسکے علاوہ پروفیسر آل احمد سرور نے حسرت کے ثلاثی قسم کے گیت کو نظم قرار دیا ہے۔

''یہ دراصل حسرت کی ایک نظم ہے پوری نظم حمید نسیم نے اپنی خود نوشت 'ناممکن کی جستجو' میں درج کی ہے۔'' **ف۶**

حیدر قریشی صاحب اپنی کتاب ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' میں رقم طراز ہیں۔

''خود حسرت اسے 'ایک گیت' لکھتے ہیں۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی بھی اسے گیت قرار دیتے ہیں۔۔۔تو پھر خود اصل شاعر کی بات مان کر اسے صرف ایک فلمی گیت ہی کیوں نہیں مان لیا جائے؟'' **ف۷**

ماہیا چونکہ ایک غنائی صنفِ شاعری ہے۔مخصوص دھن اور لے اسکی پہچان ہے۔لہٰذا اس کی شکل میں تینوں مصرعے برابر نہیں ہوتے۔بلکہ پہلا اور تیسرا مصرعہ برابر ہوتا ہے۔دوسرا مصرعہ ایک سبب کم ہوتا ہے۔لیکن حسرت صاحب ماہیے کے وزن کی نزاکت کا خیال نہیں رکھ سکے جو کہ ماہیا کا وصفِ خاص ہے۔اس طرح سے انہوں نے ثلاثی نما کسی گیت کی تخلیق کی ہے۔

ہمت رائے شرما اور چراغ حسن حسرت کے بعد وقفہ وقفہ سے اردو ماہیے کے ملے جلے اور غیر مؤثر تجربات اردو میں دکھائی دیتے ہیں جو بشیر منذر، عبدالمجید بھٹی، منیر عشرت، ثاقب زیروی اور اختر شیرانی کے تین مصرعوں پر مشتمل مساوی الوزن ماہیے ہیں۔جن کی مثالیں درج ذیل ہیں:

بشیر منذر (۱۹۵۲ء):

گھنگھور گھٹا چھائی
پھر جام چھلک اٹھے
ماحول کو نیند آئی
اک جام پلا جاؤ

لمحات بلاتے ہیں
مدہوش بنا جاؤ

(ماہنامہ: ماہِ نو کراچی۔جون ۱۹۵۲ص ۳۵)

عبدالمجید بھٹی (۱۹۵۴ء):

یہ درد یہ تنہائی
ان چاندنی راتوں میں
تم آئے نہ نیند آئی
سمٹی ہوئی چاہیں ہیں
پھیلی ہوئی راہوں پر
مایوس نگاہیں ہیں

(ماہنامہ: ماہِ نو کراچی ۱۹۵۴ء ص ۳۴)

ثاقب زیروی کے مجموعہ کلام 'شہاب ثاقب' سے ماخوذ:

وہ سامنے آ بیٹھے
بولیں یا انہیں دیکھیں
ہم ہوش گنوا بیٹھے

(ناشر: دی پاکستان کوآپریٹو بک سوسائٹی لمیٹیڈ، چٹاگانگ، کراچی۔ص ۱۳۶)

اختر شیرانی:

کیا روگ لگا بیٹھے
دل ہم کو لٹا بیٹھا
ہم دل کو لٹا بیٹھے
مٹ جائے یہ سینے سے
اس عشق میں جینے سے
ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
دم عشق کا بھرتے ہیں
ہم یاد انھیں کرتے ہیں
وہ ہم کو بھلا بیٹھے ہیں

لکھا تھا یہ قسمت میں
آخر کو محبت میں
ہم جان گنوا بیٹھے

(کلیاتِ اختر شیرانی۔مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسنی، ندیم بک ہاؤس، لاہور ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۹)

مذکورہ بالا تمام ماہیے ہم وزن مصرعوں کے ماہیے ہیں جو کہ اس وقت کی تخلیقات ہیں جب اردو زبان میں ماہیے نہیں لکھے جاتے تھے۔لہٰذا یہ ان شعرائے کرام کی ماہیے سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

علاوہ ازیں موجودہ دور میں ماہیے کی ابتداً علی محمد فرشی کے مساوی الوزن ماہیے سے ہوتی ہے۔ جو کہ ۱۹۸۵ء میں منظرِ عام پر آئے۔

علی محمد فرشی:

دونین ہیں چھاگل سے　　ایک پیڑ ہے گاؤں میں
کچھ اور نہ تم پوچھو　　بس دھوپ وہ نکلی تھی
ہم لوگ ہیں پاگل سے　　ہم جل گئے چھاؤں میں

(ماہنامہ ''اوراق'' لاہور۔نومبر دسمبر ۱۹۸۴ء۔ص ۱۷)

علی محمد فرشی کے ماہیوں کے متعلق حیدر قریشی صاحب فرماتے ہیں:

''۱۹۸۳ء میں علی محمد فرشی کے تین ہم وزن مصرعوں کے ثلاثی ''ماہیے'' کے طور پر چھپے۔علی محمد فرشی کے چند ماہیے۔ پاکستان ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ کئے گئے تھے ان کی گائیکی سن ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ماہیے کی اصل لے میں نہ آنے کے باعث انہیں گانے والا بھی مشکل میں ہے اور گائیکی کا انداز بھی پنجابی کی کسی دھن سے میل نہیں کھا رہا ہے۔علی محمد فرشی حقیقتاً تین ہم وزن مصرعوں کے ہائیکو لکھنے کے بعد تین ہم وزن مصرعوں کے ماہیے لکھنے لگے تھے۔تحریری صورت میں اردو میں ہائیکو کا تجربہ ویسے بھی ہلکا پھلکا سا تھا۔ایسے میں ماہیے کے مزاج سے قریب ثلاثی سامنے آئے تو قارئین ادب نے انہیں پسند کیا۔'' ف ۸

علی محمد فرشی کی پیروی میں نصیر احمد ناصر، سیدہ حنا، دیپک قمر، وصی محمد وصی وغیرہ نے بھی تین مساوی الوزن مصرعوں میں ماہیے لکھے۔علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر اور سیدہ حنا کے کچھ ثلاثی یہاں پیش ہیں۔ جو انہوں نے ماہیے کے عنوان سے چھپوائے ہیں۔

علی محمد فرشی:

جو فرق تھا زر کا تھا
تعبیر محل کی وہ

میں خواب کھنڈر کا تھا

ہاتھوں کی لکیروں میں
اک نام سلگتا ہے
بے آب جزیروں میں

کیچڑ میں کنول دیکھا
بے آسرا بچے کو
روتے ہوئے کل دیکھا

دیمک لگی الماری
اب اس میں رکھا کیا ہے
بیمار ہے بے چاری

نصیر احمد ناصر:

اک فاختہ بیٹھی ہے
پنکھ اس نے سمیٹے ہیں
لگتا ہے کہ زخمی ہے

سیّدہ حنا:

چاندی کی کٹوری ہے
بیوی میرے بھائی کی
کہتے ہیں چٹوری ہے

ان شاعروں سے یہ سہو، لاشعوری طور پر اور ماہیے کے دوسرے مصرعہ کے نازک فرق کو سمجھ نہ پانے کی وجہ سے ہوا۔سیدہ حنا کی ماہیا نگاری سے متاثر ہو کر بھارت کے دیپک قمر نے اپنی ماہیا نگاری کا آغاز تین مساوی الوزن مصرعوں سے کیا۔دیپک قمر سے وصی محمد وصی متاثر ہوئے اور پھر سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔تین ہم وزن مصرعوں کی ماہیا نگاری کے نتیجے میں ماہیا نگاری میں غلط اوزان کا رواج عام ہوا اور من چاہی بحریں ایجاد ہونے لگیں۔مثالیں:

علامہ شارق جمال

روشنی کا کہیں لشکر بھی نہیں
شب میرے شہر سے گذری لیکن
جاگتی صبح کا منظر بھی نہیں

راستے میں کہیں اشجار نہیں
دھوپ ہے آج بدن کی قسمت
دور تک سایہ دار نہیں

(ماہیے: از شارق جمال ناگپور۔مطبوعہ نئی شناخت کٹک، جلد: شمارہ ۲)

حسن عباس رضا:

اگرچہ اب قفس میں بھی نہیں ہوں
میں نیلے پانیوں پر کیا اڑوں گا
کہ اپنی دسترس میں بھی نہیں ہوں

میرے اندر کوئی تنہا بہت ہے
نہ جانے کیوں خوشی کی ساعتوں میں
لپٹ کر مجھ سے وہ روتا بہت ہے

(ماہیے۔از حسن عباس رضا۔مطبوعہ لاہور، شمارہ جون جولائی ۱۹۹۲ء)

سیما شکیب:

آنکھوں میں بھری ہے ریت
طوفان کے ہاتھوں سے
پامال ہوئے میرے کھیت

رنگیں اندھیرے میں
تری یاد مجھے لے لیتی ہے
بانہوں کے گھیرے میں

(ماہیے۔از سیما شکیب۔مطبوعہ سہ ماہی ارتکاز کراچی اکتوبر ۱۹۹۲ء)

فیروز مرزا:

شجر سے ٹوٹا
سکوت جیسے
ہجر سے ٹوٹا

نکال خنجر
برہنہ سر ہے

سنبھال خنجر

(ماہیے۔از فیروز مرزا۔مطبوعہ دو ماہی گلبن احمد آباد۔شمارہ جولائی اگست ۱۹۹۲ء)

اس طرح سے غلط وزن کے ماہیوں کی روش عام ہوتی چلی جا رہی تھی۔شعرائے کرام نئے نئے اوزان اور من چاہی بحریں گھڑتے چلے جا رہے تھے۔ایسے مجموعی حالات میں درست وزن کی طرف متوجہ کرنے کی اولین کاوش ممتاز عارف نے کی۔اپنے خط جو کہ ''اوراق'' شمارہ اگست ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا اس میں انہوں نے درست وزن کی طرف توجہ دلائی اور اس کی بجا طور پر نشاندہی بھی کر دی تھی۔

اردو ماہیے کی تحریک تو اسّی کی دہائی سے شروع ہو چکی تھی۔لیکن جب اگست ۱۹۹۰ء میں ممتاز عارف کا خط شائع ہوا تو حیدر قریشی صاحب نے اپنی ساری توجہ درست وزن کی طرف مبذول کی اور غور و خوض کیا جس کے نتیجے میں غیر ارادی طور پر ان سے چند درست اوزان کے ماہیے بھی تخلیق ہو گئے جو کہ ماہنامہ ''ادب لطیف'' لاہور کے شمارہ نومبر ۱۹۹۰ میں شائع ہوئے۔ان میں سے چند ایک ماہیے دیکھیے۔

سوہنی ہے نہ ہیر ہے وہ
اس کی مثال کہاں
آپ اپنی نظیر ہے وہ

آنکھوں میں ستارے ہیں
ہجر کی شب میں بھی
وہ پاس ہمارے ہیں

کچھ ہم نے ہی پی لی تھی
یا پھر سچ مچ ہی
وہ آنکھ نشیلی تھی

مل مہکی فضاؤں سے
یار نکل باہر
اندر کے خلاؤں سے (**حیدر قریشی**)

یہ تحریک اس وقت اور بھی زیادہ مضبوط اور کامیاب ثابت ہوئی۔جب حیدر قریشی نے ۱۹۹۰ء میں ماہیے اور ثلاثی کے فرق کو واضح کیا نتیجتاً دیگر شعراء کی توجہ بھی اس طرف مرکوز ہوئی۔تب تحقیق سے پتہ چلا کہ بہت پہلے ۶۰۔۱۹۵۰ء کے درمیان قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی پنجابی ماہیے کے وزن پر درست وزن کے ماہیے کہہ چکے ہیں۔قمر جلال آبادی کے ماہیے فلم ''پھاگن'' میں محمد رفیع اور آشا بھونسلے نے مل کر گائے تھے۔

قمر جلال آبادی (فلم پھاگن):

تم روٹھ کے مت جانا
مجھ سے کیا شکوہ

دیوانہ ہے دیوانہ
کیوں ہو گیا بے گانہ

تیرا میرا کیا رشتہ
یہ تو نے نہیں جانا

میں لاکھ ہوں بے گانہ
پھر یہ تڑپ کیسی

اتنا تو بتا جانا
فرصت ہو تو آ جانا

اپنے ہی ہاتھوں سے
میری دنیا مٹا جانا

ساحر لدھیانوی کے ماہیے فلم ''نیا دور'' میں محمد رفیع نے گائے تھے۔

دل لے کے دغا دیں گے
یار ہیں مطلب کے

یہ دیں گے تو کیا دیں گے
دنیا کو دکھا دیں گے

یاروں کے پسینے پر
ہم خون بہا دیں گے

ابتدأ میں اردو ماہیوں کے بنیاد گذاروں میں چراغ حسن حسرت، قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی کو تسلیم کیا جاتا تھا، بعد کی تحقیق میں **قتیل شفائی** کا نام بھی سامنے آیا جنہوں نے پاکستانی فلم حسرت کے لیے ۱۹۵۳ء میں ماہیے لکھے تھے۔ یہ ماہیے سلیم رضا اور زبیدہ خانم نے گائے تھے۔

باغوں میں بہار آئی
مہکی ہوئی رُت میں
دل لیتا ہے انگڑائی

بعد ازاں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے ایک انکشاف اور اس پر حیدر قریشی کی گہری تحقیق سے یہ بات روشن ہوئی کہ ''اردو ماہیا'' کے بانی ہمت رائے شرما ہیں۔

اخیر میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ماہیا فلم اور ریڈیو کے ذریعہ اردو ادب میں متعارف ہوا۔ جس کی ابتدأ ہمت رائے شرما کے ماہیوں سے ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اردو ماہیے کے بنیاد رکھنے والوں میں ہمت رائے شرما، قمر جلال آبادی قتیل شفائی اور ساحر لدھیانوی ہیں۔ جن سے لوک لَے کی پابندی کرنے والے اردو ماہیوں کا آغاز ہوا اور حسرتؔ کا نام اس فہرست میں شامل نہیں۔ اسکے علاوہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۹۰ء تک ماہیا نما تخلیق ہوتے رہے۔ لیکن ۱۹۹۰ء کے بعد سے آج تک اردو ماہیا شعوری اور تخلیقی طور پر منظر عام پر آ رہا ہے

بلاشبہ ماہیا رفتہ رفتہ اردو شاعری میں اپنا مقام مستحکم کر رہا ہے۔ اس وجہ سے یہ ہمیں ایک مثبت امید کا پیغام بھی دیتا ہے کہ ماہیا انڈو پاک کی تہذیب و ثقافت اور شعری روایت کا مشترک اثاثہ ہے۔

----

(۱) کتاب: اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما۔ از حیدر قریشی صفحہ نمبر ۲۳۔۲۴
(۲) ایضاً صفحہ نمبر ۲۴
(۳) ایضاً صفحہ نمبر ۲۴
(۴) ایضاً صفحہ نمبر ۲۴
(۵) مضمون بشیر سیفی۔ مطبوعہ ماہنامہ صریر کراچی۔ جون جولائی ۱۹۹۶ء
(۶) مکتوب آل احمد سرور۔ کوہسار جرنل۔ بھاگل پور۔ شمارہ دسمبر ۱۹۹۷ء
(۷) مضمون: اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما۔ از حیدر قریشی
مطبوعہ ماہنامہ انشا کلکتہ شمارہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۸ء

''جو لوگ اپنی افتادِ طبع کے باعث سنجیدہ علمی مباحث کے متحمل نہیں ہو سکتے یا جنہیں اہلِ علم کی مجالس میں بیٹھنے کا زیادہ موقعہ نہیں ملا اور جو اس شہرت پہ نازاں ہیں کہ پگڑی اچھالنا ان کا کمالِ فن ہے، وہ اگر دشنام اور دلیل میں امتیاز سے قاصر ہوں تو انہیں معذور سمجھا جا سکتا ہے۔''
(**ارشاد احمد حقانی** کے کالم **حرفِ تمنّا** میں شامل **خورشید ندیم** کے مکتوب سے اقتباس۔
مطبوعہ روزنامہ **جنگ** مورخہ ۲۴ر جنوری ۲۰۰۹ء)

مرتضیٰ اطہر (دہلی)

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں عصری حسیت کا اظہار

(''آدمی کی زندگی'' کے حوالے سے)

عہد حاضر کی شاعرات میں فہمیدہ ریاض ایک منفرد اور نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۶۷ء میں ''پتھر کی زبان'' کے نام سے شائع ہوا اور پھر اس کے بعد ''بدن دریدہ''،''دھوپ''، کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے''،ہمرکاب''اور''آدمی کی زندگی'' بالترتیب شائع ہوئے۔کلیات ''میں مٹی کی مورت ہوں'' کے نام سے پاکستان سے شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے شیخ ایاض کے سندھی کلام اور ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کے فارسی کلام کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔نثر میں بھی انہوں نے دو ناولٹ (گوداوری اور زندہ بہار)اور ایک افسانوی مجموعہ''خط رموز'' کے نام سے تخلیق کیا ہے اور جو منظر عام پر آ چکے ہیں۔

فہمیدہ ریاض کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے دور کی جدید عورت نے نہ صرف یہ کہ ایک بے حد حساس اور زندگی کی نئی معنویت سے آگاہ ذہن کی بیداریوں کا اندازہ کروایا ہے، بلکہ اس اعتماد کا اظہار بھی کیا ہے جو اس صلاحیت کے نتیجے میں اس کے اندر پیدا ہوا ہے۔ان کی شاعری میں ایک ایسی عورت مکالمہ کرتی نظر آتی ہے جو اپنے بدن کی معنویت اور اہمیت سے پوری واقفیت تو رکھتی ہی ہے تاہم ذہن اور شعور کی پختگی کا احساس بھی اس کے اندر موجود ہے۔

انکے پہلے مجموعے''پتھر کی زبان''(۱۹۶۷ء) سے لیکر''آدمی کی زندگی''(۱۹۹۹ء) تک کے شعری سفر میں فکر اور فن کی سطح پر ارتقائی عمل کارفرما نظر آتا ہے۔''پتھر کی زبان'' کی نظمیں جہاں ایک نوعمر لڑکی کے رومانی جذبات اور اس کی نفسیات کی ترجمانی کرتی ہیں وہیں''بدن دریدہ''،''دھوپ''اور''ہمرکاب'' کی نظمیں ایک لڑکی سے ایک عورت اور ایک عورت سے ایک ماں بننے میں عورت کے احساسات اور محسوسات کا آئینہ ہیں۔''آدمی کی زندگی''میں ایک ایسی عورت نظر آتی ہے جو بدلتے ہوئے عمرانی اور معاشی ماحول میں موجودہ دور کے انسان کو لاحق پیچیدہ مسائل سے پوری واقفیت رکھتی ہے اور اس کے تجربے اور مشاہدے کی وسعت اس کی فکر میں بھی گہرائی اور وسعت پیدا کرتی نظر آتی ہے۔

''آدمی کی زندگی'' میں شامل نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنسی تفریق ،فرقہ واریت ،مذہبی انتہا پسندی ،تشدد ،کرپشن وغیرہ ایسے عوامل ہیں جو پاکستانی معاشرے میں جڑ پکڑ چکے ہیں اور جن سے چھٹکارا پائے بغیر پاکستانی معاشرہ جدید عہد میں ایک متوازن ،منظّم اور ترقی یافتہ سماج نہیں بن سکتا ۔پاکستانی معاشرے کے مزاج کی بنیادی خصوصیات میں آج بھی وہی عناصر کارفرما ہیں جو کئی دہائیوں قبل تھے ۔اور سماجی ،معاشرتی ،علمی اور فکری سطح پر اگر کوئی تبدیلی آئی بھی ہے تو وہ اتنی معمولی ہے کہ بحیثیت مجموعی کوئی انقلابی تبدیلی پیدا کرنے سے بہر طور قاصر ہے۔اسی لیے عورت کا تجربہ بھی اسی پس منظر میں سامنے آ رہا ہے جو مروجہ پس منظر رہ چکا ہے۔''کوتوال بیٹھا ہے۔۲''اسی نا قابل تبدیل سماجی صورت حال کا اشاریہ ہے۔آج پاکستان میں ضیاء الحق کے دور حکومت جیسا اندھا مارشل لائی نظام نہیں ہے۔لیکن سماجی سطح پر آج بھی عورت کو انہیں تفریقات اور ناانصافیوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے جو گزشتہ کئی دہائیوں پہلے کی عورت کو درپیش تھے۔''آدمی کی زندگی''میں شامل نظم''حاشیہ''عورت کی اسی افسوسناک حالت کی ترجمانی کرتی ہے:

کبھی تم نے سوچا
کہ روز کر جب اپنی قدروں کا
اور اپنے''مشرق کی اخلاق'' کی رفعتوں کا
جہاں سے نظر تم کو آ تا رہا ہے
تمدن پر اپنے نہایت حقیر
کہ روجب رقم زوفشاں داستاں[
اپنے اعلیٰ عروجوں کے اوصاف کی
تو اک حاشیہ اس میں تاریک چھوڑو
کہ لیٹی ہوئی ہیں وہاں باحیا مشرقی عورتیں
جن کو چشم فلک نے نہ دیکھا کبھی
وہاں درج ہے ان کے جسموں پر خود انکے ہاتھوں سے
تحریر ہوتی کہانی
تسلسل سے اب تک لکھی جا رہی ہے
بہت قابل رحم ہے یہ داستاں
ہے تمہارے تمدن کا وہ حاشیہ
کہ او جھل رہا ہے سب کی نظروں سے اب تک

اب اتنا بتا دو
کہ تم اس سے نظریں چراؤ گے کب تک

جبر اور نا انصافی کے اس طویل اور مسلسل چلنے والے عمل کے سبب لا حاصلی کا احساس پیدا ہو جانا بھی فطری ہے۔''ادمی کی زندگی'' کی بعض نظموں میں لا حاصلی اور نامرادی کی کیفیت ملتی ہے۔''**بڈھی انقلابی عورت**'' کی ابتدا میں معاشرے کے تغیر پذیر نہ ہونے کا رنج اور انقلاب کی کوششوں کے کارلاحصل ثابت ہو جانے کا افسوس دکھائی دیتا ہے لیکن اس ذہنی کشمکش سے گزرنے کے بعد بڑھیا انقلاب کی راہ پر جمے رہنے کا عزم مستحکم کرتی ہے:

۔۔۔بڑھیا نے کب اس کی مانی
آسماں پر تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے
اور کہتے تھے
یہ شاید اس کی عادت ہے
یا شاید اس کی فطرت ہے (**بڈھی انقلابی عورت**۔آدمی کی زندگی)

اسی مجموعے میں شامل ایک اور نظم ''ایک زن خانہ بدوش'' ایک بنجارن کی زندگی اور اس کے مسائل کو موثر اور جذباتی انداز میں پیش کرتی ہے۔ پاکستان میں گزشتہ برسوں میں عورتوں کے 'تحفظ آبرو' کے نام پر قتل (Honour killing) کے بہت سے واقعات سامنے آئے ہیں۔اس غیر انسانی طریقہ کار پر ''نینا عزیز'' کے عنوان سے ایک بیحد موثر نظم موجود ہے۔

یہ ساری نظمیں بنیادی طور پر احتجاجی نظمیں ہی ہیں اور نا انصافی اور جبر کے خلاف مزاحمت ان کا مرکزی خیال ہے۔لیکن احتجاج اور مزاحمت کے باوجود فکر میں سنجیدگی اور لہجے میں ایک ٹھہراؤ نظر آتا ہے جو ''بدن دریدہ'' اور ''اپنا جرم ثابت ہے'' میں ناپید ہے۔جھنجھلاہٹ (Frustration) اور والہانہ پن کے بجائے سنجیدگی اور ٹھہراؤ اب انکے لہجے کی شناخت بنتے دکھائی دیتے ہیں۔

فہمیدہ کی ۱۹۸۰ء کے بعد کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موضوعات کی سطح پر قابل قدر وسعت ان کی شاعری میں آئی ہے۔اب ان کی شاعری میں انسان دوستی، امن، بھائی چارہ، مناظر فطرت، سائنسی اور میکانیکی مسائل جیسے موضوعات بھی اپنے موجودہ سیاق وسباق میں جگہ پاتے ہیں۔''ادمی کی زندگی'' کے مطالعے سے ایک ایسی عورت ظاہر ہوتی ہے جو عرفان ذات اور عرفان کائنات دونوں کی آگہی رکھتی ہے۔ان کی شاعری میں داخلی موضوعات اور خارجی موضوعات کی حد بندی نہیں، بلکہ دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم کی طرح ان کی شاعری میں گھل مل گئے ہیں۔'' آدمی کی زندگی'' کی بعض نظموں میں ناکامی، نامرادی، احساس تنہائی، اقدار کے شکست وریخت کا غم جیسے عناصر نظر آتے ہیں، تو دوسری طرف سماجی، عالمی صورت حال پر لکھے ہوئے خارجی

مضامین کی بھی کمی نہیں۔ایسے موضوعات کے بیان کے لئے وہ عام طور پر نثری نظم کے پیرائے کو اپناتی ہیں۔'' آدمی کی زندگی'' کی یہی خصوصیات اس کا رشتہ مابعد جدید شاعری کی فکری بنیادوں سے جوڑ دیتی ہیں۔

'' آدمی کی زندگی'' کی نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ایک ایسی عالمی فضا کے قیام کی خواہش موجود ہے جس میں انسانیت اور بھائی چارگی کے جذبے کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور اس میں جنگ وجدل کے بجائے امن وشانتی کا بول بالا ہو۔انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ آج کے دور میں صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں 'فتنے اور شر' کا بول بالا ہے۔مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ پرستی ایسے عوامل ہیں جو انسانیت کی راہ میں حائل ہیں اور دنیا کے حکمرانوں اور سیاست دانوں کے ذریعے اس منفی رویے کو اپنے مفاد کے حصول کی غرض سے فروغ دیا جاتا ہے۔لیکن ایسی صورت حال میں بھی ہمارے دانشور اور ادیب اپنے فرائض کو پوری طرح انجام دینے سے قاصر ہیں۔

فہمیدہ کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ جب تک شدت پسند نام نہاد مذہبی رہنما موجود ہیں وہ مذہب کے نام پر فرقہ واریت کو فروغ دیتے رہیں گے۔ پاکستان میں ہی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان باہمی تشدد اور خوں ریزی کے واقعات آئے روز سنائی دیتے ہیں۔'شیعہ اور سنی'، وہابی اور بریلوی' کے درمیان تشدد کے واقعات میں ہزاروں لوگ ہر سال جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے جس بے باکی اور اعتماد کے ساتھ کفر اور شرک کا فطویٰ جاری کرتا ہے، وہ واقعی مضحکہ خیز ہے۔اس صورت حال پر ان کی نظم '' خاکم بدہن'' ایک بے باک طنز ہے:

میں عازم میں خانہ تھی کل رات کہ دیکھا
اک کوچہ پرشور میں اصحاب طریقت
تھے دست وگریباں
خاکم بدہن، پیچ عماموں کے کھلے تھے
فتوں کی وہ بوچھاڑ کہ طبقات تھے لرزاں
دستان مبارک میں تھیں ریشان مبارک
موہائے مبارک تھے فضاؤں میں پریشاں
کہتے تھے وہ باہم کہ حریفان سیہ روح
کفار ہیں بدخو
زندیق ہیں، ملعون ہیں بنتے ہیں مسلماں!
ہاتف نے کہا رو کے کہ اے رب سماوات!

لاریب سراسر ہیں بجا دونوں کے فتوات

خلقت ہے بہت ان کے عذابوں سے پریشاں

اب ان کی ہوں اموات!

فہمیدہ ریاض نے اپنے عہد کے دوسرے جدید شعرا کی طرح سائنسی، میکانکی دور کے مسائل اور انسان کے کرب اور تنہائی کے احساس کو بھی اپنی نظموں میں قلم بند کیا ہے۔ ادب میں داخلی اور خارجی موضوعات کی حد بندی کا رجحان عام ہے۔ لیکن فہمیدہ اس رویے کو قبول نہیں کرتی ہیں۔ ان کے مطابق:

''اندرونِ ذات خود خارج کا ڈھالا ہوا پیکر ہوتا ہے۔''[۱]

(فہمیدہ ریاض، دیباچہ، **دھوپ**، مشمولہ ''میں مٹی کی مورت ہوں''، ص ۲۱۸)

یہی وجہ ہے کہ انسان کے ذاتی تجربات اور احساسات کا رشتہ بھی کہیں نہ کہیں اس کے اطراف کے حالات اور ماحول سے جڑا ہوتا ہے۔ ہجر اور تنہائی کے آنسوؤں کا دھارا اندرونِ ذات سے نہیں بلکہ ذات کے چاروں طرف بکھرے ہوئے سنگین حالات سے پھوٹتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ فہمیدہ کی شاعری میں خارجی اور داخلی موضوعات یکساں طور پر موجود ہیں۔ یعنی ان کی شاعری ایک ہی وقت میں ترقی پسند بھی ہے اور جدید بھی۔

ہمارے عہد کے شعرا نے جن موضوعات کو شعری اظہار میں شامل کیا ہے ان میں سائنسی اور میکانیکی ایجادات کے ذریعے پیدا ہونے والے نئے مسائل اہم موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے سبب پورے انسانی وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے انسان کے اسی کرب کو محسوس کیا اور انسانی رشتوں اور کاروباری زندگی کے درمیان تقابل کر کے جدید زندگی میں نئے رشتوں کی تلاش شروع کی۔ آج کے اس صنعتی دور میں معیشت اور سیاست کے ساتھ ساتھ انسان کی زندگی بھی بازار پر مبنی ہو کر رہ گئی ہے۔ دولت کی ہوڑ نے انسان کو حد درجہ خود مرکوز (Self Centred) اور انفرادیت پسند (Individualistic) بنا دیا ہے۔ ایسے ماحول میں شاعر کا حساس دل اپنے ہی شہر میں خود کو اجنبی پا کر افسردہ ہو جاتا ہے۔ وہ بھیڑ میں کھڑا ہو کر بھی خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے:

اس شہر میں اجنبی یوں تو نہ تھی میرے خدا

اس کی زمیں، اس کے فلک، اس کی ہوا کو کیا ہوا

پہچان میں آتا نہیں، پہچان بھی پاتا نہیں مجھ کو کوئی

بدلا ہوا سارا سماں

ہے روشنی اتنی مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں

شاعر پریشان ہو کر خود سے سوال کرتا ہے کہ 'کیوں مٹ گئے سارے نشاں؟' اور پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ:

اب تو فقط ہر موڑ پر ہر گام پر

بازار ہے، بازار ہے، بازار ہے

بازار کے اندر مگر فرصت کسے دیکھے ادھر

ساگر کے تٹ تک چھا گیا، سانسوں کی حد آ گیا

جو ہر طرف بازار ہے

بازار ہے، بازار ہے (''**اس شہر میں**''۔ آدمی کی زندگی)

ہمارے عہد میں جس طرح رشتے ٹوٹ رہے ہیں اور انسانیت کے اقدار ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہے ہیں، وہ ایک حساس ذی شعور شخص کے لئے فکر کا موضوع ہے:

جس سمت نظر اٹھا کے دیکھیں

پامال زمیں پر پڑے ہیں

قدروں کے ایاغ ریزہ ریزہ

انسان کے خواب ریزہ ریزہ

ہر کاخ و مکاں سے ہویدا

لیکن فہمیدہ کو یہ یقین بھی ہے کہ ایسی صورت حال ہمیشہ نہیں رہے گی۔ انسان رشتوں اور قدروں کی اہمیت کو سمجھے گا اور پھر ان کی طرف رجوع کرے گا:

اقدار ہیں شرط آدمیت

انسان دیکھے گا خواب اک دن

بچھڑا دل تجھ سے آ ملے گا

جیسے لپکا گھٹا میں کوندا

جیسے برسی گھٹا گرج کر

بارش میں سوچتا ہے شاعر (''**بارش میں**'' آدمی کی زندگی)

جس کو کبھی چکھا نہیں اس کا مزہ ہی اور ہے

آپ بہشت مانگئے، میری دعا ہی اور ہے

(شہزاد احمد)

آصف علی محمد (ماریشس)

اقبال اور ماریشس

(**نوٹ**: مضمون نگار آصف علی محمد ماریشس میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور اسی ماحول میں انگریزی اور فرانسیسی سرکاری زبانوں کے ہوتے ہوئے اردو لکھنا پڑھنا سیکھی۔اس لحاظ سے اردو سے ان کی وابستگی کی نوعیت اردو کی ان نام نہاد بستیوں کے عام لکھنے والوں سے مختلف ہو جاتی ہے جو پاکستان یا انڈیا کے ماحول میں پل بڑھ کر وہاں سے مغربی دنیا میں آتے ہیں اور ایک عمر کے بعد یہاں شاعر اور ادیب بن بیٹھتے ہیں۔مضمون نگار کے اسی اختصاص کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کا یہ مختصر سا اور ابتدائی نوعیت کا مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔اردو کا ایسا پس منظر رکھنے والوں کی تحریروں کی حوصلہ افزائی وقتاً فوقتاً کی جاتی رہے گی۔**مدیر جدید ادب**)

یہ مضمون نہایت ہی جامعیت اور اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے اور میں آپ تمام اہلِ دانش کی توجہ اپنے موضوع کی طرف مبذول کرنا چاہوں گا کہ میرے مضمون کا عنوان ہے ''اقبال اور ماریشس''۔اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اقبالؔ محض جنوبی ایشیائی بیداری کا شاعر نہیں ہے۔توقع ہے کہ یہ مختصر ترین مضمون حاضرینِ محفل کی وسیع ترین ذخیرہ معلومات میں تھوڑا سا اضافہ کرے گا۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے وہی آب و گِلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اقبالؔ ایشیائی بیداری کا شاعر ہے لیکن یہ واضح رہے کہ شاعرِ موصوف کے کلام کی صدائے بازگشت ہند و پاک سے نکل کے بلادِ اسلام سے بھی آگے گزر کر دنیا کے ہر گوشے میں سنائی جا سکتی ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ماریشس میں بھی اقبالؔ کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں گو کہ اقبالؔ عموماً نظم کا شاعر ہے۔

یہ مسلّمہ امر ہے کہ (انیس سو اڑسٹھ) ۱۹۶۸ء سے پہلے یعنی ماریشس میں قبلِ آزادی کا اگر تاریخی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے اپنے دین و مذہب کے تحفّظ کی خاطر ان دستاویزوں سے اپنے بچّوں کو پڑھایا جو ان کے اسلاف انہیں بطور توشۂ عقبیٰ دے گئے۔ جو سب سے حیرت انگیز امر ہے وہ یہ کہ ان میں اقبالؔ کی چند نظمیں اور اشعار بھی شامل تھے جو اسی عہد میں ماریشس میں زبان زدِ خلائق ہو چکے تھے۔بچّوں کو باقاعدہ اقبالؔ کی مشہور نظم 'لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری' سکھائی جاتی تھی اور مساجد کے ائمہ و خطیب جستہ جستہ

اپنی تقریروں کو اقبالؔ کے اشعار سے ہم آمیز کر کے بیداری کا پیغام دیتے تھے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

علاوہ ازیں یہ متفرق اشعار بھی اکثر و بیشتر مسلم اہلِ مذہب کی تقریروں میں گوش گزار کرنے کا موقع ملتا ہے ؎ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

روزِ حساب جب میرا پیش ہو دفترِ عمل آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال تری اذاں میں نہیں ہے میری سحر کا پیام

اس سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اقبالؔ کی شاعری برِّ صغیر ہند و پاک کی تمام حدود سے نکل کر اس جہانِ دراز کے دیگر اقلیموں اور کِشوَروں میں سرایت کر گئی۔یعنی اقبالؔ کا کلام اہلِ ہند و پاک ہی کو نہیں بلکہ تمام اہلِ عالم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے بانگِ درا بلکہ صدائے جرس کا کام کرتا ہے اور مردِ مومن سے فریاد کرتا رہتا ہے کہ ؎ از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز !

یہ حقیقت بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اقبالؔ کی شناخت ماریشس میں صرف اسلام یا مذہب تک محدود نہیں ہے بلکہ تعلیمی سطح پر بھی اقبالؔ کی بڑی قدر و منزلت ہے اور ابتدائی و ثانوی اسکول کی سطح کے علاوہ کلامِ اقبالؔ کی درس و تدریس دانش گاہی سطح پر ہوتی ہے اور ان کی منتخب نظمیں تعلیمی نصاب میں شامل ہیں مثلاً جبرئیل و ابلیس، ایک آرزو، مسجدِ قرطبہ وغیرہ وغیرہ۔

نیز یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ماریشس میں باقاعدہ ۱۹۹۹ء میں اقبالؔ پر عالمی کانفرنس منعقد کی گئی تھی جس میں کئی حضراتِ محترم و مشاہیر تشریف فرما تھے۔یہ استدلالی امر ہے کہ اقبالؔ کا پیغامِ بیداری صرف ایشیاء تک محدود نہیں بلکہ اقبالؔ کی اساسِ فکر کی کارفرمائی پوری انسانیت پر محیط ہے۔اقبالؔ صرف ایشیائی بیداری کا شاعر نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کا شاعر ہے جو زندگی کو 'جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں' قرار دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مردِ مومن کو اپنی چشمِ دل وا رکھنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ سینہ کائنات کے اَسرارِ نہاں فاش ہو جائیں اور تقدیرِ عالم بے حجاب ہو جائے۔ بے شک اقبالؔ پر بہت سے تحقیقی و تنقیدی کام ہوئے ہیں لیکن میری یہ رائے ہے کہ کلامِ اقبالؔ کے نئے باب تا ابد کھلتے رہیں گے اور اس کا پیغامِ بیداری تمام روئے زمین کے لوگوں کے ہوش و خرد ہی نہیں بلکہ قلب و نظر بھی بیدار کرے گا ؎

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

مدیر جدید ادب کے نام خط

اور تبصرہ بعنوان ''جدید ادب اور حیدر قریشی''

برادرم حیدر قریشی صاحب سلام مسنون

جدید ادب ۱۲ جو جنوری ۲۰۰۹ء تا جون ۲۰۰۹ء کی اشاعت ہے، مل گیا ہے۔اس دفعہ آپ نے وقت سے پہلے پرچہ چھاپنے کی مثال قائم کر دی۔ میں منتظر تھا کہ عمران شاہد بھنڈر سے ایک بار پھر ملاقات ہوگی اور بہت سارے دروں پردہ اسرار منکشف ہوں گے لیکن اس دفعہ انہیں غیر حاضر پا کر مایوسی ہوئی۔شاید وہ اپنے تحقیقی کام میں زیادہ مصروف ہو گئے ہیں اور آپ کے اپنے مضمون کی اگلی قسط ارسال نہیں کر سکے۔

شمارہ ۱۲ میں ''ادبی کائنات میں رنگ۔۔۔'' اور ''چند پرانی ونئی یادیں'' نے بڑا مزہ دیا۔حیرت ہوئی کہ آپ نے اپنی ادبی زندگی میں خواتین کی اتنی بڑی تعداد سے پاک اور مصفّٰی روابط قائم کیے۔اور عزت واحترام کی فضا میں تعلقات کو آگے بڑھایا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ ہمارے ہاں ہوس پرست مدیران بھی موجود ہیں جو خاتون کے چہرے کی بجائے پہلے آزار بند پر نظر ڈالتے ہیں، پھر کئی کہانیاں گردش میں آجاتی ہیں۔ بالخصوص ان خواتین کی کہانیاں جو خود نہیں لکھتیں، مردوں سے لکھواتی اور ان سے زیادہ شہرت سمیٹتی ہیں۔آپ کے مضمون میں چند اشارے بڑے معنی خیز ہیں لیکن اس وبا کو کیسے روکا جائے جب ادبائے کرام اخلاقیات کا اچھا معیار خود بھی پیش نہیں کرتے۔آپ نے سُنا کہ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات معقول معاوضے پر لکھے جا رہے ہیں۔جب سے پی ایچ ڈی اسکالر کو پانچ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ منظور ہوا ہے، اس ادبی کام میں سرمایہ کاری کا رجحان در آیا ہے۔

نصرت ظہیر صاحب نے ''اردو کا تہذیبی پُل اور ماس میڈیا'' کے عنوان سے خیال انگیز مقالہ لکھا ہے۔ان کے مندرجات اور موقف سے اختلاف ممکن نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندو پاک دونوں ملکوں میں اردو غریب الدیار ہے اور سرفرازی انگریزی کو حاصل ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں جو رابطے کی زبان مستعمل ہے وہ اردو ہی ہے جس کا بھارتی نام ہندی ہے۔اب ہندوستانی فلمیں پاکستان میں بھی چلنے لگی ہیں۔ایک فلم مجھے بھی دیکھنے کا

اتفاق ہوا۔حیرت ہوئی مکالموں میں بولی جانے والی ہندی، سنسکرت آمیز محسوس نہ ہوئی اور ہندی اور اردو میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔لیکن اردو اور ہندی کے معاملے میں سیاستدانوں نے جس نفرت کو ابھارا ہوا ہے وہ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔تاہم میرا خیال ہے کہ ادبی رسائل جو اردو رسم الخط میں چھپتے ہیں ایک پُل کا کام ضرور دے رہے ہیں۔نصرت ظہیر نے کھل کر بحث کی ہے تاہم مفاد پرستی کے کم ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔اور ممبئی دھماکوں کے بعد تو دونوں ملک پھر جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔خلقِ خدا سہمی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر شہناز نبی کے دونوں مقالے ''میر تقی میر۔۔شاعرِ آہ'' اور ''اکبرالہٰ آبادی اور تعلیمِ نسواں'' میں نے دلچسپی سے پڑھے۔دونوں شاعروں نے اپنا اظہار ایک خاص ماحول میں کیا۔ان کا مطالعہ اسی ماحول کی مطابقت سے ہونا چاہیے۔اور یہ بات شاید محلِ نظر ٹھہرے کہ اکبرالہٰ آبادی نے ''اودھ پنچ'' کو اپنی شہرت کا وسیلہ بنایا تھا اور مغربی تہذیب اور سرسید کی مخالفت کی تھی۔ایک جیسے سماجی حالات سے دو مختلف المزاج دانشوروں کا مختلف نتائج اخذ کرنا بعید از قیاس نہیں۔محمد خالد انجم عثمانی کا مقالہ ''انیسویں صدی کے نثری اسالیب'' کچھ اور وسعت کا تقاضا کرتا ہے۔میرا خیال ہے کہ اس مقالے میں نثری اسالیب کی دھوپ چھاؤں کا پورا منظر مرتب نہیں ہوتا۔دلچسپ بات یہ ہے سرسید احمد خان نے نثر کے جس سائنسی اسلوب کو پروان چڑھایا تھا اس کے خلاف ردِ عمل بھی علی گڑھ سے ہی رونما ہوا اور ایک خاص نوعیت کی رومانوی نثر کو قبولِ عام حاصل ہوا۔جس کی صورت پاکستان میں علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ادیبوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔مثال: ''سفر نصیب''۔''دردِلکشا''۔''آبِ گم''۔

مظفر حنفی صاحب کا مصاحبہ بے حد دلچسپ ہے۔انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی کی فضا کی خرابی کا تذکرہ کیا ہے۔انہیں شاید یہ علم نہیں کہ اب یہ خرابی پورے برِصغیر میں پھیل گئی ہے۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی نے ان کا ''قلمی چہرہ'' پھول کے قلم سے لکھا ہے۔ان کی کتاب ''طلسمِ حروف'' پر انور سدید کا تبصرہ پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی۔خدا جانے میں نے یہ تبصرہ کب لکھا تھا؟ مطبوعہ تبصروں کے ساتھ حوالہ درج ہونا چاہیے تھا۔مجھے اب یاد پڑتا ہے کہ یہ تبصرہ ''اوراق'' میں چھپا تھا۔مظفر حنفی صاحب نے اسے خوب سنبھال کر رکھا۔

نظم کے حصے میں نیّر جہاں کی نظم ''پیپل سے میپل تک''۔۔۔خاور اعجاز کی ''خدشہ''۔۔حمیدہ معین رضوی کی ''وفائے رائیگاں''۔۔احمد منظور کی ''گلاب خواہش''۔۔ستی پال آنند کی چاروں نظموں میں تخلیق کاروں کے باطن کی سچی آواز میری جانب سفر کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں ان دنوں دائیں ران میں ''شیایٹکا درد'' میں مبتلا ہوں۔جدید ادب کے مطالعے میں ایسا کھویا کہ درد کا احساس ختم ہو گیا۔جدید ادب کا یہ پازیٹو پوائنٹ ہے۔اس پرچے پر تبصرہ ''نوائے وقت'' کو بھیج رہا ہوں۔چھپنے پر تراشہ آپ کو ارسال خدمت کروں گا۔

والسلام

مخلص

انور سدید ۱۵ر دسمبر ۲۰۰۸ء

انور سدید صاحب کا موعودہ تراشہ

جدید ادب اور حیدر قریشی

حیدر قریشی کو اردو ادب کی ترویج کا شوق اس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ خانپور کی ایک فیکٹری میں محنت مزدوری کرتے تھے۔غزل کہتے تھے، افسانہ لکھتے تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا سے شناسائی ہوئی تو ان کے باطن سے انشائیے کے شگوفے بھی پھوٹنے لگے۔لیکن ادب کا یہ عمل ان کی ذات تک محدود تھا۔اردو ادب کی خدمت کے لئے وہ اپنے عمل کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ انھوں نے خانپور جیسے دور افتادہ مقام سے رسالہ **جدید ادب** جاری کیا۔فیکٹری سے محنت مشقت سے حاصل کیا ہوا رزقِ حلال اس پرچے کی طباعت اور اشاعت پر خرچ کر ڈالتے۔تھوڑے عرصہ میں جدید ادب اتنا معیاری پرچہ بن گیا کہ اس دور کے پاک و ہند کے بیشتر اہم ادیب اپنی اعلیٰ تخلیقات **جدید ادب** کو اشاعت کے لئے بھیجنے لگے۔متعدد نئے لکھنے والوں کو حیدر قریشی نے اعتماد اشاعت عطا کیا۔اور آج وہ اردو ادب کی کہکشاں کے روشن ستارے بن گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ اردو کے ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال دہلی سے کراچی آئے۔تو وہ حیدر قریشی کو دیکھنے کے لئے سرگودھا جاتے ہوئے خان پور کے اسٹیشن پر رُکے۔حیدر قریشی کو اپنے ساتھ ریل گاڑی میں بٹھایا اور ادب کے جملہ امور پر ان سے سیر حاصل بحث کی۔دہلی واپس جا کر رپورتاژ لکھا تو خان پور سے بہاول پور تک کے سفر اور حیدر قریشی کی ملاقات کو جوگندر پال نے یادگار قرار دیا۔اور ملال کیا کہ ان کے پاس خانپور کا ویزہ نہیں تھا۔اس لئے وہ خانپور میں دفتر **جدید ادب** میں قیام نہ کر سکے۔حیدر قریشی نے ریل کے ڈبے میں جوگندر پال سے اپنی باتوں کو انٹرویو کی صورت دی اور **جدید ادب** میں شائع کیں۔یہ چند باتیں مجھے اس لئے یاد آگئیں کہ چند روز پہلے میرے دوست سرفراز بھٹی جو دنیاداری کے بے شمار جھمیلے برداشت کرنے کے بعد اب سالک راہِ حق بن چکے ہیں 'جدید ادب' کا ایک پرانا شمارہ لے آئے جس میں ڈاکٹر وزیر آغا، اصغر مہدی، اظہر جاوید، عذرا اصغر، غلام جیلانی اصغر، اور متعدد ادیبوں کے خاکے تھے۔کہنے لگے جدید ادب کا یہ خاکہ نمبر آپ کی لائبریری میں محفوظ ہونا چاہیئے۔میری لائن اب بدل گئی ہے۔اسی روز مجھے دہلی سے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے مدارالمہام مصطفیٰ کمال پاشا نے جدید ادب کا بارھواں شمارہ بھیجا تھا۔ایک ہی روز حیدر قریشی اور جدید ادب سے دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔تو گویا دبستان کھل گیا اور میں نے اس دن کا باقی ماندہ حصہ ان دو شخصیات (حیدر قریشی اور جدید ادب) کے ساتھ گذارا۔

اب یہ بتانا بھی ضروری ہے۔کہ حیدر قریشی نے اردو ادب کے فروغ کا جو نصب العین خانپور میں اختیار کیا تھا وہ جرمنی میں منتقلی کے بعد بھی قائم رکھا اور جدید ادب جاری کیا جس کے بارہ ششماہی ضخیم شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ جرمنی میں اردو طباعت کے لئے سہولت دستیاب نہیں ہے، اس لئے یہ پہلے لاہور سے چھپتا تھا۔لیکن جب ہماری ''عوام بیزار'' حکومت نے کتابوں اور رسائل کی ترسیل ڈاک میں ہزار گنا اضافہ کر دیا تو حیدر قریشی نے **جدید ادب** کی طباعت کا انتظام دہلی سے کیا۔لیکن اس کی اشاعت جرمنی سے ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ رسالہ **جدید ادب** کو جرمنی سے اردو ادب کی ایک مضبوط ترین آواز قرار دیا جاتا ہے تو یہ بالکل درست ہے۔ یہ پرچہ بالعموم تین چار سو صفحات پر مشتمل ہوتا ہے مشینی کتابت کا قلم باریک ہے اس لئے اس میں پانچ چھ سو صفحات کا مواد سما جاتا ہے۔مضامین نظم و نثر اتنے پر مغز ہوتے ہیں۔کہ چھ ماہ کے بعد اگلے پرچے کے آنے تک زیر مطالعہ رہتے ہیں ردِ عمل کو ہی نہیں نئی تخلیق کاری کو بھی مہمیز کرتے ہیں۔

حیدر قریشی نے شمارہ:۱۲ کے اداریے میں ادب کی اس افسوسناک صورت حال کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ''خود ادب سے وابستہ افراد کو مجموعی ادبی صورتحال سے دلچسپی نہیں رہی۔۔ لکھنے والے اپنی اور اپنے دوستوں کی تخلیقات کے مطالعہ کے بعد عام طور پر رسالہ بند کر کے رکھ دیتے ہیں۔ادبی مسائل پر مکالمہ کم ہوتا ہے۔ بہت کم ادیبوں نے ذاتی مفادات سے بالاتر اور بے خوف ہو کر ادبی مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے۔حیدر قریشی کو تشویش ہے کہ اب فرقہ پرستی کا زہر بھی ادبی رویوں میں سرایت کرنے لگا ہے۔ان کا تقاضا ہے کہ ''مختلف تشویشناک مسائل کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اختلاف رائے کو رسمی طور پر نہیں بلکہ کھلے دل سے برداشت کرنے کا ظرف پیدا کرنا ہوگا۔ادب میں فرقہ پرستی، بڑی سطح کے علمی سرقوں اور دوسرے منفی رویوں کا سنجیدگی سے نوٹس لینے کے ساتھ عمدہ تخلیقی ادب کی تحسین کے رویے کو کسی نظریاتی اختلاف کے بغیر خالص ادبی بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا۔ایسا نہ ہوا تو اردو ادب عالمی سطح پر تو کیا مقامی سطح پر بھی اپنی بچی کھچی اہمیت کھو بیٹھے گا۔''

جدید ادب کے اداریے سے اختلاف کی گنجائش نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے اردو ادیبوں کا بیشتر طبقہ اپنی ذات کے سحر میں مبتلا اور نرگسیت کا شدید ترین شکار ہے۔حیدر قریشی نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے تو اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ پاکستان میں ادب کی ایک قبائلی جنگ تقریباً چالیس سال سے لڑی جا رہی ہے۔ دونوں کے رسائل بند ہو چکے ہیں لیکن مطلع اب بھی ابر آلود ہے۔ بھارت میں ڈاکٹر گیان چند کی ایک متنازعہ کتاب چھپنے کے بعد دو متحارب کیمپ معرضِ وجود میں آ گئے ہیں۔ادبی رسائل اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے منقسم ہو گئے۔۔۔اور صلح کے آثار نظر نہیں آتے۔ایک بڑے ادیب پر غیر ملکی کتابوں سے سرقے کا الزام لگا ''ملزم'' کے ہاتھ لمبے تھے، اس نے اپنے ملک میں اس رسالے کی اشاعت مشروط کر دی، جس نے سرقے کے ثبوت شائع کئے۔اس نوع کی کشیدہ فضا کو تحلیل کرنے اور کشادہ ماحول استوار کرنے کے لئے سینئر ادیبوں کو حقیقی اور سچی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنا چاہیئے۔اختلافِ رائے ادب کا ضروری جزو ہے۔اسے قبول کرنے کے لئے اعلیٰ ظرفی کی مثالیں سامنے لائی جانا چاہئیں۔اس کی ایک صورت یہ ہے کہ اچھی تخلیقات کے تجزیاتی مطالعوں کو فروغ دیا جائے اور

آدھے بھرے ہوئے گلاس کو آدھا خالی کہنے سے گریز کیا جائے۔اگر نسبتاً جونیئر ادیبوں کی تخلیقات پر سینئر ادبائے کرام شفقت آمیز رائے کا اظہار (جو سچ سے بعید نہ ہو) تو نتائج کی شرح فیصد بہتر ہوگی۔میرا خیال ہے کہ جدید ادب میں خصوصی گوشوں کی اشاعت کا اہتمام اسی مقصد کے حصول کا ہی اقدام ہے۔شمارہ دوازدہم میں ''گوشہ مظفر حنفی''اور گوشہ ''احمد حسین مجاہد''تحسین سخن شناس کی اچھی مثالیں ہیں۔شعرا کے وسیع تر تعارف کے لئے جناب اکبر حمیدی،شہناز نبی ، خاور اعجاز،ظفر اللہ محمود، طاہر عدیم، اور معید رشیدی کی چھ چھ،سات سات غزلیں پیش کی گئی ہیں۔منشا یاد،شمیم حنفی،جمیل الرحمٰن،ستیہ پال آنند،اور جاوید ندیم کی کتابوں پر تبصرے اور تفصیلی مطالعات میں جاوید انور،ڈاکٹر حامد اشرف، منشا یاد ، ڈاکٹر عبدالرشید، اور عبدالرب استاد کے تجزیاتی مضامین بھی اس مثبت سلسلے کی کڑیاں ہی قرار دیئے جائیں گے۔''ادبی کائنات میں رنگ''اگرچہ حیدر قریشی کی ذاتی یادنگاری کا عمدہ عکس ہے۔ لیکن جس خلوص سے انھوں نے خواتین ادیباؤں کا ذکر کیا ہے وہ قابل صد تعریف ہے۔مضامین میں نصرت ظہیر(اردو کا تہذیبی پل)،محمد خالد انجم عثمانی (انیسویں صدی کے نثری اسالیب)،ڈاکٹر حامد اشرف (عمر خیام، شرابِ حقیقت کا طلب گار)،ڈالٹر شہناز نبی (میر تقی میر۔شاعرآہ)اور افسانوں میں ''روایت بے روایت''(احمد ہمیش)،''تمغۂ جرات''(بلند اقبال)،''نارسائی''(علی محسن)۔''اللہ میاں''(عبداللہ جاوید)،بے حد قابلِ تعریف ہیں۔خطوط کے حصے میں پوری دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مکتوب شامل ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''جدید ادب'' کثرت سے پڑھا جانے والا اور تاثر پیدا کرنے والا رسالہ ہے۔اردو ادب کی اس خدمت کے لئے مدیر حیدر قریشی مبارکباد کے مستحق ہیں۔پاکستان کے قارئین www.jadeedadab.com پر یہ رسالہ پڑھ سکتے ہیں۔

(تبصرہ مطبوعہ **ادبی صفحہ** روزنامہ **نوائے وقت** لاہور۔۱۹/دسمبر۲۰۰۸ء)

☆☆☆☆

۱ : **وضاحتی نوٹ**:ڈاکٹر انور سدید صاحب کی محبت ہے کہ وہ میرے تئیں بعض چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی زیادہ اہمیت دے دیتے ہیں۔جوگندر پال جی نے ایسا پروگرام بنایا تھا جیسا انور سدید صاحب نے لکھا ہے لیکن عملاً ایسا نہیں ہو پایا تھا اور مجھے ان سے ملاقات کے لیے پھر لاہور جانا پڑا تھا۔مظہر امام صاحب ایک بار خانپور سے گزرے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔وزیر آغا صاحب کے ساتھ ایک بار بھاولپور تک ملاقات رہی تھی۔ممتاز مفتی صاحب آدھی رات کو خانپور سے گزرے تو خیالوں میں ہی مجھ سے گپ شپ کر گئے،ان کے ایک خط میں اس کا ذکر موجود ہے۔سو مجھے لگا کہ جوگندر پال سے ملاقات،انٹرویو وغیرہ کی باتیں خانپور کے حوالے سے بعض دوسرے ادیبوں کے واقعات کے ساتھ گڈ مڈ ہوگئی ہیں۔میں نے جوگندر پال جی کے فکشن پر متعدد مضامین لکھے ہیں۔انٹرویو کوئی نہیں لیا۔ایک بار آل انڈیا ریڈیو سے میرا ایک انٹرویو ہوا تھا،میری خوش قسمتی کہ اسے لینے کے لئے جوگندر پال جی تشریف لائے۔یہ انٹرویو چھپا تو میں نے اسے دو ادیبوں کے درمیان مکالمہ کا عنوان دلایا۔ح۔ق

ادبی و شخصی کوائف

نام: خواجہ سلطان جمیل

والد: خواجہ محمد امیر۔صبا اکبر آبادی　**والدہ**: عقیلہ بیگم

پیدائش: ۱۴/اگست ۱۹۳۵۔آگرہ　**شادی**: ۶/دسمبر ۱۹۶۵

اولاد: چار بیٹے تین بیٹیاں (سب شادی شدہ۔الحمدللہ)　**تعلیم**: ایم اے (جامعہ کراچی)

ملازمت: دسویں پاس کرنے (۱۹۵۴میں) کے بعد مختلف محکموں میں رہے۔ ۱۹۶۰ء میں یو بی ایل سے وابستہ ہو گئے۔۱۹۹۵ء میں ریٹائر ہوئے۔

رہائش: (پاکستان) A/49-3 گلشن اقبال کراچی

کناڈا (اکتوبر ۲۰۰۱ سے) 1807-370 DIXON R0AD

ETOBICOKE ON M9R 1T2

لکھنے کی ابتداء: ۱۹۵۱ء **پہلی کہانی** جو شائع ہوئی: 'آخری تاریخ' ۱۹۵۳ء

کتابیں: افسانے۔ کھویا ہوا آدمی (۱۹۸۶ء)　سایہ سایہ دھوپ (۱۹۸۹ء)

ایک شام کا قصہ (۲۰۰۰ء)　میں آئینہ ہوں (۲۰۰۲ء)

ڈرامے　جنگل زمین خوشبو (۱۹۹۹ء)

منتظرِ اشاعت: ۱۳۷افسانے　۲۵ شخصی خاکے

ناول (امید کی کہانی) ۔**بچوں کے لئے ناول** (سلیم کی واپسی)۔**بچوں کے لئے کہانیاں**

☆مختلف موضوعات پر مضامین جن میں ریڈیو سے نشر ہونے والے پاکستانی ۱۲۶ افسانہ نگاروں کے بارے میں اظہارِ رائے کیا گیا ہے۔ ہر افسانہ نگار کے بارے میں اِس ہفت روزہ پروگرام کا دورانیہ ۴۵ منٹ ہوتا تھا۔

☆ریڈیو پاکستان کراچی سے ہی مسلسل تین سال تک ایک ڈرامائی فیچر ''حامد منزل'' کے نام سے تحریر کیا۔

☆ ان کے بارے میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کی سطح پر دو مقالے لکھے گئے۔

☆ کناڈا میں مقیم مشہور و معروف ناول نگار جناب اکرام بریلوی کی کتاب ''سلطان جمیل نسیم کے افسانے تنقید اور تجزیہ'' کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

سفر:۔ فریضہء حج اور دو مرتبہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے علاوہ سنگاپور، ملیشیا، تھائی لینڈ انگلستان، فرانس، امریکا کی سیاحت کی.... کناڈا کی شہریت حاصل ہے۔

میرزا ادیب

سلطان جمیل نسیم اور اُن کے افسانے

سلطان جمیل کے افسانوی مجموعے ''کھویا ہوا آدمی'' سے متعلق اپنی معروضات پیش کرنے سے پیشتر دو تین باتیں نسیم کے بارے میں عرض کردوں تو میرے قاری کو اِن افسانوں کی تفہیم میں زیادہ مدد مل سکتی ہے اور وہ میری اِن معروضات کی روشنی میں جمیل نسیم کے فن کو سمجھنے کی کچھ سہولت حاصل کر سکے گا۔

سلطان جمیل نسیم کا تعلقا فسانہ نگاروں کی جدید نسل سے ہے' جدید تر نسل نہیں،ان کے ہاں جدید طرزِ احساس تو لازماً ہے مگر انہوں نے اردو افسانے کی اُن روایات سے احتراز نہیں کیا جو منشی پریم چند سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہیں،سلطان جمیل کے یہاں اردو افسانے کے روایتی لوازم ایک توازن اور خوش اسلوبی کے ساتھ در آتے ہیں۔ وہ احساس کی بھول بھلیوں میں خود گم ہو کر اپنے قاری کے ساتھ بھی یہی سلوک روا نہیں رکھتے' ابلاغ کے بنیادی تقاضے کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اُن افسانوں میں بھی جہاں اِن کا قاری افسانے کی چند سطریں پڑھنے کے بعد یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ افسانہ تجریدی نوعیت کا ہوگا افسانہ نگار جو کچھ کہنا چاہتا ہے اپنے پڑھنے والے تک پہنچا دیتا ہے۔

سلطان جمیل نسیم نے بیشتر کرداری افسانے لکھے ہیں۔وہ افسانے کے مرکزی کردار کے توسط سے اپنا تجربہ ضروری جزیات کے ساتھ حوالہء تحریر کرتے ہیں اگر چہ روداد' ماجرا' واقعہ' کچھ بھی کہہ لیں' کردار سے الگ نہیں ہے۔ کردار اور ماجرا یا پلاٹ لازم وملزوم ہوتے ہیں مگر افسانہ نگار یا پہلے پلاٹ کی بُنت کو کردار پر ترجیح دیتا ہے یا پہلے ایک خاص کردار اُس کے ذہن میں آتا ہے اور پھر وہ واقعہ کو اس کردار کے اردگرد اِس طرح پھیلا دیتا ہے کہ کردار اِس واقعہ کے حوالے سے خود کو نمایاں کر دیتا ہے۔سلطان جمیل نسیم نے موخر الذکر انداز اپنایا ہے۔

تیسری بات میں یہ عرض کرونگا کہ ''کھویا ہوا آدمی'' کا مصنف ذہنی طور پر ترقی پسند ہے' اِس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہا ہے اور ہے۔ ممکن ہے اُس کبھی اِس تحریک کی تائید بھی نہ کی ہو۔ لیکن اُس کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اُس کی ہمدردیاں کچلے ہوئے' گرے ہوئے پس ماندہ طبقے کے ساتھ ہیں اور یہ نتیجہ ہے اُس کے ترقی پسند ذہن کا....اُس کے اکثر و بیشتر بلکہ کم و بیش تمام

افسانوں کے مرکزی کردار غربت زدہ طبقے کے افراد ہوتے ہیں۔میرے محترم دوست شوکت صدیقی نے سلطان جمیل نسیم کے اِس مجموعے کے فلیپ پر لکھا ہے۔

''سچ پوچھئے تو موضوع یا مرکزی خیال خود اپنی ہیئت اور تیکنک وضع کرتا ہے۔ایسا نہیں ہوتا کہ پہلے تکنیک وضع کر لی جائے اور اُس سانچے میں موضوع کو ڈھال کر افسانہ تخلیق کر دیا جائے۔''

شوکت نے بالکل درست بات لکھی ہے ہر موضوع اور مرکزی خیال اپنے اظہار کے لئے اپنی ہیئت' سانچہ' یا تکنک خود وضع کرتا ہے۔کوئی بنا بنایا سانچہ استعمال ہو ہی نہیں سکتا۔اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ہر مصنف کی اپنی ایک تخلیقی شخصیت ہوتی ہے اور یہ تخلیقی شخصیت اپنا ایک خاص اسلوبِ اظہار اپنا لیتی ہے اور وہ شخصیت اسی اسلوب اظہار سے اپنا تشخص قائم کرتی ہے، مگر یہ ایک وسیع تر سطح پر ہوتا ہے، اس سطح کے اندر بھی کئی سطحیں ہوتی ہیں اور ہر سطح کسی موضوع سے ہم آہنگ ہونے کی خاطر اپنے اندر مطلوبہ تبدیلی بروئے کار لاتی ہے۔

سلطان جمیل نسیم کے یہاں تیکنک کا خاصا تنوع نظر آتا ہے۔انہوں نے جو موضوع بھی اختیار کیا ہے اُس کے لئے تیکنک بھی ایسی اختیار کی ہے جو اُس موضوع سے داخلی طور پر بھی مطابقت رکھتی ہے۔''گھر کا راستہ'' کی تیکنک ''گواہی'' کی تیکنک سے مختلف ہے۔''آگ اور سمندر'' کے فنی عناصر ''خوابوں کا سفر'' کے فنی لوازم سے الگ تھلگ ہیں۔جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں' میری دانست میں ہمارا یہ جدید افسانہ نگار ہجومِ خلائق سے ایک کردار کا انتخاب کرتا ہے۔انتخاب اِس لئے کرتا ہے کہ ہجوم میں وہی کردار اُسے 'ہانٹ' کرتا رہا ہے یا کر رہا ہے، پھر جب یہ کردار اُس کے ذہن کی گہرائیوں میں اتر کر اُسے اپنی اہمیت پوری طرح واضح کر دیتا ہے تو افسانہ نگار سوچتا ہے کہ میں کس طرح اِسے اپنی گرفت میں لاؤں کہ یہ اپنی مکمل شخصیت کے ساتھ میرے قاری سے اپنا تعارف کرانے کے قابل ہو جائے۔اور اِس سوچ سے تخلیقی عمل شروع ہو جاتا ہے جو ایک افسانے پر منتج ہوتا ہے۔یہ کردار افسانہ نگار کے شعور میں سفر کرتا رہا ہے اِس لئے وہ خود باہر آنے کے لئے مصنف کے ذہن کے دروازے کھول لیتا ہے۔یہی تیکنک کا مرحلہ تشکیل پاتا ہے۔

''کھویا ہوا آدمی'' کے ابتدائی صفحے پر جناب صبا اکبرآبادی کا ایک شعر درج ہے۔

کونین تلاش میں رواں ہے کھویا ہوا آدمی کہاں ہے

یہاں سے ایک یہ بات اور ذہن میں آتی ہے کہ افسانہ نگار نے اُس کھوئے ہوئے آدمی کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو کونین کی تلاش میں رواں ہے، پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ ایسا تو نہیں کہ افسانہ نگار نے استعارۃً ایک ایسے آدمی کی ذہنی کیفیات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے جو زندگی کی سچی قدروں کا راستہ بھول کر گمراہیوں کے جنگل میں بھٹک رہا ہو۔؟ یا کیا یہ کھویا ہوا آدمی خود اپنی ہی تلاش میں سرگرداں ہے۔

سلطان جمیل نسیم کے ہاں یہ دونوں صورتیں موجود ہیں۔اِس مجموعے میں کم از کم تین ایسے افسانے شامل ہیں جو اِن پہلوؤں کی نشان دھی کرتے ہیں۔پہلا افسانہ ہے ''گھر کا راستہ''....بظاہر ایک شخص اپنے گھر کی تلاش میں جھد آزما ہے۔یہ گھر اُس شے سے عبارت نہیں ہے جو اینٹوں' مٹی اور گارے کے امتزاج سے صورت پذیر ہوتی ہے اور جسے ہم گھر یا مکان کہتے ہیں۔یہ گھر استعارہ ہے اُس شخص کی اپنی ذات کا، وہ اپنی ذات سے بچھڑ گیا ہے اور اُسے ڈھونڈ رہا ہے۔دوسرے دو افسانے ہیں ''کھویا ہوا آدمی'' اور ''سنگ زادوں کی بستی میں'' اول الذکر افسانے میں مصنف نے کمال ذہانت کا ثبوت دیا ہے' کنواں' رسی' کنویں کی گہرائی کنویں کے اوپر کھڑے ہوئے لوگوں کا خاموش اضطراب' اِن سب عناصر سے ایک ایسی تصویر بنتی ہے جو موجودہ انسانوں کی سعی و جستجو کے رنگ دکھاتی ہے۔یہ رنگ سب کچھ ہیں اور پھر کچھ بھی نہیں ہیں۔یہ سعی و جستجو رائیگاں بھی جاتی ہے اور ثمر آور بھی ثابت ہوتی ہے۔مائیکل جوزف اِن رنگوں کی داخلی کیفیتوں سے آشنا ہے اس لئے وہ اپنی جگہ مطمئن ہے۔

''سنگ زادوں کی بستی میں'' بے گھری اور بے دری کا ایک تصور افسانہ نگار نے الفاظ کی معنوی صداقت یا صداقت انگیز معنویت سے محرومی کے ذریعہ واضح کیا ہے۔یہی اِس خیال افروز افسانے کا موضوع ہے۔''خالی ہاتھ'' ایک فکر انگیز علامتی افسانہ ہے۔بظاہر لوگ اپنے گھر چھوڑ کر مغرب کی طرف بھاگ رہے ہیں ڈالر کے لئے یا درہم کے لئے ....مصنف نے کمال ہنرمندی سے یہ بات واضح کی ہے درہم یا ڈالر کی پہلی قیمت بے گھری ہے۔کھویا ہوا آدمی محض کھویا ہوا آدمی نہیں ہے۔ایک سچائی ہے۔ انسان نے صرف ایک سچائی کھو کر بہت کچھ کھو دیا ہے....مگر ابھی اس کے پاس وہ متاعِ بے بہا موجود ہے جسے عظمت و وقارِ حیات کہا جاتا ہے۔

''میرے لئے'' یہ ایک بڑا موثر افسانہ ہے مگر ممکن ہے بعض قارئین اسے موضوع کے اعتبار سے متنازع قرار دیں ایک ماں اپنی بیٹی کی عزت و آبرو بچانے کے لئے جس ایثار کا مظاہرہ کرتی ہے وہ ان کی نظروں مستحسن نہ سمجھا جائے۔مگر یہاں اِس بات پر غور کرنا ہوگا کہ اگر ایک ماں ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتی ہے جس سے افروز کی ماں دوچار ہوئی ہے تو اُس کا ماں ہونے کے حوالے سے' کیا ردِ عمل ہوگا۔؟ ماں کے سامنے ایک سوال ہے کہ وہ اور اُس کی جواں سال بیٹی زندہ کیوں کر رہیں۔؟

کیا زندہ رہنے کے لئے وہ طریقہ اپنانا ہوگا جو مجید نے بتایا ہے۔!

ایک ماں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تو پھر اور کوئی طریقہ کیا ہے۔!

اِس سوال کا جواب جذباتی نہیں ہوگا یہاں صورتِ حال کی ساری سنگینی کو سمجھنا ہوگا۔اگر اس سنگینی کو سمجھ لیا جائے تو افروز کی ماں نے جو لفظ کہے ہیں، جو فیصلہ کیا ہے وہ ایثار کے سوا اور کچھ نہیں۔

افسانہ نگار نے اس افسانے کا آخری جملہ بڑی تخلیقی ذہانت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

''گاہک افروز کے لئے نہیں آئے گا۔''

’’تو پھر۔‘‘

’’میرے لئے۔‘‘

اِس بے حد مختصر جواب ’’میرے لئے‘‘ میں معنویت کی ایک دنیا چھپی ہوئی ہے۔ ماں کے یہ دو لفظ سن کر قاری کی روح کانپ جاتی ہے مگر چند لمحوں بعد وہ ’’ماں‘‘ کی عظمت کے سامنے اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ ’’گواہی‘‘ سلطان جمیل کے کئی افسانوں کی طرح اک کرداری افسانہ ہے۔ یہ کردار جس کا نام ’ممتاز‘ ہے اور ایک چھوٹی سی دوکان کا مالک ہے واقعتاً ایک بڑا کردار ہے۔ ایک عظیم کردار ہے۔ راجہ کرم بخش، جو شہر کے بڑے رئیس ہیں۔ وہ ممتاز کا ایمان ’’گواہی‘‘ کی صورت خریدنا چاہتے ہیں اور ممتاز کہتا ہے۔

’’میری چھوٹی سی دکان ہے، میں صبح سے شام تک پچیس پچاس پیسے تک کی پرچون بیچتا ہوں۔ اتنی بڑی رقم سے جو چیز خریدی جاسکتی ہے وہ میری دکان پر نہیں بکتی۔‘‘

ایک افسانے کا عنوان ہے ’’آگ اور سمندر‘‘ نسیم نے اپنے اِس بہت خوبصورت افسانے میں ایک زندہ رہنے والا‘ قابل محبت‘ قابلِ احترام کردار، دیا ہے۔ یہ کردار ہے شاداں‘ جو بعد میں ’خالہ‘ کہلاتی ہے۔ یہ کردار اپنے جذبہء ایثار کی بدولت ایک زندہ کردار بن جاتا ہے۔

ہمارا یہ دور‘ جہاں تک انسان کی حقیقی اقدارِ حیات کا تعلق ہے بہت کچھ کھو چکا ہے مگر جیسا کہ میں نے سلطان جمیل نسیم کے چند افسانوں حوالہ دیا ہے‘ اس دور میں بھی انسانیت زندہ ہے۔

انسانیت زندہ ہے.... کیونکہ ابھی افروز کی غریب اور بے سہارا ماں۔ دوکاندار ممتاز اور خالہ جیسے کردار زندہ ہیں، سلطان جمیل نے اور بھی ایسے کردار دیئے ہیں۔ ٹیگور نے کہا تھا۔ جو بچہ اِس دنیا میں آتا ہے وہ کہتا ہے خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔ اور سلطان جمیل نسیم کے یہ کردار بھی ہمیں یقین دلا رہے ہیں کہ انسانیت ابھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ یہ ایسے کردار ہیں جن کی نور فشانی سے زندگی کے اندھیرے دور ہوتے ہیں اور جو ہمارے دلوں میں زندگی سے محبت کا جذبہ ابھارتے ہیں۔

سلطان جمیل نسیم کے افسانے جہاں زندگی کی رودادِ ستم سناتے ہیں وہاں ہمیں روشنی اور محبت اور امید کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ ’’کھویا ہوا آدمی‘‘ کا مصنف خود رجائیت پسند ہے۔ اس لئے اس کے افسانے بھی اپنے دور کی سفاکیوں کی طرف اشارہ کرنے کے باجود‘ انسان کو انسانیت سے مایوس نہیں ہونے دیتے ۔سلطان جمیل نسیم کا افسانہ .....آج کا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ اپنے اندر کہانی پن بھی لئے ہوئے ہے۔ نیا طرزِ احساس بھی اور اردو افسانے کی صحت مند روایت بھی۔ اس کے علاوہ یہ ایسا افسانہ ہے جسے دل چسپی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ یہ قاری کے جمالیاتی احساس کو بھی نمو بخشتا ہے۔

انتظار حسین (لاہور)

بتیس سال کی ریاضت کے بعد

ایک افسانہ نگار بتیس سال تک افسانے کے دشت کی سیاحی کرتا رہا۔ اب جا کر اُس نے پہلا مجموعہ پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ نگار سلطان جمیل نسیم ہیں جنہوں نے اپنا پہلا افسانہ ۱۹۵۳ء میں لکھا تھا، تب سے وہ اِس فن میں ریاض کر رہے تھے۔ اب ۱۹۸۶ء کے آغاز کے ساتھ اِن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ’’کھویا ہوا آدمی‘‘ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اِن کی اِس روش کو دیکھ کر ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ کہا ہے کہ ’’اردو افسانے کے ایوان میں سلطان جمیل نسیم ایک دھماکے کے ساتھ نہیں آئے بلکہ خراماں خراماں داخل ہوئے ہیں۔ یہی آہستہ روی اِن کے افسانوں کی گہرائی اور پختگی کا باعث بھی ہے۔‘‘

ڈاکٹر وزیر آغا نے درست کہا۔ یہ آہستہ روی آج کے زمانے میں کمیاب ہے۔ یہ تو ہمارے کلاسیکی عہد کا رویہ تھا کہ شاعر ایک عمر شعر گوئی میں صرف کرتا تھا۔ پورا ریاض کرتا تھا تب کہیں جا کر اپنا دیوان مرتب کرتا تھا۔ اِس صبر اور ریاض کا اجرا سے فنی پختگی کی شکل میں میسر آتا تھا۔ یہ صبر یہ ریاض آج کے زمانے میں ناپید ہے۔ کاتا اور لے دوڑی کا چلن ہے۔ اس میڈیا کے طور طریقے اب ادب میں بھی در آئے ہیں، لکھنے والا بہت عجلت میں ہوتا ہے۔ کچا پکا جیسا بھی مال اِس کے پاس ہوتا ہے وہ جھٹ پٹ کتاب کی شکل میں پیش کر ڈالتا ہے۔ پھر فن میں پختگی کہاں سے آئے اور گہرائی اور گیرائی کہاں سے پیدا ہو، تو سلطان جمیل نسیم کی آہستہ روی ان کی ذہنی سلامت روی ضامن ہے۔ اس سے یہ تو پتہ چل ہی جاتا ہے کہ لکھنے اپنے فن کے سلسلے میں کتنا سنجیدہ ہے مگر اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ۱۹۵۳ سے ابتک یعنی ۸۶ تک ہمارے افسانے کی دنیا میں بہت انقلاب آچکا ہے۔ جب سلطان جمیل نسیم نیا فسانے کی وادی میں قدم رکھا تھا تو افسانے میں حقیقت نگاری کا چلن تھا اس دہائی کے ختم ہوتے ہوتے اردو افسانے نے حقیقت نگاری کے اسلوب کو سلام کیا اور اظہار کے نئے طریقوں کی تلاش شروع ہوئی اس تلاش کے نتیجے میں وہ افسانہ پیدا ہوا جسے علامتیا ور تجریدی افسانہ کہا جاتا ہے۔ سلطان جمیل نسیم کو یہ نئے اسالیب اپنی طرف نہیں کھینچ سکے۔ وہ ایک استقلال کے ساتھ حقیقت ہی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ ہاں اسی دائرے میں رہتے ہوئے کبھی کبھی وہ علامتی رنگ میں بات کہنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک تو انکا رویہ اس لئے درست نظر آتا ہے کہ ان کے بہت سے افسانے تہہ داری کے وصف سے متصف ہیں لیکن خرابی ان کے یہاں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب

وہ حقیقت نگار رہتے ہوئے بعض تجریدی افسانہ نگاروں کے رنگِ بیان کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

''اُس نے اپنے قدموں کی چاپ کو محتاط خاموشی کے سلیپر پہنائے''

''شام مسکراتی ہوئی رات کے بستر پر لیٹتے ہی سوگئی''

''سورج ابھی تک انتظار کی صلیب پر لٹکا ہوا ہے''

''چہرے پر شناسائی کا بھبوت ملا۔ آنکھوں میں چھپے ہوئے خوف وہراس کے اندھیرے کو سمیٹ کر اپنائیت کے جذبات کا اجالا پھیلایا''

اِس قسم کے بیانات پڑھ کر مجھے انور سجاد کا خیال آیا۔ پھر رشید امجد کا جنہوں نے اس رنگ بیان کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ تجریدی افسانے میں بھی یہ رنگِ بیان میری دانست میں کوئی ایسی پسندیدہ چیز نہیں ہے اور حقیقت نگاری کے اسلوب سے تو یہ بالکل ہم آہنگ نہیں۔

سلطان جمیل نسیم کی ایک کمزوری نے اُن کے حق میں کام کیا ہے۔ وہ اس رنگ بیان کو زیادہ دیر تک نبھا نہیں پائے، اس طرح لکھتے ہوئے ان کا جلد ہی سانس پھول جاتا ہے پھر وہ اپنے انداز کے بیان پر آجاتے ہیں بس ان کی یہی کمزوری ان کی حقیقت نگاری کو ایک مروجہ خرابی سے بچا لے گئی۔ بہر حال حقیقت نگاری کی روایت میں سلطان جمیل نسیم کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ نئی زندگی نے جو نت نئے مسائل پیدا کئے ہیں اور انسانی تعلقات میں بگاڑ کی صورتیں پیدا کی ہیں انہیں افسانہ نگار نے شدت سے محسوس کیا ہے اور جذبے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مجموعہ کا پہلا افسانہ ہی ہمیں پکڑ لیتا ہے جہاں ایک شخص دوبئی سے پیسہ کما کر مدت کے بعد گھر لوٹا ہے اور اِس عرصہ میں شہر کے گلی کوچے اس کے لئے اتنے اجنبی ہوگئے ہیں کہ وہ گھر کا راستہ بھول جاتا ہے۔ بس اسی طرح نئی زندگی کے مسائل ان افسانوں میں راہ پاتے اور ایک فنی چابکدستی کے ساتھ اظہار پاتے نظر آتے ہیں۔

کتاب بڑے سلیقہ سے عہد کے نامور ادیبوں کی آراء کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ بلکہ ان آراء کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوا کہ سلطان جمیل نسیم نے اپنے افسانوں پر بزرگوں کی آراء کا زیادہ ہی بوجھ ڈال دیا ہے۔ آراء کا یہ ہجوم نہ بھی ہوتا تب بھی یہ افسانے قاری سے اپنا لوہا منوا لیتے۔

آجکل ہمارا افسانہ نگار جدیدیت کے فیشن میں مبتلا ہے۔ ادب میں جدیدیت ممنوعہ شے نہیں ہے، لیکن دائمی قدریں ہمیشہ فیشن زدگی سے الگ رہتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ سلطان جمیل اِس علت کا شکار نہیں ہوئے، اِنکی کہانیاں پڑھ کر مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے کہ ابھی ہمارے نوجوان لکھنے والوں میں ایسے افسانہ نگار موجود ہیں جنکا قلم مستقبل سے مایوس نہیں ہونے دیتا میری دعا ہے خدا اِنکی عمر میں برکت اور فکر کو مزید قوت عطا فرمائے۔ **غلام عباس**

مشفق خواجہ

سلطان جمیل نسیم کے افسانے

(سلطان جمیل نسیم کے پہلے افسانوی مجموعہ ''کھویا ہوا آدمی'' کا دیباچہ)

یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے، بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے اردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں صوبہ سندھ کا دورہ کیا، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ حیدرآباد' نواب شاہ' میر پور خاص' اور سکھر میں ہم نے کئی روز گزارے۔ میں اس سفر کی خوشگوار یادیں لے کر کراچی واپس آگیا اور اُن میں ایک یاد سلطان جمیل کی تھی جنسے میری پہلی ملاقات حیدرآباد میں ہوئی اور پھر وہ نواب شاہ اور میر پور خاص میں ہمارے ساتھ تھے۔ اِس سفر کے دوران میرا زیادہ وقت سلطان جمیل کے ساتھ گزرا۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ''قافلہء اردو'' میں وہی ایک میرے ہم عمر تھے' اور جب وہ ہم مذاق اور خیال بھی نکلے تو مجھے اُن کے قریب رہنا اور انہیں اپنے قریب رکھنا اچھا لگنے لگا۔ جب بھی موقع ملتا ہم دونوں الگ بیٹھ کر دنیا بھر کی باتیں کرتے۔ ان باتوں کا سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا ہماری خواہش ہوتی تھی کہ جب بھی موقع ملے بزرگوں کی محفل سے اُٹھ کر کہیں الگ جا بیٹھیں۔ یہ موقع عموماً اُس وقت ملتا تھا جب بابائے اردو کے اعزاز میں کوئی مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ میں اور سلطان جمیل نظریں بچا کر مشاعرہ گاہ سے باہر نکل جاتے اور اُس وقت لوٹتے جب بابائے اردو کی تقریر شروع ہونے والی ہوتی۔

ہم دونوں ادب میں نو وارد تھے میری گرہ میں چند غزلیں تھیں اور سلطان جمیل نسیم کی گرہ میں چند افسانے۔ ہم ادب کے حوالے سے بھی باتیں کرتے تھے لیکن زیادہ تر باتیں ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں کیں، اور اِس طرح ایک دوسرے کے بارے میں اتنا جان لیا کہ جب جدا ہوئے تو یہ محسوس ہوا ایسے ہم نے ایک عمر ساتھ گزاری ہو۔ گزشتہ پچیس برسوں میں سلطان جمیل کو میں نے دُور سے بھی دیکھا اور قریب سے بھی۔ دُور سے اِس طرح کہ وہ حیدرآباد میں تھے اور میں کراچی میں۔ اور اب ہم دونوں میں ملاقات کا واحد ذریعہ مراسلت تھی جو بڑی تیز رفتاری سے ہوتی رہی۔ جب وہ کراچی آگئے تو مراسلت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

سلطان جمیل کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے ہے۔ ان کے والد حضرت صبا اکبرآبادی ہیں جنکی غزل گوئی اور مرثیہ نگاری ہمارے ادبی سرمائے کا ایک وقیع حصہ ہے اور جنہوں نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔ نانا رعنا اکبرآبادی تھے۔ ان کے علاوہ اِس خاندان میں متعدد اہلِ علم وادب گزرے ہیں۔ ایسے ماحول میں آنکھیں کھولنے کے بعد ادب سے دلچسپی لینا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سلطان جمیل نسیم نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق ابتدأ شاعری سے دلچسپی لی، کچھ شعر بھی کہے لیکن انہیں جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ ان کا اصل میدان شاعری نہیں افسانہ نگاری ہے۔ سلطان جمیل یوں تو تیس برس سے لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں انہوں نے پہلی کہانی لکھی تھی۔ ان کا مجموعہ اب سے بہت پہلے آجانا چاہئے تھا بلکہ اب تک کئی مجموعے شائع ہو جانے چاہئے تھے لیکن انھوں نے اشاعت سے زیادہ لکھنے پڑھنے پر توجہ دی۔ اسی وجہ سے ان کے بیشتر افسانوں نے گزشتہ دس پندرہ برسوں میں پڑھنے والوں کی توجہ اپنی اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔ اسی زمانے میں ان کی بہترین کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے ''کھویا ہوا آدمی'' میں چھبیس افسانے شامل ہیں۔

اِن افسانوں کی پہلی خصوصیت جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ وہ اِن کا لائق مطالعہ ہونا ہے۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی ہے کہ آج کل کے بیشتر افسانے سب کچھ ہونے کے باوجود لائق مطالعہ نہیں ہوتے۔ لکھنے والے دعویٰ تو اِس کا کرتے ہیں کہ ساری دنیا کا سراغ ان کے افسانوں میں مل جائے گا لیکن صورت حال یہ ہے کہ اُن کے مافی الضمیر کا سراغ بھی مشکل سے ملتا ہے۔ افسانے سے کہانی کو خارج کرنے کے رجحان کی وجہ سے افسانہ اب افسانہ نہیں رہا پڑھنے والوں کی آزمائش بن گیا ہے۔ کہنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ افسانہ ایک تشکیل ہے جو کسی احساس کی بھی ہوسکتی ہے اور واقعہ کی بھی۔ لیکن عملاً کسی واقعہ کو بنیاد بنائے بغیر احساس کی تشکیل کا تصور افسانے کی ہیئت کے لئے ناموزوں ہے اِس کے لئے اور بہت سے میدان پڑے ہیں وہاں آپ احساس کی تشکیل کا جادو جگائیے۔ افسانے سے اس کا بنیادی وصف یعنی کہانی پن چھیننے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی احساس کی تشکیل کے مفروضے نے بعض جدید افسانہ نگاروں کو گمراہ کیا ہے اور اُن کے افسانے نثری نظم سے ملتی جلتی کوئی چیز بن گئے ہیں اور یہیں سے جدید افسانے میں وہ وصف پیدا ہوا ہے جو اُسے لائق مطالعہ نہیں رہنے دیتا۔ احساس کی تشکیل کے مفروضہ تصور نے جدید افسانے کو لسانی اعتبار سے بھی خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ زبان اب ذریعہ اظہار نہیں رہی، اخفائے مطالب کا ذریعہ بن گئی ہے اور وہ بھی اِس طرح کہ الفاظ اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ یہ تسلیم کہ ادب میں الفاظ کی معنویت ماورائے لغت بھی ہوتی ہے لیکن الفاظ کو نئے معنوں میں برتنے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ پرانے اور مروج معنوں سے لکھنے والے کو واقفیت ہو۔ زبان کے معاملے میں سلطان جمیل نسیم کے ہاں اِس قسم کے ''تجدد'' یا ''اجتہاد'' کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اِس کے باوجود اُن کی زبان نئے عہد کی زبان ہے جس میں لفظ کا پیرہن خیال کے پیکر پر نہایت موزوں نظر آتا ہے بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ سلطان جمیل نسیم نے اپنے افسانوں کی

بنت میں زبان کو ایک ایسے عنصر کی حیثیت سے استعمال کیا ہے جس سے افسانے میں تہہ داری کا وصف پیدا ہوتا ہے اور اُسے بیانِ واقعہ کی سطح سے اوپر اُٹھا دیتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ سلطان جمیل نسیم کے افسانے اردو افسانے کی روایت سے الگ نہیں ہیں لیکن انہیں روایتی افسانہ نگاری کے زمرے میں شامل نہیں کہا جا سکتا۔ کسی تحریر کا روایت سے منسلک ہونا اور روایتی ہونا دو مختلف چیزیں ہیں یہ افسانے اردو افسانے کی روایت سے الگ اس لئے نہیں ہیں کہ ان میں اِس فن کی بنیاد یعنی کہانی سے کنارہ کشی نہیں کی گئی۔ یہ وہی روایت ہے جو پریم چند سے ہوتی ہوئی کرشن چندر، بیدی، منٹو اور غلام عباس کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے۔ سلطان جمیل کے افسانوں کو روایتی ہم اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اِن میں کہانی کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اور اِس بہت کچھ میں لکھنے والے کا اسلوب، کردار نگاری اور ماحول کی تصویر کشی کے علاوہ اچھے افسانے کی تمام خوبیان گنوائی جا سکتی ہیں۔ میں صرف ایک چیز کی طرف اشارہ کروں گا کہ روایتی افسانے میں عموماً واقعات کردار کی تشکیل کرتے ہیں لیکن سلطان جمیل کے ہاں کردار مختلف ذہنی رویوں کے اظہار کی علامت ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ سلطان جمیل نسیم کے کردار معاشرے کے مختلف طبقات کی نمائندگی نہیں کرتے' بلکہ اِن طبقات کے باہمی تعلق سے جو ذہنی روّیے تشکیل پاتے ہیں اُن کی عکاسی کرتے ہیں اِن کے بیشتر افسانوں کا بنیادی کردار صیغہ واحد متکلم ہے۔ یہ روّیہ فرد اور فرد کے تعلق سے بھی ہے اور فرد اور معاشرے کے تعلق سے بھی۔ سلطان جمیل نسیم نے اِنہیں روّیوں اور اِنہیں تعلقات کو دیکھا، سمجھا اور پرکھا ہے۔ کہیں وہ کامیاب ہوئے ہیں اور کہیں ناکام۔ کامیابی بھی اُن کی اپنی ہے اور ناکامی بھی اِن کی اپنی کہ انہوں نے عام روش سے ہٹ کر اپنا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اِس قسم کی کوشش کرنے والے خود ناکام ہوں یا کامیاب' بعد میں آنے والوں کی مشکلوں کو کسی حد تک آسان ضرور کر دیتے ہیں۔ اِس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کی اِس لئے ضرورت نہیں کہ میں ایک دوست کی کتاب پر اپنی رائے لکھ رہا ہوں کوئی تنقیدی مقدمہ نہیں لکھ رہا جس کی مجھ میں صلاحیت ہے نہ اہلیت۔

''کھویا ہوا آدمی'' آپ کی عنایت سے تین چار دن پہلے مجھے مل گیا تھا اب تک پانچ افسانے پڑھ چکا ہوں، اگر رسید بھیجنے کی عجلت نہ ہوتی تب شاید پوری کتاب پڑھنے کے بعد یہ سطریں لکھتا آپ کے افسانوں میں نازک سماجی مسائل کو فنی سلیقے کے ساتھ سمویا گیا ہے۔ اِن میں بنیادی طور پر عبوری معاشرے کی اقدار کی تصویر کشی ہوئی ہے۔ کہانیوں کے پلاٹ' کردار' اور علامتیں عصری تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ ان سے معاشرتی حقیقت نگاری کی روایت کو تقویت ملی ہے، آپ کے اسلوب کی تازہ کاری اور موضوعات کے تنوع نے بھی بڑی کشش پیدا کی ہے۔

شفیق الرحمن

ڈاکٹر اسلم فرخی (کراچی)

میں آئینہ ہوں

سلطان جمیل نسیم بڑے معروف اور ہمہ جہت فن کار ہیں۔ افسانے تو خیر لکھتے ہی ہیں، افسانہ ان کی بنیادی شناخت ہے، ڈرامے بھی لکھتے ہیں ریڈیائی ڈرامے اور ٹی وی ڈرامے، ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں میں صداکاری اور اداکاری بھی کی ہے۔ ریڈیو، ٹی وی کے ادبی پروگراموں میں میزبان بھی رہے ہیں اور اپنی تخلیقات بھی پیش کی ہیں۔ تحت اللفظ مرثیہ خوانی بھی کی ہے اسی تعلق سے میں نے ان کو ہمہ جہت فنکار کہا ہے۔

سلطان جمیل نسیم نے ادب کے آغوش میں پرورش پائی ہے۔ ان کے والد حضرت صبا اکبر آبادی کا شمار برصغیر کے نامور اور ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔ سلطان جمیل نسیم کے ابتک تین مجموعے افسانوں کے اور ایک ڈراموں کا شائع ہو چکا ہے۔ چوتھا افسانوی مجموعہ ''میں آئینہ ہوں'' اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔

سلطان جمیل نسیم نے اپنے اِس مجموعے کا سرنامہ حضرت صبا اکبر آبادی کے اِس شعر کو قرار دیا ہے۔۔

تمھیں سو رُخ نظر آئیں گے اپنے
میں آئینہ ہوں اور ٹوٹا ہوا ہوں

مجھے ''میں آئینہ ہوں'' کے مطالعے میں یہ شعر بار بار یاد آتا رہا۔ زندگی کے نجانے کتنے رُخ ہیں کہ جن کی جھلک اِس مجموعے میں نظر آتی ہے۔ اِس آئینے میں کتنے چہرے ہیں۔ بھیانک، فن ناشناس، زمانے کے ٹھکرائے اور ستائے ہوئے حالات کا شکار، فضا اور ماحول کے مارے ہوئے۔ بہتر حالات کے انتظار کی دھوپ میں دھیرے دھیرے سوکھنے والے۔ یہ سب ہمارے اپنے ہیں۔ اُس وسیع خانوادے کے فرد جس کا نام احتیاج ہے۔ یہ اقتدار اور ثروت کے جویا نہیں، محبت اور سکون چاہتے ہیں۔ سیدھے سادے طریقے سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ محنت اور جدوجہد اِن کا شعار ہے مگر محنت اور جدوجہد کے باوجود محبت اور سکون ہمیشہ ان سے گریزاں رہتے ہیں، انھیں زندگی میں کوئی سکھ نہیں ملتا۔ مسایل قدم قدم پر انھیں تکلیف پہنچاتے رہتے ہیں۔ ''میں آئینہ ہوں'' ایک مرقع ہے سچی اور بھرپور تصویروں کا۔ افسانہ نگار نے اپنے معاشرے میں جو کچھ دیکھا ہے، جو کچھ اس کے سامنے گزرا ہے۔ زندگی نے جو جو رُخ اختیار کئے ہیں انھیں بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں اور بہت ہنرمندی کے ساتھ

اپنے قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس کے بیان میں تلخی نہیں، نرمی اور دھیما پن ہے۔ وہ فنکار ہیں مبلّغ اور مصلح نہیں۔

سلطان جمیل نسیم منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ افسانے کے فن پر ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں موضوعات کی تلخی اور معاشرے میں گھلے ہوئے زہر کا بیان بھی بڑے نرم اور فنکارانہ انداز میں ہوا ہے۔ انھوں نے اِس مجموعے کے دیباچے میں کہا ہے کہ ''میں نے اِس بات کا دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ میں جیسا لکھنا چاہتا ہوں ویسا ہی لکھ دیتا ہوں البتہ یہ اقرار ضرور کروں گا کہ جیسا لکھنا چاہتا ہوں ویسا لکھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں'' مجھے اِس اعتراف میں جمیل نسیم کی فنکارانہ مہارت کا عکس نظر آتا ہے۔ اُن کا یہ کہنا کہ میں حسبِ منشا لکھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں' سچائی اور بصیرت کا اشارہ ہے۔ سلطان جمیل نسیم نے اپنے ہر افسانے میں سچائی اور حقیقت کو سچائی اور حقیقت کی طرح قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''میں آئینہ ہوں'' سترہ افسانوں کا دلاویز مجموعہ ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق کو اپنے دامن میں سمیٹے۔ بے رحم سچائیوں اور حیران کن عصری حالات کو فن کارانہ انداز میں واضح کرتے ہوئے یہ افسانوی مجموعہ واقعی ایک آئینہ ہے۔ مگر مجھے اِس میں تامل ہے کہ یہ آئینہ ٹوٹا ہوا ہے۔ در اصل ٹوٹے ہوئے ہم لوگ ہیں۔ ہماری زندگی' معاشرہ' ماحول اور فضا ہے۔ نسیم نے از راہِ انکسار آئینے کو ٹوٹا ہوا کہا ہے یہ بھی ان کی فنّی بصیرت کا ثبوت ہے۔

> سلطان جمیل نسیم کے افسانے اردو افسانہ نگاری کی اُس عظیم روایت سے تعلق رکھتے ہیں جس کا آغاز منشی پریم چند سے ہوا اور جو افسانے میں تجریدیت کی حالیہ آندھی تک اردو ادب کا سرمایہءافتخار رہی۔ آج بعض لوگ' جو جدید کہلانا پسند کرتے ہیں، اُس روایت کو ماضی کی فرسودہ روایت قرار دے کر خوش ہوتے ہیں مگر یہی تو وہ روایت ہے جو دنیا بھر میں فکشن کے غیر فانی شاہکاروں کی صورت میں محفوظ ہے اور آئندہ بھی سچے اور کھرے افسانے اور ناول کی عمارت اس روایت کی بنیاد پر اُٹھائی جائے گی۔ افسانے میں تجریدیت کا تجربہ ایک تیز جھونکا تھا جو اُس روایت روایت کو مسخ کئے بغیر گزر گیا۔ میرے اس دعوے کا ایک روشن ثبوت سلطان جمیل نسیم کی یہ کہانیاں ہیں جو ''کھویا ہوا آدمی'' میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں نہ صرف اردو فکشن کی متذکرہ عظیم روایت کی نمائندہ ہیں بلکہ مصنف نے اس روایت کو اپنی صاف ستھری حقیقت پسندی اور جرائت مندانہ صداقت نگاری سے مزید نکھارا ہے۔ سلطان جمیل نسیم کی زبان سادہ اور رواں ہے اور مشاہدہ تیز اور ہمہ گیر ہے۔ اس کا اسلوب دل و دماغ کو افسانے کی ابتدا ہی میں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور جب وہ افسانے کو سمیٹتا ہے تو قاری کا ذہن پوری طرح منور ہو چکا ہوتا ہے۔
>
> **احمد ندیم قاسمی**

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

سلطان جمیل نسیم کی جدیدیت کی طرف پیش قدمی

میں سلطان جمیل نسیم کے افسانوں کا پرانا قاری ہوں' ان کے بعض افسانوں نے میرے ذہن میں کہرام بھی برپا کیا تھا، اور زندگی کی اِس حقیقت سے جو مجھے نظر آتی تھی اور جس کا اثبات جمیل نسیم کے افسانے پوری جرأت سے کرتے تھے، اکثر اوقات نفرت ان افسانوں نے ہی پیدا کی، میں نے ان کے افسانے ''گھر کا راستہ''۔ ''میرے لئے''، ''آدھا سورج'' اور ''گواہی'' پڑھے تو انہیں پریم چند کی اس روایت کا پاسبان سمجھا' جس کی تعریف ایک ترقی پسند افسانہ نگار نے یوں کی تھی:

''یہی تو وہ روایت ہے جو دنیا بھر میں فکشن کے غیر فانی شاہکاروں کی صورت میں محفوظ ہے
اور آئندہ بھی سچے اور کھرے افسانے اور ناول کی عمارت اِس روایت پر اٹھائی جائے گی۔''

میں نے ان کے افسانے ''سنگ زادوں کی بستی میں'' شعریت آمیز نثر کے چند استعاراتی جملے پڑھے اور اُن کے پس منظر چھپی ہوئی حقیقت سے معانقہ کرنے کی کوشش کی تو مجھے احساس ہوا کہ سلطان جمیل نسیم شاید تجریدی علامتی افسانے کے فنکار ہیں اور اب اپنی خوبصورت تخلیقی نثر کو افسانے میں استعمال کر کے رشید امجد کو مات دینے کی کوشش کر رہے ہیں' اِن کے چند جملے جو افسانہ لکھنے کی پریم چندانہ روایت سے یکسر انحراف کی مثال ہیں' ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ ''پھر یوں ہوا کہ سمندر کی گستاخ لہروں نے ساحل کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور ساحل نے وہ ہاتھ جھٹک کر ہچکولے کھاتی ہوئی بادبانی کشتی کو سینے سے لگالیا۔''

۲۔ بوڑھے کی صدف جیسی آنکھوں نے لفظوں کے موتیوں کو پرکھنا شروع کر دیا۔ ایسے الفاظ جن کے معنی کی آب اتر چکی تھی اُن کو اٹھا کے جانب رکھا کہ وہ ان کی عظمتِ رفتہ آگاہ تھا اور ثابت و سالم آبدار الفاظ اپنے قلم جیسے ہاتھوں سے اُٹھاتا رہا۔''

یہ جملے سلطان جمیل نسیم کے ایک ہی افسانے میں لوحِ حقیقت سے اسلوبِ علامت میں اُترے ہیں اور ایک مربوط کہانی کا حصہ ہیں لیکن اگر آپ اِن کی علامتی توضیح کریں تو اِن جملوں میں آپ کو دو الگ الگ کہانیاں پوشیدہ نظر آئیں گی۔ سلطان جمیل نسیم کے فن کی ایک منفرد جہت، کہانیوں سے وحدتِ تاثر کو گزند نہیں پہنچایا اور

آپ کو بنیادی اور مرکزی مربوط کہانی کی طرف ہی توجہ مبذول رکھنے کی راہ دکھائی ہے اور اس کے فن کی ایک منفرد جہت ہے۔ ان جملوں کی توضیح حسبِ ذیل ہے۔

پہلے جملے میں ساحل ایک منفعل نسوانی کردار ہے جس پر بپھرا ہوا سمندر (جو ایک مرد کی علامت ہے) مسلسل حملہ کر رہا ہے' مجھے ہچکولے کھاتی ہوئی بادبانی کشتی وہ بچہ نظر آتا ہے جس کی ماں ایک ہوس پرست مرد کی زد میں ہے اور جس کا ہاتھ اس کے گریبان تک بھی پہنچ چکا ہے' گریبان کی طرف پیش قدمی ظاہر کرتی ہے کہ حملہ جنسی جذبے کے تحت کیا گیا ہے اور عورت محض عورت ہی نہیں ہے ایک بچے کی زندگی کی محافظ اور ضامن بھی ہے۔ اِس توضیح کو اگر آپ افسانہ ''میرے لئے'' کے متصل رکھ کر دیکھیں تو آپ کو یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا کہ اوّل الذکر جملے سے جو کہانی میں نے اخذ کی ہے اسی کو مرکزی خیال بنا کر سلطان جمیل نسیم نے تاثر کے معنوی مفہوم کو علامتی صورت دینے کی کاوش کی ہے اور یہ اس معاشرتی المیے کو ظاہر کرتی ہے جب ماضی اور حال میں فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مشاہدہ اپنی آب اور لفظ اپنا معنی کھو دیتے ہیں۔ اور انسان ''کیا پایا'' کی مسرت سے محروم ہو کر ''کیا کھویا'' کے دکھ سے مغلوب ہو جاتا ہے۔

میں اس طویل تمہید کے لئے معذرت خواہ ہوں' مقصد اِس حقیقت کو نمایاں کرنا تھا کہ سلطان جمیل نسیم نے قدیم افسانے کی روایت سے رشتہ منقطع کئے بغیر جدیدیت کی طرف پیش قدمی کی تو یہ قبولِ عام فیشن کو قبول کرنے کی بدعادت نہیں تھی بلکہ مقصود معنی کے ہیولے اور واقعے کی حقیقت کو ایک نئے انداز میں پیش کرنا تھا۔ اِس قسم کے افسانوں میں انہوں نے منظر کے پسِ پردہ عمل میں آنے والے ہنگامے کو دیکھنے اور کرداروں کے نقوش اور خدوخال الگ ہو کر افعال اور اعمال سے اپنا حقیقی تجربہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کا تاثر چونکہ گہرا ہے، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ سلطان جمیل نسیم افسانے سے جو معاشرتی مقصد بلا اعلان حاصل کرنا چاہتے تھے وہ اس کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہو گئے ہیں۔

سلطان جمیل نسیم کے افسانے پڑھتے ہوئے ولیم فاکنر (william Faukner) کا یہ قول متعدد مرتبہ یاد آیا کہ

''افسانہ نگار کو افسانہ لکھنے کے لئے تجربہ' مشاہدہ' اور تخیل تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اگر اِن میں سے دو اور بعض اوقات اگر ایک چیز بھی میسّر آ جائے تو بقیہ چیزوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی.................''

لیکن اگر یہ تینوں مجتمع ہو جائیں تو یقیناً ایک بڑا افسانہ وجود میں آ جاتا ہے۔ سلطان جمیل نسیم کے ہاں ان تینوں اجزاء کا امتزاج بھی ملتا ہے اور انہوں نے ان سے فرداً فرداً استفادہ کی کاوش بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر اِن کا افسانہ ''گھر کا راستہ'' لیجئے.....

یہ افسانہ خالصتاً مشاہدہ کا افسانہ ہے، اس کا مواد اُن اشخاص سے جمع کیا گیا ہے جو بیرونی ممالک میں دولت کمانے کے لئے جاتے ہیں اور پھر غیر ملکی اشیاء سے لدے پھندے آتے ہیں تو دیکھنے والوں کی آنکھوں کو بھی چندھیا دیتے

ہیں۔ یہ مشاہدہ روزمرّہ کی ایک ایسی حقیقت ہے جو بیشتر گھروں میں کسی نہ کسی صورت میں ہر روز دہرائی جاتی ہے اور شاید اب اتنی عام ہو چکی ہے کہ متاثر بھی نہیں کرتی۔ سلطان جمیل نسیم نے اِس حقیقت کو اپنے تجربہ کا حصہ بنایا تو اُن پر کھلا کہ دُور دیس سے کندھوں پر دولت لاد کر لانے والا انسان تو اپنے گھر کا راستہ گم کر چکا ہے۔ اور یہ وہی کھویا ہوا انسان ہے جو اپنے دیس میں بھی اجنبی ہے اور اپنی شناخت کھو کر ایک عظیم انسانی المیہ سے دوچار ہو چکا ہے۔ اِس تجربے نے ان کی متخیلہ کو مہمیز لگائی اور پھر وہ افسانہ معرضِ وجود میں آ گیا جس کے واحد متکلم میں معاشرے کے ہر فرد کی صورت موجود تھی۔ اِس افسانے میں سوچ کی تیز رو واقعات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور آپ کی فکر کو مہمیز ہی نہیں لگاتی بلکہ یہ سوالات بھی اُٹھاتی ہے کہ

''وطن لوٹتے ہی الفاظ کیساتھ واحد متکلم کا روّیہ دشمنوں کا سا کیوں ہو گیا ہے۔؟''

''ہجر کی تھکن میں لذّت کیوں تھی اور اپنوں سے آ ملنے میں کرچیوں کی چبھن کیوں ہے۔؟''

''گھر اور راستے میں بُعد المشر قین کیوں پیدا ہو جاتا ہے''؟

''کیا انسانوں کا قصور لفظوں کے سر منڈھا جا سکتا ہے۔؟''

''کیا الفاظ سیپی کی طرح معنوں کے موتی سمیٹے انسانوں کے سمندر میں گم سم پڑے رہتے ہیں۔؟''

یہ سب سوالات آپ کے سامنے اپنی مجرد حیثیت میں نہیں آتے بلکہ کہانی کے بطون سے اُبھرتے ہیں اور اس تضاد کو آشکار کرتے ہیں جس سے پورا معاشرہ دوچار ہے۔ چنانچہ سلطان جمیل نسیم کے افسانے کی خوبی یہ بھی ہے کہ اِس سے آپ کی سوچ متحرک ہو جاتی ہے اور معاشرہ نئے تناظر میں سامنے آتا ہے۔

''گھر کا راستہ'' کے بعد جب میں سلطان جمیل نسیم کا افسانہ ''میرے لئے'' پڑھتا ہوں تو یہ مجھے بیتی ہوئی حقیقت نظر آتا ہے۔ اِس افسانے کا تاثر اکہرا ہے۔ یہ کہانی بھی معاشرتی المیہ اُبھارتی ہے۔ اِس کے تمام معانی افروز، مجید اور افروز کی ماں کی حرکات وسکنات کے ساتھ ٹنکے ہوئے ہیں اور پھیلنے کے بجائے سمٹتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ نقطۂ انجام پر جب یہ دل دوز حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ واقعات وحادثات کی زہرناکی انسانی ضمیر کو بری طرح کچل دیتی ہے تو شدید جھٹکا لگتا ہے۔ سلطان جمیل نسیم نے اِس افسانے میں تخیّل کی نادرہ کاری اور تجربے کا جوہر شامل کرنے کی کوشش نہیں کی اور صاف نظر آتا کہ ولیم فاکنر نے افسانے کے لئے جن تین چیزوں کو اہم شمار کیا تھا ان میں سے سلطان جمیل نسیم نے صرف ایک استعمال کی ہے۔ اِس قسم کے افسانوں میں وہ حقیقت کو سیدھے سبھاؤ پیش کر دیتے ہیں، لیکن کرداروں کے آلام سے غمِ دوراں کو ضرور اُبھارتے ہیں۔

اِن کے یہاں خیر وشر کا تصادم بھی عمل میں آتا ہے اور یہ پریم چند عظیم روایت کی توسیع میں بھی معاونت کرتا ہے، چنانچہ میں اِس قسم کے زیرِ سطح معنی کی تلاش غیر ضروری تصور کرتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے افسانے لکھ کر سلطان جمیل نسیم نے عام قاری کے ذوق کی تسکین کی ہے اور ان کی مقبولیت کا گراف ''زیرِ آسماں''۔ آگ اور

سمندر''۔ آدھا سورج اور ''شکست کی آواز'' جیسی کہانیوں سے بھی مرتب ہوا ہے، جن میں سلطان جمیل نسیم نے ایک ماہر اور فن شناس تماشائی کا کردار ادا کیا ہے لیکن خود تماشا نہیں بنے۔ اِن کہانیوں میں ''یونیورسل اپیل'' موجود ہے اور یہ اپیل گہری دردمندی اور انسان دوستی کی غماز بھی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اپیل سطح کے ساتھ ترقی پسندانہ انداز میں چپکا دی گئی ہے اور پڑھنے والوں سے ''رحم کی اپیل'' مانگ رہی ہے اور سلطان جمیل نسیم نے اسے تجربے کا بلند مقام عطا نہیں کیا۔ اِس قسم کے افسانوں میں سلطان جمیل نسیم نے اُن تمام رنگوں کو قبول کیا ہے جو اِن کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں 'ایک مخصوص نصف قطر کی قوس قزح مرتب کرتے ہیں اور حقیقتِ کل (TOTAL REALITY) کو پیش کر دیتے ہیں کیا اِس سب کو سلطان جمیل نسیم کی خوبی شمار نہیں کرنا چاہئے۔؟

تخیل کی خالص صورت کو افسانے میں ڈھالنے کا تجربہ سلطان جمیل نسیم نے ''کھویا ہوا آدمی'' میں کیا ہے، اِس افسانے میں انہوں نے مواد کو اسلوب میں آمیخت کرنے اور ایک نئی تکنیک وضع کرنے کی کاوش کی ہے۔ افسانہ ہمارے سامنے کسی فلم کی طرح منظر در منظر گرہ کشا نہیں ہوتا بلکہ یہ آپ کے سامنے جزوی تصویروں کو پیش کرتا ہے۔ کنویں سے آنے والی آوازیں اور آوازوں کی ڈور میں بندھی ہوئی امداد کی التجائیں، مائیکل جوزف' جسے لاتعلقی کی دیمک نے چاٹ لیا ہے، اور مصنف جس نے ہاتھ سے قلم رکھ دیا ہے اور ان کاغذ پر بکھرے ہوئے خطوط کا چہرہ دیکھ رہا ہے، سب افسانہ نگار کے ذہن کے پاتال سے پیدا ہونے والی لہریں ہیں، جو معاشرتی حقیقتوں کے ساتھ بار بار ٹکرا رہی ہیں اور ہمیں اس کرب سے آشنا کرتی ہیں جو تضادات سے پیدا ہوتا ہے۔ اور بیسویں کے ربع آخر کا نادر عطیہ ہے۔ یہ افسانہ چونکہ متخیلہ کی پیداوار ہے اس لئے اس میں زمان ومکان بھی بے کنار ہیں اور مسرت اور نفرت کے پیمانے بھی الگ ہیں اس کی ایک مثال حسبِ ذیل اقتباس ہے۔

''مین اس منزل میں ہوں جہاں ایک فلسطینی کے چھرا گھونپنے کے بعد خوشی تو ہوتی ہے مگر وہ خوشی راتوں کی نیند چاٹ جاتی ہے۔ صبح ویت نامیوں پر گولیوں کی بوچھار تو کرتا ہوں لیکن رات کو اُن کی لڑکیوں کو بوسوں کی بارش میں نہلا دیتا ہوں۔ نیگرو نسل کو اپنے ملک سے ختم کر دینے کی انتہائی خواہش کے باوجود میں شدید بیماری کے عالم میں کراہت کے ساتھ ایک کالی نرس کے ہاتھوں تیمارداری قبول کرتا ہوں اور اُسے سسٹر کہہ کے پکارتا ہوں.....مگر بھیک کے لئے پھیلے ہوئے ضرورت مند ہاتھوں پر چند سکّے رکھنے سے پہلے یہ اطمینان بھی چاہتا ہوں کہ مانگنے والا میرے ہی ملک اور مذہب کا ہے یا نہیں.....''

سلطان جمیل نسیم کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ندگی کے ٹوٹے پھوٹے فریم میں جن تصویروں کی رونمائی کی ہے وہ بظاہر بے چہرہ ہیں لیکن وہ عمل جسے وزیر آغا نے کریلین پراسس کا نام دیا ہے ہمارے سامنے ان تصویروں کو جوڑ کر پیش کرتا ہے اور جذباتی گہرائی کو کروٹ دے دیتا ہے، مایوسی' نامرادی' اور پژمردگی کے اِن لمحات میں سلطان

جمیل نسیم نے بالعموم نہیں بلکہ کبھی کبھی ایک دانا بزرگ Wise old man کو افسانے میں ابھار کر مصلح کا کردار ادا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ''کھویا ہوا آدمی'' میں یہ دانا بزرگ خود مصنف ہے۔جس کے ذہن میں مائیکل جوزف کیلئے گالیوں کے بلبلے اُٹھ رہے تھے۔لیکن جب مائیکل جوزف کے اندر سے نیکی بیدار ہوگئی تو رسی کو کنویں میں گرنے سے روکنے کے لئے دوسرے لوگوں کے ساتھ شامل ہوگیا تو اِس دانا بزرگ نے ''مسکرا کر کاغذ کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں قلم کی دعائیں الٹ دیں'' یوں ایک مثبت رویہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔''سنگ زادوں کی بستی میں'' ''عذاب'' اور ''پرانا ساتھی'' چند ایسے ہی افسانے ہیں جن میں نئی معنویت واقعے کے بطون سے بیدار ہوتی ہے اور کہانی اپنی بے چہرگی کے باوجود قاری کو ذہنی اور فکری آسودگی عطا کردیتی ہے۔

مجھے کچھ یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے بعض افسانہ نگاروں نے افسانے میں خود اپنی زندگی بسر کی ہے۔ سلطان جمیل نسیم کے ہاں مجھے یہ منفرد صورت نظر آتی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اِس عمل میں وہ اکثر اپنی ذات کو دوسرے لوگوں کے قالب میں بھی ڈھال دیتے ہیں۔ یہ نمایاں خصوصیت مجھے ان کے افسانے ''بے چہرہ آوازیں'' ''آخری کمرہ'' اور ''علاج'' میں نظر آئی ہے۔اِس قسم کے افسانوں کو سلطان جمیل نسیم نے اپنے تجربے کے جوہر سے نکھارا ہے۔حقیقت کے منفی روپ سے صداقت کا چہرہ دکھایا ہے' اور یوں کثیر الالبعاد حقیقتوں اور معانی کو محیط کیا ہے۔بلاشبہ ان کے جذبے کا رنگ تو ایک ہی ہے،لیکن متذکرہ بالا قسم کی کہانیوں میں انہوں نے اس ایک رنگ کو ہی کچھ اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان کی کمی بیشی سے ہمارے سامنے نہ صرف کئی رنگ آجاتے ہیں بلکہ ان سے کبھی نشاطیہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور کبھی حزنیہ لے اُبھر آتی ہے۔

افسانہ نگار جوگندر پال نے درست کہا ہے کہ:۔

''سلطان جمیل نسیم کی ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی آسیب موجود ہے اور قاری بظاہر خالی راستے پر چلتے ہوئے بھی کسی نادیدہ سے ٹکرا کر بمشکل گرتے گرتے بچتا ہے۔''

میرا خیال ہے کہ سلطان جمیل نسیم کا مقصد نہ قاری کو گرانا ہے اور نہ گرتے گرتے بچانا۔اُن کے پیشِ نظر تو ایک ہی مقصد ہے کہ وہ زندگی کے مشاہدے کو تجربے میں تبدیل کردیں.....تجربے کو متخیلہ سے مس کرنے کا موقع فراہم کریں' اور پھر وہ افسانہ معرضِ تخلیق میں لائیں' جس میں بقول ولیم فاکنر مشاہدہ' تجربہ اور متخیلہ کا امتزاج موجود ہوتا ہے اور قاری کو نہ صرف حقیقت سے آگہی ہوجاتی ہے بلکہ کہانی کے پسِ پردہ معنی اور نئی حقیقت سے بھی ملاقات ہوجاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ افسانہ لکھ کر سلطان جمیل نسیم اپنے اِس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں،اور یہی وجہ ہے کہ اردو افسانے کے تجربات کے گھمسان میں وہ ایک ایسی توانا شخصیت بن کر آئے ہیں جنکے فن کی توصیف ادب کی معتبر ہستیوں کی ہے۔

ڈاکٹر خالد سہیل (کنیڈا)

ادھوری کہانیاں۔۔ادھورے خواب

'وہ جب کھانی لکھنے بیٹھا تو اس کے ھاتھوں نے بغاوت کر دی'

کچھ میرا بھی ایسا ہی حال تھا جب میں سلطان جمیل نسیم کے افسانوں کے مجموعے 'ایک شام کا قصہ' کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے بیٹھا۔اس سے پہلے میں بیسیوں کتابوں پر تبصرہ اور درجنوں ادبی شخصیات کے بارے میں اپنی رائے لکھ چکا ہوں۔لیکن وہ کتاب پڑھ چکا تو میری آنکھیں نم تھیں اور ہاتھ شل۔میں بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جب انسان بہت کچھ کرنا چاہے تو 'کچھ بھی نہیں کر پاتا' 'کچھ بھی نہیں کہہ پاتا' کچھ بھی نہیں لکھ پاتا۔چنانچہ میں نے قلم رکھ دیا اور بہت دیر تک خلاؤں میں گھورتا رہا۔اب اس سحر سے قدرے باہر نکلا ہوں تو کچھ لکھنے بیٹھا ہوں۔

اس کتاب میں جو کہانیاں ہیں اور جو خواب ہیں وہ سب ادھورے ہیں۔ادھورے اس لئے نہیں کہ افسانہ نگار کے فن میں کوئی کمی ہے۔وہ ادھورے اس لئے ہیں کہ وہ متقاضی ہیں کہ قاری انہیں پڑھ کر اپنے اندر سمو لے اور وہ اس کے دل' اس کے ذہن اور اس کے شعور میں تکمیل کی حدوں کو چھوئیں کیونکہ یہی شہہ پاروں کا کمال ہے کہ وہ اپنے قاری کو شریکِ سفر بناتے ہیں اور مشترکہ منزلوں کی تلاش کی دعوت دیتے ہیں۔لیکن میں نے جونہی ان کہانیوں اور خوابوں کو جذب کرنا چاہا میرا دل زخمی ہونے لگا۔میرا ذہن کراہنے لگا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔میں ان کہانیوں کو اپنے شعور میں نہ رکھ سکا لاشعور میں اترنے لگیں اور ڈراؤنے خواب بن کر ڈرانے لگیں کیونکہ وہ خواب اس گلی' اس کوچے' اس شہر اور اس دھرتی کے ہیں جو میری بھی دھرتی ماں ہے لیکن میں نے پہلی بار افسانہ نگار کی زبان سے اس کی درد بھری کہانی سنی اور مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے اس دھرتی ماں سے جدا ہوئے اتنا طویل عرصہ ہوگیا ہے اور میں اس کے درد و غم سے اتنا دور ہوگیا ہوں کہ ان کے بارے میں سوچتا ہی نہیں اور اگر سوچتا بھی ہوں تو زیادہ غور نہیں کرتا اور اگر غور کرنا بھی چاہتا ہوں تو کسی جرنلسٹ کے کالم سے متاثر ہوکر' کسی صاحبِ دل اور صاحبِ ذوق افسانہ نگار کی نگارشات سے متاثر ہوکر نہیں۔

سلطان جمیل نسیم نے ان کہانیوں میں کراچی شہر اور پاکستان کا کچھ اس طرح نقشہ کھینچا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ان کہانیوں میں فن اور زندگی کے سارے رشتے موجود ہیں جو ہمیں اس شہر کے مختلف باسیوں کے درد اور غم اور کرب سے متعارف کرواتے ہیں۔وہ بتاتے ہیں کہ پچھلی چند دہائیوں میں امن اور سکون

سے زندگی گزارنے والے کیسے دہشت اور وحشت میں گھر گئے ہیں۔ان کہانیوں میں:

۔۔ان بچوں کی کہانیاں بھی ہیں جو بچپن سے ہی ماں باپ کے سائے سے محروم ہو جاتے ہیں۔

۔۔ان نوجوانوں کی کہانیاں بھی ہیں جو سکول اور کالج چھوڑ کر شدت پسند گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔

۔۔ان جوانوں کی کہانیاں بھی ہیں جو ملازمت چھوڑ کر پستول خرید لیتے ہیں اور بھتہ جمع کرنے لگتے ہیں۔

۔۔ان ماؤں کی کہانیاں بھی ہیں جن کے بیٹے صبح گھر سے جاتے ہیں تو لوٹ کر نہیں آتے۔

۔۔ان باپوں کی کہانیاں بھی ہیں جو ملکی حالات سے اتنا گھبراتے ہیں کہ بیٹوں کو امن کی زندگی گزارنے کے لئے امریکہ بھیج دیتے ہیں اور پھر ان بیٹوں کی لاشیں واپس آتی ہیں کیونکہ انہیں کسی نے پراسرار طریقے سے قتل کر دیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور

۔۔ان بہنوں کی کہانیاں بھی ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے بھائیوں کو سپاہی ہتھکڑیاں لگا کر لے جاتے ہیں

یہ کہانیاں پڑھتے پڑھتے انسان بھول جاتا ہے کہ دوست کون ہے اور دشمن کون' اپنا کون ہے پرایا کون۔کس سے بچا جائے' کس پر اعتماد کیا جائے۔یہ اس شہر کی کہانیاں ہیں جس پر خانہ جنگی کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں اور خوف نے خیمے گاڑ دیے ہیں۔یہ خوف شہر میں ان نقاب پوشوں کا روپ دھار لیتا ہے جو اجنبی انسان کو دن دھاڑے اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور جب وہ احتجاج کرتا ہے تو اذیت سہتا ہے

'میرے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ پڑا' پسلیوں پر گھونسا اور پنڈلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر'

نجانے کتنے معصوم انسان نجانے کتنی قتل گاہوں میں بے وقت کی موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں

بقول شاعر:

ہمارا شہر تو چھوٹا ہے لیکن ہمارے شہر کا مقتل بڑا ہے

اور جب کوئی قاتل کو تلاش کرنے نکلتا ہے تو اسے مصطفیٰ زیدی کا شعر یاد آتا ہے

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

جب شہر کا یہ حال ہو تو لوگ گھروں میں چھپ جاتے ہیں' فیکٹریاں بند ہو جاتی ہیں اور درختوں سے چڑیاں اڑ جاتی ہیں اور یہ کسی شہر کے لئے اچھا شگون نہیں ہے۔ایسے شہر میں رہنے کا اثر یہ ہے کہ ہر شہری کہتا ہے 'خوف ایک دھند کی طرح مجھ پر پھیلتا رہا'۔لیکن آخر ایسا کیوں ہے؟ ہر حساس شہری اور ادیب پوچھتا ہے کہ کس نے 'لڑکوں کے ہاتھ سے کتاب چھین کر کلاشنکوف تھما دی ہے'۔

سلطان جمیل نسیم ایک ماہر طبیب کی طرح اس شہر خوف کی علامات یوں بتاتے ہیں۔

'بچے کے منہ میں دودھ نہیں ہے خون ہے۔۔ماں کے سینے میں چھاتیاں نہیں ہیں زخم ہیں۔۔۔ جوانوں کی شہہ رگ سے فوارے نکل رہے ہیں۔۔بوڑھے خاک میں روندے جا رہے ہیں۔۔ہوا سسک سسک

کر کہہ رہی ہے بھاگ جاؤ۔۔زمین اچھال رہی ہے جاؤ۔۔پرچھائیاں چیخ رہی ہیں بھاگو۔۔میں کبھی انٹر کانٹی نینٹل کی طرف بھاگتا ہوں۔۔کبھی جنگل کی طرف دوڑتا ہوں۔۔اجتماعی قبریں منہ کھولے راستے میں پڑی ہیں'

علامات بتانے کے بعد وہ ایک مسیحا کی طرح تشخیص بھی کرتے ہیں اور چبھتے ہوئے سوال بھی پوچھتے ہیں۔

''رکشوں کے شور اور بسوں کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ نفرت کی دھند' بارود کی بو' مرنے والوں کی چیخیں' زخمی ہونے والوں کی کراہیں' پس ماندگان اور لواحقین کی گریہ وزاری سے ہوا بھی بوجھل ہوگئی ہے۔فضا اتنی مسموم ہوئی کہ لوگ اپنے روزگار پر جاتے ہوئے خوف کھانے لگے۔۔۔یہ خانہ جنگی کیسی ہے۔۔؟ متحد ہو کر اپنے اصل دشمن سے مقابلہ کیوں نہیں کرتے۔بھوک اور جہالت جو تمہاری نسلی دشمن ہیں انہیں کھلی چھوٹ کیوں دے رکھی ہے؟''

سلطان جمیل نسیم ہر صفحے پر قاری کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں اور اسے آئینہ دکھاتے ہیں لیکن وہ آئینہ چکنا چور ہو چکا ہے کیونکہ اس شہر کے باسیوں کی انائیں چکنا چور ہو چکی ہیں ان کی کرچیاں عوام و خواص کے لاشعور میں گھس چکی ہیں۔کتاب کے آخر تک قاری لہولہان ہو چکا ہوتا ہے۔

وہ کہانیاں پڑھ کر مجھے اپنی ایک غزل کے دو اشعار یاد آ گئے۔

کیا تم نے کبھی اپنا مقدر نہیں دیکھا ہر گھر میں جو بستا ہے یہاں ڈر نہیں دیکھا

راتوں کی تو کیا بات ہے اس شہر میں خالدؔ برسوں سے کبھی دن بھی منور نہیں دیکھا

آخر دن بھی منور نہ ہونے کی وجہ؟ بقول سلطان جمیل نسیم ''اندھیرے میں لپٹی ہوئی اتنی راتیں اور اتنے دن گزر چکے تھے کہ ان کے ذہن میں روشنی کا تصور بھی دھندلا سا گیا تھا''

سلطان جمیل نسیم نے اپنی کتاب کا نام اپنے افسانے 'ایک شام کا قصہ' کی وجہ سے رکھا ہے جس میں شہر کے میدان میں ایک لاش پڑی ہے اور سارے شہری اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پہچان نہیں پاتے ۔۔۔''اس لئے کہ وہ بے سر کی لاش ہے''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ وہ کون تھا جس کا سر قلم کر دیا گیا۔اس سر میں کیا سودا تھا جو دوسروں کے لئے اتنی پریشانی کا باعث بنا کہ وہ اسے قبول نہ کر سکے۔آخر ایک شخص آتا ہے بے سر کی لاش کو دیکھتا ہے اور ہجوم سے خطاب کرتے ہو کہتا ہے ''سنو۔۔یہ شخص۔۔یہ لاش جس کی بھی ہے وہ ہم میں سے تھا۔۔ہم شاید آج نہ پہچانیں۔۔لیکن کل۔۔ہماری گردنین اس کے احسان کے سامنے جھک جائیں گی کیونکہ یہ ہم میں سے ہے۔۔اور اس نے یہاں دیواروں میں پڑے شگاف دیکھے ہیں۔۔اس نے کوئی راستہ ضرور چنا ہوگا۔۔اس نے کوئی ایسی بات ضرور سوچی ہوگی جو ہم سب کو ایک لمبے عرصے بعد۔۔ایک عمر کی جدائی کے بعد۔۔اس سرزمین کی طرف لے جائے جو ہم سے روٹھی ہوئی ہے۔۔اسی لئے اس کا سر قلم کر دیا گیا۔۔آؤ۔۔ہم عہد کریں کہ اس دیوار کو۔۔۔''

لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے لوگ جانے لگتے ہیں۔وہ کہتا ہے:

'میری آواز ٹوٹ گئی۔۔میری بات ادھوری رہ گئی،،میدان میں کھڑے ہوئے لوگ آہستہ آہستہ رخ پھیر کے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف۔۔یہ اطمینان لئے واپس جا رہے تھے کہ ان کے سر ان کی گردنوں پر سلامت ہیں'۔۔۔۔۔کہانی کا یہ کردار آخر لاش کے قریب جاتا ہے اور کہتا ہے

''پھر میں اِس تنِ بے جان کے اوپر یوں لیٹ گیا کہ اب کوئی دیکھے تو اس کو یہ لاش۔۔۔بے سر کی نظر نہ آئے'' ایک مردہ جسم کو'ایک مردہ لاش کو اپنے سر کی قربانی دینا۔۔یہ سلطان جمیل نسیم کی ادبی کرامت ہے تخلیقی معجزہ ہے۔

ان کہانیوں میں سلطان جمیل نسیم جہاں قید و بند کی کہانیاں سناتے ہیں وہیں آزادی کے نغموں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔جہاں تاریکی کا نوحہ سناتے ہیں وہیں روشنی کا مژدہ بھی بیان کرتے ہیں۔جہاں رات کا ذکر کرتے ہیں وہیں صبح کی امید بھی دلاتے ہیں۔اور ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم سب مسافر ہیں اور قافلوں کا حصہ ہیں اور' مسافروں کے گھر نہیں ہوتے اور قافلے پڑاؤ ڈالتے ہیں' ان قافلوں کی آنکھوں میں امن کے' آشتی کے' انصاف کے خواب ہیں اور وہ ایسے نوجوانوں' ایسے مسافروں اور ایسے جیالوں کی تلاش میں ہیں جو اپنے آدرشوں کے لئے قربانیاں دے سکیں اور ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کر سکیں۔

سلطان جمیل نسیم کو یقین ہے ایک دن ان گلی کوچوں میں' اس شہر میں' اس دھرتی پر آشتی کا سورج نکلے گا

لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے۔کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ابھی خواب دیکھنے والے زندہ ہیں جو اس حقیقت سے باخبر ہیں

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا اور جوئے شیر لانے کے لئے وہ قربانیاں دینے کے لئے تیار ہیں

اگر سلطان جمیل نسیم میرے پاس ہوتے تو میں ان کو گلے لگاتا اور ان کا وہ ہاتھ چوم لیتا جس نے یہ فن پارے یہ شہہ پارے تخلیق کئے ہیں۔میری نگاہ میں 'ایک شام کا قصہ' ایک ایسی کتاب ہے جو اردو ادب میں ان کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

سلطان جمیل نے کہانی کی بنت اور اظہار کے لئے جو طریقہ اپنایا ہے وہ روایت سے گہری وابستگی رکھتے ہوئے بھی جدید انداز اور طرزِ احساس اور حسیت اظہار کے روایتی رویوں سے مل کر ان کے یہاں انفرادیت اور پہچان کی گواہی دیتے ہیں۔ان کی کہانیاں جدید عہد کے مسائل' فرد کی آزادی' اور آشوبِ شہر' شہروں کی میکانکی کیفیات اور کسی حد تک سیاسی سماجی صورت کا احاطہ کرتے ہوئے جدید عہد کے انسان کی بے سروسامانی اور دکھ درد کی تصویریں پیش کرتی ہیں۔اِن کا فرد آشوب زدگی میں جینے کی امنگ لئے مسلسل آگے بڑھنے اور زندہ رہنے کے عمل سے گزرتا ہے۔اظہاری طور پر انہوں نے اگرچہ جدید علامتی اسلوب کو نہیں اپنایا ہے لیکن روحِ عصر اور موضوع کی سماجی ہم آہنگی نے اِن میں جدید طرزِ احساس کو ایک عجیب مزاج اور لہجے میں نمایاں کیا ہے اور یہی ان کی پہچان ہے۔

رشید امجد

سلطان جمیل نسیم کی افسانہ نگاری

کے بارے میں تاثرات

ایک اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہئے کہ وہ جب معمولی سے واقعہ کو بھی مس کرے تو وہ ایک جیتی جاگتی کہانی میں تبدیل ہو جائے۔سلطان جمیل نسیم کو قدرت کی طرف سے یہی خوبی ودیعت ہوئی ہے۔اِسی لئے ان کے افسانوں میں 'کہانی پن' اپنی ساری جاذبیت اور تنوع کے ساتھ ابھرا ہے۔علامتی تجریدی افسانے کے اِس دور میں جب کہانی محض ایک ہیولا سا بن رہی ہے' سلطان جمیل نسیم نے کہانی واقعاتی بنیاد مہیا کی ہے مگر اِن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کہانی کو واقعہ کی سپاٹ سطح پر رہنے نہیں دیا بلکہ اسے اوپر اٹھا کر اس میں ایک نئی معنویت سمودی ہے۔میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ اردو افسانے کا مستقبل نہ تو محض واقعہ نگاری سے عبارت ہوگا اور محض علامتی تجریدی اندازِ اظہار سے بلکہ وہ اُس خاص ادب میں اُبھرے گا جس میں افسانہ، واقعہ میں مضمر اس کی معنوی پرچھائیں کو جلو میں لے کر برآمد ہوتا ہے۔سلطان جمیل نسیم کی افسانہ نگاری کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اِس میں اردو افسانے کا یہ مستقبل لَو دینے لگا ہے۔

اردو افسانے کے ایوان میں سلطان جمیل نسیم ایک دھماکے کے ساتھ نہیں آئے بلکہ خراماں خراماں داخل ہوئے ہیں۔یہی آہستہ روی ان کے افسانوں کی گہرائی اور پختگی کا باعث بھی ہے۔میری دلی آرزو ہے کہ ان کی یہ آہستہ روی اسی طرح برقرار رہے تاکہ وہ شہابِ ثاقب کی طرح اُبھرنے اور بجھ جانے والوں کے برعکس افسانے کے افق پر ایک روشن ستارے کی طرح چمکیں اور سدا چمکتے رہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا

سلطان جمیل نسیم کے اِس افسانوی مجموعے (کھویا ہوا آدمی) میں اگرچہ ایک ہی کہانی کا نام ''آسیب'' ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی آسیب موجود ہے اور قاری بظاہر ''مٹھی بھر روشنی'' کے سہارے ''گھر کا راستہ'' ڈھونڈتے ہوئے کسی نادیدہ سے ٹکرا کر بمشکل گرتے گرتے سنبھلتا ہے۔نئے آدمی کا یہ روگ اب کافی پرانا ہو چکا ہے کہ جب تک وہ آنکھیں موند کر نہ چلے اُسے اپنا آس پاس نظر ہی نہیں، آئے بھی کیسے اُسے کراچی سے چاند تک بھی جانا ہو' پھر بھی اپنے خون کے مانند دراصل اُسے سر سے پیر یا پیر سے سر تک ہی آنا ہوتا ہے۔اپنی منزلِ دروں میں ہی قدم اُٹھائے وہ نہ معلوم کن بیرونی اطراف کا رُخ کئے ہوتا ہے، نہ معلوم اُسے کہاں

پہنچنا ہوتا ہے۔انسان کی اِس گمشدگی کا احساس سلطان جمیل نسیم کو بجا طور پریشان کئے ہوئے ہے اور میں اُس کی پریشان حالی میں اُس کا تعاقب کئے جانا چاہوں گا کیونکہ بے خبری کی یہ عجیب وغریب وارداتیں انسانی ضمیر کئی ایسی ٹوہوں کی حامل ہوتی ہیں جن کے بغیر جینا باخبر معلوم نہیں ہوتا۔

جوگندر پال

اچھے اور کامیاب افسانے کی خوبی یہ ہے وہ قاری کے ذہن کو متاثر کرے۔ یہ اثر جتنا گہرا اور دیرپا ہوگا افسانہ اتنا ہی اچھا اور کامیاب قرار پائے گا۔سلطان جمیل نسیم کے افسانوں کا یہ بنیادی وصف ہے۔موضوع کے اعتبار سے اِن کے افسانے متنوع اور رنگارنگ ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلوب اور ہیئت انہوں نے نت نئے تجربات کئے ہیں، یہ تجربات محض تجربے کی خاطر نہیں کئے گئے بلکہ موضوع کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر کئے گئے ہیں۔سچ پوچھئے تو موضوع یا مرکزی خیال خود اپنی ہیئت اور تیکنک وضع کرتا ہے ایسا نہیں ہوتا پہلے تیکنک وضع کر لی جائے اور اس سانچے میں موضوع کو ڈھال کر افسانہ تخلیق کر دیا جائے، ہر چند کہ ایسی کوششیں کی جا چکی ہیں اور اُن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے' مگر وقت اور تجربے نے ثابت کر دیا کہ ایسے افسانے زیادہ عرصے زندہ نہ رہے۔نقش پر آب ثابت ہوئے، یہ بنیادی طور پر اظہار وابلاغ کا مسئلہ ہیوہ یہ ہے مرکزی خیال کس طور قاری تک پہنچایا جائے۔اور اِس طور پہنچایا جائے کہ وہ اس سے مسحور ہو جائے۔اُس کے ذہن میں نئے دریچے کھل جائیں۔خیالات میں بالیدگی اور نمو پیدا ہو۔سلطان جمیل نسیم کوچہء ادب میں نو وارد نہیں ہیں کم وبیش ربع صدی سے افسانے لکھ رہے ہیں۔وہ سلامت روی اور اعتدال سے آگے اور آگے بڑھتے رہے ہیں۔ان کا ہر قدم اپنے فن کے ارتقا کی جانب بڑھا ہے۔اس طویل سفر میں کتنے ہی صبر آزما مراحل آئے مگر فن سے ان کی لگن متزلزل نہ ہوئی چنانچہ فنِ افسانہ نگاری میں آج وہ اُس مقام پر نظر آتے ہیں کہ ان کا شمار اردو کے جانے پہچانے اور نمایاں افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔'کھویا ہوا آدمی' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے امید ہے ادبی حلقوں میں اسے قابلِ پذیرائی قرار دیا جائے گا اور اس کا خیر مقدم اسی جوش وجذبے سے کیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہے۔

شوکت صدیقی

'سایہ سایہ دھوپ'' میں شامل بائیس (۲۲) کہانیاں ہیں جو سلطان جمیل نسیم کے نادر اور بے سکون کر دینے والے فن سے متعارف کراتی ہیں۔وہ لفظ کے اصل معنی میں ایک داستان گو ہیں اور کہانی کو صفائی سے، اختصار سے' دلبستگی سے بیان کرنے کا ملکہ ان کو حاصل ہے۔کہانی کی ابتدا ہی سے وہ پڑھنے والے کو کالرج کے قدیم THE ANCIENT MARINER کی طرح اپنی گرفت لے لیتے ہیں اور اُس وقت تک اُسے آزاد نہیں کرتے جب تک کہانی ختم نہ ہو جائے۔ان کا ہاتھ بہت سبک ہے مگر بڑا کاریگر ہے۔وہ آرائشی نثر نگاری یا ارغوانی عبارت کا سہارا لئے بغیر بڑے قدرتی ڈھنگ سے اپنی کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں جس میں کوئی جھول نہیں ہوتا، نہ ہی قاری کے لئے دہچکا۔وہ تجریدی یا علامتی داستان گوئی کو حرام نہیں سمجھتے بشرطیکہ کہانی کا مفہوم ہی خبط ہو کر نہ رہ جائے مگر

اِس مجموعہ کی بیشتر کہانیاں روایتی ہیں۔منشی پریم چند، راجندر سنگھ بیدی،سعادت حسن منٹو اور غلام عباس کی عظیم روایت میں لکھی ہوئی۔اِن کی اثر انگیزی اور فنی پختگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔عنوانی کہانی ''سایہ سایہ دھوپ'' دو پاگل عورتوں، ایک حرامی لڑکے اور ایک ڈسپلن قائم رکھنے والے وارڈن کی حیران کن کہانی ہے۔اتنی اچھی' خالص کہانی میں نے اردو میں ایک مدت کے بعد پڑھی ہے۔اس مجموعہ میں دوسری بھی بہت سی اور کہانیاں ہیں جو مجھے پسند آئیں۔ سلطان جمیل نسیم میرے لئے ایک نئی دریافت ہیں ایک نہایت خوش کن دریافت۔وہ ایک اوریجنل (original) تیز نظر اور دلچسپ کہانی لکھنے والے ہیں اور میں انہیں سلام کرتا ہوں.....

محمد خالد اختر

او بھائی تیرے اندر تو ایک داستان گو سو رہا ہے جسے تُو کھویا ہوا آدمی کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی لوریاں سنا کر اور سلا رہا ہے تھپکیاں دے رہا ہے۔ناول لکھ۔تیرے پاس زبان ہے اور بیان کرنے کو آج کل کے حالات بھی پکار رہے ہیں جو سیاسی' سماجی' فوجی' ڈھونگی' مذہبی بدماشیوں اپنی سیدھی سیدھی سچی سچی الجھاوے سے پاک زبان میں لکھ دے۔ یہ سب ایک بڑے ناول میں سمویا جا سکتا ہے مجھے تیری کتاب پڑھ کے یہی سوجھا کہ ناول کا مشورہ دوں۔تو چل پتر۔میرا کہا مان اور ہو جا شروع۔

ممتاز مفتی

''کھویا ہوا آدمی'' کے افسانے ہر لحاظ سے عمدہ اور دلکش ہیں۔ یہ افسانے زندہ مسائل پر زندہ افسانے ہیں۔

عرش صدیقی

آپ کی کہانیاں مجھے اچھی لگیں۔اِن میں روایتی کہانی کے برعکس اختصار اور ایجاز کی خوبیاں ہیں۔آپ نے ان کا مواد ہم عصر معاشرے اور اردگرد کی جیتی جاگتی زندگی سے کشید کیا ہے۔اِن میں ریڈا ایبلٹی ہے جو کسی کامیاب کہانی کی پہلی شرط ہوتی ہے۔بعض علامتی انداز کی کہانیاں مثلاً ''کھویا ہوا آدمی'' ''خالی ہاتھ''۔''عذاب'' اور ''گھر کا راستہ' نیا ذائقہ لئے ہوئے ہیں۔میں ایسی ہی علامتیں پسند کرتا ہوں جو معنی کا دائرہ وسیع کر دیں، تاثر میں شدت پیدا کر دیں اور قاری کو بھٹکنے بھی نہ دیں۔شناخت۔جنریشن گیپ اور میرے لئے، حقیقت نگاری کے اسلوب میں لکھی ہوئی نہایت عمدہ کہانیاں ہیں۔مجموعی طور پر مجھے آپ کی سب ہی کہانیاں کامیاب اور اچھی معلوم ہوئی ہیں۔تنوع نہ صرف آپ کے موضوعات میں ہے بلکہ آپ کا اسٹائل بھی جامد نہیں ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

محمد منشا یاد

سلطان جمیل نسیم اُن قابلِ ذکر افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو 'کہانی' اور 'افسانہ' کے فرق کی بابت شعوری

ہوئے بغیر اپنی کاوشوں میں مگن ہیں۔ وہ پہلے سے طے شدہ مفروضات کی عینک سے ہم عصری حقیقتوں کا مشاہدہ نہیں کرتے، شاید یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ وہ ہیئت کے بارے میں متشدد ہونے کے کے بجائے اُسے اپنے مواد پر چھوڑ دیتے ہیں۔ سلطان جمیل نسیم کے افسانوں میں حقیقت پسندی، اشاریت پسندی اور علائم نگاری کی تیکنک اپنی ضرورت کے مطابق نظر آتی ہے۔ وہ انسانی زندگی کے قابلِ مطالعہ رُخ کو اپنی آنکھوں اور ذہن سے بیک وقت دیکھتے ہیں۔ صرف یہی اِن کا وصف خاص نہیں ہے بلکہ ان کی انفرادیت کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مشاہدہ ہی میں مطالعہ اور محاکمہ کے عناصر کچھ اِس طرح پرو دیتے ہیں کہ ان کی تخلیقات میں کہانی کا حسن بھی باقی رہتا ہے اور اِس کے ساتھ افسانہ نگار مجہول غیر جانب داری کے الزام سے بھی بَری الزمہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

سلطان جمیل نسیم کے بارے میں یہ بات میں لکھ چکا ہوں کہ وہ ۵۰ کی دہائی سے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے یوں تو پاک و ہند کے تمام ہی اہم رسائل شائع ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر تخلیقات ''سیپ'' ہی میں اشاعت پذیر ہوئی ہیں۔ سلطان جمیل نسیم کے فن یا اُن کی تخلیقات کے بارے میں یہ بات واضح طور کہی جاسکتی ہے کہ اُن کے افسانوں میں شہری زندگی کی بیشمار تصویریں مختلف زاویوں اور نو بہ نو رنگوں کے ساتھ اِس طرح بیان ہوتی ہیں کہ قاری سے مکالمہ کرنے لگتی ہیں اور یہ میرے نزدیک اِس بات کی بھی دلیل ہیں کہ انہوں نے ذاتی تشہیر پر توجہ مرکوز رکھنے کے بجائے اپنے فن کو مرکزِ فکر و نظر بنائے رکھا ہے۔ اگرچہ سلطان جمیل نسیم کے فن پر ایم اے کی سطح پر کئی مقالے تحریر کئے جا چکے ہیں، حال ہی میں جناب اکرام بریلوی نے سلطان جمیل نسیم کے افسانوں کو موضوع بنایا ہے۔ ایک بزرگ ناول نگار اور نقاد کی جانب سے اپنے عہد کے ایک اہم افسانہ نگار کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کے ساتھ دوسرے ناقدین کو اپنے عہد کے افسانے کی طرف توجہ مبذول کرانے کی ایک سعئ کامیاب بھی کہی جاسکتی ہے۔

نسیم درانی

آپ کے پاس حسنِ تحریر بھی اور سلیقۂ تالیف بھی اور پھر یہ بھی ہے کہ مطالعے، مشاہدے اور جذبات کی خوبصورت آمیزش آپ کو اُس ذہنی الجھن کا شکار نہیں ہونے دیتی جو موجودہ دَور کے افسانہ نویسوں کا خاصہ بن چکی ہے یعنی ایک بیمار داخلیت۔ آپ باہر کی دنیا میں سانس لینے کے عادی ہیں اِسی لئے آپ کے کرداروں میں جان ہے اور تحریر کی دلچسپی آخیر تک برقرار رہتی ہے۔ ابہام کے بہانے جو ادب عوام کے سامنے آج کل پیش کیا جا رہا ہے وہ صرف مصنف کو تو خوش رکھ سکتا ہے کہ انسانی کردار کی گہرائیوں اترنے کی صعوبتیں برداشت کئے بغیر اپنی علمیت کا لوہا پڑھنے والے (یا پڑھنے کا بہانہ کرنے والے) سے منوالیں لیکن ایسا ادب میرا خیال ہے ہمارے معاشرے

میں کوئی تبدیلی نہ لا سکے گا۔ مجھے آپ سے ایسی کوئی شکایت نہیں......

ڈاکٹر حسن منظر

سلطان جمیل نسیم کے جتنے افسانے میں ابتک پڑھ چکا ہوں اُن میں ''میں آئینہ ہوں'' تازہ ترین مجموعہ ہے۔ سلطان جمیل نسیم کے فنِ افسانہ نگاری میں متخیلہ کا کردار یا لوازم اِن کے معاصر افسانہ نگاروں سے فائق ہے کہ اِس میں اِن کی امیجری کے خدوخال نمایاں اور شوخ ہیں۔ سترہ افسانوں کے اِس مجموعے میں عہد بہ عہد کے معاشرتی عوامل کا ارتقائی عکس بھی ہے اور اِن کے شعور کے ارتقاء کو بھی افسانوں کے بین السطور میں پڑھا جا سکتا ہے۔ ان کی متخیلہ میں ڈرامے کی کیفیت بھی آشکارہ ہے مگر خوشی کی بات ہے کہ ڈرامائیت میں ملوث ڈرامے کی بات نہیں بلکہ نہایت آہستہ روی، شائستگی اور دھیمے انداز میں قاری پر اِس نکتے کو منکشف کرانے کا ہنر انہیں معلوم ہے جو انہیں کامیاب افسانہ نگاروں کی صفِ اول میں جگہ دیتا ہے۔ اصل میں متخیلہ کی تخلیقی تمازت سے لے کر فنکارانہ چابکدستی کے مراحل کو وہ جس خوش اسلوبی سے طے کر جاتے ہیں اسے صاحبانِ بصیرت ہی سمجھ کر داد دے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل

سلطان جمیل نسیم نظر اور نظریہ کے درمیان ایک نقطۂ اتصال ہے۔ اس کے افسانے شعور اور وجدان ہم آہنگی سے جنم لیتے ہیں وہ اپنے تخلیقی سفر میں نہ اپنے تجربہ اور مشاہدہ سے انکار کرتا ہے اور نہ تجربہ اور مشاہدہ کے دوش بدوش بصیرت کی نظر نہ آنے والی لہر سے بے تعلق ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اِس کے افسانے ایک خوشگوار احساسِ تحیرّ کے ساتھ ہمیں زندگی کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر کی طرف بھی مائل کرتے ہیں۔ ہمارے میں ایک سچے اور کامیاب افسانہ نگار کا مقصد اس کے سوا کچھ اور ہے بھی نہیں۔

احمد ہمدانی

فنکار اپنے ذہن کی تنہائیوں میں زندہ رہتا ہے۔ اُس کے پاؤں اپنی دھرتی سے جڑے ہوتے ہیں۔ سلطان جمیل نسیم کا افسانوی مجموعہ ''ایک شام کا قصہ'' پڑھ کر احساس ہوا کہ وہ فکشن کے بجائے Factual Fiction میں یقین رکھتا ہے۔ اس نے اپنے معاشرے کے تہذیبی، طبقاتی، معاشی، سیاسی اور تاریخی تضادات کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے، بلکہ اپنی تخلیقات کا خام مواد بھی وہیں سے حاصل کیا ہے، پھر اُسے اپنی کہانیوں میں سموتے وقت خود سے انگنت جنگیں لڑی ہیں، اپنا خون جلایا ہے تب کہیں ''ایک شام کا قصہ'' اپنے رنگ روپ میں سنور کر منظر عام پر آیا ہے، گو اِس مجموعے کی تمام کہانیاں یک موضوعی ہیں لیکن ایک ہی موضوع پہلو در پہلو لکھنا انتہائی مشکل کام ہے۔ قد آور ادیب بھی میدان چھوڑ جاتے ہیں لیکن سلطان جمیل نسیم نے اپنی تخلیقی زبان، پختہ کرافٹ، بلند تخیل، منطقی جزیات اور فنی صلاحیتوں کے ساتھ اپنے افسانوں کو نہایت کامیابی سے لکھا ہے۔

جتندر بلو

سلطان جمیل نسیم

من مانی

عبدالغنی قریشی کو سینتیس (۳۷) سال کی ملازمت نے تھکا دیا تھا۔ رہی سہی کسر بیوی کی موت نے پوری کر دی، وہ اس بات کو بھی قدرت کی کوئی مصلحت سمجھتا تھا کہ کوئی بیٹی نہیں تھی اب گھر میں کسی عورت کی آواز سننے کی ایک ہی سبیل رہ گئی تھی کہ اُس کے دونوں بیٹے وجاہت اور شباہت، جن کا یونیورسٹی میں یہ آخری سال تھا۔ وہ تعلیم سے فارغ ہو جائیں تو گھر میں بیٹی کی کمی دور ہو اور بہوؤں کی چوڑیوں کی کھنک گھر کو گھر ہونے کی صدا دے، بیٹی کی خواہش کا اظہار کبھی اُس کی بیوی نے بھی نہیں کیا تھا دونوں اپنی تمنا دل میں لئے بیٹھے رہے، خیر بیوی تو اپنی آرزو اپنے ساتھ لیکر چلی گئی لیکن قریشی کی خواہش بیٹوں کے ساتھ جوان ہوتی رہی، بیٹوں کا نتیجہ آنے سے پہلے قریشی کو ایک غیر متوقع امتحان سے گزرنا پڑا۔ بڑے بیٹے وجاہت نے ایک دن، رات کے کھانے پر بظاہر چھوٹے بھائی کو مخاطب کر کے کہا۔

''مجھے امریکا کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہے فیس اور رہائش کے لئے یونیورسٹی میں ہی ایک جاب کی بھی آفر ہے۔ دو سال کا کورس ہے۔ اُس کے بعد پھر آگے راستہ کھلا ہی کھلا ہے۔'' یہ آخری جملہ کہتے ہوئے اس نے اپنے والد کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔

عبدالغنی قریشی نے کسی ردِعمل کا اظہار تو دور کی بات ہے بیٹے کی طرف نظر اُٹھا کے دیکھا بھی نہیں اور جس دھیمے انداز میں کھانا کھا رہا تھا اسی طرح چھوٹے چھوٹے نوالے توڑ کر کھاتا رہا۔ البتہ شباہت نے اِس اطلاع پر جواباً کہا۔ ''بھائی۔ مجھے یقین ہے کہ اس بار بھی میری پوزیشن آئے گی۔ وہاں میرے لئے بھی کوئی جاب دیکھئے گا''

''تم اپنا رزلٹ آجانے دو۔ تمہارے لئے تو وہاں بڑی گنائش ہے ....فزکس کے لوگ ملتے کہاں ہیں۔ مجھے تو ابا میاں کی فکر ہے۔ اکیلے رہ جائیں گے''

اب قریشی نے منہ کا نوالہ نگل کر کہا۔

''میری فکر نہ کرو....تمہاری ماں کے گذر جانے کے بعد بھی کوشش یہی کی ہے کہ تمہارے کسی کام میں کوئی خلل نہ پڑے۔۔ رہی میری زندگی تو وہ جتنی بھی ہے جیسے تیسے گذر ہی جائے گی۔ تم لوگ اپنے مستقبل کی طرف دھیان دو''

یہ سن کر وجاہت کے چہرے پر ایک اطمینان کی جھلک نظر آئی مگر اُس نے پہلے سے ذرا دھیمی آواز میں کہا۔

''مگر ابا میاں وہاں جانے کے لئے تو کچھ رقم کی ضرورت ہوگی ہی۔''

''کتنی رقم کی۔؟''

''اندازاً پچھتر ہزار کا تو ٹکٹ ہوگا۔ اور ہاتھ میں بھی کم از کم ہزار پانچ سو ڈالر تو ہونے ہی چاہئیں۔''

''کیوں آپ تو کہہ رہے تھے وہاں جاب مل جائے گی'' شباہت نے کہا

''جاب تو مل جائے گی...مگر تنخواہ تو ایک مہینے بعد ہی ملے گی۔''

''میں نے سنا ہے وہاں ویکلی بیسس (Basis) پر پیمنٹ (Payment) ہوتا ہے۔''

''اب یہ سب تو وہاں جا کر ہی پتہ چلے گا۔''

عبدالغنی قریشی نے بیٹوں کی بات سنی اور آخری نوالہ نگلنے کے بعد کہا۔

''پردیس میں آدمی کو خالی ہاتھ نہیں جانا چاہئے...میں تمہیں ہزار ڈیڑھ ہزار کا ڈرافٹ بھی بنوا کر لا دوں گا...مگر جانا کب ہے۔؟''

جواب سننے سے پہلے عبدالغنی قریشی کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھونے کے لئے اُٹھ گیا۔ وجاہت بھی اُٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ قریشی نے اپنی مخصوص آرام کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا اور ابھی اطمینان سے دو کش بھی نہیں لئے تھے کہ وجاہت ایک فائل لے کر اُن کے پاس آیا۔

''دیکھئے ابا میاں اس فائل میں وہاں کی یونیورسٹی کا لیٹر بھی لگا ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ During the study وہ جاب بھی provide کریں گے۔''

قریشی نے فائل کو ہاتھ لگائے بغیر کہا۔ ''مجھے کیا دکھاتے ہو.... یہ سب تمہارے سوچنے سمجھنے کی باتیں ہیں..اپنا مستقبل دیکھو اور بس۔''

دوسرے دن دفتر سے آنے میں معمول کی تاخیر ہوئی لیکن قریشی نے وجاہت کو دیکھتے ہی کہا....

''آج میں نے کہہ دیا ہے۔ کل تک تمہیں ڈرافٹ مل جائے گا۔ کپڑے لتوں کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا دینا۔

دونوں بھائیوں کے لئے باپ کا رویہ توقع کے خلاف تھا۔ کم از کم وجاہت تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اکیلے رہ جانے کا ضرور تذکرہ کریں گے۔ جب کھانے کی میز پر بیٹھے تو قریشی نے چھوٹے سے پوچھا۔

''تم نے بھی کہیں باہر جانے کا سوچا ہے یا یہیں نوکری کرو گے۔؟''

''فی الحال تو میں یہ دیکھوں گا کہ اگر یہاں کوئی قائدے کی جاب مل جاتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ بھائی وہاں میرے لئے کچھ کریں گے۔ یا پھر آپ ہی کچھ سوچیں گے۔''

''دیکھو یہ ملک میری عمر اور مجھ سے بڑی عمر کے لوگوں نے بے شمار قربانیاں دیکر حاصل کیا ہے....ہمارے قائدین میں جناح صاحب تھے سر آغا خان تھے، چودھری خلیق الزماں اور چودھری ظفر اللہ تھے، شیرِ بنگال مولوی عبدالحق تھے.....جس پاکستان کا تصور تھا....وہ تو جناح صاحب کی موت اور لیاقت علی کی شہادت کے بعد بتدریج ختم ہوتا گیا۔ اب بظاہر یہ اسلامی ملک بھی نہیں ہے اور ایسا سیکولر بھی نہیں ہے جس کا تصور بانیانِ ملک کے ذہن میں

تھا۔اب لوٹ کھسوٹ،ایک دوسرے کے حقوق چھیننے میں سب لگے ہیں....تمہاری ماں کے گذر جانے کے بعد، میں بھی اس لئے جئے جارہاہوں کہ خودکشی کرنے کی ہمت نہیں ہے....جب میں اپنے بارے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تو تم لوگ جو' موجودہ عہد کے پروردہ ہو....اردو سے زیادہ انگریزی سمجھتے ہو.... اِس ملک سے زیادہ مغربی معاشرہ میں رہنے کے خواہش مند ہو تو میں تمہارے بارے میں کیا سوچوں..ممکن ہے میری رائے تمہاری راہ میں رکاوٹ بنے....اس لئے اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرو۔میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب تمہاراہی ہے....مجھے ساتھ نہیں لے جانا....میرے بعد بھی تمہارا ہوگا.... اِس لئے اپنی کوئی ضرورت روکومت۔...میں کیوں کہ آج کا آدمی نہیں رہا اس لئے تمہارے بارے میں یا تمہارے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی نہیں کرسکتا....بس یہی میری رائے ہے اور یہی میرا کہنا۔'' قریشی نے اتنا کہنے کے بعد اخبار آنکھوں سے لگالیا۔

یہ انداز قریشی کا آج کا نہیں تھا۔کم بولتا اور کم کھاتا تھا۔دنیاداری میں بھی بیوی ہی نے لپیٹا تھا۔اُسی کے کہنے سے مکان خریدلیا۔اسی کی منشا کے مطابق دوسری منزل بنوالی،اُسی کے مشورے سے انشورنس کرالی۔جب بیوی زندہ تھی تب بھی وہ اپنی ساری تنخواہ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔بس کا کرایہ اور اخبار کا بل.... یہ اُس کی ضرورت تھے۔ناشتہ کے بعد بیوی دس روپے کا نوٹ خاموشی سے میز پر رکھ دیتی تھی، جب دو چار دفعہ ایسا ہوا کہ قریشی کو واپس آنا پڑا کہ وہ نوٹ اُٹھانا ہی بھول گیا تھا تب بیوی چلتے وقت یہ کہہ کر آمد ورفت کا کرایہ دے دیتی تھی کہ احتیاط سے رکھنا کہیں راستے میں گر نہ جائے یا کوئی ایسی چیز منگانا ہوتی جس کے ملنے کا امکان محلے کی دوکانوں پر نہ ہوتا تو مطلوبہ شے کا نام ایک کاغذ پر لکھ کر اسی میں قیمت رکھ دیتی تھی۔اپنی بیماری کے دوران گھر کی دیکھ بھال اور کھانا پکانے کی ذمہ داری بیوی نے شکورے کی ماں کے سرڈال دی تھی جس کو وہ اپنے بچپن سے جانتی تھی۔

قریشی جنسی طور بھی کوئی گرم آدمی نہیں تھا.بیوی خود ہی پہلو میں آکر لیٹ جاتی تھی.... وجاہت کی پیدائش کے بعد قریشی نے صاف طور سے کہہ دیا کہ مجھے سویرے اُٹھ کر کام پر جانا پڑتا ہے اور رات بھر بچے کے کلبلانے اور تمہارے کروٹیں لینے اور بچے کو بہلانے پچکارنے کی وجہ سے دن بھر نیند آنکھوں میں کھٹکتی رہتی ہے۔بس اُسی دن سے بیوی نے اپنا بستر دوسرے کمرے میں لگالیا.... پہلا بیٹا تو ہونا ہی تھا۔دوسرے بیٹے شباہت کے بعد بیوی کے پیٹ میں رسولی ہوگئی تو سال بھر تک علاج معالجہ ہوتا رہا اور وہ قریشی کے کمرے کی طرف جھانکنے سے بھی اجتناب کرتی رہی،قریشی نے بھی کبھی اسے آواز دینے کی کوشش نہیں کی....سال بھر سے زیادہ الگ رہنے کے بعد ایک رات وہ خود ہی آگئی۔

میاں بیوی ہونے کے باوجود ان میں کبھی اشاروں کنایوں بھی جنسی موضوعات پر باتیں نہیں ہوتی تھیں، ہاں اخبار میں کوئی ایسی خبر آجائے جس میں قتل کی وجہ جنسی ہیجان یا شدت بیان کی گئی ہو... یا کوئی بال بچوں والی عورت کسی کے ساتھ فرار ہو جائے.... یا کوئی نابالغ لڑکی اپنی عزت لٹا بیٹھے.... یا ایک عورت کی آبروریزی کے لئے کوئی ٹولی گھر میں کود پڑے تو ایک سطر کی سرخی سنا کے قریشی یہ ضرور کہہ دیتا کہ....یہ عجیب خبر ہے فرصت ملے تو پڑھ لینا...اور جب بھی اسے گھر کے کام کاج سے فرصت ملتی وہ اُس خبر کو پڑھنے کے ساتھ دوسری خبریں بھی پڑھ ڈالتی

اور شام کو جب قریشی کھانا کھانے کے بعد اپنی آرام کرسی پر بیٹھا ہوتا تو وہ تمام اہم خبریں گوش گزار کر کے صرف اتنا تبصرہ کرتی ''کیسا زمانہ آگیا ہے۔آج کی عورت کو نہ بچوں کا خیال ہے نہ اپنے گھر کا.....اور مرد بھی کتنے بے غیرت ہوگئے ہیں کہ ایک لڑکی کے ساتھ چار پانچ.....''

اور قریشی ہلکے سے طنزیہ انداز میں کہتا۔''زمانہ ترقی کررہا ہے۔''

اور وہ خالص گھریلو انداز میں کہتی۔''خاک پڑے ایسی ترقی پر''

جب وہ دوسری مرتبہ آپریشن کے لئے اسپتال میں داخل ہوئی تھی تو قریشی کے معمول میں فرق یہ پڑا تھا کہ بینک جانے کے لئے گھنٹہ بھر پہلے نکلتا، بیوی کے پاس ہوتا ہوا دفتر جاتا اور دفتر سے اٹھنے کے بعد اسپتال میں گھنٹہ دو گھنٹہ بیوی کے پاس جا کے ضرور بیٹھتا۔ڈاکٹر نے کوئی نئی دوا لکھی ہوتی تو وہ لا کے رکھ دیتا۔ڈاکٹری رپورٹ پڑھتا۔اِس دوران وہ پوچھتی رہتی....شکورے کی ماں سویرے وقت پہ آ کے ناشتہ بنا دیتی ہے۔؟ دونوں بچوں کو آپ خود اسکول چھوڑ کر آتے ہیں۔؟ معلوم نہیں اسکول سے واپسی پر وہ کھانا ٹھیک سے کھاتے بھی ہونگے یا نہیں......رات کو تو آپ اپنے ساتھ ہی بٹھا کر کھلاتے ہونگے ؟ اس کے سب سوالوں کا جواب اثبات میں دیتا رہتا....اتوار کی اتوار دونوں بچوں کو ساتھ لا کے ماں سے ملوا دیتا.... جب بچے سامنے ہوتے تو وہ ایک طرح سے قریشی کو نظر انداز کردیتی....اور وہی سب باتیں پوچھتی رہتی جو ہفتہ بھر قریشی سے معلوم کرتی رہی تھی....قریشی کو مخاطب کر کے صرف اُس کمی کی نشان دہی کرتی جو بچوں کو دیکھ کر محسوس کی ہوتی۔

''شکورے کی ماں کو وجاہت کی یہ قمیض دکھایئے گا ایک بٹن آستیں کا ٹوٹا ہے اور ایک گلے کا بھی جھول رہا ہے۔اسکول کے یونیفارم تو ٹھیک سے دھو کے استری کردیتی ہے یا اُن میں بھی میل چمٹا رہ جاتا ہے۔؟''

دو مہینے تک وہ اسپتال میں رہی جس روز اُس کے چہرے پر صحت مندی کے آثار قریشی کو دکھائی دیئے اُس کے دوسرے ہی دن وہ دینا سے پردہ کرگئی۔اُس دن دونوں بچوں کے سالانہ امتحان کا پہلا دن تھا۔قریشی ان کو امتحانی مرکز چھوڑنے گیا تو راستہ میں صرف اتنا پوچھا اب تمہارا امتحان کے دن بعد ہے۔ ؟ بچوں کا جواب سننے کے بعد پوچھا۔اسٹڈی تو مکمل ہے۔؟ دونون نے اطمینان بخش جواب دیا جس کو سن کر قریشی نے کہا۔

''آج میں نے بینک سے چھٹی کی ہے اس لئے تمہیں لینے میں ہی آؤں گا۔کب تک پرچہ ختم ہو جائے گا۔؟ دونوں لڑکوں نے اندازاً وقت بتادیا۔اُس نے کہا، فرض کرو مجھے ذرا دیر ہو جائے پھر بھی تم اسکول میں ہی رہنا، میں چوکیدار کو سمجھائے دیتا ہوں، میرے آنے تک وہ تمہارا خیال رکھے گا۔''

پانچویں چھٹی کلاس کے دونوں بیٹوں کو اسکول چھوڑ کر اسپتال گیا۔وہاں سے بینک فون کیا اور غیر حاضری کی وجہ بتائی پھر قریبی عزیزوں کو فون کر کے اطلاع دی پھر اسپتال کا حساب کتاب چکتا کر کے ایمولنس میں بیوی کی میت گھر لایا۔خاندان کی اور محلے کی چند خواتین جمع ہوگئی تھیں۔میت گھر میں آتے ہی رونے اور آہ وبُکا کا شور اٹھا۔گھنٹہ بھر میں سارے ہی عزیز جمع ہوگئے تھے۔کسی قریبی رشتہ دار نے اطلاع دی کہ قبر کی جگہ کا انتظام ہوگیا ہے، کسی نے کہا،غسل کرانے والی خاتون اپنے ساتھ ہی کفن سینے والی کو بھی لے آئی ہیں اور یہ اُن کے خرچہ کا حساب

ہے۔قریشی نے فوراً حساب صاف کیا۔کسی فلاحی ادارے کی میت گاڑی بھی قبرستان لیجانے کے لئے آ گئی تھی۔ظہر کی نماز کے بعد تدفین ہوئی۔گھر سے قبرستان تک جو کچھ خرچ ہوتا رہا وہ ادا کرتا رہا،اس تمام عرصہ میں وہ بالکل پُرسکون تھا۔اگر فکر تھی تو صرف اتنی کہ اسکول کے چوکیدار کو جو وقت دیا ہے اُس سے پہلے ہی بچوں کو لینے کے لئے پہنچ جائے،عزیز اقارب میں سے جو بھی آتا وہ گلے مل کر پُرسا دیتا،صبر کی تلقین کرتا اور قریشی یہ سوچتا کہ بچوں کو لینے وہ مقررہ وقت پر پہنچ بھی سکے گا یا نہیں....جو رشتہ دار اپنی گاڑی میں اُس کے گھر آئے تھے اُن میں سے چند میت گاڑی میں ہی بیٹھ کر قبرستان گئے۔تدفین کے وقت بے اختیار نکل آنے والے قریشی کے چند آنسو بھی دفن ہو گئے۔واپسی پر اُس نے اپنی بہن سے کہا کہ وہ دونوں لڑکوں کو لینے جا رہا ہے۔تب بہت سے عزیزوں کو یہ معلوم ہوا کہ دونوں بیٹے اسکول میں ہیں تو کسی خاتون نے اعتراض کیا،یہ تو سراسر ظلم ہے بچوں کو آخری بار ماں کی شکل تو دکھا دی ہوتی۔خواتین اِس بحث مباحثہ میں الجھی رہیں۔قریشی نے بیٹوں کو اسکول سے ساتھ لیا،پہلے اُن سے پوچھا کہ پرچہ کیسا ہوا۔۔پھر رکشا میں بیٹھ کر اُس نے لمحہ بھر یہ سوچا کہ بیٹوں کو یہ خبر کیسے سنائے۔!

''تمہاری امی دو مہینے سے اسپتال میں تکلیف جھیل رہی تھیں۔آج وہ ساری تکلیفوں سے نجات پا گئیں۔''

دونوں بیٹوں نے باپ کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھے تو قریشی سمجھا کہ جو زبان سے نہیں کہہ سکا وہ اُس کے آنسوؤں نے بیٹوں کو بتا دیا۔کسی عزیز نے تیسرے دن سوئم کا انتظام کر دیا تھا اور اسی دن دونوں لڑکوں کا دوسرا امتحانی پرچہ تھا۔۔قریشی کو بتایا گیا تو اُس نے پوچھا کیا گھر پر بھی کھانے کا بندوبست کرنا ہوگا تو بہن نے کہا۔اے بھیا کیا پُرسے کو آنے والوں اور مرحومہ کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچانے کے لئے کلام مجید پڑھنے والوں کو بھوکا مارو گے..؟ قریشی نے تو اپنے طور پر یہ انتظام یہ کیا تھا کہ مسجد میں ظہر اور عصر کے درمیان قرآن خوانی رکھی تھی،پیش امام صاحب کو،اُن سے پوچھ کر ہی وہ رقم ادا کر دی تھی جو تلاوت کرنے والے مدرسہ کے بچوں کو دینے کیلئے انہوں نے بتائی تھی،اور قریب کے ایک بھٹیار خانے سے کہہ دیا تھا کہ دس بجے سے ظہر تک جتنے فقراء آئیں ان کو کھانا کھلا دیا جائے۔اب ہمشیرہ کے کہنے سے ایک پکوان ہاؤس جا کر شیر مال قورمہ اور میٹھے کا آرڈر دیا۔گھر کا پتا لکھوایا اِس تاکید کے ساتھ کہ یہ سب وقت پر پہنچنا لازمی ہے۔

بیٹوں کو ماں کی دائمی جدائی کا شدید احساس ہوا لیکن ساتھ میں نہ کوئی خالہ رہتی تھیں نہ پھوپی اسی لئے بچوں نے صرف باپ کے اکیلے رہ جانے کو ہی محسوس کیا۔ماں کی عدم موجودگی اور باپ کی بھرپور شفقت کا ردِعمل یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز تعلیم کو اور پھر اپنے والد کی خوشنودی کو بنا لیا۔جب بڑے بیٹے نے ملک سے باہر جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو اُس کو توقع تھی کہ باپ کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا۔لیکن معاملہ برعکس نکلا۔

پھر یہ ہوا کہ چھ مہینے کے اندر دونوں بیٹوں کو قریشی نے ائرپورٹ پر گلے لگا کے ہزاروں میل کے لئے رخصت کر دیا۔اپنے بیٹوں کے بغیر گھر کا سُونا پن پہلی رات اس طرح محسوس ہوا کہ وہ بہت دیر تک گھٹی ہوئی چیخوں کے ساتھ نہیں بلکہ بلند آواز میں روتا رہا اور اِس رونے میں بیٹوں کی جدائی تو وجہ بنی ہی تھی مگر جس صبر و ضبط کے

ساتھ اس نے برسوں پہلے بیوی کو لحد میں اتارا تھا وہ دکھ بھی تنہائی کا روپ دھار کے آنکھوں سے اچھلنے لگا تھا۔دکھ کیسا بھی ہو....وقت کے بہاؤ کے سامنے زیادہ دیر تک نہیں ٹک سکتا....چنانچہ گھر میں اکیلے رہنے کی عادت سی ہو گئی۔کبھی کبھار چھوٹے بہن بھائی ملنے کے لئے آ جاتے....کبھی کوئی دوست چکر لگا لیتا....لیکن ہر آنے والے کو یہ احساس ہوتا کہ عبدالغنی قریشی کی صحت ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے۔۔دس پندرہ دن کے بعد ایک بیٹا فون کرتا اور کبھی دوسرا....یوں ایک ماہ میں دونوں بیٹوں سے بات کر کے ذرا سا اطمینان اور سکون مل جاتا۔

جس طرح وہ اپنی کیفیت کا اظہار ایک ہی شہر سے ملاقات کرنے کے لئے آنے والوں کے سامنے نہیں کرتا تھا، پردیس میں اپنے اپنے مستقبل سے جوجھتے بیٹوں کو کیسے بتا دیتا۔ایک روز چھوٹے بیٹے کا فون آیا،دو چار منٹ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے بتایا کہ وجاہت نے ایک صاحبِ کتاب لڑکی سے نکاح کر لیا ہے۔یہ خبر دینے کے بعد وہ کسی منفی ردِعمل کا منتظر تھا کہ قریشی نے کہا۔

''چلو یہ اچھا ہوا۔مجھے تم لوگوں کی طرف سے یہی ایک فکر لگی رہتی تھی کہ کھانا پینا ڈھنگ سے ہو رہا ہے یا نہیں۔اب اِس فکر سے تو چھٹکارہ ملا''

یہ سن کر شباہت ذرا ہنسا اور کہا۔''ابا میاں۔کھانا تو یہاں ہم لڑکے باری باری پکا لیتے ہیں۔یہی بھائی کرتے ہیں''

قریشی نے فوراً پوچھا۔''لڑکے۔! کیا تم اور وجاہت ساتھ ساتھ نہیں رہتے۔؟''

''ابا میاں۔بھائی دوسرے شہر میں رہتے ہیں میں دوسرے شہر میں۔''

''کیوں۔یہ الگ الگ کیوں رہتے ہو۔''

''بھائی کو جس شہر میں جاب ملی وہ وہاں ہیں۔مجھے جس شہر میں ملی میں وہاں ہوں۔''

''مگر یہ بات پہلے تم نے نہیں بتائی تھی....تم وجاہت کی شادی میں شریک ہوئے تھے یا نہیں۔۔۔؟''

''ابا میاں۔انشاءاللہ نیکسٹ ویک اینڈ (Next Weekend) پر جاؤں گا۔''اور اس سے پہلے کہ قریشی کوئی اور سوال کرے، شباہت نے کہا''میں نے آپ کی اسپانسر شپ کے پیپر داخل کئے ہیں۔ایک سیٹ آپ کو بھی بھیج رہا ہوں۔جہاں جہاں میں نے پینسل سے نشان لگائے ہیں،وہاں دستخط کر کے جو پتا لکھا ہوا لفافہ ہے اُس میں رکھ کر TCS سے بھیج دیجئے گا۔''

''بیٹا میں جہاں ہوں مجھے رہنے دو۔بس تم لوگ آپس میں خوشی اور میل جول کے ساتھ رہو۔''

''ہم لوگ تو ٹھیک ہیں لیکن میری خواہش تھی کہ آپ بھی ہمارے پاس آ جائیں۔کب تک اکیلے رہیں گے۔''

''دیکھو بیٹا۔میں نے زندگی کا سفر بہت طے کر لیا ہے۔اب اتنی ہمت نہیں ہے کہ تمہارے پاس آنے کے لئے اتنا طویل سفر کروں۔''

''اچھا جو پیپر میں نے بھیجے ہیں، وہ تو آپ بھیج دیجئے گا۔اس تمام پروسس میں بھی سال چھ مہینے لگ جائیں گے۔۔پھر میں خود آ کر آپ کو یہاں لے آؤں گا۔''

''مجھے بلانے کے بجائے اگر تم اور وجاہت یہاں آ کے مل جاؤ تو اچھا ہے۔''

''آپ پیپر تو سائن کر کے بھیج دیجئے گا۔ پھر ہم دونوں بھی آپ کو لینے آئیں گے۔۔''

''وجاہت سے کہنا۔ مجھے اپنی شادی کی ایک دو ایک تصویریں تو بھیجے۔''

''میں جا رہا ہوں نا اگلے ہفتہ اُن کے پاس۔۔ میں تصویریں بھیج دونگا....''

''وجاہت کیا اتنا مصروف رہتا ہے کہ اپنی شادی کی اطلاع بھی نہ دے سکا اور اب تصویریں بھی تم۔۔۔''

قریشی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ٹیلیفون ٹوں ٹوں کرنے لگا۔

ٹیلیفون کی لائن کٹ جانے پر اس نے سوچا فون کارڈ کا وقت ختم ہو گیا ہوگا۔ ہر بات اور ہر کام کے لئے کارڈ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ شباہت چھ ماہ بعد گیا تھا میں نے جاتے وقت تاکید کی تھی اپنا فون لگوا لینا، وجاہت کی طرح چار پانچ ڈالر کا ایک کارڈ خریدنے کے لئے ہزار دفعہ سوچنا نہیں پڑے گا۔ مگر خدا جانے وہاں جا کے سب ایک ہی رنگ میں کیوں رنگ جاتے ہیں وجاہت نے اپنے پہنچنے کی اطلاع اتنی بھاگ دوڑ میں دی کہ میں پوری طرح اُس کی آواز کو دل میں بھی نہیں اُتار سکا.... ہاں شباہت نے جانے کے بعد فوراً فون کیا اور بڑی تسلی سے بات کی مگر مہینہ بھر بعد وہ بھی بھاگ دوڑ میں فون کرنے لگا۔ پھر بھی غنیمت ہے اپنی آواز سنا دیتا ہے، مہینہ دو مہینہ بعد فون کر کے اپنی اور بڑے بھائی کی خیر خبر دیتا ہی رہتا ہے۔ لیکن وجاہت.... کیا اُس کے پاس فون کرنے کے لئے بھی وقت نہیں ہے.... یہ سوچتے سوچتے قریشی کے سینے میں کھانسی کا غبارہ اوپر اُٹھنے لگا.... اِس کھانسی سے جان چھڑانے کے لئے اُس نے بیٹوں کے جانے کے بعد سگریٹ بھی چھوڑ دی تھی، مگر اپنی صحت کی طرف سے وہ کبھی فکر مند نہیں رہا پہلے بیوی کی بیماری نے مستقبل کی طرف سے فکر مند کر دیا تھا.... مگر بچوں کی پرورش کے خیال نے اِس فکر کو بھی دُور پٹخ دیا پھر جب بیٹے پڑھ لکھ کر فکری طور پر الگ ہوئے تو اُن کا دور دراز ملک میں جا بسنا ہی ایک ایسا روگ بن گیا تھا جس کو وہ لا علاج سمجھتے ہوئے کسی کے سامنے بیان بھی نہیں کرتا تھا۔ جب کبھی بڑا بیٹا وجاہت فون کرتا تو قریشی اُس سے ضرور یہ کہتا کہ دیکھو بیٹا تم پردیس میں ہو چھوٹے بھائی کا خیال رکھنا اور پیسہ کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتاؤ..... ایک دفعہ چھوٹے شباہت نے فون کیا اور چند باتیں ادھر اُدھر کی کرنے کے بعد اُس نے کہا۔

''ابا میاں۔ بھائی جب آپ کو فون کیا کریں تو اُن سے روپے بھیجنے کے لئے اور میرا خیال رکھنے کے لئے نہ کہا کیجئے۔۔ وہ آپ کے کہے بنا میرا خیال رکھتے ہیں اور اب تو ہم لوگ بھی کما کھا رہے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کو ہر دوسرے تیسرے مہینے کچھ بھیج دیا کروں۔''

''ارے نہیں بیٹا۔ میری پینشن ہی بہت ہے۔۔ اور پھر ریٹائرمنٹ کے وقت سارے لون شون کٹ کے اتنا پیسہ مل گیا کہ میں نے بچت سرٹیفکیٹ خرید لئے ہیں ہر چھے ماہ بعد اچھی خاصی رقم ہاتھ میں آ جاتی ہے اور..... ارے یہ فون پھر کٹ گیا۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ اپنا فون نمبر مجھے دیدو.... مگر شرم آتی ہے شاید.... فرق بھی تو دن رات کا ہے.... معلوم نہیں کب جاگتے اور کب سوتے ہوں گے۔ اچھا ہوا جو وہ نیک بخت اِن کے چھٹپن ہی میں چل بسی.... ورنہ پہلے تو اِن کے اتنی دور جانے کے خیال سے ہی مر گئی ہوتی.... زندہ رہ بھی جاتی تو یہ ادھوری ادھوری سی باتیں اُسے مار ڈالتیں.... حیرت ہے آج اتنے برسوں بعد.... اتنے تواتر سے اُس کا خیال کیوں آ رہا ہے۔؟؟؟ آرام کرسی پر

جھولتے ہوئے دیر تک مرحومہ کے بارے میں سوچتا رہا.... پھر یکا یک یہ خیال آیا برسوں ہو گئے وہ قبر پہ فاتحہ پڑھنے بھی نہیں گیا.... کل چلا جاؤں گا۔

دوسرے دن شباہت نے جو کاغذات بھیجے تھے اور اُن پر جہاں نشان لگائے تھے وہاں دستخط کر کے اور ان کے ساتھ تمام متعلقہ فارم بھر کے اور اندازہ سے زیادہ ہی رقم لیکر وہ خود TCS کے دفتر گیا اور بیٹوں کا مطالبہ پورا کر دیا۔ ۔واپسی میں رکشا میں بیٹھتے ہی اُس نے کہا.... پاپوش نگر کے قبرستان چلو.... جب قبرستان کے دروازے پر اترا تو چند لمحوں تک یہ سوچتا رہا... اسی دروازے سے اندر جانا ہے۔! مزید سوچے سمجھے بغیر وہ وہ اندر چلا گیا.... اندر جا کے پھر کس طرف جانا ہے..؟؟

گھنٹہ بھر تک ڈھونڈنے کے بعد بھی جب لحد کے آثار نہ ملے تو قریشی نے قبر تلاش کرنے کا ارادہ ملتوی کرنے کے بعد گورکن کے لئے معلوم کرنا شروع کر دیا کہ شاید وہ رجسٹر دیکھ کر جگہ بتا سکے۔ گورکن مل گیا۔ قریشی نے جیب سے پچاس روپیہ کا نوٹ نکال کر پہلے اُس کے ہاتھ پر رکھا پھر دن تاریخ مہینہ سال بیوی کا نام بتا کر قبر کے بارے میں معلوم کیا تو گورکن نے تفصیل سن کر مٹی اور پسینہ میں لت پت شلوکے کی جیب میں رکھے ہوئے نوٹ کو مٹھی میں دبوچ کر کہا۔ ''بابو، مجھے تو یہاں کام لگے چار چھ برس ہی ہوئے ہیں۔ شاید بابا کچھ بتا سکے۔'' اتنا کہہ کر ذرا چپ ہوا پھر اپنی چپ میں ہونٹوں تک آنے والی ہنسی دبا کر بولا۔ ''اُس قبر میں تو ملوم نئیں اور کتنے مُردے لٹا دیئے گئے ہوں گے۔ یاں تو کوئی سال چھے مہینے پھول ڈالنے نہ آئے تو اسی قبر کو دوسروں کے لئے تیار کر لیا جاتا ہے۔ تم تو بیس پچیس سال بعد معلوم کرنے آئے ہو۔ یہ تو شاید بابا بھی نہ بتا سکے۔''

قریشی نے مسکرا کر قبرستان کے رکھوالے کا شکریہ ادا کیا پھر قبلہ رو ہو کر جو آیات از بر تھیں اُن کا ورد کیا اور تمام اہلِ قبور کے لئے مغفرت کی دعا کی، گھر آ گیا۔ راستہ بھر وہ شرمندہ شرمندہ سا رہا.... تمہارے بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہا.... امید ہے تم نے میری غیر حاضری پر برا نہیں مانا ہوگا۔

بچوں کے فون آتے رہے.... دل بہلتا رہا.... شباہت نے تین چار تصویریں وجاہت کی بھیجیں جن میں وہ اپنی دلہن کے ساتھ کھڑا تھا۔ پھر اپنی بھابی کے ساتھ شباہت کی بھی دو تصویریں تھیں۔ عینک کو آگے پیچھے کر کے دیکھنے سے بھی وجاہت کی دلہن کے نقش و نگار سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ بظاہر نہ پاکستانی لگتی تھی نہ انڈین .... انگریز بھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ دونوں بیٹوں کی تصویر نے دل میں سرور کی کیفیت بھر دی۔ وجاہت کچھ دبلا ضرور معلوم ہوا مگر چہرے پر سجی ہوئی مسکراہٹ قریشی کو اچھی لگی۔

دوسرے دن وہ بلا ضرورت بازار گیا۔ ایک اسٹیشنری کی دکان سے اُس نے محدب شیشہ خریدا.... گھر آ کے وجاہت کی بیوی کی تصویر کو دُور پاس کر کے دیکھا.... پہلے جاپانی سمجھا.... پھر چینی... کبھی بانگلہ دیشی کبھی فلپائینو.... ابھی طے نہیں کر پایا تھا کہ وجاہت کا فون آ گیا۔ خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد قریشی نے پوچھ ہی لیا کہ دولہن کون سے ملک کی لائے ہو۔؟ ۔قریشی کے سارے اندازے غلط نکلے۔۔ لڑکی ملیشیا کی ہے ظاہر ہے مسلمان ہے اور نکاح بھی اسلامی طریقہ سے ہوا ہوگا، تفصیل بتانے کے بعد وجاہت نے پوچھا۔

آپ کو ایمبیسی کا کوئی لیٹر ملا۔؟

بیٹا تمہاری تصویریں مل گئیں اب مجھے کسی لیٹر کی ضرورت نہیں ہے۔

ابا میاں...لیٹر ملنے کے بعد آپ اپنا پاسپورٹ اور کم سے کم چار تصویریں اُن کو بھیج دیجئے گا۔ پندرہ بیس دن کے بعد آپ کو پانچ سال کا ویزا مل جائے گا۔ میں آپ کا ٹکٹ بنوا رہا ہوں جو کل یا پرسوں تک آپ کو مل جائے گا....اور پہلی بار قریشی نے بیٹے کی بات کاٹی....میرا ٹکٹ بھیجنے کے بجائے تم اپنی دلہن اور شباہت کو لیکر آ جاؤ اس طرح....

بیٹے سے بات کرتے ہوئے کھانسی کا غبارہ گلے سے باہر نکل کے پھٹنے کے بجائے گلے میں ہی اٹکا رہ گیا۔

بیٹے نے کئی مرتبہ ہلو ہلو کرنے کے بعد....کالنگ کارڈ کی وارننگ سنی کہ One Minute left پھر بیٹے نے غصہ میں رسیور رکھا.....بڑے میاں کسی کی سنتے ہی نہیں ہمیشہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔۔

دسمبر ۸۹ء میں آپ کے یہاں اس پیاری سی شام کے بعد آج سارا دن میں نے آپ کے ساتھ بِتایا ہے۔''سایہ سایہ دھوپ'' کی تقریباً ساری کہانیاں پڑھ لی ہیں اور اِس بھرپور ملاقات پر خوب خوب محظوظ ہوا ہوں۔آپ کی یہ خوبی نہایت پسندیدہ ہے کہ آپ اپنی کہانی کو کہیں کھڑا نہیں ہونے دیتے بلکہ وہ کرداروں کے ہی رویوں اور عمل سے خود رو ہو کر ندی کے مانند آپ نقطۂ عروج تک آ پہنچتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کا قاری اپنے نتائج خود آپ مرتب کئے جانے کی تخلیقی سہولت کے اسباب پا کر بے تحفظ آپ کی وارداتوں شریک ہو جاتا ہے۔آپ کی کہانی ''سایہ سایہ دھوپ'' میں نے آخر میں پڑھی ہے اور اس کے specifics کے طلسم سے باہر آنا نہیں ہو پا رہا ہے۔خدا آپ کو سلامت رکھے اور آپ اسی مانند دھونی رمائے اپنی تپسیا میں مگن رہیں۔

جوگندر پال

''ایک شام کا قصہ'' ملتے ہی میں نے فوراً پڑھ ڈالا۔سب سے پہلا تاثر تو کہانیوں کی عام فضا کا ہوا، یہ اس دھواں دھواں سی کیفیت کا ہی اثر ہے کہ ساری کہانیوں میں آمد ہی آمد ہے۔ ہر کہانی نے خود کو لکھوایا ہے۔۔آپ نے سوچ سمجھ کر ضرور لکھا ہوگا لیکن مجھے تو ہر کہانی میں بے ساختگی کا احساس ہوا۔دوسری بات یہ کہ ماحول کی وحشت 'سراسیمگی' گھٹن اور ہمہ وقت کسی حادثے یا ذہنی اذیت سے دوچار ہونے کے خوف کے باوجود' مایوسی اور مکمل تاریکی نہیں ہے۔دوسری طرف بے جا اور ''ترقی پسندانہ'' رجائیت بھی نہیں ہے جو بیشتر کہانیوں کو پروپیگنڈہ بنا ڈالتی ہے۔ یہاں تو صرف حقیقت ہے اور انتہائے غم واندوہ میں بھی ''میں مرا نہیں۔۔میں زندہ ہوں'' کا طنطنہ۔ایہام یا رجائیت سے الگ ہٹ کر آپ نے کہانی کو زندگی کے قرار واقعی تناظر میں پرکھا اور برتا ہے.....

قیصر تمکین

سلطان جمیل نسیم

سچ کے سوا کچھ نہیں

ہمارے گھر میں خط دو ہی جگہ سے آتے تھے۔ایک کھلنا سے جہاں ارشاد میٹرک کرنے کے بعد اصفہانی میچ فیکٹری میں ملازم ہو کر چلا گیا تھا دوسرے غازی آباد سے خالہ جان کے....رشّو کے خط سے تو یوں سمجھئے کہ سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جاتا تھا۔اماں خط کے ایک ایک لفظ کے جواب میں ہزار دعائیں دیا کرتیں، پھر روہانسی ہو جاتیں بلکہ آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب جاتیں، نجانے اُسے ہماری کون سی بات بری لگی جو دسویں پاس کرتے ہی مشرقی پاکستان چلا گیا۔کئی مہینے تک ہمیں اُس کا ٹھور ٹھکانہ بھی معلوم نہ ہو سکا، پھر اُس نے خود ہی رابطہ کیا اب اماں کے پاندان کو ہرا بھرا رکھنے کے لئے ہر مہینہ کبھی پچاس اور کبھی ساٹھ روپیہ ضرور بھیج دیتا ہے اور اماں اُن روپوں کو پہلے تو تبرک کی طرح اپنے آنچل میں باندھ لیتی ہیں اور پھر خرچ بھی اُسی مد میں کرتیں جس کے لئے بھیجے گئے تھے، ارشاد کے خط آئیں یا نہ آئیں فرق اس لئے نہیں پڑتا تھا کہ وہ اماں کو مہینہ دو مہینہ میں ٹیلیفون بھی کر لیتا تھا البتہ خالہ جان کے خط پابندی سے ملتے رہتے اُن کے خطوں میں بڑی یکسانیت ہوتی تھی، اور وہ اپنے ہر خط میں عام طور سے یہی لکھتی تھیں کہ بچے بڑے ہو رہے ہیں اگرچہ سب حسبِ مقدور پڑھ لکھ رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ نوکریوں کے لئے جوتے بھی چٹخاتے پھر رہے ہیں۔لڑکیاں سیانی ہو رہی ہیں، ہم پلہ رشتے تو جیسے عنقا ہو کر رہ گئے ہیں، چوطرفہ پریشانیوں نے راتوں کی نیند پر ایسا سایا ڈالا ہے کہ آنکھیں اب تم پر ہی لگی رہتی ہیں، کوئی ایسا راستہ نکالو کہ ہم بھی تمہارے پاس پاکستان آ جائیں....دراصل کسی نے خالہ جان کو پاکستان کی ایسی تصویر دکھا دی تھی کہ وہ سمجھتی تھیں یہاں ہُن برس رہا ہے۔اِن خطوں میں اتنی یکسانیت ہوتی تھی کہ ہم اکثر خالہ جان کا پوسٹ کارڈ پڑھے بغیر اپنی طرف سے خط کا مضمون اماں جان کو سنا دیا کرتے تھے۔خط سننے کے بعد اماں وہ پوسٹ کارڈ ہم سے لیکر چاروں طرف سے گھما کے دیکھتی تھیں اور اپنے دوپٹہ کے پلّو سے یوں صاف کر کے تکیہ کے نیچے رکھ لیتی تھیں جیسے اپنی بہن کے آنسو پونچھ لئے ہوں۔پھر ہم سے کہتی تھیں۔

''ارے ہو سکے تو بلا لو۔ میں بھی ایک نظر اُسے دیکھ تو لوں۔اب وہی ایک تو رہ گئی ہے اماں باوا کی نشانی۔۔۔''

ہم اماں جان کو تسلی دیتے اور وہ ہمیں دعائیں دیکر مطمئن ہو جاتیں۔۔۔کم از کم ہم یہی سمجھ لیتے تھے۔

رشّو (ارشاد) سال دو سال میں دس پندرہ دن کی چھٹی لے کر اماں جان کی آنکھوں میں روشنی باقی رکھنے کو آ جاتا۔ اُس کے آنے سے ہم سب ہی خوش رہتے تھے۔ بھاوجیں تو ماچس کا ڈھیر دیکھ کر ہی خوش ہو جاتی تھیں۔ اسکول کے بعد بچوں کو وہ جگہ جگہ لئے پھرتا۔ پھر وہ دس پندرہ دن چٹکی بجاتے گزر جاتے۔ دو تین مرتبہ میں نے وجّو کی موجودگی میں کہا بھی کہ یہیں رہ جا، تیرے آ جانے سے فیکٹری میں برکت ہوگی۔ کوئی واضح جواب نہیں دیا، بس ہنس کے ٹال دیا۔

پھر معلوم ہوا کہ رشّو نے بنگال میں ہی شادی کر لی ہے....ایک دن سان نہ گمان وہ اپنی بیوی اور بچہ کو لیکر بھی آ گیا....ظاہر ہے خوشی کا اظہار سب ہی نے کیا....اور جلدی میں جس سے بھی جو کچھ بن پڑا وہ اُس کی دلہن اور بچہ کو تحفہ دیا....پھر اُس کا اشارہ ملنے پر اُسکی بنگالن بیوی نے سب کو اتنی قیمتی اور نایاب چیزیں دیں کہ سب کے منہ اتر گئے۔ آٹھ دس روز گھر میں خوب رونق رہی پھر وہ چلا گیا۔ ہم میں سے کسی کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آسکی ہے کہ آخر رشّو کس بات پر ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ اب ہم اسی کی خوشی میں خوش تھے۔

ایک دن جب ہم دونوں بھائی دفتر میں بیٹھے ایک نہایت ضروری ٹیلیفون کا انتظار اِس طرح کر رہے تھے کہ لفظ ہونٹوں کا راستہ بھول گئے تھے اور کان صرف ٹیلیفون کی آنے والی گھنٹی کی طرف لگے تھے کہ اب آئے کہ اب آئے....انتظار کے اِس سنسان مقام سے کئی راستے نکلتے تھے خدا جانے میرا ذہن کون سے راستہ پر بھٹک گیا کہ بالکل بے دھیانی میں بھائی سے پوچھ بیٹھا.

''وجّو ..ہم خالہ جان کے خط پڑھے بغیر اپنی طرف سے مضمون گھڑ کے سنا دیتے ہیں تو کیا ہم اپنی ماں سے جھوٹ نہیں بول رہے ہیں....'' اُس کا ذہن بھی شاید انتظار کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا، میری بات سن کر پہلے تو ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا، پھر پوچھا۔

''کیا کہا آپ نے۔!''

میں نے اپنی بات دہرائی تو وہ ہنس دیا۔

''دھوکہ کیسا بھائی جان....آپ نے تو اُن کے کئی خط پڑھے ہیں۔ سب کا مفہوم ایک ہی سا ہوتا ہے' بس لفظ ذرا آگے پیچھے ہوتے ہیں....''

''مگر وجّو....میں سوچتا ہوں کہ....''

''ایک تو آپ مجھے وجّو کہنا چھوڑ دیجئے۔ آپ جانتے ہیں میرا نام وجاہت مرزا ہے۔ اکثر آپ مجھے اسٹاف اور کلائنٹ کے سامنے بھی اِسی نِک نیم سے پکار لیتے ہیں۔ I feel aukward دوسرے یہ کہ خالہ کے بارے میں زیادہ نہ سوچا کیجئے۔ وہ وہاں آرام سے بیٹھی ہیں اور ہم یہاں....''

میں اُس کی بات نظر انداز کر دینے کے لئے ذرا مسکرایا، کچھ دیر خاموش رہا....پھر پوچھا۔

''تمہیں خالہ یاد تو ہونگی۔؟''

''نہیں۔''

''ہاں آں کیا یاد ہونگی....تم سال بھر کے تھے جب ہم یہاں آئے۔ رشّو تیرہ چودہ سال کا تھا۔ وقت کیسے پر لگا کر اُڑتا ہے۔ مجھے خالہ جان کی باتیں اور ان کی صورت اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ہم دونوں بھائیوں کو بہت چاہتی تھیں۔ تمہارا تو اماں سے زیادہ لاڈ کرتی تھیں۔۔۔''

''مجھ سے کتنا لاڈ کرتی تھیں یہ مجھے تو ذرا بھی یاد نہیں.... ہاں آپ سے جو محبت جتاتی تھیں اُسکے پیچھے بھی کوئی مطلب ہوگا''

میں وجو کی بات سن کر ہنس دیا اور بولا۔ ''مجھ سے....!ایک بارہ تیرہ سال کے لڑکے سے انھیں کیا مطلب ہوسکتا ہے۔''

''سنا ہے وہ اپنی ایک لڑکی سے آپ کے ساتھ شادی کا منصوبہ بنائے بیٹھی تھیں اور دوسری سے ارشاد بھیا کا۔''

''تمہیں یاد ہے۔؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا

''نہیں۔ میں نے ایک دفعہ امّاں سے سنا تھا۔''

میں نے معمول کے مطابق وجّو کے اُکھڑے ہوئے لہجہ پر کوئی توجہ نہیں دی اور کہا۔

''خالہ کی بڑی بیٹی نفّو اُس زمانے میں چار پانچ سال کی تھی۔ گول مٹول' سرخ سفید۔ اب تو بہت بڑی ہوگئی ہوگی۔''

''یہ نفّو کیا نام ہوا۔''

''نام تو اس کا نفیسہ تھا مگر سب پیار سے نفو نفو کہتے تھے۔''

''اِس کا مطلب ہے نام بگاڑنے کا رواج ہمارے خاندان میں خاصا پرانا ہے۔''

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''ابا میاں نے ساتھ آنے کے لئے خالو سے کتنا کہا مگر وہ مانے ہی نہیں۔ مٹّی جو وہاں کی تھی۔''

''لوگ جہاں ہیں اُن کی مٹّی وہیں کی ہے۔ پھر یہاں آنے کے لئے کیوں مرے جا رہے ہیں۔''

''یار خاندان بکھر گئے۔ اگر آ جائیں تو ہمیں بھی سپورٹ ہو جائے گی۔ اللہ کے فضل سے ہمارا کاروبار بھی تو Expand ہو رہا ہے....رشّو ڈھاکہ میں جا کے بس گیا ہے۔ یہیں رہتا تو ہمیں اور سہارا ہوتا....''

''بھیا کی بات رہنے دیجئے۔ ہم سب کو اختیار ہے کہ اپنے مستقبل کا خیال رکھیں۔ خالہ کی بات کیجئے، ابا میاں اپنا مکان ان کے نام کر آئے تھے۔ نانا کی جائیداد میں سے بھی اپنا حصہ اُن ہی کے نام کر دیا تھا۔ ہمارے مکان کا تو سنا ہے بیچ باچ کے تیا پانچا کر لیا۔ اب تک اُسی مشترک جائداد سے سانپ کی طرح لپٹی ہوئی ہیں۔ ہم نے تو ابا میاں

کے کہنے سے کوئی کلیم بھی نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ کسٹوڈین سے بھی بچے ہوئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا پھر یہاں آنے کے لئے کیوں تڑپ رہے ہیں۔؟''

میں جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وجّو نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اب رہی یہ کہ ہمارا کام بڑھ رہا ہے تو ہمیں اُن کو سپورٹ کرنا چاہئے، یا اُن کی سپورٹ حاصل کرنی چاہئے۔ مجھے یہ بتائیے یہاں آدمیوں کی کمی ہے۔؟ ہمیں اُن کی سپورٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ٹیکنکل کام پنجابی جس خوبی سے کرتا ہے وہ کوئی دوسرا کر ہی نہیں سکتا۔ فزیکل لیبر میں آپ نے دیکھ ہی لیا، پٹھان سے بڑھکر کوئی نہیں ہے، اور ان مہاجروں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے کہ ذرا پڑھائی لکھائی میں آگے کیا نکل گئے دماغ ہی ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ کام کم کرتے ہیں اپنے ماضی کی بادشاہی کے قصے زیادہ سناتے ہیں۔ انھ۔''

میں نے وجّو کی تردید کرنے کے بجائے کہا۔ ''ارے بھائی آنے والا کچھ نہ کچھ چھوڑ کر تو آتا ہے اور جو چیز چھوٹ جائے اُس کی یاد بھی بہت عرصہ تک ساتھ رہتی ہے۔''

''جانے دیجئے ان باتوں کو.... اگر وہ لوگ آ بھی گئے پھر بھی میں انھیں اپنے ساتھ نہیں رکھوں گا۔ نجانے رشتے داری کی آڑ میں کیا کیا رعایتیں مانگ بیٹھیں.... رشّو بھیا بتا رہے تھے کہ خالہ اُن کے پاس گئیں تو پندرہ دن سے زیادہ نہ ٹکیں اِس لئے کہ وہاں اُن کو اللے تللے نظر نہیں آئے.... بھیا سے ہمارے بارے میں سن کر، اب وہ یہاں آنے پر بضد ہیں۔''

اس موضوع پر میں اور وجّو شاید اور باتیں کرتے کہ وہ ضروری فون آگیا جس کا انتظار تھا۔ یوں ساری باتیں آئی گئی ہو گئیں۔ خدا جانے یہ خالہ جان کے جذبے کی کشش تھی یا اماں کی دعاؤں کا اثر کہ 1965 کی جنگ کے چار پانچ سال بعد اُن کا ویزہ لگ گیا اور وہ پاکستان پہنچ گئیں۔

''لڑکے اپنے اپنے کام میں لگے تھے، لڑکیوں کو کہاں ساتھ لگائے پھرتی۔ بڑی آپا کو دیکھنے کے لئے پھڑک رہی تھی سو چلی آئی....''

دو مرتبہ ان کے ویزے کی تجدید کرائی، ہمارے یہاں ہی نہیں بلکہ دُور پاس جس عزیز سے وہ ملنے گئیں، اُن کی یہ خواہش اتنی ہی بڑھتی گئی کہ کسی صورت اُن کے سب گھر والوں کو یہاں بلا لیا جائے۔ وجاہت اکل کھرا تھا۔ ایک بار خالہ نے اپنی اس خواہش کا اظہار اس کے سامنے کر دیا تو اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر لیا تھا۔ ''ہمارا گھر کتنے میں بیچ ڈالا۔''

اور خالہ نے بچوں کی بیماریوں اور بے روزگاریوں کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد صورتِ حال کی وضاحت یوں کی کہ ابا کے ایک دوست کاشی رام جی نے آٹھ ہزار روپے میں مکان اپنے پاس رہن رکھ لیا ہے، ہمارے بڑوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں اس لئے مروت والے آدمی ہیں، کاغذ لکھ کے دیا ہے کہ پانچ برس تک بزار سے دو

پیسہ کم بیاج لیں گے۔ لڑکے کہتے ہیں ابھی پانچ برس میں دو چار مہینہ کم ہیں۔ ہم پہلے ہی چھڑا لیں گے۔''
وجاہت نے اُن سے پھر کبھی بات ہی نہیں۔
اکثر وہ مجھے ہاتھ پکڑ کے اپنے قریب بٹھا لیتی تھیں اور اپنی خواہشوں کا برملا اظہار کر دیا کرتی تھیں۔

''بیٹا۔۔ ہم سب کو بھی تم پاکستان بلا لو۔ وہاں تمہارے تین بھائی ہیں، یہاں آ کے دست و بازو بنیں گے۔ ماشاءاللہ سب پڑھے لکھے ہیں، انگریزی تو ایسی فروَٹ بولتے ہیں کہ سننے والا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے.... مگر جب یہان سے تمہارا خط جاتا ہے تو سب ایک دوسرے پر ٹالتے ہیں آخر کاشی رام جی کے پاس جا کر سنتی ہوں، وہ خط کم سناتے ہیں املے اور قوائد کی غلطیاں زیادہ نکالتے ہیں۔ اُن کا یہ سبھاؤ دیکھکر اب نفو ہی اٹکل پچو سے پڑھ کر سنا دیتی ہے.... دیکھو بیٹا ایم اے بی اے کرنے کے بعد رشید نے پرچون کی دکان کھول لی ہے۔ عزیز ایک اسکول میں ماسٹری کر رہا ہے۔ بس قدیر کو اللہ اللہ کر کے دوائیوں کی کمپنی میں نوکری مل گئی ہے۔ چار بہنوں کی ذمہ داری ہے۔ لڑکیوں کو بھی کوئی کہاں تک پڑھائے.... اور پھر زمانہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ قادر بخش کی نواسی ایک رات گھر سے نکلی اور بمبئی پہنچ گئی۔ پہلے تو بڑی ڈھنڈیا پڑی۔ تھانے کچہری تک نوبت پہنچنے ہی والی تھی کہ لڑکی نے دس ہزار بھیج کے سب کو اپنے پاس بلوا لیا۔ فلموں میں کام کر کے اب لاکھوں میں کھیلتی ہے۔ میں کہتی ہوں عزت سلامت رہے۔ اسی لئے کہتی ہوں یہاں آ جائیں تو اپنوں میں لڑکیوں کی بھی کھپت ہو جائے گی اور لڑکے بھی تمہاری طرح کچھ بن جائیں گے۔''
مخاطب مجھی سے رہتیں لیکن رُخ اماں کی طرف کر کے گہری سانس لیکر کہتیں۔

''گھر بھی ٹوٹ رہا ہے جگہ جگہ سے چُونا تو پہلے ہی جھڑ رہا تھا، اب کمروں کی چھتیں بھی ٹپکنے لگی ہیں۔ بڑے کمرے کی چھت تو برسات میں پرنالہ بن جاتی ہے۔ ہفتہ بھر تک لڑکیاں پانی سونتی رہتی ہیں مگر سیلن جونک کی طرح چمٹ کے بیٹھ جاتی ہے۔ ابا میاں نے گھر بھی ایسا بنایا تھا کہ ہم آٹھ جنے پتہ ہی نہیں چلتا کس کونے میں سمائے ہوئے ہیں۔ کاشی رام جی کہہ رہے تھے ابھی تو اونے پونے میں بک بھی جائے گا، بالکل ہی ڈھے گیا تو ملبے کی قیمت کون دے گا۔''

اب خواہشیں زبانی اظہار سے پوری نہیں ہوتی ہیں۔ خالہ جان کو جانا ہی تھا، سال بھر رہ کے چلی گئیں۔ جانے کے بعد اُن کے خطوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا' اماں جان بار بار جواب بھیجنے کی تاکید کرتی تو میں اپنے بیٹے نجیب کو، جو اُس زمانے میں ساتویں میں پڑھ رہا تھا، کاغذ قلم دے کے اماں جان کے پاس بٹھا دیتا، جو وہ بولتیں نجیب لکھتا رہتا۔ ایک روز کونا کٹا ہوا پوسٹ کارڈ ملا، جو انگریزی میں لکھا تھا، جس میں خالہ جان کے گذر جانے کی خبر تھی۔ امّاں جان کو جتنا رونا تھیں رولیں.

پھر جب مشرقی پاکستان کے حالات کروٹ لینے لگے تو ہم نے ارشاد کو بلانے کے لئے کتنے فون کئے۔ اس

کا ایک ہی جواب ہوتا کہ میں یہاں بالکل محفوظ ہوں.... بظاہر لگتا بھی یہی تھا کہ اُس کی بیوی بنگالن ہے اور اُس نے اپنی ایک بیٹی کی شادی بھی مقامی خاندان میں کی تھی۔لیکن جب تعصب کی لہر اٹھتی ہے تو رشتے ناتوں کو کہاں دیکھتی ہے....ایک بیخبری کا عالم تھا جس سے ہم گذر رہے تھے اور....جس کے دامن میں امید بھی تھی اور مایوسی بھی....

دو تین مہینہ بعد مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہو جانے کا واقعہ گزر گیا۔

اب قوم اپنے غم کا سوگ مناتی رہی۔ ہمارے لئے اُس سوگ میں ارشاد کا غم بھی شامل ہو گیا تھا، سیاست داں تاویلیں پیش کرنے کے ساتھ ایک دوسرے کے سر پر الزام بھی تھوپتے رہے۔سال بھر تک کیوں اور کیسے کا مباحثہ بھی ہوتا رہا۔پھر سب بھولنے لگے۔اور جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے۔ہم سب سے الگ تو نہیں تھے۔!

یکا یک وجاہت کے سر میں کناڈا جانے کا سودا سما گیا۔اور بغیر لحاظ مروت اس نے چلتے ہوئے کاروبار میں سے اپنا حصہ الگ کر لیا۔میں نے لاکھ سمجھایا کہ اس طرح بچے کھچے کاروبار کو سنبھالنے میں جی توڑ محنت کرنے کے بعد بھی ایک عرصہ لگ جائے گا۔

''یہ آپ جانیں۔ مجھے ابھی جو Opportunity مل رہی ہے اس کو میں کھونا نہیں چاہتا۔۔۔''

''لیکن وجّو ہمارے کاروبار کا۔۔۔۔''

''بھائی جان مجھے اپنے بچوں کا فیوچر دیکھنا ہے۔کاروبار تو جیسے ہم نے مل کے جمایا تھا۔اب نجیب بڑا ہو گیا ہے۔ اس کو شامل کر کے کوشش کیجئے، ایک دو برس میں ٹھیک ہو ہی جائے گا۔''

وجاہت چلا گیا۔

عید بقرعید پر اماں جان کے نام اُس کے کارڈ آتے رہے، جن پر اس کا پتا بھی نہیں لکھا ہوتا تھا۔

نجیب کالج میں پڑھ رہا تھا۔میری دوگنی محنت کے باوجود، بڑھتی مہنگائی اور بڑے ہوتے بچوں کے سبب آمدنی اپنی جگہ ٹھٹھر کے رہ گئی تھی۔اب مجھے ایک ہی آس تھی کہ نجیب سائینس کا گریجویٹ ہو جائے، کوئی ڈھنگ کی ملازمت مل جائے تو شاید ہاتھ میں دو پیسے زیادہ آئیں۔میں نے بھی اپنے واقف کاروں سے کہہ رکھا تھا اور خود نجیب بھی اپنے طور سے کوشش میں لگا ہوا تھا۔

ایک بار کسی ہمدرد نے مشورہ دیا تھا کہ نجیب کو اپنے ہی ساتھ کام میں لگا لوں۔مگر ایک تو اُس کا رجحان نہیں دوسرے اگر زور زبردستی سے اپنے ساتھ لگا بھی لوں تو فائدہ کیا۔سوکھی گائے کو ایک آدمی دوہے یا دو، دودھ تو وہ اتنا ہی دیگی جتنی اس کے بدن میں جان ہے۔

یہ اُس روز کی بات ہے جب مجھ سے نجیب نے آ کے تھکے ہوئے لہجہ میں کہا تھا''ابو۔بڑی سفارش یا کچھ لئے دیئے بغیر نوکری نہیں مل سکتی۔''

ابھی میں اُس کی بات کا جواب دے بھی نہیں سکا تھا کہ اُس نے دوسری بات کہی۔

''اگر آپ کہیں سے بھی ڈیڑھ دو لاکھ کا انتظام کر دیں تو میں اے۔ایس۔آئی ہو جاؤنگا۔ یہ آپ سے پرامس کرتا ہوں کہ ملازمت ملنے کے چھے سے آٹھ مہینے کے اندر یہ روپیہ واپس کر دوں گا۔''

اُس کی بات سن کر میرے وجود میں ایک اُبال سا اٹھا، پھر میری آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری صورت دیکھ کر اور میرا جواب سن کر وہ تمام ادب آداب اور لحاظ مُروت ایک طرف رکھ کے بپھر جائے گا اور جس طرح میری عدم موجودگی میں اپنی ماں کے سامنے میری کم ہمتی اور ایمانداری کو بزدلی پر محمول کرتا رہا ہے۔اب وہ سب باتیں میرے روبرو کہہ دیگا....مگر نجیب کے کچھ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ اُسی وقت ایک صاحب مجھے پوچھتے ہوئے آئے۔لباس اور شخصیت مرعوب کن تھی۔قریب آنے کے بعد انھوں نے پھر میرا نام لیا۔جب میں نے کہا۔''فرمایئے۔''تو اُن صاحب نے کہا

''آداب۔میرا نام عبدالرشید ہے اور میں آپ کی ہندوستان والی مرحوم خالہ کا بیٹا ہوں۔''

میں اُٹھ کر اُن سے بغلگیر ہوا۔پھر پوچھا۔

''آپ انڈیا سے آرہے ہیں۔؟

''جی نہیں، فی الحال تو دبئ سے آرہا ہوں۔میری ماں کی خواہش تھی کہ میں ایک مرتبہ پاکستان جا کے آپ سب سے ملوں اور خالہ اماں کو سلام کرنے کے لئے حاضر ہوؤں....بڑی مشکل سے دو دن کا وقت نکال کے آسکا ہوں..''

''تو چلیئے گھر چل کے باتیں کرتے ہیں۔سامان کہاں ہے آپ کا۔؟''

ایک رات کی تو بات تھی۔پھر آپ کا گھر بھی دیکھا ہوا نہیں تھا، اس لئے ہوٹل میں ٹھہر گیا۔''

''یہ تو بڑی زیادتی کی آپ نے کہ گھر ہوتے ہوئے ہوٹل میں ٹھہرے۔''

''خالہ اماں کیسی ہیں۔؟''بات کا رُخ ہی بدل گیا۔

''بڑھاپے میں آدمی کیسا ہوتا ہے۔گھر چل کے خود ہی دیکھ لیجئے گا۔''

اماں جان پر عمر کا بوجھ اتنا پڑ چکا تھا کہ وہ چلنے پھرنے سے لاچار ہو گئی تھیں۔زمانے کی اتنی اونچ نیچ دیکھی تھی کہ اپنی عینک کہیں رکھ کے بھول گئی تھیں اور اپنوں کے بارے میں ایسی اور اتنی باتیں سنی تھیں کہ اب کسی کے بولنے سے پہلے آہستہ سے پوچھتی تھیں''کوئی بری خبر تو نہیں ہے؟'' پھر چیخ چیخ کر ان کو بتایا جاتا تھا کہ اچھی بات ہے اور ضروری بات ہے۔تب وہ سننے پر رضامند ہوتی تھیں۔ اِس وقت بھی جب ان کو بتایا گیا کہ یہ بھائی عبدالرشید ہیں۔آپ کی چھوٹی بہن کے بیٹے....ہندوستان سے آئے ہیں.....تو انھوں نے بھائی رشید کے کندھے ہر ہاتھ رکھ کے وہ سب کہنا شروع کر دیا جو کسی بھی ملنے والے کے سامنے دہراتی رہتی تھیں۔

بیٹا، ہم نے کبھی اِس زمانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا کہ اپنے بیگانے بن جائیں گے ایسے بیگانے کہ اپنوں کا گلا کاٹنے لگیں گے۔۔تمہیں معلوم ہے میرے ارشاد کے ساتھ کیا ہوا۔؟ بیوی بنگالن....بیٹی داماد بنگالی....

میں نے اُن سے کہا۔''اماں۔یہ خالہ جان کے بیٹے ہیں۔''
اماں جان کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ایک جملہ کہنے کے بعد اُن کا گلا سوکھ جاتا تھا۔میری بات سن کر بولیں۔
''لمبی زندگی بھی عذاب ہوتی ہے۔تمہاری ماں خوش نصیب تھی کہ وقت پر مرگئی۔اور ایک میں ہوں۔میرے ارشاد کے ساتھ کیا ہوا.....''
رشید بھائی اُن کے قریب بیٹھ گئے،اپنے بازو اماں جان کے نحیف وناتواں کندھوں پر رکھے پھر مجھے اشارہ کیا۔وہ جو کچھ آہستہ آہستہ کہتے رہے وہ میں چیخ چیخ کر اماں جان کے گوش گزار کرتا رہا۔
''اماں جان بھائی عبدالرشید کہہ رہے ہیں وقت کے ساتھ آدمی بدل جاتا ہے،حالات بدل جاتے ہیں اور یہ خوش خبری سنا رہے ہیں کہ چاروں بہنیں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی ہیں۔دو اپنے بچوں کے ساتھ امریکا میں ہیں اور دو جدہ میں۔۔سب بھائیوں کی بھی شادی ہوگئی ہے۔۔بھائی عبدالعزیز،الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں،بھائی عبدالقدیر دبئ میں ہیں اور اِن کے ساتھ یعنی بھائی عبدالرشید کیساتھ ہی کاروبار کر رہے ہیں اور....اور اماں جان بھائی عبدالرشید مجھے ایک تین لاکھ دس ہزار کا ڈرافٹ دے رہے ہیں۔یہ ابا کے مکان کی قیمت ہے۔۔نانا جان والی حویلی دوبارہ بنوالی ہے۔فرمارہے ہیں کہ پاکستان کے خصوصاً کراچی کے حالات زیادہ سازگار نہیں ہیں،اس لئے وہ نجیب کو جلد ہی ویزا بھیج کر دبئ بلالیں گے اور مجھ سے بھی کہہ رہے ہیں کہ میں بھی۔۔۔
اتنا کہنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ شاید اب میں اُن کا کہا نہ دہرا سکوں کہ یہ اتنا سچ ہے کہ میرے حلق میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا ہے۔

☆☆☆☆

''ایک شام کا قصہ'' ۔''کھویا ہوا آدمی''اور''سایہ سایہ دھوپ'' کے بعد سلطان جمیل نسیم کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شائع شدہ سبھی افسانے دہشت گردی کے موضوع پر ہیں۔شاذ و نادر ہی قاری کو ایک ہی موضوع پر لکھے گئے افسانوں کا مجموعہ پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ایک ہی موضوع پر لکھنا جتنا مشکل ہے اُتنا ہی پڑھنا بھی۔لیکن سلطان جمیل نسیم نے بڑی فنکاری سے یہ سبھی افسانے لکھے ہیں ہر افسانے کا پلاٹ تنوع لئے ہوئے ہے اور ہر افسانے کی تیکنک میں بھی ندرت ہے۔کسی افسانے سے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔سبھی افسانے اچھے اور دلچسپ ہیں۔زبان بامحاورہ' مکالمے چست اور فطری' جذبات نگاری پُر اثر اور بیان رواں دواں ہے۔۔بین السطور افسانہ نگار کا اظہارِ خیال یہ ہے دہشت گردی کراچی اور حیدرآباد سندھ کا مسئلہ نہیں بلکہ درحقیقت یہ ایک عالمی مسئلہ ہے جس سے مفر کا فی الحال کوئی امکان نظر نہیں آتا.....

محافظ حیدر

عبداللہ جاوید بنام حیدر قریشی

کینیڈا۔۱۸رستمبر۔۲۰۰۸

عزیز گرامی حیدر قریشی۔سلام خلوص
سنا ہے آپ میرا گوشہ چھاپ رہے ہیں۔یہ نہیں کہ میں ان سب چیزوں سے بے نیاز ہوں۔میں بھی سب کی طرح آدمی ہوں۔قلم کار بھی ہوں ۔نہ ہی سادھو سنت ہوں نہ تارکِ دنیا پیر' فقیر اور یہ جو 1970 سے مشاعروں' مذاکروں سے توبہ کی اور ایک کونہ پکڑا سو اس کے پیچھے ساتھی قلم کاروں کی آپا دھاپی' ٹانگ گھسیٹی' خود تشہیری' اور خود ساختہ اور نام نہاد اکابرینِ ادب' نقّادانِ اکرام اور گدّی نشینانِ ادارہ ہائے ادب کی غلط بخشیاں' اور گروہ نوازیاں اور بقول ڈاکٹر احسن فاروقی ''اپنے گھوڑے یا گھوڑی کو آگے لگانے'' کی نفسیات رہی۔مجھے اس سے انکار نہیں کہ یہ سب بھی بندے بشر کے ضمیر میں ازل سے شامل ہے لیکن آٹے میں نمک کی حد تک ہوں تو کوئی مجھ سا لکھنے والا در گذر کر جائے لیکن نمک میں آٹا ہو جائیں تو کیا کرے۔۔؟ خود گذر جائے۔۔میں بھی قریب قریب گذر ہی گیا لیکن شعر و ادب کی شراب ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' کے مطابق جان سے لگی رہی۔ گاہے گاہے کلام اور مضامین وغیرہ شائع ہوتے رہے۔'فنون' 'سیپ' کبھی کبھار جنگ کراچی' ایک آدھ مرتبہ 'ڈان' کراچی اور جسارت میں ہفتہ وار ادبی کالم 'گاہے گاہے' کے عنوان سے کچھ عرصہ۔فی الحال ہفتہ وار 'اردو پوسٹ' کینیڈا میں ادبی کالم۔وغیرہ وغیرہ۔
قریشی صاحب! آپ کی حِس مزاح نہایت برجستہ ہے۔ابھی کی بات ہے ٹیلیفونی بات چیت میں آپ نے کتنا برجستہ کہا تھا'' آپ گوشہ نشین کیسے ہوئے۔۔؟ گوشہ نشین تو وہ ہوتا ہے جس کا گوشہ شائع ہو جاتا ہے۔'' ابھی میں آپ کے اس فقرے کا پوری طرح مزہ بھی نہ لے پایا تھا کہ خبر ملی کہ آپ مجھ کو''گوشہ نشین'' کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔میں نے لڑکپن میں اپنی والدہ کو یہ کہتے سنا تھا'بن مانگے موتی ملے،مانگے ملے نہ بھیک' یہ کہاوت میری کمزوری بن گئی کیونکہ بعد میں۔۔۔شعر و ادب کا جو ماحول بنا اس میں موتی تو موتی معمولی کنکر' پتھر بھی بن مانگے ملنا قطعی بند ہو گئے بلکہ مانگنا۔۔۔بھیک مانگنا ہو کر رہا،یا پھر۔۔۔آگے بڑھ کر۔۔۔سفارش سے حاصل کرنا' ہتھیا لینا' جھپٹ لینا' وغیرہ وغیرہ۔۔۔بھائی یہ میں چاہتا تھا جو آپ بن مانگے دینے جا رہے ہیں۔میں تو حیران ہوں اور آپکا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

مخلص

عبداللہ جاوید

عبداللہ جاویدؔ ۔۔مختصر تعارف

نام :محمد عبداللہ خاں جاوید **قلمی نام** :۱۔جاوید یوسف زئی (ساٹھ کی دہائی کے وسط تک)
۲۔عبداللہ جاویدؔ ۔ (زبانِ خلق کی عطا)

مقام وسال پیدائش : غازی آباد۔۱۶ دسمبر ۱۹۳۱

والد کا نام : محمد اسمٰعیل خاں (مرحوم) **والدہ کا نام** : شمس النساء بیگم (مرحومہ)

اجداء کا تعلق : ددھیال سے:یوسف زئی افغان ننھیال سے:ایرانی

تعلیم : ایم اے انگریزی وامریکی ادب، ایم اے اردو، ایل ایل ۔بی

پیشہ : ۱۔ وکالت ۲۔ تدریس ۔انگریزی ادب کے لکچرار اور پھر انگریزی اور اردو ادب کے پروفیسر

ادبی زندگی کا آغاز: ۴۲ ۔ ۱۹۴۱

شعبہ ہائے ادب:شاعری (اردو ۔انگریزی)۔افسانہ نگاری (اردو ۔انگریزی)
ڈرامے (اردو)۔تنقید (اردو)

کالم نگاری: روزنامہ جنگ ۔ادارتی صفحہ ’نقطۂ نظر‘۔ ہفتہ وار اعظم ۔کراچی ’تلخ وشیریں‘
روزنامہ جسارت۔کراچی ۔ادبی صفحہ۔’گاہے گاہے‘ ۔ہفتہ وار ٹورانٹو ٹائمز ’ذکرِ خیر‘
ہفتہ وار اردو پوسٹ ۔ٹورانٹو۔ادبی کالم۔ ’دلِ دونیم‘

تصانیف :

بیادِ اقبال (مضامین) ۱۹۶۹
موجِ صدرنگ (شاعری) ۱۹۶۹ ۔ اشاعتِ اوّل۔۔۔۲۰۰۶۔ اشاعتِ دوم
حصارِ امکاں (شاعری) ۲۰۰۳۔ خواب سماں (شاعری) ۲۰۰۶۔

زیرِ ترتیب : تنقیدی مضامین
کالم اور انشائیے۔(انتخاب)۔ادبی کالم (انتخاب)
ادبی مضامین اور خاکے (انتخاب)۔افسانے (انتخاب)

متعلقات : شاعرِ صدرنگ عبداللہ جاوید ۔ تجزیاتی مطالعہ
تجزیہ نگار۔تسلیم الٰہی زلفی۔

حسن عابدی()

موجِ صدرنگ

یہ مجموعہ دیدہ زیب ہونے کے علاوہ قاری کو دعوتِ فکر ونظر بھی دیتا ہے۔اس میں ایک بے چین روح اور متجسّس نگاہوں کی وارداتِ قلبی کو شعر کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔لیکن اس مجموعے کو آپ محض آپ بیتی بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ شاعر نے دوسروں کے کے دکھوں کو اپنے دکھوں میں اس خوبصورتی سے سمویا ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا بہت مشکل نظر آتا ہے اور یہی شاعر کا کمال ہے

مجموعے پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔وہ زندگی کے بعض دقیق حقائق کو اس آسانی سے بیان کر دیتے ہیں کہ سامنے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں حالانکہ یہ بات دیکھنے میں جتنی آسان نظر آتی ہے اس کو برتنے میں اتنی ہی مشکل پیش آتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے روایتی انداز پر شعر نہیں کہا بلکہ ان کی سوچ اور اس کے اظہار میں ایک جدّت اور اپچ ہے۔وہ عام مشاہدے اور تجربے کو بھی اپنے اندازِ بیان سے ایک نیا روپ دے دیتے ہیں اس کے علاوہ ان کے اظہارِ بیان میں بھی بڑی بیبا کی اور خلوص ہے اس لئے ان کا شعر آسانی سے دل میں گھر کر لیتا ہے ۔تشبیہوں کے استعمال میں انہوں نے خاصے سلیقے اور خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا ہے۔بعض مقامات پر بالکل اچھوتی تشبیہوں کے ذریعے انہوں نے غیر مرئی احساسات کو ٹھوس حقیقتوں کے قالب میں ڈھال دیا ہے

مثلاً ؎ یاد یوں دل میں کسی کی آئی روشنی جیسے نظر تک پہنچی
(یا یہ شعر) رات کے ساتھ مہ ونجم کا رشتہ ہے مگر جیسے ظالم کا تعلق ہو مراعات کے ساتھ

جیسا کہ انہوں نے کتاب کے مقدمہ میں کہا ہے کہ ان کا تعلق شاعری میں کسی خاص مکتبۂ فکر سے نہیں وہ شاعری کو آتش لکھنویؔ کی طرح صنّاعی بھی تصوّر نہیں کرتے بلکہ بقول ان کے شاعری صنّاعی نہیں بلکہ خلّاقی ہے۔

مجھے آپ کی غزل اور نظم دونوں میں بہت کچھ لطف اور ذہنی اور روحانی بالیدگی کا سامان ملا۔آپ نے اپنے وسیع مطالعے کو بھی اپنی شاعری میں جگہ جگہ سمویا ہے۔ **شمس الرحمان فاروقی**

تاثرات

موجِ صدرنگ کے مندرجات ،اسلوب ،بیان ،اندازِفکر،طرزِتغزل،اور روایات کے حدود میں رہتے ہوئے ،طبع زادتخلیقی ندرت سے مالا مال ہیں اس میں کوئی شبہ ہی نہیں۔خدا کرے دوسرا مجموعہ جلد از جلد مرتّب ہو جائے۔آپکا مجموعہ میرے احباب میں گشت کررہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آپ کی غزل نئے تفکر کی اشارہ نما ہے۔نئے تغزل کا اشاریہ ہے،آپ نے موجِ صدرنگ کے دیباچے میں شعر کے مزاج کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔میں اس سے سو فیصد متفق ہوں۔اس مرتبہ کراچی تشریف لائیں تو ضرور مجھے شرف ملاقات بخشیں۔ **رئیس امروہوی**

میں نے آپکو بڑی محبت ،انہماک اورشوق سے پڑھا۔آپ امپریس کرنے کے لئے نہیں لکھتے بلکہ آپ کے یہاں باریک سے باریک نکات بھی بڑے فطری ،شفاف اور غیر ڈرامائی معمول سے نبھ جاتے ہیں جو واقعی بڑی بات ہے۔میری رائے میں اظہار و بیان کا ایسا ہی بالغ اور شور سے پاک انداز مستقبل میں ہمارے ادب کی محلیت کے اسباب کا موجب قرار پائیگا۔ **جوگندر پال**

عبداللہ جاویؔد کی بیس سالہ کاوشوں کا نچوڑ موجِ صدرنگ کی صورت میں ہمارے پیشِ نظر ہے۔ساتھ ہی ان کے وہ مضامین بھی جومختلف رسائل کی زینت بنے۔ہمیں اس نظرئے کی تلاش ہے جو جاویؔد کا ایمان بن کراس کے ان ادب پاروں کے تمام جھرونکوں سے جھانک رہا ہے۔جاویؔد نے شاید اپنی ان تخلیقات کو ذریعہ بنا کران قدروں کے پرچار کا بیڑہ اٹھایا ہے جوزندگی ،احساسِ شعور،وجدانِ فکراوران سب سے بڑھ کرانسان کی عظمت کی علمبردار ہیں۔عبداللہ جاویؔد کے نزدیک فن کا معیار آفاقی اوراسے پرکھنے کے لئے کسوٹی انسان۔وہ انسان جو بلا تخصیص خطہ،مذہب،زبان ،رنگ اورنسل کے صرف سانس کی آتی جاتی دودھاری تلوار کی زد میں ہے۔

عبداللہ جاوید نے خود شاعری کی تعریف یوں کی ہے کہ میری رائے میں شاعری صنّاعی نہیں بلکہ خلاّقی ہے۔خلاّقی کو خالص شعوری عمل سمجھنا قرینِ قیاس نہیں۔تنقیدی شعور کے اس درجے پر پہنچنے والے شاعر کے یہاں داخلیت اور خارجیت دونوں فکرواحساس کے بلند مرتبے ملنا کوئی مشکل نہیں۔شاید اس لئے جاویؔد کے ہر تیسرے شعر میں یہ بات واضح نظر آتی ہے۔ان نظموں میں :تم جواَب سامنے ہو، یہ بھی کیا کم ہے،قلوپطرہ،زیست، بھاگتے لمحے بدلتے روپ،نوشتۂ دیوار،لہو عظیم ہے یارو،اور ویت نام ایک لمحۂ فکریہ،بہت خوبصورت نظمیں ہیں۔

انوار احمد زئی

ڈاکٹر الیاس عشقی (حیدرآباد)

حصارِ امکان

ایسا خیال پڑتا ہے کہ کسی نے کبھی عبداللہ جاوید صاحب کی شاعری کے پہلے مجموعے ''موجِ صدرنگ'' کو بجاطور پر زندہ جاوید شاعری قرار دیا تھا۔میں اس میں ترمیم وضاحت سے کرنا چاہتا ہوں کہ ایک زندہ جاوید شاعر کی زندہ جاوید شاعری ہے۔اس لئے کہ شاعری شاعر سے اور شاعر شاعری سے زندہ رہتا اور پہچانا جاتا ہے۔

پہلی رائے میں مبالغہ کا شائبہ ہوتو ہو مگر میری رائے بے لاگ ہے اور پوری ذمہّ داری کے ساتھ دی گئی ہے کہ اس کتاب کا ظاہر باطن کا اور باطن ظاہر کا آئینہ دار ہے۔لیکن عروس جمیل کے قامت پر لباس حریر تنگ پڑ گیا ہے۔کتاب دیدہ زیب اوراس کے مندرجات لطیف اور خیال انگیز ہیں۔

دنیا میں شاعری کی بہت تعریفیں کی گئی ہیں مگر فن کوئی تعریف قبول نہیں کرتا اور دائرہ امکان کو توڑ کر نکل جاتا ہے۔عبداللہ جاوید صاحب نے بھی بڑے خلوص اور ہنر مندی سے اپنی شاعری اور معاصر ادب کے حوالے سے شاعری کی ایسی تعریف کی ہے جو تعریف معلوم نہیں ہوتی۔انکی تحریر میں جو تازگی اور ابتکار ہے۔اس سے انداز بیان پر ان کی قدرت مافی الضمیر کو صاف اور سنہرے انداز میں بیان کرنے کا سلیقہ اور سادہ الفاظ کی معنویت پر انکی قدرتِ اظہار کا اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے شاعر سے زیادہ پڑھنے والے کے ذوق پر بھروسہ کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ان کے کلام کا ان سے بہتر تجزیہ اور انتخاب کرسکتا ہے۔یہ بات اپنی شاعری اوراس کے قاری کے متعلق انہوں نے اپنے انداز میں کہی ہے۔شعر کا معاملہ عجیب ہے۔اس سلسلے میں ایک عمر کے غور وخوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شعر پڑھتے ہی اور سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شاعری ہے۔شعر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔درمیانی کوئی راستہ نہیں ہوتا۔اس سلسلے میں مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی تامّل نہیں ہے کہ عبداللہ جاوید صاحب کا دوسرا مجموعہ 'حصارِ امکان' اچّھی شاعری کی کتاب ہے ان کے کلام کے شاعری ہونے میں تو کوئی کلام نہیں لیکن کتنی بڑی شاعری ہے یہ فیصلہ تو وقت گزرنے کے بعد ہی تاریخ کرے گی۔ابھی تو شاعر اوراسکی شاعری ہماری آنکھوں کے اتنے قریب ہیں کہ آنکھیں پوری طرح ادراک نہیں کرسکتیں۔کبھی شعر شاعر سے تو کبھی شاعر شعر سے زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔یہ فاصلہ دونوں میں توازن پیدا کردے گا تو حقیقت ابھر کر سامنے آجائیگی۔جہاں تک اس ناچیز کی رائے

کا تعلق ہے تاریخ کا فیصلہ ذوق اور عقل کے خلاف نہ ہوگا۔

جدید ترین تنقید نے جس میں بلا شک ایک حد تک فکری صداقت بھی ہے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاعر جب خارجی ماحول سے اثرات اخذ کر کے اپنے شعور اور تحت الشعور کے عمل سے گذر کر اسے ایک بار پھر خارج کے حوالے کرتا ہے تو اس میں ذاتی عنصر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر اپنی شاعری سے بالکل بے تعلق کیسے ہو سکتا ہے۔ فکر و جذبات کا توازن اس قسم کی تقسیم کو اور اس بے رحم عمل کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس مختصر ریڈیائی جائزے میں اس طول کی گنجائش نہ تھی لیکن شاعر نے کچھ ایسے مسائل چھیڑے تھے کہ یہ باتیں ناگزیر معلوم ہوئیں۔ اس طول کلام کے بعد اصلی کتاب کے بارے میں گفتگو کا وقت کم رہ جائے گا اور اسکے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا۔

اس دور میں مختصر نظموں کا رواج ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے۔ جس میں دیسی اور بدیسی سانچے سب ہی ہیں ۔لیکن یہاں ہمارا موضوع دیسی سانچوں سے متعلق ہے۔ ہمارے دور کی مختصر ریزہ چینی کی یہ مثالیں ایسی ہیں جن میں مفہوم کو خوردبین سے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں عبداللہ جاوید صاحب ایک منفرد فکر کے شاعر ہیں۔ ان کی تقریباً سب ہی مختصر نظمیں مرکزی خیال اور فکری عنصر کا ایک توازن پیش کرتی ہیں۔ یہ شاعر کی طبیعت کا توازن ہے جس نے انکی اکثر چھوٹی نظموں کو ایک منفرد مقام دے دیا ہے۔

انہوں نے مشرق اور مغرب کے جس فکری اور تیکنیکی توازن کا ذکر کیا ہے اور مشرقی اقدار کی جس پاسداری کا ذکر کیا ہے وہ بھی ان کی چھوٹی نظموں میں نظر آتی ہے۔ چھوٹی نظموں کی بلاغت اور معنویت ایک جہاں معنی رکھتی ہے جو الگ ایک اظہارِ خیال چاہتی ہے۔ یہاں کچھ اور مختصر نظموں کا ذکر کرنا ہے انہوں نے بہت طویل نظمیں تو لکھی ہی ہیں لیکن نسبتاً طویل نظمیں بھی مختصر ہی ہیں جن میں بڑے موضوعات کو ''کوزے'' میں بند کیا ہے۔ یہ بھی ایک جداگانہ بیان چاہتا ہے اور ہمیں سرِ دست مختصر نظموں سے تعلق ہے۔

''حصارِ امکان'' کو کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ایک لمحہ کو بھی گمان نہیں ہوتا کہ 'زوالوجی' کی حقیقت بیان کر رہا ہے: سنڈی سے تتلی کے قالب میں آنا / پھر سنڈی بن جانا / مر جانا / تتلی بن کر اڑ جانا

دیکھئے کس طرح انہوں نے غالب کے دشتِ امکان کو دائرہ امکان میں لا کر ایک فطری حقیقت کو کسی حد تک افشا کیا ہے۔ نظم ''کیسی بلندی کیسی پستی'' ملاحظہ کیجئے۔

پانی / بادل کا /
اونچے سے اونچا / جاتا بھی ہے /
نیچے سے نیچے / آتا بھی ہے

جو حقیقت ان سادہ لفظوں میں بیان ہوئی ہے حیرت ہے سادہ لفظوں میں کیسے سما گئی۔ اگر آپ کو مایا کا روپ دیکھنا ہو تو اس دشوار فلسفے کو ان سادہ سلیس لفظوں میں دیکھئے۔

صورت کے اندر / صورت گر دیکھوں / باہر سب دھوکا / کیوں باہر دیکھوں

مایا کے مقابلے میں کس خوبصورتی سے وجود کی تصدیق کی گئی ہے۔ مجرد آزادی کے تصور اور اصل صورت حال کے احساس کی نزاکت دیکھئے۔

پنجرے کے باہر بھی
شاید
پنجرہ ہے
باہر کے باہر بھی شاید
پنجرہ ہے

احساس کی اس سطح پر شاعری کم ہوئی ہے۔ جبر و اختیار کے الجھے ہوئے موضوع کو بھی اس انداز سے بیان کیا ہے تعجب ہوتا ہے کہ انہیں ناگزیر الفاظ کس آسانی سے مل جاتے ہیں ۔

دریا میں رہنا بھی ہے
بہنا بھی ہے
پل پل کچھ کرنا بھی ہے
بھرنا بھی ہے
فصلِ غم بونا بھی ہے
ڈھونا بھی ہے
مرنے سے ڈرنا بھی ہے
مرنا بھی ہے

غزل کا انداز بھی نرالا ہے مانوس مگر احساس کی سطح پر بلندی کو چھوتا ہوا ۔

جس سے بھی دل لگا وہ بڑی دیر سے ملا — جو بھی بھلا لگا وہ بڑی دیر سے ملا
فیصلہ تھا نہ مانگوں اس کو — ہاتھ اٹھاتا تو دعا کیا کرتا
اپنی تخلیق کی اکائی میں — ایک ہیں خلق اور خدا دونوں
مانگتے وقت ہوا کیا جاوید — کس کی نیت تھی کسے مانگ لیا

اپنی حسیت میں جاوید صاحب سب سے جدا ہوتے ہوئے بھی سب کے ہم آواز نظر آتے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے۔ **(ریڈیائی تبصرہ۔ ریڈیو پاکستان حیدرآباد سندھ۔ ۲۷ مئی ۲۰۰۳ ۔ وقت نشر۔ ۲ بج کر ۳۰ منٹ)**

اکرام بریلوی (امریکہ)

عبداللہ جاوید کی شاعری

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

عبداللہ جاوید جو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہیں، عالمی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔۔۔افسانوی ادب اور سنجیدہ کالم نگاری کے رموز سے واقف ہیں، ان کے تین دیدہ زیب شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔۔۔انہوں نے خود اپنے نظریہ شاعری سے متعلق کئی اجمالی اور تفصیلی خیالات کا اظہار کیا ہے جسکا لُبِ لُباب کچھ اس طرح ہے۔

''میری رائے میں شاعری صنّاعی نہیں بلکہ خلّاقی ہے اور خلّاقی کو خالص شعوری عمل سمجھنا قرینِ قیاس نہیں۔۔۔شعر وارد ہوتا ہے، لایا نہیں جاتا۔ جب وہ آتا ہے تو اپنے ساتھ وہ سب کچھ لاتا ہے جسکو ہم فارم، اسلوب، آہنگ اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ متنوّع اور مختلف فارم شاعری کے خلّاقانہ عمل میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔۔۔۔شعر میں خواہ خطابت کی روح ہو، خواہ فکر کا عنصر، جذبے کی آمیزش ہو کہ احساسِ جمال کا رچاؤ، شعر اوّل اور آخر شعر رہتا ہے اور اسکو شعر کے طور پر دیکھنا ہی صحیح ترین عمل ہے۔۔۔۔۔ابہام، ابلاغ میں رکاوٹ کا موجب نہیں ہوتا۔۔۔۔۔اس سے معنوں میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔جس بات کو ہم روایت سے بغاوت کہتے ہیں۔ وہ بھی روایت کے پس منظر میں نمو پاتی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

لیکن میری رائے میں بکھری بکھری، ریزہ ریزہ بے نام سی چیزوں کو زندگی دینا شاعری کی جادوگری ہے اور اس زندگی کا اہم ترین اور حسین ترین مظہر انسان اور اسکے مسائل و معمولات ہیں۔۔۔پابلو نرودا نے کہا تھا۔'' یہ انجان گلی کا بلاوا ہے ''۔۔۔ شاعر اس انجان گلی میں انجانی بے چینی کے دباؤ میں سرگرداں رہتا ہے کہ یہ ایک بے سمت سفر ہے اپنے آپ کے ساتھ اور اپنے سے ایک بامعانی علیحدگی کے ساتھ۔۔۔۔۔اس حقیقت کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اجتماعی شعور کے اظہار کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقۂ کار کا نام شاعری ہے۔ شاعری جو زندگی اور انسان کو قریب لاتی ہے۔۔۔۔۔۔اور زندگی اور انسان کی رزم و بزم آرائی شاعر کے لئے سرخوشی اور نشاط و انبساط کا حیلہ اور وسیلہ بن جاتی ہے۔۔۔۔۔شاعر کا رشتہ گو بظاہر اندھیروں سے ہے مگر وہ اندھیروں میں روشنی اور نور پھیلانے کو اپنا مقصود و منشاء سمجھتا ہے۔۔۔۔۔ہمیں ان ہی حدود و امکانات کے

اندر رہ کر عبداللہ جاوید کی شاعری کو دیکھنا، سمجھنا اور پرکھنا ہے۔

عبداللہ جاوید کا عمومی موضوع انسان اور خدا، اور ان کے اندر اور باہر جو کچھ بھی ہے وہ ان کے ذیلی موضوعات ہیں دراصل ان کی شاعری کا محور صوفیانہ افکار سے ہم رشتہ ہے۔ان کے صوفیانہ افکار و واردات میں جو والہانہ شیفتگی و برُشتگی نظر آتی ہے اس میں ان کے ددھیال اور ننھیال کا بڑا حصّہ ہے اور مذہبی روایات کا بھی۔۔۔۔ وہ تصّوف اور طریقت کو انسانیت کی ارتقاء اور تکمیل کا راستہ خیال کرتے ہیں، اور پایان کار، یہی راستہ مذہبی، سماجی، عمرانی اور اخلاقی نظام سے مل جاتا ہے۔اس اخلاقی درس کے دو مخرج ہیں۔۔۔۔ ایک بے لوث محبّت اور دوسرا دلِ درد آشنا۔۔۔۔ان دونوں کے امتزاج سے وہ زندگی میں نہ صرف تجربات حاصل کرتے ہیں بلکہ اپنی شاعری میں گہرائی اور گرائی پیدا کرتے ہیں۔انہوں نے شعوری طور پہ جو نظامِ فکر اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے اسکی مثال خانقاہوں میں نظامِ عمل کی صورت میں نظر آتی ہے۔ان کا یہی نظامِ فکر اک گونا طہارتِ نفس اور پاکیزگی پیدا کرتا ہے، جن کے تمام ممکنات و مضمرات کو میں ''عالمِ سرِّ جاں'' سے تعبیر کرتا ہوں۔۔۔اس مقام تک پہونچنے کے لئے قلبِ ماہیت ضروری ہے، یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب شاعر اپنے زخم کرید کرید کے دکھانے کے بجائے زمانے بھر کے غم اپنانے کا حوصلہ رکھتا ہو۔۔۔یوں تو ولؔی اور میرؔ بھی اس 'عالمِ سرِّ جاں' سے گزرے مگر انہیں زیادہ تر مجازؔ سے دلبستگی رہی۔ غالبؔ نے کچھ سوال اٹھائے، تحیّر، تجسّس اور تشکیک سے گزر سے۔۔۔ جدید دور کے شاعروں میں فانؔی، اصغرؔ اور جگرؔ بادۂ تصوّف کے ذوق شناس ہیں۔لیکن جن شعرا میں، خاص طور پر عالمِ انوار و اقدار اور عشقِ حقیقی کی زمزمہ سنجیاں ملتی ہیں ان میں مظہر جانِ جاناںؔ، نیازؔ بریلوی، میر عبدالحئی تاباںؔ، میر دردؔ، قائم چاند پوریؔ، میر اخترؔ، انعام اللہ یقیںؔ سرتاسر رچے ہوئے ہیں۔عبداللہ جاویدؔ پر ان ہی شعرا کا اثر ہے وہ ان کے سفیر و اسیر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات تو یونہی درمیان میں آگئی تھی۔۔۔۔۔۔۔عبداللہ جاویدؔ نے اپنی شاعری میں اس منزل تک پہونچنے کے لئے چھپ چھپ کر مژہ مژہ سیلِ خوں بہایا ہے۔اپنے غموں کو انگیز کر کے دوسروں کے غم کو اپنایا ہے۔۔۔۔ان کی زندگی کی راتیں اس کشمکشِ سوز و ساز میں گذری ہیں۔عبداللہ جاویدؔ بھی دنیاوی آسائشوں کے میسّر ہونے کے باوجود اسی عالمِ کرب سے گزر رہے ہیں کہ ان کے لئے 'درغمِ دیگر بسوز' وظیفۂ حیات ہے اس لئے ان کے کلام میں وہ ٹھہراؤ ، وہ ضبط و احتیاط، اور عناں گیختگی ہے جو صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جو زندگی اور عشق کی تمام صعوبتوں پر انسان عبور پا جائے اور عارفانہ تیور اور بے نیازانہ وضو کے ساتھ سب کچھ سہ لینے کے قابل ہو جائے۔عبداللہ جاویدؔ ہمیں دردؔ کی طرح اسی منزل پر نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ یہ وہ منزل ہے جہاں غمِ نشاط اور اضطراب ایک بلیغ سکون میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔۔۔۔ اور اس طرح انہوں نے اپنے باہر کو بھی اپنے اندر سمولیا ہے اور اسی لئے ان کی شاعری میں بھی کما حقّہ وہ سب کچھ سمٹ آیا ہے جو باہر ہے یا خود انکے اندر سمایا ہوا ہے۔۔۔ اور اسی لئے وہ محبّت اور عشق کی سرحد پار

کر کے جنوں کی منزل کو چھو تے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔ وہ معرفتِ نفس کی اس منزل کو سرَ کر کے، معرفتِ کائنات اور معرفتِ الٰہی کو پہونچتے ہیں۔۔۔ان کے ہاں جب جذبے پر تخیّل کی ضرب لگتی ہے تو اس میں ایک طرح کی روشنی پیدا ہوتی ہے۔یہ روشنی ان کے نزدیک تجلّیِ الٰہی ہے جو انہیں مشاہداتِ آب و گلِ اور کرشمۂ حیات سے ہمکنار کرتی ہے۔یہی نہیں بلکہ اس طرح خودی اور خدا ان کے ہاں ایک ہوتے نظر آنے لگتے ہیں اور میں نے اس حقیقت کو ُعالمِ سرِّ جاں‘ سے تعبیر کیا ہے۔آیئے اب ان سیّال کیفیات سے مملو کچھ اشعار ملاحظہ کرلیں۔

ہمارا سایہ بھی ایسا نہیں کہ اپنا ہو — وہ ساتھ ساتھ بھی رہ کر جدا جدا ہی رہا
یوں دیکھئے تو اس کا نشاں بھی کہیں نہیں — محسوس کیجئے تو وہ ہر سُو دکھائی دے
حسنِ گریز پا میں ترا آئینہ تو ہوں — لیکن وہ عکس ڈال مجھے تو دکھائی دے
کیا ہے عشق تو اب روکنا کیا — یہ خنجر تو رگِ جاں پر رکے گا
عشق ہے ظاہر میں خوشبو کا سفر — راستہ جاتا ہے انگاروں کے بیچ

ان تمام ممکنات و مضمرات کو میں ُعالمِ سرِّ جاں‘ سے تعبیر کرتا ہوں مگر اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایک بہار ایجاد ذہن ُنیرنگیِ جلوۂ تن ‘ کی لطافتوں سے بے نیاز ہو جائے۔عبداللہ جاویدؔ کے ہاں اس طرح کے اشعار کی تہذیب یافتہ تکرار بھی جلوہ ریز ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

زیرِ پیراہن بھی وہ رنگیں بدن — سر سے پا تک شعلۂ عریاں لگے
کہا بھی ہم نے وہ آدمی ہے خواب نہیں — یہ دل غریب مگر خواب دیکھتا ہی رہا
بے ساختہ ہنسنے کی ادا یاد رہے گی — ہونٹوں پہ ہنسی، رخ پہ حیا یاد رہے گی
ہر روپ ترا دل پہ مرے نقش رہے گا — ہر بات تری مجھ کو سدا یاد رہے گی

اور ’’موجِ صدرنگ‘‘ کی نظم ُلب بستگی‘‘ اور جسم کی آواز تو نیرنگیِ جلوۂ تن سے شرابور ہیں۔’’موجِ صدرنگ‘‘ میں جذبہ فکر میں لوَ دے رہا ہے تو ’’حصارِ امکاں‘‘ اور اسکے بعد ’’خواب ساں‘‘ میں فکر میں جذبے کے رچاؤ کے ساتھ فللکس (FLUX) کی سی کیفیت در آئی ہے یعنی سادگی میں ایک طرح کی وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ گہرائی اور گرائی پیدا ہوئی ہے اور عبداللہ جاویدؔ اس پرکار سادگی میں ُآزادہ و خود بین‘ نظر آتے ہیں یعنی انفرادیت پیدا ہوئی ہے۔۔۔زیادہ تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے، وہ خود ہی کہتے ہیں:۔

’’موجِ صدرنگ‘‘ ہو یا زیرِ نظر کتاب (حصارِ امکاں) میرا شعری اسلوب بندھا ٹکا، سانچے میں ڈھلا یا ڈھالنے والا صنعتی، میکانکی، دستکارانہ، مشینی، مرصّع کاری سے سجایا ہوا بڑی حد تک ٹھوس اسلوب نہیں ہے۔اسکے بر خلاف سیّال، لچکدار اور صدرنگ ہے۔۔۔۔’’موجِ صدرنگ‘‘ اور (’’حصارِ امکاں‘‘) زیرِ نظر کتاب میں جو فرق ہے وہ دو دنیاؤں کا فرق ہے میں ان میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہوں۔‘‘

یہ لچکدار اور صدرنگ کیفیت آئندہ بھی قائم رہتی ہے اور یہی انکی انفرادی شان اور امتیازی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

نہ تھا وہ جس کو دنیا دیکھتی تھی — جو تھا وہ سامنے آتا نہیں تھا
جسم کے اندر سفر میں روح تک پہنچے مگر — روح کے باہر رہے، اندر نہیں دیکھا گیا

یا اس نظم میں۔

صورت کے اندر/صورت گر دیکھوں/ باہر سب دھوکا/ کیوں باہر دیکھوں !

اور اب وہ جاپان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ فلسفی نیشی دا کتارو Nishida Kitaro کے قریب آجاتے ہیں، جس کا کہنا ہے۔

"The West has taken Being as the ground reality, and the East has taken nothingness and the relationship of the human individual to either or both of these conceptions "

اس اقتباس کی روشنی میں درجِ ذیل شعر اور نظم ’’سب میں ہوں مگر سب نہیں ہوں‘‘ کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

نہ ہونے پر بھی ہوں، میں ابتدا سے انتہا تک ہوں — مرا ہونا کوئی دیکھے، میں بندے سے خدا تک ہوں
سنّاٹے میں کوئی صدا سی دیتا ہے — سنّاٹے میں بھول نہ جانا، میں بھی ہوں

’’وا ،صورتِ زخم تھا/اب نہیں ہوں/فریاد تھا، پہلے اب نہیں ہوں/۔۔۔گو، میرا نفس نفس ہے روشن/مانگی ہوئی تاب و تب/نہیں ہوں/دشمن ہوں ازل سے تیرگی کا/میں سنگِ فصیلِ شب نہیں ہوں/مثبت ہوں/نفی سے صلح کرلوں/اتنا بھی تو باادب نہیں ہوں‘‘

اور

’’موجود ازل سے ہوں ،ابد تک — اے وقت بتا میں کب نہیں ہوں
کثرت میں ہوں وحدتِ مبیّن — سب میں ہوں مگر میں سب نہیں ہوں۔‘‘

(حصارِ امکاں)

میں اس مضمون کے شروع میں کہہ چکا ہوں کہ عبداللہ جاویدؔ کا عمومی موضوع ُانسان اور خدا‘ سے ہم رشتہ ہے۔۔۔۔وہ تصوّف اور طریقت کو انسانیت کی ارتقاء اور تکمیل کا راستہ تصوّر کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ انسان اپنے پورے، رومانی، ذہنی، جذباتی، مادّی اور جسمانی وجود کے ساتھ (ان ہی کے الفاظ میں) گنگناتا، ہمکتا، روٹھتا، اور منتا نظر آتا ہے۔اسکے علاوہ ان کی شاعری میں کم و بیش وہ سب کچھ بھی ہے جو ان کے عمومی موضوع کے اندر اور باہر پھیلا ہوا ہے۔۔۔اس پھیلے ہوئے موضوع میں زندگی اور اس کی ناکامیاں اور ناہمواریاں بھی ہیں، فطرت کا جلال و جمال بھی ہے، قدرت کے مناظر کا حسن، پھولوں کے رنگ، آزادی کی تڑپ، بھور سمے کا جادو، اور شام کا طلسم بھی ہے۔۔۔۔۔وقت کی سوفطائی وسعت کا تصوّر بھی ہے اور حیات کی دلکشی اور دکھ کے ساتھ ایک طرح کا گہرا احساس بھی۔۔۔زمانے کی شکایت بھی ہے اور خود آگہی اور خدا آگاہی کا کرب اور اعتماد بھی

ہے۔۔۔مادرِ گیتی کی خوشبو بھی ہے اور نوعِ انسان کا درد بھی ہے اور روایات کا لحاظ بھی۔۔۔اور جدّتِ ادا کی مختلف صورتیں بھی جلوہ گر ہیں۔۔۔یعنی عبداللہ جاوید زندگی کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری کم و بیش پوری زندگی کی وسعت پر حاوی ہے۔ان کی غزلوں سے کچھ اشعار اور منظومات سے چند حوالوں کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں:۔

ہم خدا کو بھی بسا لیں دل کے بیچ　　شرط یہ ہے وہ ہمیں انساں لگے

اسی نے تیرگیِ شب کی باگ موڑی ہے　　وہ ایک شعلہ جو تا صبح کانپتا ہی رہا

خاموشیوں میں سرِّ نہاں کھولتا ہوا　　گونگا ہے لاکھ پھر بھی سراپا زباں ہے وقت

کل کائنات اپنے جلو میں لئے ہوئے　　جاوید ہست و بود کا اک کارواں ہے وقت

یہ وقت گزر رہا ہے یا میں　　خود وقت ہوں اور گزر رہا ہوں

اگلے لوگ تو فصلِ جنوں میں دامن چاک پھرا کرتے تھے

آج جنوں کہتا ہے مجھ سے دامن کا ہر چاک سیوں

ترے کوچے میں تھا یہ بات سچ ہے　　میں زیرِ سایۂ دیوار کب تھا

جمالِ یار کا جادو نہیں تو پھر کیا ہے　　چمن چمن جو فروزاں ہیں رنگ و بو کے چراغ

اور بھی تھے اس کی محفل میں باتیں سب سے ہوتی تھیں　　سب کی آنکھ بچا کر اس نے ہم کو تنہا دیکھا تھا

چاند گگن میں ایک ہے لیکن عکس ہزاروں پڑتے ہیں　　جس کی لگن میں ڈوب گئے ہم، دریا میں اک سایہ تھا

وہ روئے سادہ جو دیکھا تو یاد بھی نہ رہا　　کہ لوگ ہم نے کئی ماہتاب سے دیکھے

۔۔۔۔لہو کی بوند/حیات آفریں لہو کی بوند/جگر کی آگ/سلگتے ہوئے جگر کی آگ/ڈھلکتے اشک/کسی ماں کی مامتا کے چراغ/اجڑتے لٹتے ہوئے دلہنوں کے پیار، سہاگ/کراہیں بوڑھوں کی/بچّوں کی سسکیاں، آہیں/جوان سینوں سے ٹکراتی گولیوں کی پکار/لہو کے چھینٹوں سے رنگین/سرخ سنگینیں/بموں کے دہن/اگلتے ہوئے دھواں اور آگ/مناؤ جشن تو ان کا بھی کچھ خیال کرو/یہ مانا خاک سے گلزار ہو گئے پیدا/کھلے ہیں کو بہ کو غنچے/رنگی گلی کلیاں/بہار آئی ہے، دورِ خزاں تمام ہوا　　**(شہر شہر جشن)**

ان کے علاوہ ''سفر''، ''انتہا''، ''اقوامِ متحدہ'' اور چند دوسری نظمیں بھی توجہ کی مستحق ہیں۔جن سے پتہ چلتا ہے کہ عبداللہ جاوید کی شاعری باطنی سطح پر اپنے قاری کو منفی روّیوں سے آزاد اور نشاطِ غم کی عرفانی تہذیب عطا کرتی ہے جو تزکیۂ نفس اور ارتقائے ابدیت کی الہامی سطح ہے جہاں لفظ محض لفظ نہیں رہتا گنجینۂ معنی کا طلسم بن جاتا ہے۔

عبداللہ جاوید کی شاعری میں کثرت سے بلکہ تکرار کے ساتھ جبر، استحصال اور انسانی جذبوں کی بدلتی شکلیں، طبقاتی، علاقائی مسائل و مظالم اور فکرِ حیات کے حوالے سامنے آتے ہیں۔۔۔۔۔ان میں ''پھول نظمیں'' خصوصی توجہ کی اس لئے مستحق ہیں کہ ان میں کہانی، کردار اور کرداروں کا عمل اور ردِّ عمل بھی ابھر کے آتا ہے۔اِن ا

انوکھی نظموں سے چند جیتی جاگتی مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

۔۔۔۔پھول حوالہ ہے
تخلیق کی صورت میں
خالق کا اجالا ہے

۔۔۔۔پھول کو اپنانا
آساں تو ہے پہلے
جاں سے گزر جانا

۔۔۔۔پھول سے مت کھیلو
پتّی پتّی ہونے کا
دکھ پہلے جھیلو

۔۔۔۔پھول کے چوکیدار
رنگ و بو پر پہرے وہرے
سب کے سب بے کار

۔۔۔۔پھول پہ رکھ کر پاؤں
جب واجا نے مونچھ مروڑی　　(واجا۔مکرانی سردار)
رویا سارا گاؤں

عبداللہ جاوید نے طنزیہ لہجے کو اس طرح اپنایا ہے کہ اس میں تلخی اور چراندھ کے دھوئیں کے بجائے ایک طرح زندگی آمیز خلش سی کھٹکتی اور چبھتی رہتی ہے اس کارِ ہنر میں وہ اکبر الہٰ آبادی کے شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

ہم تو بندے ہیں، خدا کا بھی تصوّر جاوید　　ہر زمانے میں بدل جاتا ہے حالات کے ساتھ

صحرا صحرا، گلشن گلشن، شبنم کا انجام　　چڑھتے سورج کی پوجا میں کس کو رہا ہے یاد

کھا پی کر جب راجا رات جگاتا ہے　　اس کی بھوک پرجا سو ہی جاتی ہے

'' قلوپطرہ'' والی نظم طویل ہے اس لئے نقل سے گریز کر رہا ہوں۔اس نظم کے لطیف طنزیہ لہجے کو سمجھنے کے لئے نظم کا مطالعہ از بسکہ ضروری ہے۔ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۰۔۱۳۶۔(موجِ صد رنگ) ''خواب سماں''، '' میں گراؤنڈ زیرو'' اور '' خونی ریکھا'' کا بین السطور طنزیہ لہجہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ان دونوں نظموں میں طنز کی کاٹ اور تیزی دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔

عبداللہ جاویدؔ اپنے بیٹے اسد جاوید کے پاس شگاگو میں تھے اور میں یہ مضمون لکھ رہا تھا یہ تو میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ درویشی و دل ریشی تو انہیں ددھیال اور ننھیال کے حوالے سے ورثہ میں ملی ہے۔ مگر حبِ اہلبیت کی روشنی کی کرن کہاں سے آئی۔ بالآخر میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔ بے ساختہ بولے ''یہ برقِ تجلّی کی دین ہے جو خانہء دل میں جوں کعبہ روشن و منوّر رہے۔'' بات سمجھ میں آ گئی۔ یہی سبب ہے کہ کربلا کا شعری استعارہ طرح طرح سے ان کی شاعری کی زینت بنا ہے۔ کہیں اس میں معنوی تہہ نشینی، کہیں رمز و کنایہ کی اثر آفرینی ہے۔ کہیں اسکا برملا اظہار ہوا ہے۔ کہیں اسنے تاریخی واقعات کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آیئے اس کی چند مثالیں بھی ملاحظہ کر لیں:

کربلا میں سر کٹا کر بھی نہیں ٹھہرے حسینؑ — تا قیامت برسرِ نیزہ سفر جاری رہا

اے مصلحت کی پست زمینوں کے باسیو — کتنی بلندیاں ہیں سرِ دار دیکھنا

دستِ ستم کی پیاس لہو سے بجھا گئے — دیوانے ریگِ زار میں گلشن کھلا گئے

رِدائیں پھر سروں سے کھنچ رہی ہیں — زمینِ کربلا چپ چاپ سی ہے

صرف کعبہ پر نہ تھی حجّت تمام — بعدِ کعبہ کربلا، رکھنی ہی تھی

جناب عبداللہ جاوید ایک خوش گو شاعر ہیں انہیں غزل اور نظم پر یکساں قابو حاصل ہے، غنائیت اور شعریت کے ساتھ ساتھ فکر بھی موجود ہے۔ ان کی پابند نظموں میں تسلسل اور خیال کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ غزل سامانی بھی پوری طرح موجود ہے۔ ان کی غزل میں روایت کے احترام کے ساتھ ساتھ تازہ قاری کا ہر پہلو موجود ہے۔ ان کی غز ل میں عہدِ حاضر کے سارے قرینے نظر آتے میں۔ جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے ؎

صنفِ محبوبِ غزل کا تو وتیرہ ہے یہی — ہر نئے دور میں یہ تازہ جوانی مانگے

ہر اچّھا شاعر خواب ضرور دیکھتا ہے۔ تعمیر کے خواب، انسانیت کی بہبود کے خواب، عبداللہ جاوید نے بھی خواب دیکھے ہیں۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ حقیقت میں بھی خواب کے پہلو تلاش کر لیتے ہیں ؎

کہا بھی ہم نے کہ وہ آدمی ہے خواب نہیں — یہ دل غریب مگر خواب دیکھتا ہی رہا

ان کی شاعری میں غمِ عشق کے ساتھ ساتھ شعورِ ذات بھی ہے، کائنات فہمی میں بھی اور ذات و صفات الٰہی کی آگہی بھی۔ کائنات، اپنی ذات اور اپنے خدا سے رشتہ، یہی تین عناصر ہیں جو حقیقی غزل کو جنم دیتے ہیں اور ایسے ہی شاعر کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ غزل کی صنف سمندر کی طرح وسیع ہے ؎

ہم نے اس صنف کو پرکھا تو سمندر پایا — لوگ کہتے ہیں کہ دامانِ غزل تنگ بھی ہے

ابوالخیر کشفی

رضی مجتبیٰ

شاعرِ صد رنگ

شاعری کی کوئی بھی تعریف کرنا اس لیے محال ہے کہ شاعری میں موجود ابہام، جس کے بغیر شاعری ہی ممکن نہیں، اسے انتہائی Complex بنا دیتا ہے۔ اور غالباً اس ہی وجہ سے ارسطو نے کہا تھا کہ شاعری فلسفہ اور تاریخ دونوں سے کہیں زیادہ اہم ہوتی ہے۔ عبداللہ جاوید صاحب نے اپنی ایک کتاب کے پیش لفظ میں جو بات خارج اور داخل اور صد رنگ کے پیچھے یک رنگ کی موجودگی کے بارے میں کہی ہے، اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ ان کی شاعری نے آج کے بیشتر جدید شاعروں کی طرح روایت سے ایک Absurd بغاوت نہیں کی بلکہ روایت کو اپنا کر جدیدیت کا Back Drop بنایا ہے۔ ''موجِ صد رنگ''، حصارِ امکاں'' اور ''خواب سماں'' کی شاعری کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ عبداللہ جاوید صاحب آج کی دنیا کی Sensibility میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر انھوں نے اس Sensibility میں روایت کا رنگ بھر رکھا ہے۔ اگر چہ کوئی شعر کسی موضوع کو سامنے رکھ کر نہیں لکھا جاتا ہے بلکہ ''اندھیرے'' میں تخلیق ہوتا ہے مگر جدید دور کے پیچیدہ مسائل اور ان سے پیدا ہونے والی محسوساتی اور جذباتی پیچیدگی کی نبض عبداللہ جاوید صاحب کے یہاں تقریباً ہر تخلیق میں چلتی ہوئی محسوس کی جا سکتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ عبداللہ جاوید صاحب، جن کو مغرب کے ادب سے بھی گہری شناسائی ہے، کہاں تک شاعری میں Profundity یا تعمق کی اہمیت کو مانتے ہیں۔ مگر میں چونکہ غالب اور شیکسپیئر کا دیوانہ ہوں اس لیے میں ہر شاعر کے یاں تعمقِ فکر اور گدازِ دِل دونوں کو باہم دیکھنے کا مشتاق رہتا ہوں۔ حرف و بیاں سے متعلق عبداللہ جاوید صاحب کے ہاں ایک بے نیازی پائی جاتی ہے اور اس لیے کہ بقول ان کے ان پر شعر نازل ہوتے ہیں۔ اگر چہ کہ یہ ایک افلاطونی نظریہ ہے مگر عبداللہ جاوید کے یہاں یہ نظریہ نہیں ایک وتیرہ ہے۔ مجھے عبداللہ جاوید صاحب کی شاعری پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری اپنے آپ سے گریز اور حقیقت کے نکتۂ اتصال سے گریز کے جمال سے تابندہ ہے۔ اپنی ذات سے فرار بھی ان کے ہاں پایا جاتا ہے اور غالباً یہی فرار ان کی صد رنگی کو جلا بخشتا ہے۔

عبداللہ جاوید صاحب کو جدیدیت کے تقاضوں کو نبھانے میں کمال حاصل ہے۔ان کے شعر میں جدیدیت روایت سے پیدا ہوتی ہے اور یہی ان کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ان کے لیے دامانِ غزل تنگ اس ہی لیے نہیں کہ ان کے پاس روایت اور جدیدیت دونوں کی وسعتیں موجود ہیں۔ان کے اشعار میں جدید احساس ''میریت'' لیے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ بھی میر کی طرح ساری کائنات کو اپنی شاعری میں سمونے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔مگر یہ شعوری نہیں ایک لاشعوری کوشش ہے۔ورنہ تو ان کی شاعری میں ابہام کا حُسن باقی نہ رہتا۔ مجھے ان کی شعری مجموعوں میں جو شعر پسند آئے ہیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

یہ بھی بہت ہے سینکڑوں پودے ہرے ہوئے — کیا غم جو بارشوں میں کوئی پھول مر گیا

وہ بھی رہتا ہے اسی دنیا میں — خاک دنیا سے کنارا ہوگا

جنوں سے کم تو نہیں ہے یہ شدتِ احساس — جو شاخِ گل کہیں لچکی تو سانپ لہرایا

ٹھہرے پانی کی طرح جینے سے بہتر ہے یہی — صورتِ آبِ رواں خود کو گزرتا دیکھنا

ڈوبنے پر مجھے معلوم ہوا — جس میں ڈوبا وہی دریا میں تھا

ہم اُسے دیکھنے کہاں جائیں — وہ تو اک شخص ہے گماں جیسا

چار کمروں کے مکاں میں اپنے — اک چھل پائی بھی آ بیٹھی ہے

اپنی ہی سوچ پہ چلنا چاہے — اپنی ہی سوچ سے ڈر جائے جی

نئی نسل کے وہ شعرا جو جدید بننے کی آرزو میں Triggering اور کسی حد تک پیروڈی کے سے شعر کہتے ہیں ان کو عبداللہ جاوید صاحب کی شاعری کو بغور پڑھ کر ان سے سیکھنا چاہیے کہ جدّت کیسے پیدا کی جاتی ہے۔میں نے خود بھی ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

میں شاعری بڑے شوق سے پڑھتا ہوں لیکن شاعری کے نقّادوں کی طرح رائے نہیں دے سکتا کہ میں نے اسے کبھی اس نظر سے پڑھا ہی نہیں اور نہ ہی مجھ میں اتنی صلاحیّت ہے کہ موزوں طبع ہونے کا دعویٰ کر سکوں۔لیکن جب کچھ اشعار دماغ سے گزرنے کے بعد دل کے کسی پوشیدہ گوشے میں داخل ہو جاتے ہیں۔اور پھر اس سے آگے روح میں اگر داخل نہ بھی ہو سکیں لیکن اس کے اردگرد منڈلانے لگیں۔ست رنگی تتلیوں کی طرح۔تو یقین جانئے کہ bliss کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور یہی کیفیت آپ کے مجموعے کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوئی۔آپ نے نجانے کتنی جگر سوزی سے یہ کلام تخلیق کیا ہوگا۔ مجھے تو یہ عطیہ بے دام ہی مل گیا۔از حد مسرت ہوئی اور بے حد ممنون بھی ہوں۔

دیوندر اِسر

مبین مرزا (کراچی)

عبداللہ جاوید کے افسانے

عبداللہ جاوید صاحب سے میری ملاقات تو بے شک حالیہ برسوں کا واقعہ ہے لیکن اُن سے تعارف خاصا پرانا ہے۔اور وجہِ تعارف تھی اُن کی شاعری۔میں نے اسّی کی دہائی کے اَوائل میں اُن کا کلام سب سے پہلے ''فنون'' میں پڑھا تھا اور اُن کے سنجیدہ تخلیقی رویّے کو ان کی شاعری میں ایک قدر کے طور پر محسوس کر کے مجھے خوشی ہوئی تھی۔اس کے بعد اگر کہیں ان کے نام پر نگاہ پڑی تو میں نے یک گونہ دلچسپی سے اُن کے کلام کا مطالعہ کیا اور مسرّت حاصل کی۔ یہی نہیں اس عرصے میں کئی بار ثقہ اور متین لوگوں سے ان کی شاعری کا ذکر ہوا اور اچھے لفظوں میں ہوا۔ چناں چہ چند برس قبل جب اُن سے بالمشافہ رسم و رہِ محبت کا آغاز ہوا تو ان سے دیرینہ شناسائی سے بھی مذکور رہی اور وجہِ شناسائی بھی۔لیکن ان سے ملاقاتوں کے بعد اب میں سوچتا ہوں کہ اس سے پہلے میں عبداللہ جاوید صاحب سے اپنے جس تعارف کو بڑی چیز سمجھتا تھا، وہ کس قدر رواجی سا تھا۔

اصل میں ہوتا یہ ہے کہ ہماری توجّہ آدمی کے کسی ایک پہلو یا اُس کی شخصیت کے کسی ایک رُخ پر مرکوز ہو جاتی ہے اور پھر ہم اُس کی بابت جو کچھ جانتے اور سوچتے ہیں وہ سب اسی ایک زاویے کا نظارہ ہوتا ہے۔ جب کہ امرِ واقعہ میں آدمی ہشت پہلو ہوتا ہے — اور ان میں سے ہر ہر پہلو اپنی جگہ جامع ہوتا ہے اور دوسرے کا تکملہ بھی۔ دیکھیے، میں یہ کیا بات لے بیٹھا جب کہ اس وقت مجھے بس دو اڑھائی فقرے عبداللہ جاوید صاحب کے افسانوں کی بابت کہنے ہیں، شخصیت کی عقدہ کشائی مقصود نہیں۔لیکن خیر، ہماری یہ سب باتیں کچھ ایسی بے مقصد بھی نہیں ہیں۔ کسی تخلیق کار کا کام خواہ وہ کسی بھی صنفِ اظہار و بیاں میں ہو، اس کی ذات سے لاتعلق تو بہر حال نہیں ہوتا۔عبداللہ جاوید صاحب کی شاعری کے حوالے سے بات کا آغاز ہوا تھا تو میں عرض کروں کہ ان کی بعض نظمیں پڑھتے ہوئے ہی نہیں بلکہ غزلوں کے بعض اشعار سے بھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان میں پوری ایک کہانی یا کوئی ایک مکمل واقعہ سا سما گیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت میں نے عبداللہ جاوید کا کوئی افسانہ پڑھا تھا اور نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ وہ افسانے بھی لکھتے ہیں۔ان کے افسانے تو میں نے اب آ کر پڑھے ہیں۔تو دیکھیے یہ وہی بات نہیں ہے کہ تخلیقی شخصیتِ

کا ہر پہلو اپنی ایک انفرادی حیثیت بھی رکھتا ہے اور دوسرے کا تکملہ بھی بنتا ہے۔اسی طرح ایک جامع تخلیقی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔

تو اب جو افسانے پڑھے تو اِن سے نہ صرف عبداللہ جاوید صاحب کی فن کاری کا ایک نیا رُخ سامنے آیا بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی مجموعی تخلیقی شخصیت کو بھی قدرے وسیع تناظر میں دیکھنے اور ان کے فن کارانہ سروکار کو سمجھنے کا موقع ملا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ جو ایک تاثر میں نے ابتداً اُن کے فن کارانہ مزاج کی بابت لیا تھا کہ وہ ایک سنجیدہ رویّے کے تخلیق کار ہیں تو وہ مزید مستحکم ہوا۔اب آگے بڑھنے سے قبل یہ بہتر ہوگا کہ ہم پہلے یہ جان لیں، سنجیدہ رویّے سے آخر کیا مراد ہے؟ تو یوں ہے کہ میری ناچیز رائے میں فلسفیانہ اندازِ فکر، دانش ورانہ طرزِ اظہار اور دقیق عالمانہ اسلوبِ بیان وغیرہ تخلیقی فن کار کے رویّے کی سنجیدگی کے لیے خاص ضروری نہیں ہیں بلکہ اگر بُرا نہ مانا جائے تو مجھے یہ کہنے میں بھی تامّل نہیں کہ یہ خصائص تو ایک حد تک اس کے سنجیدہ رویّے کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتے ہیں۔اس لیے کہ ایسی سب چیزیں ناقدین اور تجزیہ نگاروں وغیرہ کے مطلب کی تو ہوا کرتی ہیں مگر اپنی طبعی شکل میں یہ تخلیق کار کے لیے کچھ ایسی مفیدِ مطلب نہیں ہوتیں۔گریفائیٹ اپنی ابتدائی شکل میں جوہری کے کام کا نہیں ہوتا، وہ تو اسے اپنے لیے اس وقت استعمال کرتا ہے جب وہ ہزاروں درجے سینٹی گریڈ حدّت کے عمل سے گزر کر منقلب ہو جاتا ہے۔تب اُس کے خواص بھی بدل جاتے ہیں اور اثرات بھی۔تخلیقی پیرایے میں اظہار پانے والے علم و فلسفہ کی ماہیت بھی اسی طرح بدل جاتی ہے۔تب اُن کے اثرات صرف دماغ تک محدود نہیں رہتے بلکہ دل تک پہنچتے ہیں۔اور پھر وہ شعر و افسانہ کی آرائش کا کام نہیں کرتے اس کی قوت بن جاتے ہیں۔تو فن کارانہ رویّے کی سنجیدگی سے مراد ہے مادّی اشیا کی غیر مادّی سطح پر اُس تفہیم کی جستجو جو بیک وقت شعور و احساس کی جہتوں کا احاطہ کرتی ہے۔یہ رویّہ اصل میں فن کو زندگی بنا لینے سے پیدا ہوتا ہے —— اور عبداللہ جاوید کے فن میں خواہ وہ شاعری ہو یا افسانہ ہمیں اسی رویّے کا نشان ملتا ہے۔

بات طول کھینچے گی اور یہ طوالت کا محل ہے اور نہ ہی میں اس وقت اس کا متحمل ہو سکتا ہوں ورنہ اس بات کی تشریح اور استناد کے لیے عبداللہ جاوید کے اشعار، نظموں کے ٹکڑے اور افسانوں کے اقتباسات سے یہاں پورا پورا کام لیا جا سکتا تھا۔اگر یہ نہیں تو کم سے کم ایک کے بعد دوسرے افسانے کا خلاصہ بیان کر کے بھی بات کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا۔افسوس کہ نہ تو مجھے یہ کام آتا ہے اور نہ ہی اچھا لگتا ہے۔یوں بھی مدرّسی سے مجھے کوئی علاقہ نہیں اور یہ ہنر عام طور سے مدرّس نقادوں ہی کو آتا ہے کہ وہ اپنے ہر قاری کو کمرۂ جماعت میں بیٹھا ہو طالبِ علم سمجھ کر خلاصہ کاری کا نسخہ اس کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔میرے لیے تو یہی موزوں ہوگا کہ عبداللہ جاوید نے اپنے افسانوں میں جن موضوعات اور مسائل سے سروکار رکھا ہے، میں اُنھی کی بابت اپنے کچھ تاثرات عرض کروں۔

تو عبداللہ جاوید کے افسانوں کو پڑھ کر جو سب سے پہلی بات مجھے محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ یہ سب افسانے

بالکل الگ ہیں۔ان میں چھیڑے گئے موضوعات، اٹھائے گئے سوالات اور بیان کیے گئے نکات سب کچھ ایک دوسرے سے الگ ہے۔کرداروں میں ایسی کوئی مماثلت نظر نہیں آتی کہ ایک افسانے کا کوئی کردار کسی دوسرے افسانے کے کسی کردار کی یاد دلائے یا تسلسل محسوس ہو یا پھر کسی کے مزاج کا رنگ کہیں اور چھلکتا نظر آئے۔کسی کے لہجے پر کسی دوسرے کی چھاپ دکھائی دے۔غرض یہاں جو کچھ ہے اُسے ہم تنوّع یا رنگا رنگی کا ہی نام دے سکتے ہیں۔ان کے جتنے افسانے میری نظر سے گزرے ہیں، ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے یہاں رنگا رنگ اور پُر تنوّع صورتِ حال ہمیں نظر آتی ہے۔اچھا تو اب اس کی داد یہ ہو سکتی ہے کہ اُن کا افسانوی منظر نامہ بہت وسیع ہے یا یہ کہ کینوس بڑا یا لمبا یا چوڑا وغیرہ ہے۔ظاہر ہے، اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ یہ بھی ایک بات تو ہے اور اس کی بھی داد افسانہ نگار کو ملنی چاہیے۔

تاہم کیا کسی فن کار کی فکری و فنی حیثیت محض اس نکتے کی بنیاد پر مسلّمہ ہو سکتی ہے کہ اس کے یہاں کینوس بہت وسیع ہے یا یہ کہ اُس نے بہت سے موضوعات کو چھوا ہے یا پھر یہ کہ اُس کے یہاں زندگی کے بارہ، بیس یا پچاس رنگ سمٹ آئے ہیں۔میرا نہیں خیال کہ صرف و محض اس بنیاد پر کسی فن کار کے اصل منصب کا تعین کیا جا سکتا ہے۔دیکھنے کی جو بات ہے وہ تو یہ ہے کہ یہ سارے رنگ مل کر کیا شے بناتے ہیں۔یعنی دو جمع چار ضرب پانچ تقسیم چھ —— ان سب کا حاصل کیا نکلا؟ اصل میں یہ جو حاصل ہوتا ہے، یہ فن کار کے فن کی وحدت یا کلّیت کو بیان کرتا ہے۔گویا وسعت یا لمبائی چوڑائی کے کوئی معنی نہیں اگر ان کے ساتھ گہرائی بھی ہمارے سامنے نہ آ رہی ہو۔رنگا رنگی کی داد یہ نہیں کہ فن کار نے آپ کی آنکھوں میں قوسِ قزح بھر دی بلکہ بات تو یہ ہے کہ ان رنگوں نے مل کر اُس رنگ کو آپ کے اندر جگایا کہ نہیں جو ظاہراً آنکھوں کے آگے موجود نہیں تھا۔یہی وہ شے ہے جو فن کی دلیل بھی ہے اور اُس کا جواز بھی۔

عبداللہ جاوید کے افسانوں میں ''میری بیوی'' کو پڑھتے ہوئے میاں اور بیوی دونوں کے کردار اور اُن کی الگ الگ دُنیائیں جب ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہم صرف اُن کے تضاد، ٹکراؤ اور تصادم ہی کو نہیں دیکھتے بلکہ وہ نکتہ ہماری نظر میں آ جاتا ہے جہاں ہم انھیں باہم ہوتے، آپس میں ملتے اور ایک دوسرے کو Compliment کرتے ہوئے زندگی کے کُل میں ڈھلتے دیکھ سکتے ہیں۔اسی طرح ''اللہ میاں'' نام کے افسانے میں باپ، سماج اور بچے کا کردار ہے۔یا پھر ''جہانِ دیگر کے راستے پر'' بوڑھا اور دو ماہ کی بچی کا کردار ہے۔ان سب کے رویّے، حالات، ان کو درپیش الگ الگ حالات اور متفرق بلکہ بسا اوقات قطعی متضاد حقائق، ان کے اپنے اپنے دائرے میں زندگی کا تجربہ اور احساس کی نوعیت وغیرہ پر ہم غور کرتے ہیں تو یہ سب آپس میں متصادم نظر آتے ہیں، ایک ٹکراؤ کی سی کیفیت دکھائی دیتی ہے جیسے باہم درآویزاں لکیریں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوں۔یہی تو سوچنے کی بات ہے کہ عبداللہ جاوید کے افسانوں میں کرداروں، حالات اور حقائق کی یہ لکیریں کیا صرف ایک دوسرے کو کاٹ کر یا

ایک دوسرے سے کٹ کر رہ جاتی ہیں یا کہیں پہنچتی بھی ہیں؟ اور اگر پہنچتی ہیں تو یکسر متضاد سمتوں میں یا اس کٹاؤ کے عمل کے بعد کوئی ایک رُخ وہ مل کر اختیار کر لیتی ہیں؟ اپنے افسانوں میں عبداللہ جاوید نے اسی سوال کو جاننے اور اس کے جواب کو پانے کی جستجو کی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتحال ان کے کامیاب ترین افسانے 'وجود' میں دکھائی دیتی ہے جس میں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی یہ لکیریں، کاٹنے کے ساتھ ساتھ کسی خاص سمت کی جانب بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

اصل میں ادب انسانی زندگی کے جس تجربے کو معرضِ بیان میں لاتا ہے وہ بظاہر کتنا ہی سادہ نظر آئے بباطن وہ سادہ یا اِکہرا نہیں بلکہ پیچیدہ اور تہ دار ہوتا ہے۔ یہ فن کی بلندی اور فن کار کی ہنرمندی ہے کہ وہ اُسے پیش کرتے ہوئے چیستان بنانے کی بجائے حقیقتِ معلومہ کی سطح پر اور روزمرّہ محاورے میں بیان کر دے۔ اس کے لیے اُسے کبھی تو نقطے کو پھیلا کر دائرہ بنانا پڑتا ہے اور کبھی پھیلے ہوئے دائرے کو نقطے میں سمیٹ کر دکھانا ہوتا ہے۔ یہ فن کے تقاضے کا معاملہ ہے۔ عبداللہ جاوید فن اور اُس کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ادب کی مختلف اصناف میں جس قرینے سے انھوں نے اظہار کیا ہے، اُن کے پیشِ نظر یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ انھیں ان تقاضوں کو بخوبی پورا کرنا آتا ہے۔

افسانے پڑھ کر مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ اپنے مغربی کرداروں اور اُن کی زندگی اور سماج کے حوالوں اور سوالوں کو موضوعِ اظہار بنانے کے باوجود عبداللہ جاوید کے افسانے ہمارے افسانوی مزاج سے مغائرت کا رشتہ نہیں رکھتے۔ ان کے فن کے اگر کچھ الگ اور مخصوص نشانات ہیں تو اِس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اردو افسانے کی فکری و فنی فضا سے بھی مربوط ہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ انھوں نے بعض کردار بے شک مغربی دُنیا سے لیے ہیں یا بعض مسائل اور موضوعات ان کے یہاں ضرور مغرب سے آئے ہیں لیکن ان کے بیان میں عبداللہ جاوید کی توجہ ہر دو صورتوں میں اُس انسانی احساس پر رہی ہے جو زمینوں اور زمانوں کی مغائرت کا اسیر نہیں ہوتا ہے۔ یہ احساس دراصل انسانوں کو بانٹ کر نہیں بلکہ انھیں جوڑ کر ہمارے سامنے لاتا ہے۔ یہ کچھ وہی بات ہے جس کی طرف اوراقِ گزشتہ میں اشارہ کیا تھا کہ سارے رنگوں کو ملا کر ایک نیا رنگ بنانا۔

اب یہ سوال کرنا کہ عبداللہ جاوید صاحب نے افسانے کم کیوں لکھے؟ یا جو لکھے بھی سہی ان کی طرف ایسی بے نیاز کا انداز کیوں اختیار کیا کہ وہ اُس طور پر منظرِ عام پر نہ آسکے جس طرح انھیں آنا چاہیے تھا—— اور پھر اس طرح کی گفتگو کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انھوں نے اپنے تخلیقی جوہر کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے یا یہ کہ اردو ادب کے ساتھ بڑی زیادتی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ اپنی نگارشات کو جو ادبِ عالیہ کے شہ پارے ہیں، منظرِ عام پر نہیں لائے—— میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی باتوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے تھے۔ اگر کبھی ان باتوں کے کوئی معنی تھے بھی سہی تو آج بہرحال نہیں ہیں، کیوں کہ ایسی باتیں ہمارے یہاں ان لوگوں کے بارے میں بھی کہی جا چکی ہیں جن کا لکھنا یا نہ

لکھنا برابر تھا (بلکہ نہ لکھنا ہی بہتر تھا)۔ چنانچہ اب تک عبداللہ جاوید صاحب کا اپنے افسانوں کے بارے میں جو بھی اندازِ نظر رہا ہو اور چاہے آئندہ جو بھی وہ سوچ رکھتے ہوں، انھیں ان افسانوں کو مرتّب بہرحال کرنا چاہیے۔ جو چند سرسری باتیں سطورِ گزشتہ میں ان کے افسانوں کی بابت کہی گئی ہیں وہ ادب کے ایک ادنیٰ قاری کے محض تاثرات کا درجہ رکھتی ہیں—— جب کہ یہ افسانے اس سے زیادہ توجہ کے طالب ہیں اور!

امید ہے کہ اپنی مجموعی صورت میں جب وہ یکجا ہو کر سامنے آئیں گے تو سنجیدہ اہلِ نقد سے ضرور توجہ حاصل کریں گے اور خیال انگیز گفتگو کا باعث ہوں گے۔

موجِ صدرنگ پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت میں میرا کوئی حصہ نہیں تھا۔۔۔ اشاعت کے کچھ عرصے بعد ادارے نے اطلاع بھجوائی کہ کتاب کی نکاسی مکمل ہوگئی ہے لیکن جاوید صاحب تو جاوید صاحب ہیں، ان سے یہ بھی نہیں ہوا کہ دوسری اشاعت کے لیے دو لفظی خط لکھ دیتے۔ بہرحال **موجِ صدرنگ** کی دوسری اشاعت (غیر معمولی تاخیر سے) نذرِ قارئین و ناظرین ہے۔ اس کی اشاعت کے ضمن میں مجی صابر وسیم اور مُبین مرزا کے تعاون کی شکر گزار ہوں۔

(اقتباس: **مجھے بھی کچھ کہنا ہے** از **شهناز خانم**
مطبوعہ **موجِ صد رنگ** طبع دوم)

(مجھے بھی کچھ کہنا ہے) اس عنوان کے تحت میں نے **حصارِ امکاں** میں کچھ عرض معروض کیا تھا۔ جاوید صاحب کا ذکر بھی آ گیا تھا، اس سے گریز کرتے ہوئے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ جاوید صاحب کے تساہل کی بنا پر موجودہ کتاب **خواب سماں** کیکی اشاعت میں بڑی تاخیر اور دقت پیش آئی۔ بہرحال محبانِ گرامی صابر وسیم اور مبین مرزا کی اعانت اور عنایت نے اس بظاہر ناممکن کام کو ممکن بنا دیا۔ **حصارِ امکاں** پر جن اصحابِ قلم نے تبصرے لکھے، مضامین تحریر کیے یا مکتوبات سے نوازا، ان کی تہہِ دل سے سپاس گزار ہوں۔ مدیرانِ جرائد و اخبارات کی بھی ممنون ہوں کہ ان قدردانانِ گرامی قدر کے تعاون کے بغیر یہ سب ممکن نہ ہوتا۔ توقع کرتی ہوں کہ خواب سماں اپنے پڑھنے والوں کے دلوں میں جگہ پانے میں ضرور کامیاب ہوگی۔

(**مجھے بھی کچھ کہنا ہے** از **شهناز خانم** مطبوعہ **حصارِ امکاں**)

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

مجھے بھی کچھ کہنا ہے

جی چاہتا ہے میں بھی کچھ کہوں۔ یوں کہنے کو تو بہت کچھ ہے، سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ جاوید نہ صرف ایک اچّھے رفیقِ حیات ہیں بلکہ وہ میرے ایک اچّھے دوست بھی ہیں۔ جاوید کی پہلی کتاب ''موجِ صدرنگ'' کے شائع ہونے کا مجھے اس وقت پتہ چلا جب م۔ ع سلام مرحوم نے جاوید کو اطلاع دی کہ ہماری میٹنگ میں آپکی کتاب چھاپنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ زمانہ میری بے حد مصروفیت کا زمانہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچّے اور میری اپنی تعلیم ۔۔۔۔۔ یہ بھی جاوید کی بڑائی ہے۔ جب میری شادی ہوئی تھی۔ میں نے انٹر کا امتحان دیا تھا، جاوید نے میری تعلیم جاری رکھی اور ہر قدم پر میرے لئے مددگار ثابت ہوئے۔ میں تو خیر ان کی شریکِ حیات ہوں لیکن ہر کسی کو اٹھا کر بلندیوں تک پہنچانا شاید ان کا مشغلہ ہے جس سے خاصے لوگ مستفید ہو چکے ہیں، ان کے اس مشغلے سے اگر کسی کو نقصان پہنچا ہے تو ان کے پیاروں کو جن میں، میں اور بچّے شامل ہیں یا پھر خود ان کو۔ جب میں دیکھتی ہوں کہ وہ اپنا اخلاص غلط آدمیوں پر ضائع کر رہے ہیں تو مجھے افسوس بھی ہوتا ہے اور غصّہ بھی آتا ہے مگر وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں ''میں یہ سب اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتا ہوں۔ میرے اچّھے سلوک کے بدلے اگر کوئی برا سلوک کرتا ہے تو اللہ کے پاس مثبت مارکس کے امکانات بڑھ جاتے ہیں''

جاوید ایک اچّھے آدمی اور بہت اچّھے انسان ہیں، ہر ایک کے دکھ درد کو اپنا بنا لیتے ہیں۔ بلکہ ان کے لئے یہ کہنا بہتر ہوگا ۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دروغ گوئی ان کی طبیعت میں بالکل نہیں ہے صاف اور سچّی بات کرتے ہیں۔ حسد اور کینہ پروری ان کی فطرت کو چھو کر نہیں گئی، اپنے دشمنوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ کبھی کسی سے بدلہ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اگر کوئی دشمن اپنے کسی کام سے آئے تو پوری کوشش کرتے ہیں کہ اس کا مسئلہ حل کر دیں۔ لیکن اس سے تعلقات نہیں رکھتے

جاوید کی طبیعت میں لحاظ اور مروّت بہت ہے۔ اس پر ایک واقعہ یاد آیا۔ کسی سیمینار کے دوران ایک مشہور ومعروف دانشور اور ادب نواز سول سرونٹ نے اپنی صدارتی تقریر میں جاوید کے ایک فقرے پر اعتراض کیا جو علاّمہ اقبال کے بارے میں تھا وہ فقرہ علاّمہ اقبال کے ایک مکتوب سے لیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے اعتراض بے بنیاد تھا۔ جاوید نے ان صاحب کو سرِ جلسہ نہیں ٹوکا، جاوید کی منطق یہ تھی کہ اگر جواب میں ان سے میں یہ کہتا کہ یہ فقرہ میرا نہیں ہے میں نے علاّمہ اقبال کے ایک مکتوب سے لیا ہے تو حاضرینِ جلسہ ضرور ان کی ہنسی اڑاتے۔ جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے جاوید بہت کم جاتے، اگر کبھی کہیں جانا ضروری ہو تو مشاعروں کی عام روش سے ہٹ کر

جاوید اپنا تازہ ترین کلام سناتے ہیں۔ انہوں نے نہ تو کوئی مشاعرہ لوٹا اور نہ کسی مشاعرے میں لٹے (ہوٹ ہوئے)۔ سیمینار اور مذاکروں میں بھی جاوید کا انداز منفرد ہوتا ہے شرکائے مذاکرہ کے ناموں سے مرعوب ہوئے بغیر وہ اپنا موقف بے لاگ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ نہ اہلِ اقتدار کو خاطر میں لاتے اور نہ ہی حاملانِ جبّہ ودستار سے اختلافِ رائے کے نتائج کی پرواکرتے۔ اب تو یہ سب خواب کی باتیں لگتی ہیں۔

حملۂ قلب کے بعد جاوید نے عزلت اختیار۔ انتہائی نجی نشستوں میں ایک دو مرتبہ لے جایا جائے تو چلے جاتے ہیں۔ جاوید بہت حساس دل رکھتے ہیں۔ خود بھی بہت جلد دکھی ہو جاتے ہیں اور اگر ان کی طرف سے کسی کے لئے کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے تو اس کی خلش برسوں محسوس کرتے ہیں۔

دو سال پہلے کا واقعہ ہے جاوید کسی سے ملنے گئے۔ اتوار کا دن تھا، ہمارے ڈرائیور صاحب کو تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ جانا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جن صاحب سے ملنے گئے تھے ان صاحب کو لاہور یا اسلام آباد جانے کے لئے ایئرپورٹ جانا تھا۔ ملاقات کے بعد وہ صاحب جاوید کو چھوڑنے باہر آئے۔ وہ صاحب ایک باوضع آدمی ہیں اور یوں بھی وہ ہمیشہ جاوید کو باہر تک چھوڑتے ہیں۔ باہر ان کا سفری بیگ بالکل تیّار رکھا تھا۔ جاوید کا بہت دل چاہا کہ ڈرائیور صاحب کو کہیں ایئرپورٹ چھوڑنے کے لئے مگر جاوید یہ بھی جانتے تھے کہ ڈرائیور صاحب مذہب کے معاملے میں بہت سخت ہیں ہرگز نہیں راضی ہوں گے۔ بادلِ ناخواستہ ان صاحب سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے لیکن انہیں اس بات کا بہت افسوس رہا اور اب تک ہے۔ کہتے ہیں میں ان صاحب سے دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوں۔ ظاہر میں جو باتیں بہت چھوٹی محسوس ہوتی ہیں وہ ان کے لئے سوہانِ روح بن جاتی ہیں۔

''موجِ صدرنگ'' جب میرے ہاتھوں میں آئی اس کے گرد پوش کا ڈیزائن اور رنگ بہت پسند آیا۔ جاوید کا کلام میں نے راتوں رات پڑھ لیا ان کی بیش تر غزلیں اور نظمیں میں نے پہلے بھی پڑھی تھیں کیوں کہ مختلف رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا، مشاعروں میں بھی سننے کا موقع ملتا تھا اور ایک دو مرتبہ ریڈیو سے بھی سنا تھا۔ ''موجِ صدرنگ'' کے بعد ایک طویل وقفہ، کچھ تو حملۂ قلب اور کچھ اپنے کام میں تساہل۔ دوسروں کے کام میں جان لگا دیتے ہیں، پوری پوری رات جاگ کر کام کریں گے مگر اپنے کام میں سستی اور طبیعت کی بے نیازی ان پر مجاز کا یہ شعر صادق آتا ہے ۔

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

کون شاعر ایسا ہے جس کو اپنے اشعار کی اشاعت بھلی نہ لگے۔ شہرت کسے پیاری نہیں ہوتی جاوید بھی تمام تر بے نیازی کے باوجود کلام کی اشاعت چاہتے ہیں مگر یہ کام ان کے بس کا نہیں ۔۔۔ اگر اس معاملے کو میں اپنے ہاتھوں میں نہ لیتی تو شاید اس کتاب کی اشاعت کبھی عمل میں نہیں آتی۔ اگر اس فقرے کو آگے لے جایا جائے تو یوں ہوگا کہ معروف صحافی اور ''شاعرکائنات'' (روزنامہ ''کائنات'' سے تعلق کی رعایت سے) جناب صابر وسیم صاحب کا تعاون شاملِ حال نہ ہوتا تو شاید میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔ میں جاوید کی اور اپنی جانب سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اب اجازت۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

افسانہ

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

میری بیوی

میری بیوی نہ تو اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے حسن کے چرچے عام ہوتے اور نہ ہی اتنی بدصورت کہ دیکھنے والا اس پر دوسری یا تیسری نظر نہ ڈالے، البتہ اس کے جسم میں کچھ تھا مائل کرنے اور پکڑنے والا۔ میں اپنی بیوی سے بالکل مطمئن تھا اور شاید وہ بھی مجھ سے مطمئن تھی۔ سب سے بڑی بات، دنیا ہم سے مطمئن تھی اور ہم دنیا سے مطمئن تھے۔ ہمارے گھر میں ہم دونوں کے علاوہ ایک کتّا تھا جو باہر سے بدصورت اور اندر سے بے حد خوبصورت تھا، ڈھیر سارے چھوٹی ذات کے طوطے تھے اور ایک سفید چوہا۔ میری بیوی ان کے ساتھ گھل مل کر رہتی اور ان کی دیکھ بھال کرتی۔ وہ پڑوسیوں کے ساتھ بھی مل جل کر رہتی۔ رشتے داروں کا آنا جانا نہیں تھا۔ میرے سب لوگ میلوں دور اور اس کے لوگ سمندروں دور رہتے تھے۔ شادی کے بعد دو سال ایسے گزرے جیسے ویک اینڈ گزر جاتا ہے۔ پھر یہ ہوا کہ میرا تبادلہ امورِ خارجہ کے اس شعبہ میں ہو گیا جو میرے ملک کے عالمی منصوبوں پر کام کرتا ہے اور جلد ہی مجھ کو ایک خاص مشن پر دور دراز کی ایک چھوٹی ریاست میں بھیج دیا گیا۔ وہاں کا ماحول سازگار نہ تھا یوں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی لیکن باہر والوں کو چوکنّا رہنا پڑتا تھا۔ وہاں زیرِ زمین ایسی تنظیمیں موجود تھیں جو باہر والوں کی ''ٹارگٹ کلنگ'' میں مشہور تھیں اس کے علاوہ بیرونی ملکوں کے ایجنٹ بھی موقع ملتے ہی کام کر جاتے۔ مقامی لوگ تو فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ایک دوسرے کو مارنے کاٹنے میں مصروف رہتے تھے۔ میرے ملک والے ہی نہیں دوسری بڑی طاقتوں کے ایجنٹ مقامیوں کو تقسیم کرنے اور لڑانے میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے مقاصد مختلف ہو سکتے تھے لیکن ان سب کا طریقہء کار مشترک اور ایک جیسا تھا۔ میں یہاں آیا تو پتہ چلا کہ یہاں فرائضِ منصبی ادا کرنے کے اوقات صحیح معنوں میں کل وقتی تھے یعنی دن اور رات کے چوبیس گھنٹے ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ گھر جانا کوئی آسان نہیں۔ فون کالس پر بھی پابندی تھی۔ ای میل پر بات کرنا بھی متعیّنہ حدود کے اندر ممکن تھا ورنہ درمیان سے سینسر ہو جاتا۔ حدود سے میری مراد موضوعات کے حدود۔ سچ تو یہ ہے کہ گفتگو ہائی، ہیلو، ہوَ آر یو، فائن، تھینک یو، آئی لو یو، لو یو ٹو، اوکے، ٹیک کیئر تک ہی محدود ہوتی۔ محکمہ جاتی مراسلت، پرنٹڈ میٹر، کی شکل اور خاص معاملات ''کوڈ'' میں بھیجے جاتے۔ جیسے ہی میں وہاں پہنچا مجھے بہت سارے معاملات پر بریف کر دیا گیا۔ ہر روز

کے انسٹرکشن ایک مخصوص طریقہء کار کے تحت روز روز مل جاتے، انٹرنیٹ پر بھی بہت کچھ لیا اور دیا جاتا۔ یوں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنی بیوی سے قریب قریب جدا ہو گیا تھا۔ یہ جدائی مجھے بے حد شاق گزرتی۔۔۔۔۔ وہ بھی میری جدائی میں بہت بور ہوتی ہوگی۔۔۔۔۔۔۔ اتنے عرصے کے ساتھ میں یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہو چکی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے لئے بنے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر ہی زندگی گزار سکتے تھے'' ہَو سوئیٹ اینڈ ہَو اورینٹل'' (کتنا پیارا اور کتنا مشرقی) میں نے اپنی اس سوچ کی آپ ہی تضحیک کی۔ یوں تو میں گھر جانے کے لئے پہلے ہی ہفتے سے جُگاڑ نکالنے میں لگا تھا لیکن کامیابی تیسرے مہینے کے اواخر میں نصیب ہوئی۔ شاید یہ کامیابی بھی اس لئے ممکن ہوئی تھی کہ ہم لوگوں نے کم وقت میں مطلوبہ نتائج حاصل کر لئے تھے۔ جن دو بڑے مذہبی گروہوں میں منافرت کے بیج ہم نے بوئے تھے وہ اب قد آور درختوں کی صورت اختیار کر کے پھل دینے لگے تھے۔ دونوں گروہوں کے اربابِ اختیار میں سے بیشتر نہیں چاہتے تھے کہ آپس کے اختلافات کو ہوا دی جائے۔ اس سبب سے ہمارا کام قدرے مشکل ہو گیا تھا۔ چار و ناچار ہمیں ایسے اقدامات کی جانب رجوع ہونا پڑا جو خود ہمارے لئے بھی خطرے سے خالی نہیں تھے۔ ہر صورت میں ہمیں پردے میں رہنا تھا۔ بہر حال ایک سے زائد مرتبہ کبھی اِس گروہ اور کبھی اُس گروہ کے لوگوں کو دورانِ عبادت قتل کروانا پڑتا، تا آنکہ ان کا پیمانۂ صبر چھلک پڑا اور وہ ایک دوسرے کا خون بہانے پر مجبور ہو گئے۔ یہی ہمارا سب سے بڑا مشن تھا اور اس مشن میں ہم کامیاب ہو گئے تھے۔ اسی دوران ہمیں اپنی ایمبیسی کے چند مقامی ملازموں کو بھی مروانا پڑا۔ افسوس کہ مقامیوں کے علاوہ ہمارا ایک آدمی بھی زد میں آ گیا۔ اس طرح کے واقعات تو ہمارے پیشے کے معمولات میں داخل ہوتے ہیں۔ کہاں ہماری ایک جان اور کہاں مقامیوں کی ہزار جانیں۔۔۔۔ دونوں میں کوئی تناسب نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ریاست کے دونوں بڑے گروہ ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔ آئے دن فسادات رونما ہونے لگے تھے، لا اینڈ آرڈر کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ قانون کی حکمرانی اور حکومت کے رِٹ کے تصوّر کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ اسٹاک ایکسچینج کا انڈکس روز بروز گرتا جا رہا تھا۔ باہر کے لوگوں نے جو پیسہ ریاست کی صنعت و تجارت میں لگایا تھا اسے تیزی سے نکال رہے تھے۔ مقامی انویسٹرز کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ حکومت بیرونی قرضوں کے جال میں پھنستی جا رہی تھی۔ بیرونی طاقتیں امداد کے نام پر غلامی کے طوق پہنانے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ پڑوسی ملک ریاست کی سرحدوں پر اپنی رال ٹپکا رہے تھے، غرّا رہے تھے، دھمکیاں دے رہے تھے جس کے نتیجہ میں ریاست کے وسائل، بیرونی قرضوں، اور امداد کا بڑا حصّہ ہتھیاروں کی خریداری اور دفاعی سامان کی فراہمی میں صرف کیا جا رہا تھا۔ ایک کمزور، زوال پذیر ملک بہت جلد ہماری گود میں گرنے کے لئے تیّار ہو رہا تھا۔ بہت جلد وہ بظاہر آزاد اور بباطن ہمارا غلام ملک ہونے جا رہا تھا۔ ہمارا محکمۂ فوج اس ملک میں اپنا فوجی اڈّہ بنانے کی تیّاریاں پہلے ہی مکمل کر چکا تھا۔ جس دن میں اپنے گھر کے لئے پرواز کرنے والا تھا مجھے یہ احکامات وصول ہوئے کہ میری چھٹّی منسوخ کی جا چکی تھی اور اب مجھے سرکاری کام سے جانا تھا۔ اس کام کی مدّت ایک ہفتہ تھی۔ البتہ مجھے اجازت دی گئی تھی کہ میں اپنے گھر رہ سکتا تھا۔ یہ صورتِ حال میرے لئے خلافِ توقع حد تک

بہتر اور قابلِ قبول تھی شاید ایسی ہی صورتِ حال کو 'ایک پنتھ دو کاج' کہا جاتا ہے۔ میں خوش تھا، اور کیوں نہ خوش ہوتا آخر گھر جا رہا تھا۔۔۔گھر، جہاں میری بیوی رہتی تھی۔ میں یہ محسوس کر کے بے حد حیران تھا کہ میری خوشی میں کوئی اڑچن سی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں خوش ہوں بھی اور نہیں بھی۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں یہ سب سوچنے پر مجبور تھا۔ بیوی سے اتنا عرصہ جدا رہنا میرے لئے کیسا تجربہ تھا یہ میں خوب جانتا تھا۔ میرے سوا اور کون جان سکتا تھا؟ شاید یہ بھی پورا سچ نہیں تھا۔ پورا سچ تو یہ تھا کہ میرے چہرے مہرے، طور واطوار سے یہ پتہ چل گیا تھا کہ میں ان شوہروں میں سے تھا جن کو 'ہین پیکیڈ' کہا جاتا ہے۔ سب کو نہیں تو میرے ایک افسرِ بالا اور ایک رفیقِ کار کو ضرور اس کا اندازہ تھا۔ اس کا پتہ مجھے اس طرح چلا کہ جب میرے افسرِ بالا نے ایک پارٹی میں مجھے اس کارنر میں بیٹھے دیکھا جہاں وہ لوگ بیٹھتے ہیں جن کو ڈانس کرنا نہیں آتا یا جو کسی نہ کسی سبب سے ڈانس کرنے سے گریزاں ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے دیکھا، مسکرایا اور آنکھ دبا کر بولا ''انجوائے دی پارٹی اولڈ مین'' آخر پارٹی میں مسز ذی کا کوئی مصرف ہونا چاہئے۔ اور ہاں مس ایکس تو تمہیں ہڑپ کرنے کے لئے بالکل تیّار ہے۔ اگر تم اسکو مگر مچھ بن کر نگل بھی جاؤ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور نہ ہی محکمے کو ہوسکتا ہے'' میں بھی جواب میں مسکرایا لیکن اس جگہ سے اس وقت تک نہیں ہلا جب تک ڈانس کی موسیقی بند نہیں ہوئی۔ میں نے ڈانس کے دوران مسز ذی اور مس ایکس پر اچٹتی نظر ڈالی وہ دونوں ڈانس کرتے ہوئے مردوں پر اس طرح گر رہی تھیں جیسے تتلیاں پھولوں پر گرتی ہیں۔ اس کے دوسرے دن کافی بریک کے دوران اس نے مجھے تنہا بیٹھا دیکھ کر صرف اتنا کہا ''بیوی یاد آ رہی ہے۔۔۔ہے نا'' اور ہنستا ہوا ایک لمبی ٹانگوں والی لڑکی کے ساتھ کافی لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ کسی ایسے ہی موقع پر ایک کولیگ نے بھی میرے ساتھ ایسا ہی رویّہ اپنایا۔ ایک ہر دلعزیز دیالو مقامی لڑکی جس سے میل جول کا اوپر سے او کے سگنل ملا ہوا تھا خود میری طرف آئی اور مجھے اپنے گھر لے جانے پر اصرار کرنے لگی لیکن میں پس و پیش کرنے لگا۔۔۔۔۔۔میرے اس کولیگ نے دور ہی سے صورتِ حال کو بھانپ لیا اور میری کلائی پر بندھی گھڑی جیسی شکل کے فون پر مجھے پیغام دیا ''اے بیوی کے وفادار احمق! اگر تو نے اس خوبصورت کتیا کو ٹھکرایا تو میں تجھے مار ڈالونگا'' یہ بتانا ضروری نہیں کہ میں اس خوبصورت نو جوان کتیا کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ اس کا گھر جو ایک بوڑھی آنٹ کی موجودگی کے باوجود ہم جیسے دور افتادہ جوان آدمیوں کے لئے جنّت سے کم نہ تھا۔۔۔۔۔ یہ اور بات جب ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کے مزے لوٹ رہے تھے گھر کے ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹی وی اسکرین پر مقامی لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے مقامی لوگوں کی لاشیں ایک عبادت خانے کے اندر جگہ جگہ خون سے لت پت دکھائی جا رہی تھیں۔ عجیب لوگ تھے کہ بچّوں، جوانوں، اور بوڑھوں کی لاشوں کا انتہائی قصّابانہ انداز سے بار بار نظارہ دکھا رہے تھے، کیف و مستی میں پوری طرح غرق ہو جانے کے باوجود میں اس منظر سے بدمزہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور واش روم جا کر الٹی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ اور بات کہ میں نے اپنے احساسات اس مقامی حسینہ پر ظاہر نہیں ہونے دیئے ورنہ وہ ضرور حیران رہ جاتی کہ اتنے بڑی عالمی طاقت کا ایک سپوت اتنا جذباتی اور نرم دل۔ ''کیا میں واقعی نرم دل ہوں۔۔۔ہیومینٹرین۔۔۔ٹو ہیل وِدِ اِٹ۔۔۔شٹ'' میں اندر ہی اندر اپنے آپ پر غصّہ ہوا اور اپنے

اندر کے وُلف (بھیڑیئے) کو باہر نکال کر اس مقامی لیکن جان لیوا بھیڑ پر ٹوٹ پڑا اگر میں ایسا نہ بھی کرتا تو بھی وہ میرا والٹ ضرور ہلکا کرتی۔

بیوی سے میری ملاقات ایئر پورٹ پر ہوئی، وہ مجھے ایئر پورٹ پر لینے آئی تھی، معمول سے کہیں زیادہ پُر کشش لیکن قدرے مختلف اس نے بالوں کو بالکل ہی مختلف انداز سے بنایا ہوا تھا جسکی وجہ سے اسکا چہرہ بدل سا گیا تھا، گردن اور زیادہ پتلی ہو گئی تھی۔ اس کا لباس بے حد مختصر تھا۔ ٹھنگی سے شرٹ اور چھوٹی سی چڈّھی وہ بھی بھڑ کیلے لال رنگ کی۔ وہ سر سے پیر تک دعوت ہی دعوت تھی۔ میں نے اس سے قبل اپنی بیوی کو کسی پبلک پلیس پر ایسے لباس اور ایسے انداز میں نہیں دیکھا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے ایئر پورٹ کے کار پارکنگ کمپلیکس کی بھول بھلیّوں میں بھٹک رہے تھے۔ میرے جن ہاتھوں کو بیوی کے پتلی کمر کے گرد حلقہ بنانا تھا وہ ہینڈ کیری گھسیٹ رہے تھے اس کے لازمی نتیجے کے طور پر میری بیوی نے اپنے ایک بازو سے میری کمر کو اور کولھوں کو تھاما ہوا تھا۔ ایئر پورٹ سے گھر جانے کے دوران میں نے اپنی بیوی کا اچھّی طرح جائزہ لیا۔ اس مختصر لباس میں گاڑی چلاتے ہوئے وہ بالکل برہنہ لگتی اگر اس کے کپڑوں کا رنگ بھڑ کیلا نہ ہوتا۔ جب میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تو اسکی آنکھوں کے نیچے سیاہی مائل بھورے حلقے نظر آئے۔ ''کیا وہ بیمار تھی۔۔؟ کیا وہ دیر دیر تک جاگتی رہتی تھی۔۔؟ کیا اس نے میری جدائی کو اپنے اندر لے لیا تھا۔۔؟ کیا وہ زیادہ پینے لگی تھی۔۔؟'' ایئر پورٹ سے گھر بہت زیادہ دور نہ تھا۔ جب ہماری گاڑی گھر کے گیراج میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔ ''کیا تم زیادہ پینے لگی ہو۔۔'' میرے اس سوال پر وہ چونکی اور بولی۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔؟ ہم دونوں گاڑی سے اترے، اترتے ہی وہ تیزی سے میری طرف آئی اور مجھ سے لپٹ ہی نہیں بلکہ چمٹ کر سسکیاں لینے لگی، گیراج کا شٹر اوپر ہی تھا، میں نے اسکے ہاتھ سے ریموٹ لیا اور شٹر گرا دیا۔ میں اسکو لپٹائے، لپٹائے چھوٹا سا چوبی زینہ چڑھ کر اور اسکو اپنے سہارے چڑھا کر گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر کے اندر پہونچتے ہی وہ آواز سے رونے لگی، میرے گلے میں اپنی باہیں حمائل کئے، میرے چوڑے سینے سے اپنا گداز سینہ چپکائے وہ رو رہی تھی کبھی آواز سے اور کبھی بے آواز۔۔۔آخر میں نے اس کو انتہائی رسان سے، نرمی سے اپنے بدن سے جدا کیا۔۔۔اسکے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسکے روتے پھڑکتے منہ اور ہونٹوں کو اپنے منہ اور ہونٹوں سے بند کیا، ایک خاموش طویل بوسے کی صورت میں جو ہم دونوں کے جسموں سے ہو کر روحوں میں اتر گیا اور دیر تک اترا رہا۔۔۔جب میں نے اسکے منہ کو آزاد کیا تو اس نے اپنا سر جھکا لیا اور سرگوشی کی جیسے کسی گناہ کا اعتراف کر رہی ہو۔ ''یس ڈارلنگ۔۔تمہاری پیاری بیوی ایک ڈرنکرڈ۔۔ایک بلڈی ڈرنکرڈ ہو گئی ہے۔!!'' میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ اس قسم کے پروفشلزم کی ہمیں تربیت دی جاتی ہے۔ ورنہ سچ پوچھئے تو اپنی بیوی کی حالت اور اس اعتراف سے میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس سے قبل وہ بیئر بھی کم کم پیتی تھی۔ شیمپیئن بھی صرف چند چسکیاں۔ وہسکی کے جام تو وہ لبوں سے چھونے سے بھی گریز کرتی۔ میں نے تاسّف، تردّد اور تفکّر کے سارے مرحلے اس ایک لمحے میں، ایک ہی ساتھ طے کر لئے تھے۔ ساتھ ہی اپنے آپکو خوف زدہ بھی محسوس کر رہا تھا

، یہ سب میرا اندر تھا۔ اپنے باہر جو میں نے ردِّعمل ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ میں نے اس کے ہونٹوں پر دو انگلیاں ثبت کیں پھر آہستہ سے کہا ''اس موضوع پر کسی اور وقت بات کریں گے''

گھر جا کر، بیوی سے ملاقات کر کے میں نے صورتِ حال کی مضحکہ خیزی کا خوب خوب عرفان کر لیا تھا۔ محکمے نے مجھے چھٹّی پر نہیں بلکہ ڈیوٹی پر روانہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ میرا گھر جانا اور اپنی بیوی سے ملنا بھی ایک ڈیوٹی جیسا لگ رہا تھا۔۔۔ڈیوٹی سے بھی زیادہ سنجیدہ اور گھمبیر۔۔۔میری حالتِ زار کا اندازہ صرف وہی انسان لگا سکتا تھا جسکا واسطہ کسی عادی شرابی سے پڑا ہو اور وہ بھی شرابن بیوی سے۔ ایک جانب میں اس کام میں جٹا ہوا تھا جو میرے سپرد کیا گیا تھا تو دوسری جانب میں اپنی بیوی کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی کوشش میں لگا تھا۔ میں چاہتا تھا دونوں محاذوں پر کامیاب ہو جاؤں۔ سرکاری کام قدرے آسان ثابت ہو رہا تھا لیکن غیر سرکاری کام جس کا تعلق میری اپنی بیوی سے تھا میرے لئے ''نا قابلِ حصول ٹارگٹ'' بنتا جا رہا تھا۔ سرکاری کام ڈکیومینٹیشن کی نوعیت کا تھا انفارمیشن کو ڈِس انفارمیشن میں بدلنے کا اور ڈِس انفارمیشن کو مصدّقہ (اتھینٹک) بنانے کا۔ ایک ہفتے کے کام کو صرف دو دن میں نمٹا چکا تھا اب میری پوری توجّہ اپنی بیوی پر تھی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے شراب ترک کر دی تھی البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری خاطر وہ ٹُن ہونے سے بچنے لگی تھی۔ دن میں 'جوب' کے دوران پینے سے یوں بھی بچتی ہوگی۔ میری خاطر 'جوب' سے چھٹّی کرنے کے باوجود وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ لیکن میرے گھر سے باہر جاتے ہی وہ ایک دو گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیتی۔ میں اسکی پسند اور اسکے طریقۂ کار سے واقف ہو چکا تھا۔ زیادہ تر وہ ''ووڈکا'' سے شوق کرتی لیکن موقعہ ملتا تو ''جن'' میں سنگتروں کا رس آمیز کر کے چڑھاتی۔ وہسکی کے لئے وہ ہمہ وقت تیّار رہتی اور اسکے ساتھ سیب کا رس پی کر تو وہ خود شراب بن جاتی۔ شام کا آنا تو غضب ہو جاتا۔ شام۔۔۔اور شام کے بعد وہ بڑی مشکل میں پڑ جاتی۔ پہلے وہ مجھ سے چھپ کر واش روم میں پیتی لیکن بہت جلد چھپنے چھپانے کے تکلّف سے آزاد ہو جاتی۔ میں حتی الامکان اس کا ہاتھ روکتا لیکن اس کو روکنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا۔ اس کو پکڑنا اس لئے مشکل ہوتا کہ وہ ہر قسم کے برتن میں ڈال کر رکھ لیتی تاکہ نظر میں آئے بغیر 'پی سکے' عام گلاس، ڈسپوزل ایبل گلاس، کوئی سا بَول (پیالہ)، چھوٹا، بڑا، سوپ نوشی کا، یا جوس پینے کے مقصد کا کوئی سا کپ، یا مگ۔۔۔گھر کے اندر وائن بَول میں وہ عام طور پر پانی پیتی تھی۔ پانی پینے کا تو یونہی ذکر آ گیا۔ شراب کی زیادتی نے اس کے جگر پر اثر کرنا شروع کر دیا تھا وہ پانی پینے اور پانی ہضم کرنے کے لائق نہیں رہی تھی۔۔۔شراب کی عادت نے، میری جدائی نے، نئے لوگوں کی صحبت نے، اس میں کچھ بدلاؤ بھی کر دیا تھا۔۔۔اس کا پہلا تجربہ یوں ہوا کہ ایک شام جب میں واش روم میں نہانے گھسا تو وہ بھی میرے ساتھ لگی چلی آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی شاور باتھ میں لے گئی میں ننگ دھڑنگ اس کے پیچھے گھسٹتا چلا گیا، میں شاور کے نیچے کھڑا تھا اور وہ شیشے کی دیوار کی دوسری جانب کھڑی مجھے دیکھتی رہی تھوڑی دیر وہ مجھے دیکھ کر ہنستی رہی پھر نجانے کہاں سے اس کے ہاتھ میں ایک گلاس آ گیا۔ جس میں میرے اندازے کے مطابق چار پیگ تھے۔ کھڑے کھڑے اس نے ایک ہی سانس میں ساری کی ساری شراب حلق سے نیچے اتار لی اور خالی گلاس قریب ہی کہیں رکھ کر جب وہ نمودار ہوئی تو اس کے

گلے میں لٹکے ہوئے ایک ننھے سے کراس کے علاوہ تن ڈھانپنے کے لئے اور کچھ نہ تھا۔ ''تمہیں تو شاور کے نیچے نہانا بھی نہیں آتا'' اس نے گھٹی گھٹی ہنسی میں ملی جلی آواز سے کہا۔ پھر اس نے مجھے شاور کے نیچے نہانے کا درس دینا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں یہ بھی بھول گیا کہ میری بیوی ایک ''شرابن'' تھی جس کو مجھے ایک نارمل عورت بنانا تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک عورت تھی۔

اس عورت نے مجھے شاور کے نیچے نہانے کا جو درس دیا تھا کس سے سیکھا تھا؟ میری بیوی تو یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی۔ کیا یہ عورت ''میری بیوی نہیں ہے؟'' ''کیا یہ کوئی اور عورت ہے؟ کیا ''میری بیوی'' بدل گئی ہے؟ کسی اور عورت نے میری بیوی کی جگہ لے لی ہے؟ اگر یہ ''میری بیوی'' نہیں ہے تو یہ شرابن میرے گھر میں کیا کر رہی ہے؟ شاور کے نیچے نہانے کے بعد پہلی تنہائی میسّر آنے پر میں نے اپنے آپ کو ان جیسے بے شمار سوالوں میں گھرا ہوا پایا۔

جس پہلی تنہائی کا ذکر میں نے کیا ہے وہ میں نے کس طرح گذاری اس کا ذکر آپ کے لئے باعثِ تعجب ہوگا۔ وہ کسی طرح بھی تنہائی کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایک ڈسکو کلب تھا، مجمع، شور، رقص، گہما گہمی، لپٹا لپٹی، خوشبو، رنگ، رنگ برنگی روشنیوں کی مار، ہر سائز، ہر وضع، ہر عمر، ہر قماش کی عورتیں اور مرد، ٹین ایجرز سے لے کر پختہ جوان مرد، ادھیڑ، بوڑھے، سینیئرس، ساٹھے پاٹھے، سترے بہترے، ایک دو ان سے بھی گئے گزرے، ایک دو معذور، ایک وہیل چیئر والا، دو ایک مصنوعی بازو، مصنوعی ٹانگ والے ریٹائرڈ فوجی جن میں بیشتر کسی نہ کسی جسمانی نقص کو اپنی فوج کی سوغات کے طور پر پیش کرنے کے شوقین! ڈاڑھی والے، کلین شیو، صرف مونچھوں والے، گنجے مرد، گنجی عورتیں، وِگ پوش مرد، وِگ پوش عورتیں، بلونڈ بالوں والی عورتیں، برینٹ بالوں والی عورتیں، سرخ سر والے مرد اور عورتیں، گورے لوگ، کالے لوگ، بھورے لوگ، زرد لوگ، لمبے، ٹھگنے، موٹے، دبلے لوگ، شریف، بدمعاش، شرابی، ڈرگ ایڈکٹس، جواری، چور، اسمگلر، نوسر باز، ڈاکو، اپنی موجودگی کا ثبوت دینے والے، اور اپنی موجودگی کو غیر محسوس کرانے والے، اپنے شوہروں کی نگراں عورتیں، اپنی عورتوں کے نگراں مرد، سلیبریٹیز مرد اور عورتوں کے ساتھ ان کے باڈی گارڈز، ایک جانب کسی کسی پول سے لپٹی ہوئی برہنہ لڑکیاں، بے شمار قوموں، رنگوں، نسلوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کسی چھوٹی سی ڈائیس پر اسٹرپٹیز پرفارم کرتی ہوئی لڑکیاں جو پانچ سے دس ڈالر کے عوض اپنا سب کچھ لٹانے پر تیار رہتیں۔ رقص، موسیقی، شور، جوانی، مستی، شراب، نشہ، جوا، ڈالروں کی ریل پیل کے اس عالم میں، خود شراب پینے، نیم مدہوش ہونے، کچھ لڑکیوں کو چھیڑنے، کچھ لڑکیوں کو گالیاں دینے، ایک آدھ سے گالی کھانے، کچھ مال جوئے میں لٹانے کے بعد میں اس قابل ہوا کہ اپنی بیوی کے بارے میں کچھ سوچتا اور جیسے ہی میں نے سوچا میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔۔۔ایک تجلّی، شاید ایسی ہی تجلّی پرنس سدھارتھ کے ذہن میں نمودار ہوئی تھی جب وہ دنوں ہفتوں یا شاید مہینوں ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے گیان دھیان میں لگے رہے تھے۔ یہ بات پہلی مرتبہ اپنے ایک پرائمری کلاس کے ٹیچر سے سنی تھی۔ اس تجلّی کے بعد وہ پرنس سدھارتھ سے ''بدھا'' بنے تھے۔

میری تجلّی سے مجھے بھی کچھ بن جانا تھا۔لیکن ضروری نہیں ہے جو کچھ ہونا ہے وہ فوری ہو جائے۔اس ریاست میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی نیو برسوں پہلے رکھی گئی تھی۔اور جو بہت بعد میں ہوگا اس کی داغ بیل آج ڈالی جارہی ہے۔ڈسکو کلب کے اس متوالے صدر رنگے ہجوم میں اچانک وہ ہو جائے جو اس ریاست کی عبادت گاہوں میں ہو رہا ہے تو کیا ہو؟۔ ہنستے کھیلتے لوگوں پر اچانک نزول ہو دہشت ،خوف ،تباہی ،بربادی،ٹوٹ پھوٹ ،شور شرابہ، کراہیں ، انسانی اعضاء کا جسموں سے علیحدہ ہونا ،دور ونزدیک گرنا ،سروں کا دھڑوں سے کٹ کر چھتوں اور دیواروں سے ٹکرانا،انسانی خون کا زخموں سے رِسنا،بہنا،اور کسی جسم سے فوّارے کی طرح اڑنا ،لوگوں کی بھگدڑ، مردہ جسموں سے الجھ کر گرتے ہوئے لوگ ،اور مردہ یا نیم مردہ جسموں کو کچل کر گزرتے ہوئے لوگ ، لیٹے لیٹے کراہتے اور چلاّتے لوگ، رینگ رینگ کر،گھسٹ گھسٹ کر اس قیامت والی جگہ سے باہر نکل جانے کی کوشش میں مصروف لوگ ۔چھوٹی عمر میں اپنی پرائمری ٹیچر سے میں نے سنا تھا کہ پرنس سدھارتھ (بھگوان بدھا) نے اپنی محل کی زندگی تج دیتے اور بچّے اور بیوی کو سوتا ہوا چھوڑتے سمے، اور بعد میں 'گیا' (ہندوستان) میں سچ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتے ہوئے اور بالآخر پیپل کے پیڑ تلے آسن جما کر بیٹھنے کے دوران طرح طرح کے آزاروں اور دکھوں میں مبتلا مخلوق کا دھیان کیا تھا۔ میں بھی تو وہی کرنے لگا تھا۔تو کیا میں دوسرا بدھ بھگوان بننے جارہا تھا؟لیکن میں ان سے قطعی مختلف آدمی تھا۔وہ انسانوں کو دکھوں سے محفوظ کرنا چاہتے تھے اور میں ۔۔۔میں تو ایک بہت بڑی مشین کا پرزہ تھا جس کا کام ہے انسانوں کو دکھوں میں مبتلا کرنا۔۔پرنس سدھارتھ نے اپنی جس جوان بیوی کو ترکِ دنیا کرتے سمے سوتا چھوڑا تھا اس پر دنیا خاموش تھی۔اس کے بارے میں اگر کچھ ملتا بھی ہے تو اسکی نوعیّت ، قیاس اور گپ شپ کے دائرے میں آتی تھی۔میں نے بھی تو اپنی بیوی کو تنہا چھوڑا تھا۔میری بیوی بھی مجھے اتنی ہی پیاری تھی جتنی پرنس کی بیوی پرنس کو پیاری تھی، جوانی ہم دونوں کی بیویوں کے درمیان قدر مشترک بھی تھی

ڈسکو کلب کی پُر ہجوم تنہائی میں بیوی کے بارے میں گیان کی جو روشنی میرے ذہن میں اتری تھی اس کے تحت میں نے بیوی سے پوچھا''میری غیر موجودگی میں کوئی دوسرا مرد؟''ایئر پورٹ جاتے ہوئے گاڑی میں چلا رہا تھا اور وہ میرے ساتھ اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا ایک چوتھائی بدن مجھ پر لدا ہوا تھا۔میرا سوال اس کے کانوں کے راستے اسکے دماغ میں اور دماغ سے شاید اسکے پورے بدن میں گونج گیا۔اس کا بدن اچانک تن گیا۔وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی اور تن کر بیٹھ گئی۔میں اس کو کنکھیوں سے دیکھ کر اس کے اعضاء کی حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ریفلیکس ایکشن (غیر ارادی حرکات) پر میرا اچھّا خاصا مطالعہ تھا۔۔باڈی لینگویج سے واقف تھا۔وہ سیدھی ہو کر اور اپنی سڈول خوبصورت اور بے حد گوری ٹانگوں کو اکڑا کر بیٹھ گئی جیسے اس کا جسم کسی ناگہانی حملے سے بچنے کے لئے تیّار ہو گیا ہو۔اس نے مجھے بغور دیکھا۔میرا چہرہ سنجیدہ تھا۔معمول کی مسکراہٹ سے بھی خالی۔''

''کیا یہ ایک سنجیدہ سوال ہے جو تم پوچھ رہے ہو؟''

''یس''،میں نے اس کے بعد 'میڈم' کہنے سے اپنے آپ کو بمشکل باز رکھا۔اگر کہہ دیتا تو میری یہ ''یس'' خوفناک حد تک طنزیہ بن جاتی۔

''تم نے اس سوال کے لئے بہت ہی غلط وقت چنا ہے۔کاش!تم کسی فرصت کے وقت پوچھتے اور میں تفصیل سے کام لیتی۔''

بولتے بولتے وہ رک گئی اور یوں لگا جیسے گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھ رہی ہو۔ایک لحظہ کے لیے ایسا بھی لگا جیسے وہ رو رہی ہو۔رونے پر قابو پا رہی ہو یا بس رونے والی ہو۔۔پھر اسی طرح شیشے سے دیکھتے ہوئے اس نے گریہ سے معمور آواز میں ایک ہلکا سا''یس'' گاڑی کی بند فضا میں چھوڑ دیا۔جو کسی سائلنسر لگی ہوئی گن سے نکلی ہوئی گولی کی طرح میرے ذہن میں پیوست ہو گیا ۔

ایئر پورٹ پر جب میں ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے اترا تو وہ میری جگہ کھسک آئی اور گاڑی پارک کرنے چلی گئی ۔جس وقت وہ گاڑی پارک کر کے لوٹی میں کلیرنس لے چکا تھا۔ہم دونوں نے آنکھیں نہیں ملائیں۔البتہ جب میں اپنی ہینڈ کیری گھسیٹتا ہوا دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز کی طرف جانے لگا تو وہ ایک جھٹکے کے ساتھ میرے سینے سے آ لگی اور دوسرے لمحے علیحدہ ہو گئی اور ایئر پورٹ کی بیرونی راہداری کی طرف اس کے قدم بڑھنے لگے۔اس کی جانب دیکھے بغیر میں یہ بتا سکتا تھا کہ وہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔میرا یہ سفر کس طرح کٹا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ بچپن میں آپ کبھی پتنگ اُڑا رہے ہوں،اچانک ہوا تیز ہو گئی ہو، ڈور سے پتنگ سنبھالنا مشکل ہو گیا ہو،اور پھر ڈور نہ صرف آپکے ہاتھوں سے نکل گئی ہو بلکہ چرخی کو بھی اُڑا لے گئی ہو۔مجھے تو ڈور سنبھالنے کی کوشش کرنے کا موقع ہی نہیں نصیب ہوا اور میری بیوی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔اسکو تیز ہوا لے گئی۔ہوا جو قدرت کا مظہر ہے۔حالات کا سمبل ہے۔جس پر میرا یا میری بیوی کا کوئی قابو نہیں۔ہماری جدائی ،اس کی تنہائی ۔۔تنہائی کی طویل شام اور لمبی رات جس کی اسکو عادت ہی نہیں تھی ۔جب وہ پہلی بار میرے بغیر گھر میں رہی ہوگی تو گھر کے طوطوں اور کتّے نے اسے ضرور رفاقت دی ہوگی ۔سفید چوہے نے کچھ دیر اسے لبھائے بھی رکھا ہوگا یا پھر ان سب نے اس کے تنہا رہ جانے کے احساس کو گھٹن کی حد تک پہنچا دیا ہوگا۔گھر اسے کاٹنے دوڑا ہوگا اور وہ گھر سے باہر دوڑ گئی ہوگی اور اور پھر اسکا ایکسپوز ہو گیا ہوگا۔اس ہزار پا،اکٹوپس کے سامنے جس کو عرفِ عام میں دنیا کہا جاتا ہے۔میں نے ہمیشہ اسے ایکسپوز ہونے سے بچایا تھا۔کاش!میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔اس کو تھوڑا تھوڑا ایکسپوز ہونے دیا ہوتا۔کیا میری بیوی واقعی ایک پتنگ تھی جس کو تیز ہوا اڑا لے گئی تھی ۔میری غیر متوقع اور اچانک جدائی کی تیز ہوا۔۔یا میری پتنگ کو کسی شاطر پتنگ باز نے پہلے کاٹا اور پھر لوٹ لیا تھا۔

میری سوچ جب اس مرحلے پر پہنچی تو جیسے سب کچھ بدل گیا۔۔ سارا ماحول بدل گیا۔۔۔ماحول کیا بدل گیا۔۔۔۔؟ بدلتا جب کچھ ہوتا ، وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔۔ جہاز جس میں بیٹھا تھا۔۔۔مسافر۔۔۔ چھوٹے بڑے کاموں کے سلسلے میں ادھر اُدھر گشت کرتی ہوئی ہوسٹس لڑکیاں ۔۔۔سب کچھ جیسے ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا اور اسی ہوا میں ۔۔۔۔میں اڑتا ہوا جا رہا تھا۔۔۔میری شرٹ کے اندر جیکٹ تھا ایسا ہی جیکٹ جو عام

طور پر خود کُش حملہ آور پہنتے ہیں۔ میرا ٹارگٹ تھا خود اپنے گھر کو دھماکے سے اُڑا دینا کیونکہ اس گھر میں وہ پہنچ چکا ہوگا ۔۔۔۔میری بیوی کی تنہائی دور کرنے۔۔۔۔۔

جہاں تک میں اپنی بیوی کو جانتا تھا اس کی بنیاد پر اب میں وثوق سے یہ بات کہہ سکتا تھا کہ میری بیوی نے اپنے آپکو محض اس لئے شراب کے سپرد کیا تھا کہ اس کی زندگی میں ''وہ'' داخل ہوگیا تھا۔ میری بیوی اس قماش کی لڑکی تھی کہ وہ نہ تو میری زندگی میں کسی عورت کو برداشت کرسکتی تھی اور نہ ہی اپنی زندگی میں کسی مرد کو۔۔۔۔۔اور جب اس کی زندگی میں ''وہ'' داخل ہوگیا تو اسکے اندر کی لڑکی کو زبردست دھچکا لگا۔۔۔اس دھچکے کو وہ سہہ نہ پائی اور خود کو شراب میں غرق کردیا۔۔۔۔۔ایک لمحہ کے لئے میرے دل کے کسی گوشے میں میری بیوی کے لئے پیار جاگا ۔۔۔۔لیکن میں تو بدل چکا تھا۔۔۔میں ۔۔۔۔میں نہیں رہا تھا ورنہ اس احمقانہ مشن پر کیسے روانہ ہوتا۔۔ میں اسکو حماقت، دیوانگی، اور غیر انسانی وحشیانہ زندگی سے تعبیر کرتا تھا۔۔۔۔۔ایسے کام وہی لوگ سر انجام دیتے ہیں جن کے سر میں یا تو دماغ سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے اور ہوتا بھی ہے تو اس پر کسی ماسٹر مائنڈ کا قبضہ ہو چکا ہوتا ہے۔۔۔۔۔

یہ میں ہی تھا جو جہاز میں سوار اپنے مشن کی کی تکمیل کرنے جا رہا تھا اور یہ بھی میں ہی تھا جو جہاز کے باہر الٹی سمت ہوا میں اُڑتا ہوا اپنے ہی گھر کو دھماکے سے اڑانے جا رہا تھا، محض اس لئے کہ گھر میں ''وہ'' پہنچ چکا ہوگا اور مجھے اسے اڑانا تھا۔ اگر میں نے یہ دھماکا کیا تو گھر کے دوسرے مکینوں کا کیا ہوگا۔ میرا اور میری بیوی کا عزیز از جان کتّا، جو باہر سے بدصورت اور اندر سے خوبصورت تھا ۔۔۔چھوٹی ذات کے طوطوں کا جنہیں ہم نے بڑے چاؤ سے پالا تھا۔۔۔سفید چوہے کا جسکی ہم اپنے خاص مہمانوں کو زیارت کراتے تھے۔۔۔۔؟ اور میری بیوی کا۔۔۔جو میرا سب سے قیمتی اثاثہ تھی۔۔۔۔؟

اس سے پہلے کہ میں ہوا میں اڑتا ہوا اپنے ٹارگٹ پر حملہ آور ہوتا میرا جہاز زمین پر اتر کر ٹیکسی کرنے لگا۔ اسکے ساتھ ہی مجھے ہوش آ گیا۔ میں اپنے ذہن کو سمیٹ کر اس مشن پر مرکوز کرنے لگا جو میرے ملک کی جانب سے اسائن کیا گیا تھا۔ جسکا مقصد مذکورہ ریاست کو تہ و بالا کرنا تھا۔ یہ مشن بھی غیر انسانی اور وحشیانہ تھا لیکن میرے ماسٹر مائنڈ کے مطابق اسکا مقصد امن کو فروغ، کلچر کا بڑھاوا تھا۔ سب سے اہم نکتہ جو میرے اور میرے ساتھ فرائضِ منصبی ادا کرنے والے ساتھیوں کو فیڈ کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اس مشن کی تکمیل اور اس ریاست کے پرخچے اڑانے اور لاتعداد آدمیوں، فوجی، غیر فوجی، مرد، عورت اور بچّوں کی اموات کے بعد ہمارا ملک پہلے سے زیادہ محفوظ ہوگا۔ میں اور میرے اس مشن کے ساتھ آدمی کم اور ''پروگرامڈ'' روبوٹس زیادہ تھے۔ کیا آدمی 'پروگرامڈ' رہنے کے بعد بھی آدمی رہتا ہوگا؟ اگر آدمی رہتا بھی ہوگا تو کتنا؟ میں جو کچھ بھی اپنے ساتھ جہاز سے لے کر اترا تھا وہ ریاست کی پیٹھ پر آخری تنکا تھا یا شاید اس سے بہت زیادہ۔۔ میں جانتا تھا کہ ریاست کے بھک سے اڑ جانے میں اب زیادہ دیر نہیں

تھی۔۔ میں پروگرامڈ روبوٹ جو اپنے اندر رمق برابر 'آدمی' کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو رہا تھا پہلی فرصت میں یہ انتظام کر لیا تھا کہ میری بیوی اور اس کے ''وہ'' کی نہ صرف نگرانی کی جا سکے بلکہ اس کی شناخت، اس کے بارے میں وائٹل معلومات، اس کی تصویر، میری بیوی کے ساتھ اسکی تصاویر جلد از جلد مجھ کو مہیّا ہو جائیں۔ یہ سب کام انتہائی راز داری اور پیشہ ورانہ انداز سے انجام پایا۔ اس کام میں بمشکل تین دن لگے۔ ساتھ ہی میں جو کچھ لے کر پہنچا تھا وہ انتہائی تیزی سے نتیجے کی طرف بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے بعد کسی اور اقدام کی ضرورت نہیں پڑنی تھی۔ یہ قطعی طور پر آخری اقدام تھا اس کے بعد جو کچھ بھی ہونا تھا، خود کار ہونا تھا۔ اگرچہ تباہی اور بربادی، خون خرابہ بھی انتہا کا ہونا تھا لیکن کیا کِیا جائے ایسے کاموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس دن کے آخری ٹارگٹ کو میری نگرانی میں تکمیل پانا تھا۔ میں اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے نکل چکا تھا کہ مجھ کو، میرے گھر کے، میری بیوی کے بارے میں ایک لفافہ ملا۔ (یہ میرا خانگی معاملہ تھا اور اس معاملے میں کمپیوٹر کو ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا تھا) میں نے لفافہ بند ہی رہنے دیا اور اسے اندرونی جیب میں ٹھونس لیا۔ میری پہلی ترجیح اپنے فرضِ منصبی کی تکمیل تھی اور میں جان و دل سے اس کام میں جُٹ گیا۔ اچانک میرے ذہن میں وہی روشنی، وہی تجلّی، پھوٹ گئی جس کا ذکر اس سے قبل (گیا) انڈیا کے پرنس سدھارتھ گوتم بدھ کے حوالے سے کر چکا ہوں۔ مجھ کو اور میرے دو ساتھیوں کو اس آخری مشن کی بھینٹ چڑھنا تھا اور میرے ملک نے اسکی تیّاری کر لی تھی کہ ہم تینوں کسی طرح بچ نہ نکلیں۔ ہمارے ملک کے اپنے مامور کئے ہوئے آدمی محفوظ فاصلوں پر اس حکم کے ساتھ موجود تھے کہ ہمارے بچ نکلنے کی صورت میں ہمیں نشانہ بنا لیا جائے۔ یہ میرا آخری مشن ہی نہیں بلکہ میری زندگی کا آخری دن تھا، میرا مرنا لکھا جا چکا تھا اور یقینی تھا۔ میں پہلی مرتبہ اس سے رجوع ہوا جو کہیں نہ کہیں موجود ہے اور وقتِ آخر ہر آدمی اس سے رجوع ہوتا ہے۔ میرے اندر سے گریہ ایک فوّارے کی طرح جاری ہوا۔ روتے دل، روتی آنکھیں، روتے لبوں میں نے اس ہستی سے گڑگڑا کر معافی مانگی۔ اگرچہ جو کچھ میں نے کیا تھا اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر کیا۔ لیکن خلقِ خدا کی اس کثرت سے اموات، تباہی، بربادی، خون خرابہ کتنا وحشیانہ اور غیر انسانی لگا اس وقت جب کہ میں خود مرنے جا رہا تھا۔ اس حالت میں نجانے کیسے میں نے وہ لفافہ اپنی اندرونی جیب سے برآمد کیا اور اس کو چاک کر دیا اس کے اندر سے میری بیوی کے ساتھ ''اس'' کے فوٹو برآمد ہوئے۔ ممکن ہے اپنی موت کو اتنا قریب دیکھ کر میری بینائی میں خلل واقع ہو گیا ہو۔ ہر فوٹو میں 'وہ' ہنس رہا تھا۔ وہ ایک مقامی تھا۔ میں نے اسے ریاست میں دیکھا تھا یا شاید اس سے بات بھی کی تھی۔ یاد آیا۔۔ میرے ملک اور ریاست کی مشترکہ انجمن کے سالانہ ڈنر میں۔ پیشے سے وہ انجینئر تھا۔ میرے ملک میں جاب کرتا تھا، اسی فرم میں، جس میں میری بیوی ملازم تھی۔ تصویر کے پیچھے لکھی ہوئی مزید معلومات پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ میرا مشن پورا ہو چکا تھا۔۔۔میری موت آ چکی تھی!

عبداللہ جاوید

جس کو بھی دی صدا، وہ بڑی دیر سے ملا
جو بھی بھلا لگا، وہ بڑی دیر سے ملا
ملتے گئے جو لوگ وہ دل کو نہیں لگے
جس سے بھی دل لگا، وہ بڑی دیر سے ملا
باہر سے کوئی عکس نہ دل میں اتر سکا
جو عکس دل میں تھا، وہ بڑی دیر سے ملا
اک عمر کٹ گئی یونہی خوابوں کو دیکھتے
تعبیر جو بنا، وہ بڑی دیر سے ملا
ہم مدّتوں کسی کی پرستش نہ کر سکے
اپنا جو تھا خدا، وہ بڑی دیر سے ملا
ہنگامِ شکر ہے وہ ملا تو زہے نصیب
اب اس کا کیا گلہ، وہ بڑی دیر سے ملا
جاویؔد گو دعا تری مقبول ہوگئی
جو تھا پسِ دعا، وہ بڑی دیر سے ملا

ننگے پاؤں کی آہٹ تھی یا نرم ہوا کا جھونکا تھا
پچھلے پہر کے سنّاٹے میں دل دیوانہ چونکا تھا
پانچوں حواس کی بزم سجا کر اسکی یاد میں بیٹھے تھے
ہم سے پوچھو شبِ جدائی کب کب پتّا کھڑکا تھا
اور بھی تھے اسکی محفل میں باتیں سب سے ہوتی تھیں
سب کی آنکھ بچا کر اس نے ہم کو تنہا دیکھا تھا
چاہ کی بازی ہار کے ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا
اس کے ملن کی بات نہ پوچھو سپنا سا اک دیکھا تھا
چاند گگن میں ایک ہے لیکن عکس ہزاروں پڑتے ہیں
جس کی لگن میں ڈوب گئے ہم، دریا میں اک سایہ تھا
دل کے دھڑکنے پر مت جاؤ دل تو یوں بھی دھڑکتا ہے
سوچو باتوں ہی باتوں میں نام کسی کا آیا تھا
کیسا شکوہ کیسی شکایت دل میں یہی سوچو جاویؔد
تم ہی گئے تھے اس کی گلی میں وہ کب تم تک آیا تھا

کھلا جو پھول کوئی، کوئی پھول مرجھایا
تضادِ زیست نے ہر رنگ میں ستم ڈھایا

جنوں سے کم تو نہیں ہے یہ شدّتِ احساس
جو شاخِ گل کہیں لچکی تو سانپ لہرایا

ہر ایک لمحۂ گزراں کا احترام کرو
بچھڑنے والا کبھی لوٹ کر نہیں آیا

نگاہِ یار کی یہ روشنی رہے تو رہے
وگرنہ دہر میں جو کچھ ہے سر بسر سایہ

رہا ہے پیشۂ آبا سپہ گری جاویؔد
یہ اور بات ہمیں شاعری نے اپنایا

عبداللہ جاوید

آپ ہی ان کو جدا ہونے دیا
جس میں تھا ان کا بھلا ہونے دیا
جان کر ان کو بگاڑا پیار سے
با وفا کو بے وفا ہونے دیا
لوگ سب آتے رہے، جاتے رہے
دل کے گھر کو راستا ہونے دیا
آپ کے دل کو نہ اپنا کر سکے
اپنے دل کو آپ کا ہونے دیا
زندگی میں خواب تو دیکھے نہیں
زندگی کو خواب سا ہونے دیا
آپ کے اور اپنے دل کے درمیاں
کھیل تھا یا عشق تھا، ہونے دیا
صبر تھا یا ظلم تھا، اپنے خلاف
جو نہ ہونا تھا ہوا، ہونے دیا
جان کر اپنا زیاں کرتے گئے
جان کر سب کا بھلا ہونے دیا
عمر بھر چنتے رہے خار و خزف
اور چمن کو خوشنما ہونے دیا
جب ہرے پتّوں کو ڈھانپا برف نے
زخم کو دل کے ہرا ہونے دیا
ہم عدالت میں بھی سچ کہتے رہے
اور جھوٹا فیصلہ ہونے دیا
ہاتھ اٹھائے تو دعا مانگی نہیں
لکھنے والے کا لکھا ہونے دیا
آپ چھوٹے رہ گئے جاویؔد جی
اور لوگوں کو بڑا ہونے دیا

دل کی دیوانگی کا سماں ہر طرف
آسماں، آسماں آسماں ہر طرف
سوجھتا ہی نہیں راستہ کیا کریں
اک دھواں، اک دھواں، اک دھواں ہر طرف
اُڑ گئی ہے زمیں، پاؤں رکھئے کہاں
فرش ہے یا کہ آبِ رواں ہر طرف
ایک دریا ہے پیروں سے لپٹا ہوا
بے سکوں، بے سکوں، بے کراں ہر طرف
اصل چہرے کی پہچان ممکن نہیں
عکس ہی عکس ہیں درمیاں ہر طرف
ایک صورت کی سو صورتیں بن گئیں
آئینے رکھ دیئے ہیں یہاں ہر طرف
اتنی آنکھیں کہاں، دیکھ سکتے جو ہم
آپ کے حسن کی کہکشاں ہر طرف
آپ سے دور جاتے تو جاتے کہاں
آپ ہی آپ تھے مہرباں ہر طرف
کون کہتا ہے جاویؔد جی مر گئے؟
وہ تو موجود ہیں اے میاں ہر طرف

عبداللہ جاوید

ناچنے لگتا ہے بازاروں کے بیچ
بند کیجیے دل کو دروازوں کے بیچ
عشق ہے ظاہر میں خوشبو کا سفر
راستہ جاتا ہے انگاروں کے بیچ
دیکھیے آکر کبھی دنیائے دل
بیٹھیے آکر کبھی یاروں کے بیچ
کاسئہ درویش بھی رکھ دیجیے
کچھ جگہ خالی ہے دستاروں کے بیچ
آپ کو نشہ نہیں کرتی شراب
آپ کا کیا کام مے خواروں کے بیچ
شہر جاں تک آگئی جنگل کی آگ
جل رہی ہے عین گلزاروں کے بیچ
کیسی وحشت ہے زمیں سے تا فلک
چاند ہے سہا ہوا تاروں کے بیچ
امن ہے بغداد میں چاروں طرف
فاختہ اُڑتی ہے تلواروں کے بیچ
مانگیے جاویدؔ اب مشرق کی خیر
گھِر گیا مغرب کے ہتھیاروں کے بیچ

سبھی آلام لے کر اُڑ گیا ہے
پرندہ دام لے کر اُڑ گیا ہے
دریچے میں ذرا سی دیر گا کر
وہ طائر شام لے کر اُڑ گیا ہے
ہم اس کا نام بھی کیسے بتائیں
جو اپنا نام لے کر اُڑ گیا ہے
ہمارے دل کا سودا کرنے والا
بڑا انعام لے کر اُڑ گیا ہے
جسے ساقی سمجھ کر جام سونپا
وہ ظالم جام لے کر اُڑ گیا ہے
یقین کی روشنی کا ایک جگنو
سبھی اوہام لے کر اُڑ گیا ہے
کسی کی یاد کا خاموش جھونکا
غمِ ایّام لے کر اُڑ گیا ہے
جسے جاویدؔ سمجھے تھے وہ لمحہ
خیالِ خام لے کر اُڑ گیا ہے

پھول کے لائق فضا رکھنی ہی تھی
ڈر ہوا سے تھا ہوا رکھنی ہی تھی
گو مزاجاً ہم جدا تھے خلق سے
ساتھ میں خلقِ خدا رکھنی ہی تھی
یوں تو دل تھا گھر فقط اللہ کا
بت جو پالے تھے تو جا رکھنی ہی تھی
ترک کرنی تھی ہر اک رسمِ جہاں
ہاں مگر رسمِ وفا، رکھنی ہی تھی
صرف کعبے پر نہ تھی، حجّت تمام
بعدِ کعبہ کربلا، رکھنی ہی تھی

عبداللہ جاوید

کوئی رکتا نہیں ہے راستے پر
شجر تک چل رہے ہیں راستے پر
یہ کیسا مرحلہ آیا سفر کا
مسافر جل رہے ہیں راستے پر
فرشتے بھاگتے ہیں راستے سے
شیاطیں پل رہے ہیں راستے پر
جو صدیوں سے مسلسل چل رہے ہیں
وہ پل دو پل رہے ہیں راستے پر
کبھی تپتے ہوئے بے آب صحرا
کبھی جل تھل رہے ہیں راستے پر
کبھی رستہ اُڑا ہے آسماں تک
کبھی بادل رہے ہیں راستے پر
یقیں سے کوئی کہہ سکتا نہیں یہ
گزشتہ کل رہے ہیں راستے پر
بدلتے منظروں کی زد پہ جاویدؔ
بہت بے کل رہے ہیں راستے پر

فلک پر جب ستارے ٹوٹتے ہیں
زمیں پر دل ہمارے ٹوٹتے ہیں
یہ کیسے فیصلے ہوتے ہیں اوپر
جو نیچے عہد سارے ٹوٹتے ہیں
سُبک موجوں سے بن جاتے ہیں دھارے
سُبک موجوں سے دھارے ٹوٹتے ہیں
کوئی طوفاں دستک دے رہا ہے
لبِ دریا کنارے ٹوٹتے ہیں
جُدا یہ بات کچھ برسے نہ برسے
بظاہر ابر پارے ٹوٹتے ہیں
بجائے آب قحطِ آب برسا
یونہی اکثر سہارے ٹوٹتے ہیں
خوشی کے موڑ پر ہی کیوں یہ آخر
ہمارے خواب سارے ٹوٹتے ہیں
ہمیں پہچان ہوتی ہے خدا کی
ارادے جب ہمارے ٹوٹتے ہیں

کیا ہمیں ہونا ہے؟ کیا ہونا نہیں؟
موت سے پہلے پتا ہونا نہیں
روح کا تن سے جدا ہونا تو ہے
روح کی قسمت فنا ہونا نہیں
موت بے شک ہی نہیں برحق بھی ہے
موت اپنی انتہا ہونا نہیں
ماورائے مرگ بھی ہے زندگی
زندگی کے ماسوا ہونا نہیں
اس کی مرضی ہے اساسِ ہست و بود
اس کی مرضی کے سوا ہونا نہیں
ہے خدا لاابتداء لاانتہا
صرف ہونا ہی خدا ہونا نہیں

عبداللہ جاوید

بند دروازے کہاں تک کھولتے
کیا زمیں سے آسماں تک کھولتے
دائرہ در دائرہ تھی زندگی
دائروں کو ہم کہاں تک کھولتے
آپ نے پوچھا تو ہوتا دل کا حال
ہم زباں کیا زخمِ جاں تک کھولتے
کوئی دل کا رازداں ملتا اگر
چاک سینے کے دہاں تک کھولتے
عشق کی نشتر زنی کا حال ہم
یادِ یارِ مہرباں تک کھولتے
مہرباں سورج کے سارے راز بھی
سایۂ نامہرباں تک کھولتے
کشتیِ عمرِ رواں کا باب ہم
جنگِ باد و بادباں تک کھولتے
ذہن و دل کی جستجو کا ماحصل
ماورائے بے نشاں تک کھولتے
کھولتے ہر چیز کے سارے پرت
سب یقینوں کو گماں تک کھولتے
لمحے لمحے کو رواں رکھنے کے ساتھ
لا زماں و لا مکاں تک کھولتے
نقل کی بھی نقل تھے جاویدؔ جی
اصل کو کیسے کہاں تک کھولتے

غم کی پرچھائیں میں درخت رہا
اب کے موسم ہی اتنا سخت رہا
جیسے دریا کے دو کنارے ہوں
ہم رہے ،درمیان وقت رہا
زندگی انتظار میں کاٹی
اور یہ انتظار ، سخت رہا
تخت پر کون تھا نہ دیکھ سکے
بعد میں وہ رہا نہ تخت رہا
کیا رہا اپنے ساتھ زادِ سفر
زخم خوردہ بدن ہی رخت رہا
سب رویے انا کی بھینٹ رہے
جو رویّہ تھا سخت ، سخت رہا
دکھ تو یہ ہے کہ یہ ہمارا وطن
ایک ہو کر بھی لخت لخت رہا
ایک ہوکر بھی ہم نہ ایک ہوئے
ڈالیوں سے جدا درخت رہا
باہمی گفتگو تھی لاحاصل
سب کا لہجہ بڑا کرخت رہا
بخت کی بات گو زباں پہ رہی
ہاتھ میں اپنے ،اپنا بخت رہا
ہم ہی جاویدؔ وقت سے روٹھے
ڈھونڈھتا ہم کو ، اپنا وقت رہا

عبداللہ جاوید

چمکا جو چاند رات کا چہرہ نکھر گیا
مانگے کا نور بھی تو بڑا کام کرگیا
یہ بھی بہت ہے سینکڑوں پودے ہرے ہوئے
کیا غم جو بارشوں میں کوئی پھول مرگیا
ساحل پہ لوگ یونہی کھڑے دیکھتے رہے
دریا میں ہم جو اترے تو دریا اتر گیا
ہر سخت مرحلے پہ اکیلے ہی رہ گئے
جو کارواں تھا ساتھ ہمارے بکھر گیا
سایہ بھی آپ کا ہے فقط روشنی کے ساتھ
ڈھونڈو گے تیرگی میں کہ سایہ کدھر گیا
جھپکی پلک تو موسمِ گل کا پتہ نہ تھا
’جھونکا سا اک ہوا کا ادھر سے ادھر گیا‘
ہم جس کے انتظار میں جاگے تمام رات
آیا بھی وہ تو خواب کی صورت گزرگیا
مشکل ہے اب کسی کا سمانا نگاہ میں
وہ اک جھلک کے ساتھ ہی آنکھوں کو بھر گیا
ہم نے تو گل کی ، چاند کی ،تارے کی بات کی
سب اہلِ انجمن کا گماں آپ پر گیا
بجلی کا قمقمہ سا چراغِ حیات ہے
ٹوٹا نفس کا تار اندھیرا اُبھر گیا
جیتے جی مر چکے تھے مگر اپنا ہر نفس
ہم ہی پہ سانس لینے کا الزام دھرگیا
گھر ہی نہیں رہا ہے سلامت بتائیں کیا
غالبؔ کے بعد سیلِ بلا کس کے گھر گیا
مقطع کہو کہ لطفِ سخن کا بھرم رہے
جاویدؔ اب غزل کا نشہ سا اتر گیا

اس کی باتوں کے پردے میں کہہ لیتے ہیں اپنی بات
آج کی دنیا میں سنتا ہے کون بھلا کس کے حالات
کس کو اتنی فرصت ہے کہ دل کا زخمِ نہاں دیکھے
کس کو رکنے دیتے ہیں یاں قدموں سے لپٹے لمحات
اسکے لب و رخسار کی باتیں سکھ کے دنوں کی باتیں ہیں
اسکی زلف کے ذکر کے پیچھے پھیلی ہوئی ہے درد کی رات
دنیا کے اصنام میں سارے ایک صنم ہی سچا ہے
جیسے خدا کی ذات ہے سچّی باقی سارے لات و منات
اہلِ مجاز صنم کہتے ہیں اہلِ حقیقت اس کو خدا
ہم سے اگر پوچھو تو یارو وہ ہے سپنوں کی سوغات
آگ اور خون کے اس دریا سے کون ہے یاں جو پار ہوا
زیست میں کس کی جیت ہوئی ہے کس نے نہیں کھائی ہے مات
روز وشب کی یکسانی پر سانس گھٹی سی جاتی ہے
دن میں بھی ہے سنّاٹا سارات تو کہنے کو ہے رات

عبداللہ جاوید

ایک انجانے سفر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
ہم فقط اک رہ گزر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
اجنبی اک راستہ تھا، پاؤں سے لپٹا ہوا
اندر ،اندر ،ایک ڈر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
چل رہے تھے زندگی کا خواب سا دل میں لئے
اور فنا کی رہ گزر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
وقت کو باہر گزرتا دیکھنے والے یہ لوگ
وقت کے اندر سفر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
اک طلسمِ ہفت پیکر تھی یہ دنیا او رہم
ایک جادو کے نگر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
پہلے ہی پتھر سے چکنا چور ہوکر رہ گیا
آپ بھی شیشے کے گھر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
ہم نے جن کو دل میں ،آنکھوں میں سجا رکھا تھا وہ
اک زمانے کی نظر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
جو زمانے پر اثر انداز ہوتے تھے وہ لوگ
خود زمانے کے اثر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
ایک ہم ہی حادثوں کی زد پہ کچھ آئے نہ تھے
حادثے سب بحر و بر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
زندگی کے گھر میں تھے کچھ ٹمٹماتے سے دیئے
قمقمے سب بام و در میں تھے کھلا مدّت کے بعد
جو نظر آتا نہیں سب پر نظر رکھتے ہوئے
ہر گھڑی اس کی نظر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
عصرِ حاضر کو غرض شہرت سے ہے فن سے نہیں
ہم عبث عرضِ ہنر میں تھے کھلا مدّت کے بعد
ہم ہی خود جاوؔید تھے اپنے مقابل دو بدو
وسوسے اپنے ہی دل میں تھے کھلا مدّت کے بعد

راہ میں دھوپ تھی سایوں کے شجر پیچھے تھے
دل تڑپتا تھا، مگر دل کے نگر پیچھے تھے
راستے نے کہاں دیکھے تھے مسافر ایسے
جن کے تن آگے تھے، کاٹے ہوئے سر پیچھے تھے
فاختہ امن کے تھی ،نوکِ سناں پر آگے
شہرِ تاراج میں ،ٹوٹے ہوئے پر پیچھے تھے
کارواں والوں نے ان کو نہ کبھی یاد کیا
کیا ہوئے راہ میں، جو خاک بسر پیچھے تھے
یہ بھی دیکھا ہے تقسیمِ انعامات کے وقت
بے ہنر آگے تھے اور اہلِ ہنر پیچھے تھے
فرض بھی کر لیں کہ رَن میں تھے لڑانے والے
مرنے اور مارنے والوں سے مگر پیچھے تھے
ہم چلے جاتے تھے جاوؔید سفر کی دھن میں
جن کو سمجھا تھا کہ آگے ہیں وہ گھر پیچھے تھے

عبداللہ جاوید

روح کو قالب کے اندر جاننا مشکل ہوا
لفظ میں احساس کو پہچاننا مشکل ہوا

لے اُڑی پتّے ہوا تو شاخِ گل بے بس ہوئی
پھول پر سائے کی چادر تاننا مشکل ہوا

اپنے خلوت خانہء دل سے جو نکلے تو ہمیں
سب کے غم میں اپنا غم بھی جاننا مشکل ہوا

وقت نے جب آئنہ ہم کو دکھایا رو پڑے
اپنی صورت آپ ہی پہچاننا مشکل ہوا

اس مشینی عہد میں کیا ذات کیا عرفانِ ذات
آدمی کو آدمی گرداننا مشکل ہوا

دل نہ چھوٹا کیجیے ناقدریِ احباب پر
عیب جویوں کو ہنر پہچاننا مشکل ہوا

کیا کریں جاوؔید اس بہروپیوں کے دیس میں
گل کو گل کانٹے کو کانٹا ماننا مشکل ہوا

غم تمہارا تھا ہمیشہ
یہ سہارا تھا ہمیشہ
ہجر کی تاریک شب میں
یاد ، تارا تھا ہمیشہ
تم ہمارے تھے ، نہیں تھے
دل تمہارا تھا ہمیشہ
ڈوبنے سے ڈرنے والو !
عشق دھارا تھا ہمیشہ
کیسی دریا سے شکایت
جب کنارا تھا ہمیشہ
حسن اس کا ، عشق اپنا
استعارہ تھا ہمیشہ
گنبد و محراب و منبر
اور منارا تھا ہمیشہ
خار و گل ، صیاد و بلبل
باغ سارا تھا ہمیشہ
کوٹھیوں ، محلوں کے نیچے
گھر ہمارا تھا ہمیشہ
سب فسانے تھے ازل سے
ہر نظارہ تھا ہمیشہ
نسلِ انسانی کے ہاتھوں
میں خسارہ تھا ہمیشہ
(سورۃ العصر)

عبداللہ جاوید

اک سیلِ بے پناہ کی صورت رواں ہے وقت
تنکے سمجھ رہے ہیں کہ وہم و گماں ہے وقت

پرکھو تو جیسے تیغِ دو دم ہے کھنچی ہوئی
ٹالو تو ایک اڑتا ہوا سا دھواں ہے وقت

ہم اس کے ساتھ ہیں کہ وہ ہے اپنے ساتھ ساتھ
کس کو خبر کہ ہم ہیں رواں یا رواں ہے وقت

تاریخ کیا ہے وقت کے قدموں کی گرد ہے
قوموں کے اوج و پست کی اک داستاں ہے وقت

خاموشیوں میں سرّ نہاں کھولتا ہوا
گونگا ہے لاکھ پھر بھی سراپا زباں ہے وقت

ہمدم نہیں رفیق نہیں ہم نوا نہیں
لیکن ہمارا سب سے بڑا رازداں ہے وقت

کُل کائنات اپنے جلو میں لئے ہوئے
جاویدؔ ہست و بود کا اک کارواں ہے وقت

راستے نے کہاں دیکھے تھے مسافر ایسے
جنکے تن آگے تھے ، کاٹے ہوئے سر پیچھے تھے

فاختہ امن کی تھی، نوکِ سناں پر آگے
شہرِ تاراج میں ، ٹوٹے ہوئے پر پیچھے تھے

کارواں والوں نے ان کو نہ کبھی یاد کیا
کیا ہوئے راہ میں ، جو خاک بسر پیچھے تھے

یہ بھی دیکھا ہے کہ تقسیمِ انعامات کے وقت
بے ہنر آگے تھے، اور اہلِ ہنر پیچھے تھے

فرض بھی کر لیں کہ رَن میں تھے لڑانے والے
مرنے اور مارنے والوں سے مگر پیچھے تھے

ہم چلے جاتے تھے جاویدؔ سفر کی دھن میں
جن کو سمجھا تھا کہ آگے ہیں وہ گھر پیچھے تھے

غم کی پرچھائیں میں درخت رہا
اب کے موسم ہی اتنا سخت رہا
جیسے دریا کے دو کنارے ہوں
ہم رہے، درمیان وقت رہا

عبداللہ جاوید

موئن جوڈارو

میرا ماضی مری ہستی کا موئن جوڈارو
تو اسے دیکھ کر ممکن ہے فسردہ بھی نہ ہو
لوگ آتے ہیں یہاں ذوقِ نظارہ لے کر
ذوقِ نظارہ سے ممکن نہیں
انساں کو نجات !
یہ بھی اک تلخ حقیقت ہے مرے دوست کہ آج
یہ کھنڈر
کل جو تھا اک قصرِ نگارینِ جہاں
آج مرحوم تمنّاؤں کا گورِستاں ہے
لوگ آتے ہیں یہاں ذوقِ تجسّس لے کر
اور کچھ دیر نظارہ کر کے
اپنی راہوں پہ چلے جاتے ہیں
کس کو احساس ہے اس خاک کے ہر ذرّے میں
دلِ حساس کے زخموں کا لہو شامل ہے
ہر طرف پھیلی ہوئی گہری سی تاریکی میں
آرزوؤں کی حنا جذبوں کی ضو شامل ہے

لوگ کہتے ہیں کہ جو وقت کٹا، بیت چکا
بات جو بیت چکی، بیت چکی ختم ہوئی!
دل یہ کہتا ہے مرا زخم ابھی بھر نہ سکا
بات جو بیت چکی دل میں کھٹکتی ہے ابھی
اور احساس میں کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں
کسی مہتاب سے چہرے کے دل آویز نقوش!!

یہ گزرتا ہوا لمحہ ہے اک آزاد پرند
برق رفتاری سے اُڑتا ہی چلا جاتا ہے
ایک موہوم حقیقت ہے، حقیقت ہی سہی
اک بدلتی ہوئی شے
جس کا نہ ادراک ہو!!
اور گزرا ہوا لمحہ ہے گرفتارِ قفس
یاد کے پردے پہ ابھرا ہوا اک نقشِ دوام
اک اٹل ٹھوس حقیقت جو نہ بدلے گی کبھی
ایک تاریخ جو ہر لمحۂ ساکت میں ہے قید
''وقت لافانی!''
''عدم وقت'' کی حالت کا شعور!
ایسے ہی وقت سے ماضی مرا تشکیل ہوا
اس کو تخریب بھی کہہ سکتے ہیں کہنے والے
گر تو آیا ہے یہاں
ذوقِ نظارہ لے کر
میں بھی تاریخ کے بوسیدہ ورق الٹوں گا
تا کہ کھنڈر سے تجھے شہر کا ادراک ملے
اور مٹّی کے ہر اک ذرّے سے
دلِ حسّاس کے زخموں کا لہو پھوٹ بہے

(موجِ صدرنگ)

عبداللہ جاوید

سروائیول

بدلتے موسموں کے ساتھ ہی
حلیے بدلتے ہیں شجر
خزاں پہلے تو ہولی کھیلتی ہے
پتے، پتے سے شجر
صد رنگ پوشاکیں پہن کر
رقص کرتے ہیں
ہوا
مستی لٹاتی
ناچتی ہے اور نچاتی ہے
شجر
انجام سے کچھ بے خبر
کچھ باخبر
ہوا کے دوست بن کر
رقص کرتے ہیں
ہوا جب
جھومتی شاخوں کے سر سے
کھینچ لیتی ہے
ردائیں۔
قبائے برگ و گل
اک اک شجر کی،
پتا، پتا
پتی، پتی
جب اترتی ہے
شجر
بے پیرہن
اور بے حیا،
زمیں بستہ
بڑے لاچار لگتے ہیں
برہنہ
سر سے پا تک۔
سرد،
یخ بستہ
ہواؤں کے تھپیڑے
سہنے والے
ہر شجر کو
خواب دیتا ہے
وہی
جو زندہ رہنے کو
کئی اسباب دیتا ہے
شجر کو، آپ کو، ہم کو،
ہوا والوں کو،
زمین و آب والوں،
آسماں والوں کو۔
وہ جن کو زندہ رکھنا چاہتا ہے
جہاں بھی ہوں

وہی تو خواب دیتا ہے
آنے والے اچھے موسم کے
شجر کو
کبھی تو برف رُت
چاندی کے گہنوں سے
سجاتی ہے
برہنہ ڈالیوں کو، چاؤ سے
دلہن بناتی ہے

خزاں کی چیرہ دستی
موسمِ سرماں کی یخ سردی
بھی اک دن
بھولی بسری بات ہو جاتی ہے
زمیں
انگڑائی لے کر
سبز مخمل اوڑھ لیتی ہے
نئے کپڑے پہن کر
پیڑ، پودے
رقص کرتے ہیں
ہوا
پھولوں کو چٹکاتی ہے
اور پتوں کو چمکا کر
شجر
اک اک شجر کو
شان سے
جینا سکھاتی ہے۔!!

عبداللہ جاوید

مہلت

صبح دم، اشکِ شبنم / کوئی
دیر تک / عارضِ گل پہ ٹھہرا رہا
اک نئے دن کا سورج
(جو خود بھی نیا اور تازہ تھا)
نیم خوابیدہ چہرہ چھپاتا رہا
ابر کی اوٹ میں دیر تک
کسمساتا رہا

پاس کے پیڑ پر / نیند سے جاگ کر
چہچہاتی رہیں
ننھی چڑیاں کئی / گیت گاتی رہیں
اور / پہاڑی کی چوٹی پہ بیٹھا ہوا
ایک شاہین
اپنے زخمی پر و بال کا سوچ کر
غم زدہ ہے کہ پیڑوں کی چڑیوں
کے اوپر / جھپٹنے کا یارا نہیں

آج کی صبح مہلت میسر ہے
چڑیوں کو، شبنم کو،
ہم کو۔۔

عبداللہ جاوید

اک بار پھر

(ایک رومانی نظم)

وقت کے بہتے ہوئے
دریا میں تھی
یا فقط
محسوس ہوتی تھی کہیں
اور کہیں
محسوس بھی ہوتی نہ تھی
موج / اک چھوٹی سی
تیرے نام کی
موج
اک چھوٹی سی
میرے نام کی
تم کہ اپنے وقت میں تھیں
میں کہ اپنے وقت میں تھا
وقت کے بہتے ہوئے
دریا کے بیچ
اپنے اندر کی کشش سے
تند دریا کی روش سے
ایک دوجے کے قریب آئیں

قریب
اتنا قریب
آنکھ بھر کر دیکھنے
پہچان لینے
جاننے، جتنا قریب۔۔!

''تم ہو۔۔؟''
وہ لہرا کے بولی
''تم ہو۔۔؟''
میں لہرا کے بولا

''میں تمہیں کیسے نہیں پہچانتی
میرے ہو تم
تم مجھے کیسے نہیں پہچانتے
کس کی ہوں میں۔؟''

''اک بار پھر''
میں نے کہا
''اک بار پھر''
اس نے کہا

ساتھ ہم رہنے لگے
ساتھ ہم بہنے لگے
اک بار پھر
وقت کے دریا کے بیچ
وقت نے ہنس کر کہا

''اک بار پھر..''!
اور۔۔اک سیلِ بلا
درمیاں حائل ہوئی
اک بار پھر۔
اک بار پھر۔
اک بار پھر!!!۔

عبداللہ جاوید

ضرورت

ٹپکتے ٹپکتے ہوئے خشک / آنسو
یہ دل نے کہا
''آنسوؤں کی زباں کو / سمجھنے کی مہلت نہیں ہے
جہاں کو / کہ سارا جہاں
تیز سے تیز تر دوڑنے میں / مگن ہے''

یہاں آنسوؤں کی / رہے قیمت نہ وقعت
کوئی روتی آنکھوں کو / چہروں کو / دیکھنا بھی نہیں چاہتا

یہاں سرد آہوں / کراہوں کو
چیخوں کو / سننے کے قابل / سماعت نہیں ہے

سماعت اگر ہے تو / فرصت نہیں ہے
جو فرصت اگر ہے
ضرورت نہیں ہے۔!

عبداللہ جاوید

لفظ لکھتے رہو

لفظ لکھتے رہو
انگلیاں اور قلم
اپنے خونِ جگر میں / ڈبوتے رہو / لفظ لکھتے رہو
اپنے چھوٹے بڑے درد و غم
اور چھوٹی بڑی، جھوٹی، سچّی خوشی
بھولی بھٹکی خوشی
دوسروں کے غموں اور خوشیوں سے
آمیز کرتے ہوئے
ساتھ جیتے ہوئے، ساتھ مرتے ہوئے
عصر حاضر کے فرعون و قارون کے
روپ، بہروپ کو
مکر کی چھاؤں کو، جبر کی دھوپ کو / دیکھتے بھالتے۔۔
اور تاریخ کے / آئینے میں عیاں
آنسوؤں سے / رچا / رخوں میں ڈوبا ہوا
جدلیاتِ زماں و مکاں کا بنا / عکسِ نو دیکھتے ۔۔
اپنے لفظوں میں / فقروں میں
مصرعوں میں، شعروں میں / حرف اور صوت کی
سب خفی و جلی / ظاہری، باطنی
صورتوں میں / سموتے رہو
لفظ لکھتے رہو!

ایوب خاور (کراچی)

پوچھتے ہو کہ یہ کیا رکھا ہے آئینے میں
ایک جادو سا جگا رکھا ہے آئینے میں

یہ جو میلہ سا لگا رکھا ہے آئینے میں
کون مہمان بلا رکھا ہے آئینے میں

ایک صحرا تو مرے سینے میں بَل کھاتا ہے
دوسرا لاکے بچھا رکھا ہے آئینے میں

وقت نے نوچ اُڑایا ہے ہر اک منظرِ خوش
اک ترا عکس بچا رکھا ہے آئینے میں

چشم و لب، عارض و ابرو و خمِ زلفِ رسا
کس نے یہ حشر اُٹھا رکھا ہے آئینے میں

ایک فتنہ جو ستاتا تھا بہت پہلو میں
تھپکیاں دے کے سُلا رکھا ہے آئینے میں

اک دِیا رات کی چوکھٹ سے لگا بیٹھا ہے
اک دِیا ہم نے جلا رکھا ہے آئینے میں

نیند تعبیر کے جھونکوں میں اُڑی جاتی ہے
خواب کو ہم نے جگا رکھا ہے آئینے میں

آکے دیکھو تو سہی جانِ جہاں! جہانِ جہاں!
ہم نے اک پھول کھلا رکھا ہے آئینے میں

ایوب خاور

اک خواب ہے، اِس خواب کو کھونا بھی نہیں ہے
تعبیر کے دھاگے میں پرونا بھی نہیں ہے

لپٹا ہوا ہے دل سے کسی راز کی صورت
اک شخص کہ جس کو بُرا ہونا بھی نہیں ہے

رکھنا ہے سرِ چشم اِسے ساکت و جامد
پانی میں ابھی چاند بھگونا بھی نہیں ہے

ہر چند ترے نقشِ کفِ پا میں ہے لیکن
یہ دل کسی بچے کا کھلونا بھی نہیں ہے

وابستہ ہے مجھ سے کہ تُو ہے بھی کہ نہیں ہے
جب میں نہیں تجھ میں، ترا ہونا بھی نہیں ہے

یہ عشق و محبت کی روایت بھی عجب ہے
پایا نہیں جس کو، اُسے کھونا بھی نہیں ہے

جس شخص کی خاطر ترا یہ حال ہے خاورؔ
اُس نے ترے مرجانے پہ رونا بھی نہیں ہے

نصرت ظہیر (دہلی)

نشاں قدم کا سرِ رہگزر نہیں آتا
بہت دنوں سے کوئی بھی ادھر نہیں آتا

کوئی کچھ اِس کے لئے چھوڑ کر نہیں آتا
دلِ تباہ مگر راہ پر نہیں آتا

سفر سے لے کے جو گردِ سفر نہیں آتا
وہ راستے پہ عموماً نظر نہیں آتا

پھر اپنے ساتھ بھی رہ پاؤں یا نہ رہ پاؤں
تمہارے ساتھ یہی سوچ کر نہیں آتا

اجالے اوڑھ لئے ہیں یہاں اندھیروں نے
تبھی تو ٹھیک سے اب کچھ نظر نہیں آتا

کہاں پہ کب کسے ہمراہ لے کے چلنا ہے
کبھی کبھی یہ ہنر عمر بھر نہیں آتا

یہ دل جو شوق کو مہمیز کرتا رہتا ہے
جدھر پہونچنا ہے اکثر ادھر نہیں آتا

نصرت ظہیر (دہلی)

خامشی اظہار بنتی جا رہی ہے
شاخِ گل تلوار بنتی جا رہی ہے

آنگنوں میں کھلتی جاتی ہیں دوکانیں
ہر گلی بازار بنتی جا رہی ہے

درد میں اک آسرا تھا بے خودی کا
وہ بھی اب ہشیار بنتی جا رہی ہے

صلح کی بنیاد رکھنے جا رہے ہیں
بیچ میں دیوار بنتی جا رہی ہے

بستیوں کو چھوڑیئے یہ دیکھئے گا
اک سڑک ہموار بنتی جا رہی ہے

زندگی اقرار تھی کل تک تو نصرتؔ
آج کیوں انکار بنتی جا رہی ہے

کاوش پرتا پگڑھی (دہلی)

ہے کتنی خود رائی دنیا
گونگی ،بہری، اندھی ، دنیا

ننگی ننگی ڈول رہی ہے
کب سے یہ تہذیبی دنیا

سچ تو یہ ہے سچی کب تھی
جنم ہی سے ہے جھوٹی دنیا

طرح طرح سے دق کرتی ہے
ہمیں تمہیں یہ بوڑھی دنیا

دنیا ہی کو مار رہی ہے
دولت کی سودائی دنیا

اپنی وسعت پر نازاں تھی
مٹھی میں ہے سمٹی دنیا

اس کی ایک دہاڑ کو سن کر
گرتے پڑتے بھاگی دنیا

ٹیڑھا میڑھا میں کیوں چلتا
ملی جو ہوتی سیدھی دنیا

روزِ ازل سے اب تک خوں سے
کتنی بار نہائی دنیا

اک ہی رہ پہ آ پہنچی ہیں
شہری اور دیہاتی دنیا

روزِ ازل ہی سے روگی ہے
ہوگی کبھی نروگی دنیا

پتہ نہیں کیوں اس کے پیچھے
پڑی ہوئی ہے ساری دنیا

عمر گنوا دی اندھیاروں میں
ملے گی کب چمکیلی دنیا

روتا کون ہے کس کی خاطر
موت پہ اس کی روئی دنیا

وزن بہت ہے دین میں لیکن
دین سے بھی ہے بھاری دنیا

فلک و برّ و بحر میں کاوشؔ
کہاں کہاں ہے پھیلی دنیا

کاوش پرتا پگڑھی

میرے حصے میں کہاں آئی ہے اچھی مٹّی
اور جو آئی ہے وہ بھی تو ہے تھوڑی مٹّی
ڈھنگ کا ایک بھی برتن نہ بنا شام ہوئی
چاک پہ رکھی ہے کس قسم کی، کیسی مٹّی
آپ بے مصرف و بے کار سمجھتے ہیں جسے
ایک دن اُگلے گی سونا یہی اپنی مٹّی
ہم کو معلوم ہے ناموسِ وطن کیا شے ہے
دیوتاؤں سے بھی بڑھ کر ہے وطن کی مٹّی
انچ دو انچ بھی رکھی نہیں حصے کی زمیں
بخوشی بانٹ دی ہر قسم کی ساری مٹّی
مینہہ برسا ہے ابھی تیز قدم کیسے چلوں
راہ میں چاروں طرف بکھری ہے چکنی مٹّی
پاک تھی صاف تھی آنکھوں سے لگاتا تھا اسے
کس کے ناپاک قدم سے ہوئی گندی مٹّی
اس نے ہنس ہنس کے کلیجے سے لگایا سب کو
چاہے بھوری ہو کہ گوری ہو کہ کالی مٹّی
اک زمانے سے ہوں غربت کی ہواؤں کا اسیر
ناک میں اب بھی مہکتی ہے وطن کی مٹّی
وہ زمانہ گیا جب مٹّی تھی بس مٹّی ہی
آج سپنے میں بھی ملتی نہیں ویسی مٹّی
نگری نگری وہ ہواؤں سا پھرا کرتا ہے
دیکھیے ملتی ہے کاوش کو کہاں کی مٹّی

رؤف خیر (حیدرآباد دکن)

یہ احترام ، یہ اکرام کیسے نکلے گا
مِرے قلم سے ترا نام کیسے نکلے گا
اگر شہید نہیں ہے تو پھر تو غازی ہے
وہ کارزار سے ناکام کیسے نکلے گا
میں جانتا ہوں مجھے رات کاٹنی ہو گی
اب آفتاب سرِ شام کیسے نکلے گا
بنانے والا تو بگڑی بنا ہی دیتا ہے
تو سوچتا تھا مرا کام کیسے نکلے گا
بھگت رہے ہیں سزائے گناہِ ناکردہ
ہمارے سر سے یہ الزام کیسے نکلے گا
جو لا مکاں ہے اسی کو نکالنا ہوگا
ایودھیا سے بھلا رامؔ کیسے نکلے گا
نہ برف زار، نہ پنجاب ہی نکل پایا
تو پھر یہ ہاتھ سے آسام کیسے نکلے گا
میں صاحبانِ قلم کی کتابِ خوش[1] میں نہیں
تو میرے نام یہ انعام کیسے نکلے گا
کلامِ خیرؔ تو تم نے ابھی پڑھا ہی نہیں
خیالِ حافظ و خیام کیسے نکلے گا

۱ کتابِ خوش=Good Book

شہناز نبی (کولکتہ)

دعا سے ہاتھ خالی، دل تمناؤں سے خالی ہے
عجب سے وسوسوں میں گھر گیا تیرا سوالی ہے

تجھے تشبیہ دوں کس سے ، کروں میں استعارہ کیا
تصور تیرا مشکل ہے، تری صورت خیالی ہے

بہت چاہا کہ کترا کر گذر جاؤں ، مگر سوچو
ذرا سا مختلف ہے وہ، طبیعت کچھ نرالی ہے

ابھی سے کیوں اندھیرے کا تصور تم کو ڈستا ہے
ابھی سورج نہیں ڈ و با، ابھی پچھّم میں لالی ہے

ہمیں اس حق پرستی کا صلہ ملتا بھی کیا اس سے
کبھی تو سرزنش کردی، کبھی کچھ گوشمالی ہے

چمن زاروں سے پوچھو کس پہ اب افتاد آنی ہے
بہت بشاش ہیں غنچے، ہری اک ایک ڈالی ہے

ترے بازار میں یوسف کی قیمت ہم ادا کرتے
مگر صورت ہے لاثانی نہ سیرت ہی مثالی ہے

شہناز نبی

کیا کہیں اس دل کو کیسا مرحلہ درپیش ہے
آنکھ میں آنسو نہیں اور سانحہ درپیش ہے

پھر کسی منصور کو ہے شوقِ حق گوئی یہاں
پھر وہی دار و رسن کا واقعہ درپیش ہے

پھر کہیں دریاؤں پہ پہرے بٹھاتا ہے کوئی
پھر کسی کی پیاس کو اک حادثہ درپیش ہے

میرے اس کے بیچ کوئی رابطہ باقی نہیں
معنیٰ بے لفظ کا اک سلسلہ درپیش ہے

راستے مسدود ہیں یاں رہروانِ شوق پر
اور سفر نا آشنا کو راستہ در پیش ہے

کیوں نہیں مٹتی ہیں جسم و روح کی یہ دوریاں
خود سے ملنے میں یہ کیسا فاصلہ درپیش ہے

یہ لبا لب زندگی اور تلخیٔ کام و دہن
لمحہ لمحہ آنسوؤں کا ذائقہ د رپیش ہے

خالد حسن قادری (لندن)

اُٹھو اور اپنے دار و رسن مشکبو کرو
بہتر ہے خامشی سے کہ کچھ ہاؤ ہو کرو

درویش بے نیازِ غمِ خوب و زشت ہے
بے آبرو کرو اسے یا سُرخ رُو کرو

پھینکو اتار جامۂ پیوند کار کو
فرصت کہاں کہ بیٹھ کے اس کو رفو کرو

جائے اس طرف سے جلوسِ شہیدِ عشق
روشن تمام بام و در و کاخ و کُو کرو

یہ مصلحت سہی مگر اتنا کہاں دماغ
تحسینِ زلف بھی کرو اور موبمو کرو

غیروں کی طرح نام بھی پوچھو، یہ کون ہے
کب تک کسی کے حال کی یوں جستجو کرو

بے چشمِ اشک بار، نظر رُخ پہ ناروا
پہلے ہر اک نماز سے تازہ وضو کرو

ہم سادہ دل ہیں فنِ سخن پروری سے دور
جو گفتگو بھی ہم سے کرو دُوبدو کرو

حورو ملک بشر کے مقابل نہ ہو سکے
ہم سا جو کوئی ہو تو اسے روبرو کرو

شب خامشی سے تاروں کی چھاؤں میں کٹ گئی
اب کیا کسی سے وقتِ سحر گفتگو کرو

اک عمرِ ہجر بعد ملی فرصتِ وصال
اب آؤ اور قادریؔ کو سُرخ رُو کرو

حمیدہ معین رضوی (لندن)

کہنے کو علاج اسکا زمانے نے کیا ہے
ہے درد عجب میرا کہ جاتا نہیں پھر بھی

جس کے لئے رستوں پہ ہے قندیل جلائی
وہ روٹھ گیا ، لوٹ کے آتا نہیں پھر بھی

یوں قریہِ دل میں ہے خزاں ،چاہا بھی میں نے
میلہ جو ہر اک سو ہے ، لبھاتا نہیں پھر بھی

جس نے گڑھا کھودا تھا وہی اس میں گرا تھا
تھا شخص عجب ،سچ کو سجھاتا نہیں پھر بھی

اس قریہِ موعود میں،لاشوں کی مہک ہے
یہ خون ہے جو خون رلاتا نہیں پھر بھی

لشکر مرے دشمن کے ہر اک سو ہی کھڑے ہیں
کیوں کوئی مدد کو مری آتا نہیں پھر بھی

کچھ تو ہے تعلق کہ قدم روکتی ہے راہ
سوچا ہے بہت دھیان میں آ تا نہیں پھر بھی

اپنے ہی چراغوں نے جلا ڈالا مرا گھر
دل ان ہی چراغوں کو بجھاتا نہیں پھر بھی

چبھتی ہے خلش لہجہ و آواز کی اکثر
احساس مرا اسکو مٹاتا نہیں پھر بھی

احمد صغیر صدیقی (کراچی)

اُس حُسن کی جب بات کریں گے
دیوانے کمالات کریں گے

جانے نہیں دیں گے اُسے تنہا
ٹوٹا ہوا دل ساتھ کریں گے

ہوجائیں گے جب ختم کسی پر
اپنے سے شروعات کریں گے

وہ بھی کہیں موجود نہ ہوگا
یوں اُس سے ملاقات کریں گے

تم بام پہ اک پھول کھلانا
ہم دھوپ کو برسات کریں گے

آنا ذرا تفریح رہے گی
اک محفلِ صدمات کریں گے

احمد صغیر صدیقی

ہم پر جو کشادہ تھا
بے سود افادہ تھا

اتنا ہی تھا وہ رنگیں
جتنا کہ میں سادہ تھا

کرنا ہی نہیں تھا کچھ
کیا خواب ارادہ تھا

جی بھر کے ہنسے ہم بھی
کچھ درد زیادہ تھا

سمجھے تھے سفر میں ہیں
منزل تھی نہ جادہ تھا

جاں عرش نشینی تھی
دل خاک نہادہ تھا

جو ہم نے نبھایا تھا
پیماں تھا، نہ وعدہ تھا

کاوش عباسی (کراچی)

جادو کچھ میری چشمِ تر میں نہیں
ہم نوا ایک شہر بھر میں نہیں

سورجوں کا پتہ جو تھے وہ چاند
اب کسی خواب کی نظر میں نہیں

کیا کہیں شہر میں ملے گی مجھے
وہ محبت جو میرے گھر میں نہیں

رات کو جھیلنے میں الجھا ہے
دل لگا،نغمۂ سَحَر میں نہیں

خبطِ منزل ہے،لافِ منزل ہے
کوئی منزل مِرے سفر میں نہیں

خالی آفاق مجھ میں در آئے
کیا خلا ہے جو میرے سر میں نہیں

میری ناکام زندگی کاوشؔ
اب کسی خواہش و خبر میں نہیں

کاوش عباسی

ترا شعار،تری دھج مِرے خیال میں ہے
سبھاؤ غم میں مِرے،تمکنت ملال میں ہے

وہ تیرا کیفِ تبسم،وہ والہانہ پن
مِرے جنوں کی چمک بھی ترے جمال میں ہے

ترے تکلّمِ رعنا و خوش خیال کی خیر
جو عیش زخم میں تھا، اب وہ اندمال میں ہے

وہ بے خودی ہے کہ دل میں سماں سجا ہے کوئی
فراق ڈوبا ہوا مستیِ وصال میں ہے

فغاں کو زمزمہ کر دے،جنوں کو شانت کرے
یہ رنگ بھی تو مِرے یارِ خوش خصال میں ہے

بھروسا ہی کفِ دریائے دل کا کیا کاوشؔ
ابھی تو مانا کہ حد میں ہے،اعتدال میں ہے

غلام مرتضیٰ راہی (فتح پور۔ یوپی)

وہی ساحل، وہی منجدھار مجھ کو
بنایا اس نے کھیون ہار مجھ کو

ڈبو کر دیکھتا تھا یار مجھ کو
سکھایا تیرنا بے کار مجھ کو

زُباں کی کاٹ سے دیکھا ملا کر
لگی کچھ تیز کم تلوار مجھ کو

کبھی ہوتی نہ پھر اُڑنے کی ہمت
ملی ایسی نہ اب تک ہار مجھ کو

ہے بر حق ''ہر کمالے را زوالے''
گرا چوٹی سے اے کہسار مجھ کو

جنہیں ہے ناز اپنے فاصلوں پر
پکڑنے دیں ذرا رفتار مجھ کو

کسی نے وصل کا وعدہ کیا ہے
بُلایا ہے سمندر پار مجھ کو

غلام مرتضیٰ راہی

ندی تالاب کے در پر پیاسا
ایک اک گھاٹ کا پتھر پیاسا

تھا سمندر میں بھی رہ کر پیاسا
مرگیا ایک شناور پیاسا

بسکہ موقوف ہے ہنگامے پر
پھر ہوا خون کا خنجر پیاسا

اتنی چھلکاتے ہیں پینے والے
ساقی رہ جاتا ہے اکثر پیاسا

تیرے پانی میں ہے لالی اے فراتؔ
ایسی سیری سے میں بہتر پیاسا

دیکھیے کوہ ہمالہ کا نصیب
اوڑھ کر برف کی چادر پیاسا

بھائی کا خون بھی پی سکتا ہوں
ہے کوئی میرے برابر پیاسا

جان عالم (مانسہرہ)

دو چار قدم چپ کا سفر سات کریں ہم
لفظوں سے نکل کر بھی کوئی بات کریں ہم

دہلیزِ دلِ خستہ پہ آئی ہے اداسی
آ رونقِ ہستی تجھے خیرات کریں ہم

اک روز تو ساتھ اپنے تری یاد نہ سوئے
اک روز اکیلے بھی بسر رات کریں ہم

وہ بھی تو کسی دن کوئی اعجاز دکھائے
اب اُس کے لئے کتنے کرشمات کریں ہم

اس واسطے چپ ہیں کہ سبھی بول رہے ہیں
بولے گا بھلا کون اگر بات کریں ہم

ناصر نظامی (ہالینڈ)

نظر شناس ہی پرکھے گا چشم والے کو
اندھیرا چھو نہیں سکتا کبھی اُجالے کو

سنا ہے شہر میں سقراط سر اُٹھانے لگے
فصیلِ شہر پہ رکھ زہر کے پیالے کو

جو مجھ پہ آج لگاتے ہیں کفر کے فتوے
وہ کل کہیں گے صحیفہ مِرے مقالے کو

وہ آدمی مری نظروں میں آدمی ہی نہیں
جو توڑ پائے نہ اپنی انا کے ہالے کو

بڑھے گی اور بھی طغیانی اس کی موجوں کی
بزور جتنا بھی روکوگے دل کے نالے کو

میں اپنی سوچ فضا میں بکھیر جاؤں گا
ہوائیں رکھیں گی زندہ مرے حوالے کو

طاہر عدیم (جرمنی)

گلوں میں لپٹے خیالات کے علاوہ بھی
ہزار غم ہیں غمِ ذات کے علاوہ بھی
کوئی خبر مرے حالات کے علاوہ بھی
کوئی تو لفظ شکایات کے علاوہ بھی
ہے بعدِ ماتمِ مہتاب لاش سورج کی
ابھی تو دن ہے پڑا رات کے علاوہ بھی
گِلہ نہ کر کہ میں تجھ پہ غزل نہیں کہتا
مجھے سمجھ مری عادات کے علاوہ بھی
ہزار معجزے دنیا میں سانس لیتے ہیں
درونِ شہر طلسمات کے علاوہ بھی
کوئی تو ذکر کہ جس میں نہ ذکر ہو تیرا
کوئی تو بات تری بات کے علاوہ بھی
خدائے عشق بتائے کہ کچھ ہُوا ہے کبھی
دلوں کے دشت کرامات کے علاوہ بھی
کماں پہ تیر سجائے ہے مُنتظر کوئی
مچانِ چشم تری گھات کے علاوہ بھی
بس ایک نُقطۂ آغاز ہی نہیں کافی
کہ مرحلے ہیں شروعات کے علاوہ بھی
جو سر اٹھائے تو سب کچھ بہا کے لے جائے
درونِ چشم ہے برسات کے علاوہ بھی
کتابِ زیست پہ طاہرؔ جو دسترس ہو مری
لکھوں جنوں پہ حکایات کے علاوہ بھی

طاہر عدیم

غیر ممکن تھا مگر کاٹ کے رکھا ہوا ہے
جیسے تیسے یہ سفر کاٹ کے رکھا ہوا ہے

سُنتے آئے ہیں کہ یہ عشق بلا ہے تو جبھی
نشترِ دل سے جگر کاٹ کے رکھا ہوا ہے

کشتِ افکار میں اک سمت فقط تیرے لیے
ریشمِ فصلِ ہنر کاٹ کے رکھا ہوا ہے

چاہیے دل تو بصد شوق اِدھر طشت میں ہے
چاہیے سَر تو اُدھر کاٹ کے رکھا ہوا ہے

اپنی سانسوں سے جسے باندھ رکھا تھا تُو نے
وقت نے آج وہ گھر کاٹ کے رکھا ہوا ہے

اُس کو معلوم ہے گُزروں گا گلی سے میں بھی
اُس نے اک جگہ سے در کاٹ کے رکھا ہوا ہے

وقت اِک لاشۂ بے گور و کفن ہے جس پر
زیست کا دیدۂ تر کاٹ کے رکھا ہوا ہے

صرف اُس ذات سے ڈرنے کے عمل نے طاہرؔ
ساری اقسام کا ڈر کاٹ کے رکھا ہوا ہے

معید رشیدی (دہلی)

کچھ فسانے تھے، حقیقت تو نہیں تھی اتنی
دشتِ امکاں میں بغاوت تو نہیں تھی

اِن دنوں تارِنفس اتنے پریشاں کیوں ہیں
قریۂ جاں میں شرارت تو نہیں تھی اتنی

اُس کے ماتھے پہ چمکتے تھے کئی وصل کے چاند
زندگی ہجر کی صورت تو نہیں تھی اتنی

فرطِ جذبات میں احساس سسکتا تھا کہیں
تُو بھی تنہائی قیامت تو نہیں تھی اتنی

مجھ میں صحرا کوئی آباد ہے برسوں سے معیدؔ
اس بیاباں میں تمازت تو نہیں تھی اتنی

معید رشیدی

یہاں تو دامنِ صحرا میں تیرگی ہے بہت
سنا ہے شہرِ تمنّا میں روشنی ہے بہت

مرے بدن کے جزیروں میں شور پلتا ہے
ترے بدن کے سمندر میں خامشی ہے بہت

دیا خموش ہے اور گھر میں ایک سنّاٹا
مہیب شام کے سایے میں مفلسی ہے بہت

تھکن کو ضد کہ ذرا شب گزار لی جائے
پہ ساعتوں کے قبیلے میں کھلبلی ہے بہت

طویل شب کی مسافت میں صبحِ نو کا وجود
غموں کی آنچ میں تپ کر بھی کاغذی ہے بہت

میں کیسے ہاتھ لگاؤں تجھے چراغ کی لو
ترے مزاج میں اندازِ سرکشی ہے بہت

کوئی مکان کہیں اور منتظر ہے مرا
مرا قیام یہاں یوں بھی عارضی ہے بہت

حصارِ فکر سے جب بھی گزرنا چاہتا ہوں
تو زیرِ لب کوئی کہتا ہے سادگی ہے بہت

منظور ندیم (مجلگاؤں)

پھٹی پرانی ہیں کیوں ٹوپیاں، نہ پوچھو ہو
ہم اہلِ فکر کی حالت میاں نہ پوچھو ہو

جو تھام کر میری انگلی چلے ہیں برسوں تک
اُٹھائیں مجھ پہ جو وہ انگلیاں، نہ پوچھو ہو

منافقوں میں کٹی جا رہی ہے عمرِ عزیز
ہمارے رزق کی مجبوریاں نہ پوچھو ہو

بکھر رہی ہے مِرے گھر میں روشنی اُس کی
بجھا رہا ہے کوئی بتیاں ،نہ پوچھو ہو

بچھے پڑے ہیں مری رہگذر پہ ماہ و نجوم
انا کھڑی ہے مگر درمیاں نہ پوچھو ہو

سیّد تحسین گیلانی (لاہور)

میں رہتا ہوں ترے من میں تری ہی ذات کے ڈر سے
وہ کہتے ہیں چھپا ہے تو ،تو اپنی مات کے ڈر سے

میں سورج ہوں میں روشن ہوں کسی مومن کا دل جیسے
مگر ہر دن نکلتا ہوں، اندھیری رات کے ڈر سے

مجھے تم نے کہا تھا کے.. مَیں مرجاؤں گی تیرے بِن
مری جاں! ہم بھی زندہ ہیں تری اِس بات کے ڈر سے

میں آنسو ہوں وہ رم جھم ہوں جو جب چاہے برس جائے
کبھی بارش بھی رُکتی ہے بھلا برسات کے ڈر سے

اگر تحسیںؔ بولے تو یہ لمحے بھی ٹھہر جائیں
کہ چپ رہنا ہی پڑتا ہے ہمیں حالات کے ڈر سے

مبشر سعید (فرانس)

کب مری حلقۂ وحشت سے رہائی ہوئی ہے
دل نے اِک اور بھی زنجیر بنائی ہوئی ہے

اور کیا ہے مرے دامن مِیں محبت کے سوا
یہی دولت مری محنت سے کمائی ہوئی ہے

میرا ہونا ترے ہونے سے ہُوا ہے مشروط
تیرے ہونے نے مری بات بنائی ہوئی ہے

عشق مِیں عالمِ تفریق نہیں ہوتا مِیاں
تو نے اِس دشت مِیں دیوار اٹھائی ہوئی ہے !

تیری صورت جو مَیں دیکھوں تو گماں ہوتا ہے
تو کوئی نظم ہے جو وجد مِیں آئی ہوئی ہے

جب سے آیا ہوں مَیں اس دشتِ محبت کی طرف
خواب اپنے ہیں مگر نیند پرائی ہوئی ہے

اِک پری زاد کے یادوں مِیں اُتر آنے سے
زندگی وصل کی بارش مِیں نہائی ہوئی ہے

تم گئے ہو یہ وطن چھوڑ کے جس دن سے سعیدؔ
اِک اُداسی درو دیوار پہ چھائی ہوئی ہے

مبشر سعید

موسمِ وصل کا امکان ہُوا کرتے تھے
ہم تری آنکھ مِیں مہمان ہُوا کرتے تھے

زندگی غار کی وحشت مِیں بتانے والے
روشنی دیکھ کے حیران ہُوا کرتے تھے

موسمِ عشق دھمالوں مِیں بدل جاتا تھا
ہم ترے دھیان مِیں بے دھیان ہُوا کرتے تھے

آج جس دوست نے دُھتکار دیا ہے ہم کو
ہم اُسی دوست پہ قربان ہُوا کرتے تھے

ہم نے اُس وقت تجھے زندگی مانا تھا کہ جب
ہر طرف موت کے امکان ہُوا کرتے تھے

اب جہاں لوگ خُداؤں سے بنے بیٹھے ہیں
ہم وہاں صورتِ انسان ہُوا کرتے تھے

آج جن کو مری قربت کی ضرورت ہے سعیدؔ
وہ مرے عشق سے انجان ہُوا کرتے تھے

خواجہ جاوید اختر (الہ آباد)

جانتا ہوں حریفِ جاں ہیں سب
ہاں مگر آج کل کہاں ہیں سب

ایک میں ہی زمیں کی صورت ہوں
اور باقی تو آسماں ہیں سب

کون میری زباں سمجھتا ہے
یوں تو کہنے کو ہم زباں ہیں سب

میں سبھی کا یقین کرتا ہوں
اور مجھ سے ہی بد گماں ہیں سب

کون سی مصلحت ہے جو مجھ پر
اس قدر آج مہر باں ہیں سب

سن کے ساری حقیقتیں میری
لوگ بولے کے داستاں ہیں سب

خواجہ جاوید اختر

وہ میرے نزدیک نہیں ہے
موسم بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے

جو کچھ تجھ سے مانگ رہا ہوں
حق ہے میرا بھیک نہیں ہے

جس میں تھوڑی بھی جدت ہو
اب ایسی تحریک نہیں ہے

جانے وہ کب کیا کرڈالے
اس کا کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے

کچھ تعریفیں بھی ہیں شامل
صرف تری تضحیک نہیں ہے

روشن اب بھی ہے اک تارہ
رات بہت تاریک نہیں ہے

اس کو باآسانی پڑھیے
حرف کوئی باریک نہیں ہے

حفیظ انجم (کریم نگر)

بن سنور کر مکان سے نکلے
سانپ،بچھو بھی شان سے نکلے
گولہ بارود اور مشین گنیں
سب ترے سائبان سے نکلے
سونا چاندی کے ان گنت سکّے
اب ترے پائیدان سے نکلے
اک پرندے کو مارنے کے لیے
تیر کتنے کمان سے نکلے
کتنے کردار جھومتے، گاتے
اک تری داستان سے نکلے
خود شکاری شکار ہونے کو
اپنی اپنی مچان سے نکلے
گھپ اندھیروں میں گیان پلتا ہے
یہ اندھیرے بھی گیان سے نکلے
کچھ نہ کچھ جھوٹ موٹ ہی کہئے
کچھ نہ کچھ تو زبان سے نکلے
سارا جنگل ہی جل گیا انجم
کتنے شعلے چٹان سے نکلے

خالد ملک ساحلؔ (ہمبرگ، جرمنی)

ہم تشنگی کا آپ سے اظہار کیا کریں
معلوم ہو جواب تو تکرار کیا کریں

دل مانگتا ہے وصل کی لذت وصال میں
سایہ نہ ہو تو آپ کی دیوار کیا کریں

گر خواب کا یقین سے رشتہ نہ بن سکے
تعمیر اپنے ہاتھ سے کردار کیا کریں

دشمن کے ہاتھ میں ہیں لکیریں نصیب کی
ہم اپنے اختیار کا اقرار کیا کریں

گھر گھر میں اختلاف کی دیوار ہے کھڑی
اس بے دھیان وقت میں معمار کیا کریں

خواہش میں ہو جنون کی گرمی تو زندگی
ورنہ یہ کائنات کا کہسار کیا کریں

دنیا کا کاروبار بھی تیرا سلوک ہے
ہم ایسے بد گمان بھی انکار کیا کریں

لفظوں سے آشنا ہیں نہ جذبوں سے آشنا
ساحلؔ کہو چٹان کو ، شہکار کیا کریں

توقیر تقی (بوریوالا)

سر پہ لٹکی ہوئی تلوار کے گرنے تک ہے
زندگی وقت ہے اور وقت گزرنے تک ہے

ریت بن کر مری مٹھی سے سرکتی خوشیاں
پاؤں نیچے یہ زمیں بھی تو سرکنے تک ہے

لوگ مصروف ہیں تنصیب میں خیموں کی مگر
راہ جذبے پہ پڑی گرد اُترنے تک ہے

شہر کھنڈرات کی بنیاد ہوا کرتے ہیں
دل کی بستی کا بسے رہنا اُجڑنے تک ہے

خاک کے ٹوٹے مقابر میں بھٹکنا ہے اسے
یہ کبوتر جو ترے ہاتھ میں اُڑنے تک ہے

خواہشیں خضر کے پہلو سے نہیں نکلیں تقیؔ
یہ جھمیلہ تو بدن خاک میں ملنے تک ہے

عمران حیدرؔ (لاہور)

بچشمِ یاد تحیّر سا بھر کے جا ئے گا
یہ شوقِ دید تو لگتا ہے مر کے جا ئے گا

وہ نقش عکس کی ناؤ میں تیر کر آیا
کنارے خواب سے آگے اتر کے جائیگا

میں ریگِ حرفِ تمنا بیٹھاتا ہوں دل میں
کہ سیلِ فکرِ تپاں تو گزر کے جائے گا

یہ ابرِ رنگ جو برسے گا دل کی دھرتی پر
دھنک کو آنکھ میں پیوست کر کے جائیگا

جنوں بھی ضبط کی صورت سمٹ کے آیا تھا
سو ریگزارِ بدن میں بکھر کے جائے گا

نجانے کیوں میرے دل کی زمین چیختی ہے
یہاں پہ ایک مسافر ٹھہر کے جائے گا

عجیب در بدری اس نے پائی ہے عمران
دھڑکتے دل کی صدا سے بھی ڈر کے جائیگا

قیصر جمال (پٹنہ)

سوندھے جسموں کو عتابوں کے بھنور اچھے لگے
سر پھرے سیلاب کو مٹی کے گھر اچھے لگے

جب سے میں رہنے لگا ہوں مجرموں کے شہر میں
قتل کے الزام سارے اپنے سر اچھے لگے

کجروی میری تھی یا عزمِ سفر تھا دوستو!
چلچلاتی دھوپ بے سایہ شجر اچھے لگے

ساحلِ دریا نے سمجھا ہی نہیں موجوں کا راز
بکھرے بکھرے سے گھروندے ریت پر اچھے لگے

فاتحانہ قہقہے ہیں بارشوں کے ہونٹ پر
ان کی نظروں میں ہزاروں بے بسر اچھے لگے

بے بسی کی گردشوں کے درمیاں قیصرؔ جمال
روز و شب کے فاصلے کچھ مختصر اچھے لگے

مقبول احمد مقبول (اودگیر)

سفر کہاں میری سانسوں کا آ کے ٹھہرا ہے
کہ اس دیار کا ہر شخص گونگا، بہرا ہے

کسی کی آنکھ نہیں دیکھ پائے گی ہر گز
ہمارا زخمِ دل و جاں بہت ہی گہرا ہے

میں کب سے چیخ رہا تھا کہ ایک پَل تو ٹھہر
مگر پتہ یہ چلا اب کہ وقت بہرا ہے

یہ کیا ضرور کہ ہو متن بھی بڑا رنگین
کتابِ زیست کا عنوان تو سنہرا ہے

یہی سبب ہے جو میں آج تک سلامت ہوں
مِرے وجود پہ تیرے کرم کا پہرا ہے

غمِ جہاں کہ غمِ زندگی جو ہو مقبولؔ
ہر ایک غم سے مِرا ربط ضبط گہرا ہے

جعفر ساہنی (کولکاتا)

عاشقی کے پیام سے نکلو
جی حضوری کے دام سے نکلو

خود نشاں اپنا اک مزا دے گا
جدّ امجد کے نام سے نکلو

دشتِ ہو کا سفر بھی لازم ہے
گلستاں کے قیام سے نکلو

زندگی یوں بسر نہیں ہوتی
کچھ تو عالی مقام سے نکلو

رات سے گفتگو بھی کرنی ہے
اب مہکتی سی شام سے نکلو

کردو آغاز اک نئی رُت کا
جب کسی اختتام سے نکلو

ہو گئی سادگی پرائی سی
شہر میں اہتمام سے نکلو

وقت کی بندشوں میں رہ دیکھو
ساعتِ بے لگام سے نکلو

بھاگتی جا رہی ہے یہ دنیا
ساہنیؔ تیز گام سے نکلو

عاطرؔ عُثمانی (کوالالمپور، ملائیشیا)

مقتل میں زباں سے جو انکار نِکل جائے
آواز کے جھنجھٹ سے للکار نِکل جائے

اِس دل میں جُنوں تیرا بڑھتا ہی رہے ہر دَم
ایسا نہ ہو جیون یہ بیکار نِکل جائے

یا حُسن کرے پُورا سب عشق کی مانگوں کو
یا حُسن کے ہاتھوں سے سَرکار نِکل جائے

جو چاند مِرا جاگے پہلُو میں مِرے آ کر
تو آنکھ سے تاروں کی بھرمار نِکل جائے

یا لفظ اُگائے یہ اپنے ہی خیالوں کے
یا فن کی زمینوں سے فنکار نِکل جائے

بن جاتا ہے پھر عاطرؔ جنگل کی کہانی یہ
قصے سے جو مُنصِف کا کردار نِکل جائے

ع۔ع۔عارف (راجوری)

خوش نُما منظر یہاں کوئی نہیں
خوشبوؤں کا گھر یہاں کوئی نہیں

کس کے سر رکھیں کلاہِ فخر ہم
جب مقدّس سر یہاں کوئی نہیں

قاتلوں کے شہر میں رہتے ہو واہ!
ہاتھ میں خنجر یہاں کوئی نہیں

ٹوٹ کر بکھرے پڑے ہیں آئینے
دُور تک پتھر یہاں کوئی نہیں

کس جگہ سجدے کو پیشانی جھکے
اس طرح کا در یہاں کوئی نہیں

لوٹ کر آئے بھی کیا عارفؔ میاں
گاؤں ہے پر گھر یہاں کوئی نہیں

☆☆☆

جیم فے غوری (اٹلی)

گہرے بادل رو جائیں گے
ریت میں آنسو بو جائیں گے

ٹوٹے ہوئے سپنے آنکھوں میں
اک دن تارے ہو جائیں گے

تیرے جاگتے خوابوں میں ہم
اک دن تھک کر سو جائیں گے

رسمِ وفا کی اجلی رُت میں
ہم بھی تیرے ہو جائیں گے

صبح سفر میں نکلے تھے ہم
تاریکی میں کھو جائیں گے

مظفر حنفی (دہلی)

ہمیں للکارنے والے بہت ہیں
ہمارے ہاتھ میں چھالے بہت ہیں

مناسب ہے کہ دل کی بات مانو
تمہارے ذہن میں جالے بہت ہیں

ٹھہرنا ہو تو سورج ایک حیلہ
مسافر کو ندی نالے بہت ہیں

تمہیں کو سوچنا ہے نیزہ بازو
مِرا سر ایک ہے، بھالے بہت ہیں

سخاوت سے کہا تھا مصلحت نے
کہ مٹھی بند رکھ، پیالے بہت ہیں

اندھیری رات میں جنگل کے جگنو
سحر کرنے کو اجیالے بہت ہیں

مظفرؔ خون کو جمنے نہ دینا
ابھی آفت کے پرکالے بہت ہیں

مظفر حنفی

کوئی میرا نہیں ہے، جی سے یہ دھڑکا نکل جائے
اگر ساتھی پلٹ کر دیکھ لیں، کانٹا نکل جائے

پہاڑوں کا سندیسہ لے کے جانا ہے سمندر تک
منادی ہے کہ ریگستان سے دریا نکل جائے

دلاسہ دینے والو، شکریہ، لیکن ذرا سوچو
جسے تم گھر سمجھتے ہو، اگر صحرا نکل جائے

ستارے توڑنے کی میری خواہش تجھ سے پوری ہو
دعا ہے میرے قد سے تو بہت اونچا نکل جائے

بھلی صورت کی وہ لڑکی نہایت کج ادا نکلی
بگڑ جاتا ہے منہ، بادام اگر کڑوا نکل جائے

جُنوں آواز دے تو جسم کی دیوار توڑیں ہم
سفر آغاز ہو تو پاؤں کا چھالا نکل جائے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مظفرؔ شعر کہنے میں
کہ جیسے ہاتھ آ کر کوئی جگنو سا نکل جائے

مظفر حنفی

سر اُونچا، آنکھیں روشن، لہجہ بے باک ہمارا
تلوے زخمی، ہاتھ بریدہ، دامن چاک ہمارا

دریا کی تہہ میں ہم اُترے، ناؤ کی شوبھا تھا وہ
ساحل پر سب موتی اُس کے ہیں، خاشاک ہمارا

ریت کے اوپر نقش بنا کر چھوڑ گیا ہے کوئی
تیز ہوا کے دو جھونکوں میں قصہ پاک ہمارا

جی بھر کر خوشبو پھیلائیں، رنگ پھوار اُڑائیں
ہونا ہے اک روز نتیجہ حسرت ناک ہمارا

سادہ لوحی خوابوں کی تعبیریں کیا کرتی ہیں
خوابوں کا تو دشمن ہے گہرا ادراک ہمارا

چشمۂ حیواں، وادیٔ ظلمت، سب جنجال تھے جی کے
زہرِ ہلاہل ہی نکلا آخر تریاک ہمارا

میرؔ کا جیون روتے روتے بیتا اس نگری میں
دلّی میں سمّان مظفرؔ ہوتا خاک ہمارا

مظفر حنفی

لائقِ دید وہ نظارہ تھا
لاکھ نیزے تھے، سر ہمارا تھا

ایک آندھی سی کیوں بدن میں ہے
اُس نے شاید ہمیں پکارا تھا

بادباں سے اُلجھ گیا لنگر
اور ہاتھ پر کنارا تھا

شکریہ ریشمی دلاسے کا
تیر تو آپ نے بھی مارا تھا

صاحبو! بات دسترس کی تھی
ایک جگنو تھا، اک ستارا تھا

آسماں بوجھ ہی کچھ ایسا ہے
سر جھکانا کسے گوارا تھا

اب نمک تک نہیں ہے زخموں پر
دوستوں سے بڑا سہارا تھا

آپ منسوب ہیں مظفرؔ سے
پھول، خوشبو کا استعارا تھا

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

اور کچھ چاند رات آگے بڑھے
جو دلوں میں ہے بات آگے بڑھے

سب ہے انسان کی پیش قدمی پر
یہ بڑھے کائنات آگے بڑھے

میں ہی رہتا ہوں اپنی ذات میں بھی
میں بڑھوں میری ذات آگے بڑھے

تین سے سات پر تو پہنچا ہوں
تب مزا ہے جو سات آگے بڑھے

آخری بات پر رکی ہے بات
اب وہ چاہیں تو بات آگے بڑھے

ہوئی تیغ و سناں کی پسپائی
تب قلم اور دوات آگے بڑھے

ناچیں اودھم برات کے لونڈے
یہ ہٹیں تو برات آگے بڑھے

کچھ ادھر کا اشارہ ہو اکبر
تو ہمارا بھی ہاتھ آگے

اکبر حمیدی

اک ترا حسن ہے جو ذاتی ہے
باقی ہر شے مواصلاتی ہے

کہیں دولہا نظر نہیں آتا
اور جسے دیکھو وہ براتی ہے

ہم عذابِ الٰہی کہتے ہیں
کاروائی جو انضباتی ہے

آپ کو دیکھا تو ہوا معلوم
زندگی کیسے مسکراتی ہے

پھولوں میں آنے والی ہر سرخی
تیرے ہونٹوں کو چھو کے آتی ہے

روٹھ کر جانے والو رک جاؤ
زندگی آپ کو بلاتی ہے

ہجر ہو یا وصال ہو اکبر
ندی دریا کے گیت گاتی ہے

اکبر حمیدی

کچھ اس طرح سے مشقت ہے میرے جینے میں
کوئی نہ فرق رہا خون اور پسینے میں

کچھ اس قرینے سے خود کو سنوارتے ہیں وہ
نظر نہ آئے قرینہ کبھی قرینے میں

شبِ وصال کے منظر نظر میں بھر آئے
چمک دمک نظر آتی ہے جب نگینے میں

کبھی کبھی کی ملا قات یونہی ہوتی ہیں
نہ امتیاز رہا سال اور مہینے میں

کچھ ایسا عدم تحفظ کا خوف ہے اکبر
تمام دریا سمٹ آیا ہے سفینے میں

اکبر حمیدی

برس مجھ پر ایسا شرابور * کر دے
بھگو اتنا مجھ کو جو بے طور کر دے

نظر ڈال ایسی جو سب کی نظر میں
بہت مجھ کو بھی قابلِ غور کر دے

ملاقات کر مجھ سے جلوت میں ایسی
جو مجھ اور کو اور ہی اور کر دے

تپا میرا تن اپنے تن کی تپش سے
عنایات کا دوسرا دور کر دے

نہیں ہے اب اس عمر میں صبر اتنا
عطا جو بھی کرنا ہے فی الفور کر دے

اگر گوجرانوالا تھوڑا سا ڈالیں
تو لاہور کو پورا لاہور کر دیں

وہ دیکھے گا پلکیں اٹھا کر جو اکبر
تو ساون رُتیں اور گھنگھور کر دے

----

* اکبر حمیدی صاحب کا اصرار ہے کہ اصل لفظ شرابُو ر نہیں بلکہ شرابور ہے، جیسا کہ اس مصرع میں لایا گیا ہے۔ اہل علم کے لیے مکالمہ کا موقعہ ہے۔ (ح۔ق)

انور سدید (لاہور)

بدلتے دیکھ کر تیور اچانک
ہوا محسوس اُبھرتا شر اچانک

میں اپنی زندگی قربان کر دوں
اگر وہ دیکھ لے مُڑ کر اچانک

اسی کی جستجو برسوں رہی ہے
کھلا ہے آج جو منظر اچانک

زمیں کی ایک جنبش کا اثر ہے
کہ گرتے جا رہے ہیں گھر اچانک

وطن پردیس میں جب یاد آیا
اُبھر آیا نظر میں گھر اچانک

جو بجھتا جا رہا تھا میرے آگے
وہ بندہ بن گیا افسر اچانک

محبت کے محل سے آج انور
گرا ہے سر پہ اک پتھر اچانک

انور سدید

تو بھی کر غور اس کہانی پر
جو لکھی جا رہی ہے پانی پر

یہ زمیں زر اُگائے گی اک دن
رکھ یقیں اپنی کلبہ رانی پر

نہر کے محکمے میں گزری عمر
ملا ایوارڈ * حکمرانی پر

گرچہ مشکل تلاش تھی اس کی
گھر ترا مل گیا نشانی پر

اس کی بے محوری پہ غور نہ کر
رحم کھا اس کی بے زبانی پر

سفرِ زیست تھا سراب تمام
ناؤ چلتی رہی ہے پانی پر

قائم انور سدید نے رکھا
ارتکاز اپنی زندگانی پر

* صدرِ پاکستان کا ''تمغۂ امتیاز'' ۱۴راگست ۲۰۰۸ء کو دیا گیا۔

انور سدید

یہ مجھ سے پوچھتے ہیں یار تیرے
گزرتے ہیں کہاں اتوار تیرے

نظر وہ لوگ اب آتے نہیں ہیں
جو کل تھے حاشیہ بردار تیرے

مکاں اپنے مکیں سے پوچھتے ہیں
کہاں ہیں آج پہرے دار تیرے

تمہیں رُتبہ بڑا جب سے ملا ہے
ہوا میں اُڑ گئے اقرار تیرے

ترا دشمن تو پیہم حملہ زن ہے
گئے بیکار لیکن وار تیرے

مسلط شہر پر تاریکیاں ہیں
مگر روشن درودیوار تیرے

تمہیں گرداب میں الجھا کے انور
کہاں غائب ہوئے ہیں یار تیرے

انور سدید

پہلے ہٹائیں گے خس و خاشاک دوستو
پھر ہم کریں گے سر کئی افلاک دوستو

اس شہرِ بے وفا میں نہیں کوئی غم گسار
پھرتے ہیں لے کے دامنِ صد چاک دوستو

اس راہزن کو ہم نے دعائیں ہزار دیں
لوٹی ہے جس نے عشق کی املاک دوستو

فریاد اہلِ دل کو سنانے کے واسطے
پہنی ہوئی ہے کاغذی پوشاک دوستو

اب عشق کرنے کی نہیں لوگوں کو فرصتیں
الجھا رہے ہیں وقت کے پیچاک دوستو

پر لگ گئے ہیں آج کے انسان کو سدید
اب اُڑ رہا ہے وہ سرِ افلاک دوستو

محبوب راہی (آکولہ)

رِستے ہوئے زخموں کے وہی گھاؤ،وہی ہم
ہر لمحہ لہو کا وہی چھڑکاؤ ،وہی ہم
طوفاں کا بہر سُو وہی بپھراؤ وہی ہم
ٹوٹی ہوئی بوسیدہ وہی ناؤ، وہی ہم
بے ربط سے رشتے،وہی بے نام سے جذبے
احباب کا ہم سے وہی برتاؤ ،وہی ہم
احساس کی شدت،وہی جذبات کی حدت
سوچوں کا مسلسل وہی بکھراؤ،وہی ہم
نفرت کی بہر سمت وہی گرمیٔ بازار
چاہت کے وہی گرتے ہوئے بھاؤ،وہی ہم
سیرابیٔ احساس وہی ذہن میں بیدار
بیتی ہوئی یادوں کے وہی پیاؤ وہی ہم
حالات کی دیمک نے کیا کھوکھلا لیکن
مونچھوں کا ہمارے ہے وہی تاؤ،وہی ہم
اے زندگی! تو قابلِ نفرت ہے اگرچہ
رکھتے ہیں مگر اب بھی ترے چاؤ وہی ہم
یاروں کو ریاکاری میں حاصل ہے مہارت
کس طرح چلیں ان سے مگر داؤ وہی ہم
اک پل بھی مقدر میں نہیں چین و سکوں کا
ہر پل وہی فکروں کا ہے گھیراؤ وہی ہم
وہ گیت جنہیں گایا ہے اسلاف نے راہیؔ
پھر گائیں مساوات کے گیت آؤ وہی ہم
وہ جس کا سیاست میں چلن عام ہے راہیؔ
کرنے لگے شعروں میں بھی ہُو ہاؤ وہی ہم

محبوب راہی

نہ چاندی ہی ضروری ہے،نہ کچھ سونا ضروری ہے
قناعت لازمی ہے،صبر کا ہونا ضروری ہے

جو پانا چاہتے ہو،پہلے کچھ کھونا ضروری ہے
عزیزو کاٹنے کے واسطے بونا ضروری ہے

ذرا جو ابر چھٹ جائے،ستارے جھلملاتے ہیں
اگر ہنسنے کی خواہش ہے تو کچھ رونا ضروری ہے

کمال اس میں ہے کیا جو آپ اپنا بوجھ ڈھوتے ہو
میاں! کچھ بوجھ تو اوروں کا بھی ڈھونا ضروری ہے

بڑھاپے میں اگر دیواریں گھر کی تنگ پڑتی ہوں
محلے کی کسی مسجد کا اک کونا ضروری ہے

اگر ہو دامنِ کردار کچھ عصیاں سے آلودہ
تو پھر اشکِ ندامت سے اسے دھونا ضروری ہے

ضروری ہے کہ کچھ ابہام بھی ہو شعر میں راہیؔ
وضاحت بھی شعوری طور پر ہونا ضروری ہے

محبوب راہی

آنکھیں جھوٹی،باتیں جھوٹی،ہر ہر تیور جھوٹ
پھر بھی یقیں کرنا پڑتا ہے جو ہے سراسر جھوٹ

پورب، پچھّم، اتر، دکن، نیچے، اوپر جھوٹ
سمتوں، سمتوں جھلک رہا ہے منظر منظر جھوٹ

کوئی تناسب تو ہو آخر کوئی حد تو ہو
اک چلّو بھر سچ کے اندر سات سمندر جھوٹ

سچائی میں قدم قدم پر سو سو رکاوٹیں
سب سے آساں،سب سے سستا،سب سے بہتر جھوٹ

رات رات بھر جاگ جاگ کر توبہ استغفار
لین دین میں دن دن بھر قسمیں کھا کھا کر جھوٹ

سب سے بڑی اور اکلوتی سچائی مال و منال
پیار،محبت،رشتے ناطے،دوست برادر جھوٹ

راہی چلنا اور مسلسل چلنا ہے اک سچ
منزل،ونزل،رستہ وستہ،رہبر وہبر جھوٹ

محبوب راہی

اک شخص ذہن سے جو بھلایا ہوا سا ہے
لگتا ہے جیسے دل میں سمایا ہوا سا ہے

ہم رشتگی کا ہم میں تناسب ہے اس طرح
کھویا ہوا سا میں ہوں،وہ پایا ہوا سا ہے

تبدیل ہوں گے جانے یہ حالات کس طرح
ہر شخص جن کے ہاتھوں ستایا ہوا سا ہے

جس کی کوئی مثال نہ جس کا کوئی جواز
وہ ظلم ہم پہ وقت نے ڈھایا ہوا سا ہے

یہ خلد،ربِ خلدِ بریں،یہ مقام تو
دیکھا ہوا سا اور دکھایا ہوا سا ہے

کیا کیا نہ جانے اب یہ تہوں سے نکال لائے
بھونچال سا جو ذہن میں آیا ہوا سا ہے

راہیؔ کدھر کروں میں نئے راستے تلاش
ہر راستہ تو دیکھا،دکھایا ہوا سا ہے

اشعر نجمی (تھانے)

سکوت شب کے ہاتھوں سونپ کر واپس بلاتا ہے
میری آوارگی کو میرا گھر واپس بلاتا ہے

میں جب بھی دائروں کو توڑ کر باہر نکلتا ہوں
ہوا کے ناتواں جھونکے کا ڈر واپس بلاتا ہے

اسی کے حکم پہ اس کو میں تنہا چھوڑ آیا تھا
خدا جانے مجھے وہ کیوں مگر واپس بلاتا ہے

اشارے کر رہا ہے دوریوں کا کھولتا ساگر
مجھے ہر شام اک اندھا سفر واپس بلاتا ہے

وہ جن کی ہجرتوں کے آج بھی کچھ داغ روشن ہیں
انھی بچھڑے پرندوں کو شجر واپس بلاتا ہے

اشعر نجمی

انکشاف ذات کے آگے دھواں ہے اور بس
ایک تو ہے ایک میں ہوں آسماں ہے اور بس

آئینہ خانوں میں رقصندہ رموز آگہی
اوس میں بھیگا ہوا میرا گماں ہے اور بس

کینوس پر ہے یہ کس کا پیکر حرف و صدا
اک نمود آرزو جو بے نشاں ہے اور بس

حیرتوں کی سب سے پہلی صف میں خود میں بھی تو ہوں
جانے کیوں ہر ایک منظر بے زباں ہے اور بس

اجنبی لمس بدن کی رینگتی ہیں چینٹیاں
کچھ نہیں ہے ساعت موج رواں ہے اور بس

اشعر نجمی

انکشاف ذات کے آگے دھواں ہے اور بس
ایک تو ہے ایک میں ہوں آسماں ہے اور بس

آئینہ خانوں میں رقصندہ رموز آگہی
اوس میں بھیگا ہوا میرا گماں ہے اور بس

کینوس پر ہے یہ کس کا پیکر حرف و صدا
اک نمود آرزو جو بے نشاں ہے اور بس

حیرتوں کی سب سے پہلی صف میں خود میں بھی تو ہوں
جانے کیوں ہر ایک منظر بے زباں ہے اور بس

اجنبی لمس بدن کی رینگتی ہیں چینٹیاں
کچھ نہیں ہے ساعت موج رواں ہے اور بس

اشعر نجمی

تیرے بدن کی دھوپ سے محروم کب ہوا
لیکن یہ استعارہ بھی منظوم کب ہوا

واقف کہاں تھے رات کی سرگوشیوں سے ہم
بستر کی سلوٹوں سے بھی معلوم کب ہوا

سنسان جنگلوں میں ہے موجودگی کی لو
لیکن وہ ایک راستہ معدوم کب ہوا

شاخ بدن سے سارے پرندے تو اڑ گئے
سجدہ تیرے خیال کا مقسوم کب ہوا

نسبت کہاں رہی مجھے عصر زوال سے
میرا وجود سلطنت روم کب ہوا

انوار احمد: مختصر تعارف

انوار احمد ۳؍اپریل ۱۹۵۴ءکو ربوہ میں پیدا ہوئے۔ ہم مزاج شعراء کا وہ حلقہ جو محمد خالد، ابرار احمد اور ان کے دوسرے ساتھیوں پر مشتمل تھا، ان میں انوار احمد ایک عمدہ شاعر کے طور پر ابھر رہے تھے۔ انوار احمد ربوہ کے قریب لالیاں اڈہ پر یو بی ایل میں ملازم تھے۔ وہ اپنی تعلیمی قابلیت کی بنا پر اس ملازمت کے اہل تھے۔ لیکن چونکہ ہمارے معاشرہ میں رشوت اور سفارش کے بغیر جائز کام نہیں ہوتے، چنانچہ انہیں بھی ملازمت کے حصول کے لیے وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی سے سفارشی خطوط لکھوا کر مشتاق احمد یوسفی تک رسائی حاصل کرنا پڑی۔ قاسمی صاحب نے ۲۹؍ستمبر ۱۹۷۵ءکو ابنِ انشاء کے نام خط میں مشتاق احمد یوسفی سے کام بنوانے کا لکھا، جبکہ آغا جی نے ۱۱؍اکتوبر ۱۹۷۵ءکو اپنے خط میں مشتاق احمد یوسفی صاحب کو انوار احمد کی ملازمت کے لیے سفارش کی۔ مشتاق احمد یوسفی کی توجہ سے انہیں یہ ملازمت مل گئی۔ ان سفارشی خطوط کو لکھنے والوں اور مکتوب الیہان کے ناموں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انوار احمد ۲۱ برس کی عمر میں ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے باعث اپنے عہد کے ممتاز ترین سینیئرز کی توجہ حاصل کر چکے تھے۔ تاہم افسوس کہ ۵؍اپریل ۱۹۸۴ءکو اپنی ڈیوٹی پر جاتے ہوئے وہ ایک ٹریفک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ ان کی وفات پر منو بھائی نے جنگ اخبار میں ایک اثر انگیز کالم بھی لکھا تھا۔ کسی دوست کی دسترس میں وہ کالم ہو تو جدید ادب میں اشاعت کے لیے مجھے فراہم کر دیں شکر گزار رہوں گا۔

مجھے انوار احمد کے بڑے بھائی جناب عمر حیات صاحب اور اپنے چھوٹے بھائی عزیزم نوید انجم کے ذریعے انوار احمد کی یہ کُل ۱۳ غزلیں اور چند نظمیں مل سکی ہیں، اس بار غزلیں شائع کی جا رہی ہیں۔ اگلے شمارہ میں ساری دستیاب نظمیں شائع کی جائیں گی۔ اس دوران ان کے کسی عزیز یا دوست کے پاس ان کوئی اور کلام موجود ہو تو وہ جدید ادب کے لیے بھیج سکتے ہیں۔

حیدر قریشی

انوار احمد

وہ ایک عکس ہے پیدا ہر آئینے میں ہے
جو فرق ہے تو فقط تیرے دیکھنے میں ہے

نظر فریب ہیں منظر جہانِ امکاں کے
فصیلِ جسم مگر میرے راستے میں ہے

میں اپنے آپ سے باہر نہ خود کو دیکھ سکا
مری مثال کہاں تیرے آئینے میں ہے

جو سو گیا ہے اسے کیا کہ کیا ہے سایہ و نور
دیارِ شب کی سیاہی تو جاگنے میں ہے

اسی نگاہ سے روشن ہیں آئینے دل کے
وہ کم نگاہ نہیں، تیرے دیکھنے میں ہے

ہیں جس کو دیکھ کے صحرا کے بام و در لرزاں
وہ سورجوں سا بدن اپنے قافلے میں ہے

ہے وقت، دیکھ لے جی بھر کے روئے زیبا کو
ابھی تو دیر بہت اُس کے جاگنے میں ہے

تمہارے حصے بھی آئی متاعِ درد بہت
مرا خیال تھا انوؔار فائدے میں ہے

انوار احمد

سوچتا ہوں کہ تعلق میرا کیا ہے مجھ سے
مجھ میں گُم ہے کہ مری ذات جدا ہے مجھ سے

سنگ زن آج خدا جانے گریزاں کیوں ہے
کوئی بتلاؤ کہ کیا جرم ہُوا ہے مجھ سے

میں نے تو اپنی انا کا بھی اڑایا ہے مذاق
کیوں خوشامد کا طلبگار خدا ہے مجھ سے

تُو نے جانکاہیِ پیہم سے سمیٹا تھا مجھے
آج کیوں خود ہی بکھرنے کو کہا ہے مجھ سے

اجنبی لب مرے نغموں کے سزاوار ہوئے
بہت آگے میرا نقشِ کفِ پا ہے مجھ سے

شدتِ تشنگیِ خونِ شہیداں تجھ سے
رونقِ رزم گہِ کرب و بلا ہے مجھ سے

میں نے آواز نہ دی پاسِ ادب سے تجھ کو
اور تُو ہے کہ تجھے وہمِ جفا ہے مجھ سے

ہے یہی خوف کہ مر جائے نہ گھُٹ کر تُو بھی
ترے محبوس مکانوں میں ہوا ہے مجھ سے

گمرہی کچھ بھی سمجھ کیوں نہیں آتا آخر
میں ہوں بیزار خدا سے کہ خدا ہے مجھ سے

کبھی دیمک کی طرح چاٹ گیا لفظ کا بیج
کبھی خورشیدِ معانی بھی اُگا ہے مجھ سے

شائد انوؔار مجھے اجنبی جانا اُس نے
آج تو اُس نے سلوک اچھا کیا ہے مجھ سے

انوار احمد

تاریک راستوں میں ضیا میرے ساتھ تھی
اندھے سفر میں ماں کی دعا میرے ساتھ تھی
بارش تھمی تو سرد ہوا میرے ساتھ تھی
آنسو رکے تو آہ و بکا میرے ساتھ تھی
کچھ اِس طرح وہ لغزشِ پا میرے ساتھ تھی
میں مر گیا تو پھر بھی سزا میرے ساتھ تھی
کیا کیا گماں تھے مجھ کو کہ کیا میرے ساتھ تھا
چھونے لگا تو دیکھا ہوا میرے ساتھ تھی
چلتا تھا دشت دشت میں پرچھائیں اوڑھ کر
ہر دھوپ کے سفر میں رِدا میرے ساتھ تھی
درپے تھے اہلِ شہر کہ لے جائیں تیری یاد
لیکن وہ ایک مردِ خدا میرے ساتھ تھی
کیسے بکھرتا میں کہ کھلا ہی نہ تھا کبھی
صر صر چلی نہ بادِ صبا میرے ساتھ تھی
میں نے بھی تھام رکھی تھی موسم کی باگ ڈور
چلتا تھا جِس طرف بھی ہوا میرے ساتھ تھی
مجھ سے ہی پوچھتی تھی مرے گھر کا راستہ
میری ہی جستجو میں قضا میرے ساتھ تھی
میں دشتِ یادِ یار سے کیسے گذر گیا
انوؔار شائد اُس کی دعا میرے ساتھ تھی

انوار احمد

در و دیوار یوں اُداس نہ تھے
تم تو پہلے بھی میرے پاس نہ تھے
تیرے آنے سے کھِل اٹھا سبزہ
ورنہ اِس گھر کو گل بھی راس نہ تھے
آج دیکھا ہے تجھ کو مُدت بعد
پہلے یہ پھول تیرے پاس نہ تھے
گُل بھی عریانیاں پہنتے تھے
پر تری طرح خوش لباس نہ تھے
تھے ورق تو کتابِ گُل کا مگر
ہم پہ اوروں سے اقتباس نہ تھے
سُوکھتے ابر کی جدائی میں
ہم وہ کُنجِ چمن کی گھاس نہ تھے
مرمٹے تیری انتہاؤں پہ بھی
ہم فقط گُشتۂ لباس نہ تھے
وقت کیسے ہمیں کھنڈر کرتا
ہم کسی شہر کی اساس نہ تھے
ساحلِ بحرِ بے خودی کی طرح
ہم کبھی اپنے آس پاس نہ تھے
خار پھرتے تھے بھیس میں گُل کے
ہم ہی انوؔار غم شناس نہ تھے

انوار احمد

ترے مزاج سے اے دوست بدگماں بھی نہیں
مگر یہ بات کہ یہ طرزِ دوستاں بھی نہیں
ہے جستجو تری دل میں تو ڈھونڈ لیں گے تجھے
نقوشِ پا تو اگرچہ ترے یہاں بھی نہیں
پڑا وہ قحط کہ نایاب آفتیں بھی ہوئیں
گرے گا کیا کہ سروں پر تو آسماں بھی نہیں
زمیں کی سمت شُعاعوں کے تیر کیا آئیں
اُفق کے ہاتھ میں سورج کی اب کماں بھی نہیں
نشاط کے بھی جزیرے ہیں بحرِ غم بھی بہت
یہ بے کراں ہے مگر ایسا بے کراں بھی نہیں
متاعِ غم ہے غنیمت سمیٹ لے تو بھی
جو فائدہ ہے بہت کم تو یہ زیاں بھی نہیں
کچھ ایسا رویا میں کھُل کر کہ بُجھ گئے الفاظ
سناؤں کیا کہ مرے پاس داستاں بھی نہیں
فقط نگاہ کی دستک سے کھول دے جو کواڑ
دیارِ دل میں تو ایسا کوئی مکاں بھی نہیں
ہیں اُس کے شہر میں سب دل کے چور دروازے
وہ ایک شخص کہ جو اپنا رازداں بھی نہیں
ہر ایک بات پہ انکار مت کرو انوؔار
کہو گے کس کو کہ منہ میں مرے زباں بھی نہیں

انوار احمد

کُنجِ زنداں سے ہے صبا نکلی
جسم سے اپنے جان کیا نکلی
ہو گیا بند سب پہ بابِ قبول
میرے ہونٹوں سے جب دعا نکلی
موت سے تو میں بچ ہی نکلا تھا
رات جانے کہاں سے آ نکلی
اک ستارہ سا بازوؤں میں لئے
گھر سے وہ چاندنی نما نکلی
آج اُسکو بھی مل کے دیکھ لیا
یہ حقیقت بھی واہمہ نکلی
اجنبی کیسی کیسی چیزیں ہیں
شاعری ہی بس آشنا نکلی
میں گزر ہی گیا تھا بس انوؔار
وہ اچانک گلی میں آ نکلی

انواراحمد

اُس کے سِوا ہے شہر میں مجھ سا اُداس کون
آیا نہ دل کو وہ بھی تو آئے گا راس کون
روتا ہوں میں نہ جانے یہ کس کی جدائی میں
مجھ کو خبر کرو کہ نہیں میرے پاس کون
میں قریۂ ملال سے آیا ہوں دوستو!!
مجھ کو بتاؤ شہر میں ہے غم شناس کون
لپٹا ہوا ہے دھند میں دن کو بھی سارا شہر
پھرتا رہا ہے رات نہ جانے اداس کون
روتی تھیں جو مرے لیئے آنکھیں نہیں رہیں
اب کے بجھائے گا مرے ہونٹوں کی پیاس کون
پہلے سے اب وہ سرد رواں یاں نہیں رہے
روندے گا اب کے پاؤں تلے سبز گھاس کون
کس نے ڈرا دیا ہے ہمیں اسمِ زرد سے
پھیلا گیا ہے شہر میں خوف و ہراس کون
اُس سے کہو کہ دیکھ ہمیں بھولنا نہیں
دیکھو بکھیرتا ہے ہواؤں میں باس کون
اپنے سوا کسی کو نہیں مَیں سمجھ سکا
پھرتے ہیں کیا خبر یہ مرے آس پاس کون

انواراحمد

جو چٹانوں میں چھپا ہے وہ نظر کب آئے گا
منتظر بیٹھا ہوں کوئی نقش گر کب آئے گا
ختم ہونے میں یہ صدیوں کا سفر کب آئے گا
اے تھکے ہارے مسافر اپنے گھر کب آئے گا
اب تو تنہائی بھی اپنے آپ سے ڈرنے لگی
تجھ کو اپنے گھر کی دیرانی سے ڈر کب آئے گا
صبح کی اہٹ کی صورت گونجتی ہے ترے چاپ
چاند بھی سونے لگا تُو بام پر کب آئے گا
وہ ابھی آیا نہیں اور دل میں آتے ہیں خیال
آج آئے گا تو پھر بارِ دگر کب آئے گا
اجنبی لہجے میں ان ناآشنا چہروں سے پوچھ
پھر اُنہی مانوس لفظوں کا نگر کب آئے گا
دل گرفتوں کیلیئے رونا بھی گو آساں نہیں
اُس کو لیکن اعتبارِ چشمِ تر کب آئے گا
رات کو انوؔار گر تُو دن بھی کہ سکتا نہیں
زندگی کرنے کا پھر تجھکو ہنر کب آئے گا

انواراحمد

میں خستہ تن سمیٹے تری رہ گزار میں
اے خوش نما ہوں ایسے ترے انتظار میں
جیسے برہنہ شاخ نے پھیلا رکھے ہوں ہاتھ
اُمیدِ پیرہن کہ چھپے برگ و بار میں
یہ بے حسی کی برف پگھل جائے گی کبھی
اور تُو سُنائی دیگا ہر اک آبشار میں
تُو نقشِ پائے اہلِ طلب کی تلاش میں
پھیلے گا جنگلوں میں کبھی لالہ زار میں
خوشخط! میں آہٹوں کو اُجالوں تو کس طرح
خورشید کی نگاہ کے تُو اختیار میں
میں ریگ زارِ جسم سمیٹے رہا اک عمر
اس سے طویل جبر کہاں اختیار میں
جب صر صرِ شمال سے بکھریں گے خستہ تن
پھر منتظر نہ ہو گا کوئی ریگزار میں

انواراحمد

شاید اس رنگ میں تُو چاہے گا
ہم ہر اک بھیس بدل کر آئے
اجنبی شہر میں دستک کیسی
جانے کیوں گھر سے نکل کر آئے
آگ کچھ ایسی لگی تھی دل میں
آنکھ میں آنسو بھی جل کر آئے
یوں وہ ہر بات کا دیتا ہے جواب
جسطرح گیند اُچھل کر آئے
ہم اسی واسطے پھسلے ہیں یہاں
کوئی آئے تو سنبھل کر آئے
مل گیا تُو تو تھکاوٹ کیسی
گو بڑی دور سے چل کر آئے
سوچ کر بھی جسے ڈرتے تھے بہت
اُس سے وہ بات بھی کل کر آئے
اپنی تعریف تو ہو گی لیکن
کوئی اِس راہ سے چل کر آئے
میں تو انوؔار نہیں تھا گھر میں
دوست کیوں راہ بدل کر آئے

انوار احمد

ہر ایک لفظ سے یوں ہی گذر گیا کوئی
پر اس کا نام جب آیا ٹھہر گیا کوئی
یہ اور بات کہ جاں سے گذر گیا کوئی
دیارِ شب کو چراغاں تو کر گیا کوئی
اب اُس بگولہ صفت کی تلاش کیا یارو
نقوشِ پا بھی نہ ہوں گے اگر گیا کوئی
کرے گی دشتِ وفا میں سموم و صرصر کیا
ہوا چلی بھی نہیں اور بکھر گیا کوئی
نہیں ہے شہر میں کوئی بھی دوسرا مجھ سا
یہ جاننے کیلیئے دربدر گیا کوئی
ہمیں خبر نہ ہوئی نیم وا دریچوں کی
نہ اپنے ذہن میں جب تک اتر گیا کوئی
کسی کے خوف سے لرزاں صدائے اسرافیل
اور اپنے پاؤں کی آہٹ سے ڈر گیا کوئی

انوار احمد

اُترا خدا کا نام مرے سرد جسم پر
چھلکا وہ نیلگوں سا مرے زرد جسم پر
اُڑتا رہا وہ شانِ گنہ کے جوار میں
اُترا پسِ صلیب مرے درد جسم پر
ان دیکھی بارشوں سے دُھلا دل کا رخِ سیب
خواہش کے پانیوں سے جمی گرد جسم پر
کِھلنے لگا سینہء مہک پھول دل کے بیچ
اُگنے لگا کریہ سیہ درد جسم پر
تن کے اُجاڑ خیمے پہ سُلگی دبیز دھوپ
مہکے خزاں کے پھول مرے زرد جسم پر

انوار احمد

بجھتے نہیں خورشید کبھی موجِ ہوا سے
اے درد نہ رکھ کوئی سروکار دوا سے
جب قرب تھا حاصل ہمیں اُس آفتِ جاں کا
تب ہم ہی گریزاں تھے رہ و رسمِ وفا سے
کیا کم نگہی تیری ہمیں سیر کرے گی
ہم لوگ کہ رہتے ہیں سمندر میں بھی پیاسے
یوں خار صفت راہ کے سینے میں اُتر جا
منزل بھی عیاں ہو تیرے نقشِ کفِ پا سے
اب تیری وفاؤں کے طلبگار ہیں ہم بھی
ہاں دیکھ تیرے عشق میں کیا ہو گئے کیا سے
غمخوارئِ دل کی بھی کسے تاب ہے انوآر
زندانئِ وحشت کو بھلا کیسے دلاسے

حیدر قریشی

جتنے سیاہ کار تھے نردوش ہو گئے
ہم سر جھکا کے شرم سے خاموش ہو گئے
فریاد جتنا شورِ قیامت اُٹھا گئی
منصف ہمارے اور گراں گوش ہو گئے
جب باغیانہ ہمت و جرأت نہیں رہی
شہرِ ستم گراں میں ستم کوش ہو گئے
اہلِ خرد جو ہونے لگے اور ہوشیار
دیوانے بھی سیانے و باہوش ہو گئے
نیکی ہماری ایک بھی ان کو رہی نہ یاد
سب زود رنج، زود فراموش ہو گئے
اب کے شرابِ غم میں کچھ ایسا سرور تھا
چکھتے نہ تھے جو،وہ بھی بَلا نوش ہو گئے
دل کی تو کیا خود اپنی خبر بھی نہیں ملی
جس دن سے میرے دل میں وہ روپوش ہو گئے
ہجر و وصال ہو گئے یکجا کچھ اس طرح
جذبات پھر سے جاگ اُٹھے،پُر جوش ہو گئے
حیدؔر جب اس نے چاہ سے غم کر دیئے عطا
تو والہانہ ہم بھی غم آغوش ہو گئے

حیدر قریشی

پہنچائی گرچہ آپ نے ہر ممکنہ گزند
اک سرنگوں کو کر دیا مولا نے سر بلند
جو جتنا رب کے شکر سے لبریز ہو گیا
اللہ نے کردیا اسے کچھ اور ارجمند
اِتنے ہی ہم مزاج تھے،اِتنے ہی مختلف
جو مجھ کو ناپسند تھا،اُس کو رہا پسند
اُس کے خیال میں اُڑی مچھلی ہوا میں، تو
ہم نے لگائی ایڑ،سمندر میں تھا سمند
مسجد میں ہم گئے تو وہ جائیں گے چرچ میں
ہم قادیاؔں گئے تو وہ جائیں گے دیو بندؔ
اک بائبلؔ کہے تو کہے ویدؔ دوسرا
قرآنؔ ایک لائے تو لے آئے ایک ژندؔ
قسمت میں تھا یہی کہ پلٹ کر نہ جا سکیں
ہم بام تک پہنچ گئے،ٹوٹی نہیں کمند
پھر بھی نباہ ہو گیا،جیسے بھی ہو گیا
ہم مستِ حالِ فقر تو وہ سخت خود پسند
دونوں گناہگار ہی کچھ لاڈلے سے تھے
دونوں نے مل کے کھولا تھا بابِ قبول بند
اک دوسرے کو زخم بھی دیتے ہیں پیار سے
اک دوسرے کے واسطے دونوں ہیں دردمند

حیدر قریشی

پہلے آدھا ملک ہمارا توڑ دیا
باقی کو دہشت گردی سے جوڑ دیا

خود کش حملے، خونریزی و بربادی
کن رستوں پہ لا کے قوم کو چھوڑ دیا

غیروں سے بدلہ لینے کے چکر میں
پورے دیس کا حلیہ موڑ ، تروڑ دیا

جس نے تھوڑا سا بھی سمجھانا چاہا
اس کے گھر پہ جا کے بم اک پھوڑ دیا

مولا! کیا تو نے بھی بے بس لوگوں کو
بے رحموں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا

کس نے عذاب میں ڈالا ساری دنیا کو
کس نے کس سے مل کے روس کو توڑ دیا

کس کے ''جہاد'' نے امریکہ کو طاقت دی
اور دنیا کو یہ ''تاریخی'' موڑ دیا

بولو کتنے زخم لگانا باقی ہیں
جسدِ وطن کو اتنا تو بھنبھوڑ دیا

حیدؔر بے حس میں احساس کہاں، پھر بھی
کچھ احساس دلانے کو جھنجھوڑ دیا

حیدر قریشی

کتنے تفکرات لیے آرہی ہے عید
مہنگائی جیسے لُوٹ گئی قوتِ خرید

یا خودکشی کی خبریں ہیں یا خودکشوں کا کھیل
صاحب! کہاں کی رونقیں اور کیسا شوقِ دید

اک دوسرے کا قتل ہے شوقِ جہاد میں
اِس کے بھی سب شہید ہیں،اُس کے بھی سب شہید

افسوس ہم میں اک بھی حسینی نہیں رہا
اور دندنا رہا ہے یہاں لشکرِ یزید

خوش فہمیوں سے اب بھی نہ نکلیں تو کیا کہیں
جن کو بشارتوں کا نتیجہ ملا وعید

اپنے کیے دھرے کی سزا میں ہیں مبتلا
اب بھی اگر نہ سمجھے تو بھگتیں گے پھر مزید

وہ پاک باز ہم پہ مسلط کیے گئے
حیدؔر زمینِ پاک کی مٹی ہوئی پلید

جوگندر پال (دہلی)

بھوک پریت

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

اپنی داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے مجھے تھوڑا سا رو لینے دو۔

تھوڑا سا کیوں، برادر؟ خوب خوش ہو کے رو لو۔

نہیں برادر، خوب خوش ہو کے روتا چلا گیا تو تمہیں اپنی داستان بھول جائیگی۔

ہاں، داستان بھول گئی تو میرے پاس سنانے کو کیا رہ جائے گا؟

لیکن تمہاری داستان تو ایک طربیہ مقام پر آ پہنچی ہے، پھر میری آنکھوں میں آنسوں کیوں بھر رہے ہیں؟

نہیں، برادر، خوشی کے موقع پر جو تھوڑا سا رو لیتا ہے اُس کا دکھ میں بھی ہنسنا بنا رہتا ہے۔

نہیں، اتنی عاقبت اندیشی سے کام مت لو، وگرنہ عاقبت کو خواہ مخواہ بگاڑ لوگے۔

وہ تو بگڑ ہی چکی ہے برادر۔

پوری داستان سناؤ برادر۔ داستان کا اختتام تو تم پہلے بھی بتا چکے ہو۔

ہاں، جب ساری داستان پیش آ چکے تو اُسے سنانا ہی باقی رہ جاتا ہے۔ تو پھر یہ ہوا برادر، کہ شہزادی نے میرے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں۔ خدّام نے حکومت کا تخت اپنی جگہ سے اُٹھا کر وہیں ہمارے پیچھے لا رکھا اور اُس تخت پر نیم دراز ہو کر ہم محبت کرنے لگے۔۔۔۔

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

مجھے رونا آ رہا ہے کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ بھی پیش کیوں نہیں آیا۔

روتے ہو برادر، نہ داستان کو آگے بڑھنے دیتے ہو۔

تمہاری داستان تو وہاں آن ہی پہنچی ہے جہاں اسے پہنچنا تھا، لڑتے کیوں ہو؟ یہ لو، بھوکے ہو، تو کچھ کھاؤ۔

بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔

ہاں، یہ لو، یہ پانی بھی پیو۔

بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔ اب اپنی داستان آگے بڑھاتا ہوں۔

وہ تو یہاں آن ہی پہنچی ہے۔

کہاں؟

اس صحرا میں، جہاں ہم بیٹھے ہیں۔

ہاں برادر، ٹھہرو، مجھے بھی ذرا رو لینے دو۔

تم یہاں اپنی شہزادی کی گود میں سر رکھ لو اور میں یہاں تمہاری ہی گود میں سر دھر کر بساط بھر رو لیتا ہوں۔

ٹھہرو برادر، پہلے مجھے آرام سے اپنا سر کہیں ٹکا لینے دو، پھر میری گود میں اپنی جگہ بنا لو۔۔ لیکن یہ کیا برادد؟ تمہارے تو گود نہیں؟

ہاں!۔۔۔ ارے ہاں!۔۔۔ میری گود، برادر۔۔۔؟

اپنی ساری داستان یاد کرو۔۔۔ یاد کرو گود کہاں رہ گئی؟

اور کہاں رہے گی؟ وہیں حکومت کے تخت پر، شہزادی کے سر کے نیچے۔

اور تم اُسے بڑے آرام سے وہیں بھول آئے؟

ہاں، بھول تو آیا برادر۔ شہزادی کے بال اتنے گھنے تھے کہ اٹھتے ہوئے دکھائی نہ دی۔

یہ تو بہت برا ہوا برادر۔

ہاں، بُرا تو ہوا برادر۔

اب ایک ہی چارہ ہے۔ شہزادی کو ڈھونڈو، ورنہ گود ہی نہ رہی تو جی کر کیا کرو گے۔

بس جی لوں گا برادر۔

پر جیو گے بھی کیسے؟

ہاں، جیوں گا کیسے؟

جینا ہے تو پہلے گود کو ڈھونڈو۔

کہاں ڈھونڈوں، برادر؟

حکومت کے تخت پر!

حکومت کے طلسمی تخت کی طرف جو بھی بڑھتا ہے برادر، تخت اُسے واپس اچھال دیتا ہے۔

تو پھر اُن خدّام کو ڈھونڈو، کہ تخت تمہاری پُشت پر ڈال جائیں۔

خدّام تو شہزادی کے محل میں ہیں۔

اور شہزادی کا محل؟

میرے خیال میں، برادر؟

اور تمہارا خیال، برادر؟

میرے پاس ہی ہے، پر پتہ نہیں، کہاں؟

تمہارے پاس ہی برادر تو تمہارے پاس ہی ہوگا۔
پتہ ہی نہیں، کہاں ہے برادر، تو کیا پتہ، کہاں ہوگا؟
ٹھہرو، برادر۔
ٹھہر گیا برادر۔
اگر تمہارا خیال بھی تم سے کھو گیا تو پھر کیا فکر، کہ تم نے کیا کھویا ہے؟
ہاں، برادر، تمہاری بات لگتی تو ٹھیک ہے۔
تو پھر مزے سے اپنی داستان آگے بڑھاؤ۔
آگے کیسے بڑھاؤں برادر۔ اُسے تو جہاں پہنچنا تھا، پہنچ لی۔
ہاں، اِس صحرا میں۔
ہاں، برادر، اب ایک یہی ممکن ہے کہ پیچھے جا کر پھر یہاں تک آ جاؤں۔
ہاں، یہاں سے آگے کی کیا خبر؟
ہاں، جو کچھ ابھی پیش ہی نہیں آیا اُس کی کسے خبر؟
ٹھہرو، برادر۔
ٹھہر گیا برادر۔
مجھے خبر ہے، آگے جا کر ہمارے ساتھ کیا پیش آئیگا۔
کیا پیش آئے گا؟
ہم اِس صحرا سے نکلنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔
تو پھر آؤ برادر، آگے ہی چلیں۔
نہیں برادر، تم پیچھے جاؤ، کہ تم پیچھے سے ہی آئے۔
اور تم، برادر؟
میں کہیں سے بھی نہیں آیا برادر، اس لیے بلا تامل اپنے آگے کہیں بھی جا پہنچونگا۔
آگے تو صرف اجنبی ہوں گے برادر، کیا تمہیں اجنبیوں سے خوف محسوس نہ ہوگا؟
نہیں برادر، میں کسی سے بھی مانوس نہیں ہوں، اس لیے مجھے کوئی بھی اجنبی معلوم نہیں ہوتا۔
تو پھر چلو برادر، ایک دوسرے کی طرف پیٹھ موڑ کر اپنے اپنے سفر پر تیز گام روانہ ہو جائیں۔
ہاں، چلو۔
ٹھہرو برادر۔
ٹھہر گیا برادر۔
ہم آنکھ جھپکنے میں ہی لوٹ آئے ہیں۔

خیالوں میں ہم روانگی سے بھی پہلے پہنچ کر لوٹ آتے ہیں۔
تم کہاں سے ہو کر آرہے ہو؟
شہزادی کے محل سے۔
تعجب ہے!
اِس میں تعجب کی کیا بات ہے برادر، میرا سر غلطی سے اِدھر گھوم گیا اور تمہارا اُدھر۔
لیکن میں بھی شہزادی کے محل سے ہی ہو کر آرہا ہوں۔
تعجب ہے!
نہیں برادر، اِس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ آگے پیچھے دونوں راستے شہزادی کے محل کو ہی جاتے ہیں۔
ہاں، جاتے تو ہوں گے برادر، ورنہ تم وہاں کیسے جا پہنچتے؟
ہاں، سبھی راستے شہزادی کے محل کو ہی جاتے ہیں۔
ہاں، وہ بھی جن پر ابھی ہمارا جانا نہیں ہوا۔
ہاں برادر، کسی بھی راستے پر نکل پڑو، عین وہیں جا پہنچو گے۔
ہاں برادر، کسی بھی راستے سے لوٹ آؤ۔
ہاں، لیکن لوٹ ضرور آؤ۔
ہاں، جو خیالوں میں بچھڑ جاتے ہیں وہ کبھی نہیں ملتے۔
نہیں برادر، ابھی تو لوٹے ہیں، ابھی بچھڑنے کا ذکر مت کرو۔
ہاں، بچھڑنے کا ذکر چھیڑیں گے تو ملیں گے کیسے؟
ہاں، برادر، ملن کا ذکر کرو۔۔۔ کیا تم میری شہزادی سے مل آئے ہو؟
مل تو آیا ہوں برادر۔
ٹھہرو برادر۔
ٹھہر گیا برادر۔
پہلے مجھے بتاؤ۔
نہیں، پہلے میری سنو برادر۔۔۔ تمہاری گود وہیں شہزادی کے بالوں میں نیچے دھنسی پڑی تھی۔ میں نے چپکے سے
اُسے اٹھا لیا پر آتے آتے اپنی گود وہیں بھول گیا۔
ہت تیری!۔۔۔ تو پھر میں تمہاری ہی گود کو اپنی سمجھ کے اٹھا لایا ہوں۔
میری ہی گود میں پڑے ہو برادر، اِسی لیے مجھے اتنے اچھے لگ رہے ہو۔
اور تم مجھے برادر۔
اور ایک دوسرے کی گود میں پڑے پڑے، ہم یہاں جنت میں آ پہنچے ہیں۔

ہاں، برادر، نخلستان خود آپ ہی کہیں سے یہاں آ پہنچا ہے۔

اور خدّام نے ہمارے پیچھے حکومت کا تخت ڈال دیا ہے۔

نہیں برادر، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھو، وگرنہ یہ طلسمی تخت ہمیں واپس اچھال دے گا۔

ہاں، ہم اپنے خیال سے باہر اچھل آئے تو کسی کام کے نہیں رہیں گے۔

اچھل بھی آئے برادر، تو کیا مضائقہ ہے؟

ہاں، خیال سے ہی اچھل کر باہر آ گئے تو نفع کیا اور نقصان کیا؟

نفع نقصان کو چھوڑو برادر، یہ لو، یہ کھجور کھاؤ۔

بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔

ہاں، لو، یہ پانی پیو۔

بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔

ہاں۔۔۔اب سو جاؤ۔

ہاں برادر، بڑی گہری نیند آ رہی ہے۔

ٹھہرو، برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

اگر ہم سو گئے تو ہمیں جگائے گا کون؟

پر ہمیں جاگ کر کرنا ہی کیا ہے؟

تو آؤ، سو جائیں۔

ہاں، برادر، آؤ سو جائیں۔

کیا تم سو گئے ہو برادر؟

نہیں برادر، شہزادی کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہوں۔

مگر مجھے تو لگ رہا ہے کہ سو رہے ہو۔

ہاں برادر، شہزادی کے بال اتنے گہرے ہیں کہ نیند میں اترنے کا احساس ہوتا ہے۔

ہاں برادر، اور چہرہ اتنا شفاف، کہ نیند میں ڈوب کر بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سطح پر ہی ہیں۔

ہاں، ہم خواب میں بھی اُسے دیکھتے رہتے ہیں۔

ہاں، اور وہ ہمیں۔

ہاں، ہم سو جاتے ہیں تو ہماری قسمت جاگ پڑتی ہے۔

ہاں، ہماری خوابیدگی میں چاند سے ہُن برسنے لگتا ہے۔

تو آؤ برادر، چپکے سے سو جائیں۔

ہاں آؤ۔۔۔نہیں اُدھر نہیں برادر، اِدھر!۔۔۔

ہاں، اُدھر تو نیند ابھی جاگ رہی ہے۔

ہاں، جاگ رہی ہے تو چوروں کو اپنے اندر کیونکر گھسنے دے گی۔

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

بھوک نے پھر میرے کلیجے میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا ہے۔

تو لو برادر، کھجور کھاؤ۔

بڑے مزے کی کھجور ہے۔

یہ لو، یہ پانی بھی پی لو۔

بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔

ہاں، اب سو جاؤ۔

ہاں، اب تو آنکھوں کے کواڑ اپنے آپ بند ہو رہے ہیں۔

ہاں، برادر، چپکے سے نیند کے باطن میں داخل ہو جاؤ۔

لیکن کواڑ بند ہو گئے برادر، تو باہر کیسے نکلو گے؟

لیکن برادر، اندر ہی داخل نہ ہوئے تو باہر کیسے نکلو گے؟

ہاں، برادر، شب بخیر!۔۔۔چلتا ہوں۔

کہاں برادر؟

نیند کے باطن میں اور کہاں؟

ہاں، جاؤ۔

ہاں، چلتا ہوں۔

پھر آ گئے برادر؟ گئے بھی نہیں کہ پلٹ آئے۔

خدا کا شکر ہے کہ پلٹ آیا ہوں، نہیں تو پل ہی میں ہزاروں کوس کی مسافت طے کر کے کون پلٹتا ہے؟

ہاں، خدا کا لاکھ شکر ہے کہ لوٹ آئے ہو، مگر برادر، گئے کہاں تھے؟

نا معلوم کہاں، برادر۔بس شہزادی کی رفاقت میں حکومت کے تخت پر ہوا میں پرواز کرتا رہا اور پرواز کر رہا تھا کہ اچانک تمہاری آوازیں سنائی دیں اور تمہیں کوس کوس کر اس طرح تخت سے نیچے قدم رکھا جیسے ابھی زمین پر ہی تھا۔

لیکن تم تھے تو ہوا میں ہی۔

ہاں، اور کہاں؟

تو اچھا ہی ہوا برادر، کہ زمین پر لوٹ آئے۔خدا نے ہمیں پر عطا نہیں کیے تو اُس کی رضا یہی ہے کہ ہم دھرتی پر پڑے

رہیں۔

پر دھرتی پر نیند نہیں آتی برادر۔

ہاں، یا آتی ہے تو یہی خوف لاحق رہتا ہے کہ اب آنکھیں نہیں کھولیں گے۔

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

بھوک مجھے پھر تنگ کر رہی ہے۔

تو کیا ہوا برادر، لو یہ کھجور کھالو۔

بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔

لو، پانی بھی پی لو۔

بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔

پیٹ بھر گیا ہے تو شہزادی کی داستان شروع کردو برادر۔

شہزادی کی داستان؟

ہاں برادر۔

اگر اجازت دو برادر تو حرف بحرف سچّائی بیان کردوں؟

ہاں، برادر، خدا کا فرمان ہے کہ ہمیشہ سچ بولو۔

تو سچی بات یہ ہے کہ اپنی خوشی کی خاطر میں نے ہمیشہ جھوٹ بولا ہے۔

اِسی لیے خدا نے تمہیں اِس بیکراں صحرا میں ڈھکیل دیا ہے۔

ہاں برادر، اور تمہیں بھی۔

ہاں، مجھے بھی برادر۔۔۔بھوک سے دیوانے ہو رہے ہو، لو اور کھجور کھالو۔

بہت ہولیا برادر۔ ریت کی اِس مٹّھی کو پرے ہٹاؤ اور مجھے سو جانے دو۔

ہاں برادر، آنکھ نہ بھی کھلی تو کونسی کھجور آجائے گی۔

جوگندر پال کا افسانچہ **ارے ہاں**

اس نے اپنی تلاش میں گھر بار تیاگ دیا اور چار کھونٹ گھومتا پھرا، اور تلاش کرتے کرتے بھول گیا کہ وہ کیا تلاش کئے جا رہا ہے۔ مگر ایک دن اچانک اپنے آپ کو پھر اپنے گھر کی چوکھٹ پر پا کر مسرت سے اس کی گھگی بندھ گئی، کہ وہ گھر ہی تو بھولے ہوئے تھا، اور یہیں لوٹ کر عین مین وہیں پہنچ گیا ہے جس مقام کو ڈھونڈنے یہیں سے نکل کھڑا ہوا تھا۔

جوگندر پال (دہلی)

ڈیرہ بابا نانک

کوئی واردات بدن کا گھیرا توڑ کر روح کو جا لیتی ہے تو عمر بھر جوں کی توں لیے رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس پوری نصف صدی میں یہ خواب بار بار میری نیند میں رینگ آیا:

سب سے آگے گائیں ہی گائیں چلی آ رہی ہیں اور اُن کے پیچھے گندے گول مٹول اجول بچے، اور بچوں کے پیچھے برف براق پرندہ ڈاڑھیوں والے بوڑھے اور......سب سے آخر میں.......

مگر میں وہ پوری واردات ہی کیوں نہ بیان کردو؟

تقسیم ملک کے موقع پر شہر اور گاؤں میں فسادات بپا تھے، کچھ اس طرح، کہ جو جان بچانے کے لیے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے اُنہی کو جوانمرد سمجھا جاتا۔

جمگھٹ کے جمگھٹ وہاں سے یہاں آ رہے تھے اور یہاں سے وہاں جا رہے تھے۔

آخر ہم بھی سیالکوٹ سے ڈیرہ بابا نانک آن پہنچے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھے تھے تو ہمیں یکسر علم نہ تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے......سرحد پار؟......کونسی سرحد؟ مرے مکوں کیا معلوم، انہیں کون سی سرحد پار کر کے کہاں پہنچنا ہے؟ مگر جہاں کہیں ہماری گاڑی رک جاتی ہم سبھی مردے اِس خوف سے سانس بھرنے لگتے کہ ہم دوسرے جہاں کے کنارے آ لگے ہیں، ابھی وہ آناً فاناً نعرے بلند کرتے ہوئے ہمارے ڈبے میں آ گھسیں گے اور روحوں سمیت ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

مگر ہم سرحد پار آن پہنچے......یہاں، ڈیرہ بابا نانک، جہاں ہم نے کیا دیکھا کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ہم چہار سمت کٹے پڑے ہیں......یہاں ہاتھ، وہاں پیر، وہاں جگر کا لوتھڑا......وہ کسی عورت کا گچھا مچھا پستان اور یہ سکڑا ہوا عضو تناسل......اتنا سکڑا ہوا، کہ کسے پتہ، ہندو کا ہے یا مسلمان کا؟

مگر ہمارے ہی ساتھ ایک نرا پرا پاگل بھی آ گیا تھا۔ ایک بے نام پاگل، جس کے بارے میں کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔ نہ جانے، پاکستان میں کہاں سے بھاگ کر ہمارے رفیوجی کیمپ میں چلا آیا تھا۔ پگلا کبھی تو چلانے لگتا......نہیں، مجھے مت مارو۔ میں ہندو ہوں......یہ دیکھو!......وہ اپنی قمیص اٹھا کر پاجامے کا ناڑا کھولنے لگتا......یہ دیکھو! اور کبھی......نہیں، مجھے مت مارو۔ میں مسلمان ہوں......یہ دیکھو!......پگلے کی نظر اچانک

زمین پر ایک کٹے ہوئے عضوِتناسل پر جا پڑی۔ وہ گھبرا کر اپنا ہاتھ پاجامے کی طرف لے گیا اور شاید وہاں کچھ نہ پا کر دوڑ کر بے اختیار عضوِتناسل کو اٹھالیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے ٹٹولنے لگا کہ کسی اور کا ہے یا اُسی کا۔

رونے کے ہزار اسباب ہوں تو کوئی لاشعوری طور پر یہی چاہتا ہے کہ ذرا ہنس لے۔ ہم کئی لوگ اُس کے اردگرد جمع ہو گئے۔

نہیں، میرا ہی ہے!...... پگلا اپنے آپ کو یقین دلا رہا تھا........

''تمہارا کیسے، باؤلے؟ اِدھر تو صرف مسلمانوں کو کاٹا گیا۔''

''اچھا؟'' پاگل نے ایک دفعہ پھر عضوِتناسل کو ٹٹولا۔ ''اچھا!۔'' اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ پھر وہ بھی کوئی مسلمان ہی ہوگا۔ اس نے نا معلوم کیا سوچ کر اپنا گلہ دبوچ لیا اور اسے اتنے زور سے دبایا کہ اس کی آنکھیں باہر ابھر آئیں۔ مُسلے !۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مسلے! میری آنکھوں کے سامنے تم نے میرے بوڑھے ماں باپ کو قتل کیا اور میری بہن سے زنا کیا اور۔ اور................ آگے بڑھ کر اسے کوئی اسی سے چھڑا نہ لیتا تو وہ اپنا دم لے کر ہی دم لیتا۔

اتنے میں ہجوم میں افواہ گرم ہونے لگی کہ تھوڑی ہی دیر میں مسلمان پناہ گزینوں کا ایک پیدل قافلہ سرحد پار کرنے کے لئے یہاں سے گزر رہا ہے۔ بس پھر کیا تھا سبھی لوٹ مار کے لئے برچھے بھالے سنبھالتے خیموں کی طرف دوڑ کھڑے ہوئے تاکہ سب سے پہلے موقع اور مطلب کی جگہ پر قبضہ جما لیں۔

مجھے اپنی پشت سے ایک تلک دھاری آواز سنائی دی۔ ''ہماری کوم پرگتی کیا کھاک دھول کرے گی۔ یہ شبھ اَوسَر مُسلوں ملیچھوں کھتم کرنے کا ہے یا دھن دولت لوٹنے کا؟..........''

''اوئے پنڈتا، یہ نیک کام کرنے کو ہم جو ہیں۔ آؤ دوستو!''

مگر اسی اثناء میں رفیوجی کیمپ کے دفتر سے لاؤڈ اسپیکر پر آواز سنائی دی: بھائیو، دھیان سے سنو! اِدھر سے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ اُدھر جا رہا ہے، اور اُدھر سے ہندوؤں اور سکھوں کا ایک بہت بڑا قافلہ اِدھر آ رہا ہے........ اگر ہم نے اِدھر کوئی گڑبڑ کی تو اُدھر وہ لوگ ہمارے سیکڑوں ہزاروں بھائیوں کا خون بہانے سے باز نہیں آئیں گے .... ساودھان، بھائیو! بھول کر حملہ مت کرو صرف دور سے دیکھو اور جانے دو........ ساودھان!

لوگ مایوس ہو کر سرحد سے جڑی ہوئی شاہراہ کی طرف بکھرنے لگے جہاں سے مسلمان پناہ گزینوں کو گزرنا تھا۔

بھائیو، دھیان سے سنو! ادھر سے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ........

میں نے آواز سے کان ہٹا کر اس پاگل کی طرف دیکھا جسے ابھی تک سمجھ میں نہ آ پا رہا تھا کہ اس کا عضوِتناسل بالائی رانوں کے درمیان لٹکے لٹکے ایک دم کہاں غائب ہو گیا ہل جاتا تو وہ فوراً اپنی تسلی کر لیتا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔

میں وہیں ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ کر اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔

پاگل کا ذہن خالی ہو کر بھائیں بھائیں نہیں کر رہا ہوتا۔ ناگہاں سوچوں کی یلغار ہی تو بے چارے کو پاگل بنائے ہوتی ہے۔ وہ بھی یکبارگی اپنی کسی پیش قدم سوچ کی ترغیب نہ لا پایا اور اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے انسانی اعضاء کو اٹھا اٹھا کر کوئی پوری شکل تیار کرنے میں جٹ گیا۔ تادیر وہ اپنی اس کوشش میں جٹا رہا اور میں اسے منہمک دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ وہ بڑے جتن سے کوئی شکل بناتا اور اس پر آنکھیں جما کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے اعضا کی ترتیب کو بگاڑ دیتا اور ازسرِنو کوئی اور شکل بنانا شروع کر دیتا۔ اس نے کئی شکلیں بنائیں اور ہر بار مایوس ہو کر اعضا کو منتشر کر دیا۔ مجھے لگا کہ اس کے ذہن میں کوئی شکل پھنسی ہوئی ہے اور اسے بڑی اذیت میں مبتلا کئے ہوئے ہے اور وہ اسے ذہن سے باہر نکال کر اپنی نجات کی تدبیر کر رہا ہے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اچھل پڑا اور خوف سے چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی بنائی ہوئی نئی شکل کو گھورنے لگا۔ مڑے تڑے انسانی اعضاء سے ترتیب دی ہوئی وہ ایک نہایت بدوضع عفریت صفت حیوان کی شکل تھی جو جھپٹ کر پاگل کے جسم میں دانت گاڑ لینا چاہ رہی تھی۔

خوفزدہ پاگل نے چیخ ماری اور جو بھاگنا شروع کیا تو ایک سیدھ میں شاہراہ کے ایک دور افتادہ موڑ کی طرف بھاگتا ہی چلا گیا جہاں سرحد کی طرف بڑھتے ہوئے مسلم مہاجروں کے قافلے کی گرد اڑ رہی تھی۔

میں اس خیال سے بہت خوش تھا کہ آخرکار پاگل عفریت کو ذہن سے خارج کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ ابھی تک سرپٹ دوڑے جا رہا تھا۔ جب اپنے آگے درختوں کی اوٹ میں چھپ گیا تو میں منہ موڑ کر شاہراہ کے ایک قریبی کنارے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

سڑک کی دو جانب تھوڑے فاصلے پر ایک فوجی تعینات تھا، تاکہ مسلم مہاجر بہ حفاظت سرحد پار کر جائیں۔ ہر فوجی کے پیچھے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ذرا اور آگے آ کر خوش قسمتی سے مجھے ایک خالی کنارہ مل گیا۔ میں وہاں رک کر سگریٹ سلگانے لگا تو فوجی گارڈ نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہونے کی ہداہت کی۔

میں نے فوراً پیچھے ہٹ کر ایک درخت کے تنے پر پیٹھ لگا لی اور قافلے کا انتظار کرتے ہوئے اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگا۔ فسادیوں نے ہمارے گھر پر بھی ہلہ بول دیا تھا۔ وہ تلواریں کھینچے میری طرف لپکے تھے کہ بیچ میں ماں آ گئی اور تلوار کے وار سے تڑپ تڑپ وہیں دم توڑ دیا۔ فسادیوں نے مڑ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ کون مرا ہے، میں یا میری ماں۔

میں گھر کے آنگن میں ہی ماں کی ارتھی جلانے کے لئے چولہے کی لکڑیاں جما رہا تھا کہ دو سکھ فوجی دھپ دھپ گھر میں گھس آئے۔ نکلو! چلو!...... لیکن میری ماں ؟......... جو مر گیا، اسے چھوڑو اور خود کو بچاؤ!..........

سڑک پر پہرہ دیتے ہوئے فوجی نے میری طرف پھر شک بھری نظروں سے دیکھا اور اب کے میں خود آپ ہی

درخت سے ٹیک ہٹا کر دو قدم پیچھے آ کھڑا ہوا، اور اسی دوران قافلے کا اگلا حصہ ہمارے قریب آ پہنچا۔

آگے آگے گوری اور بھوری صحت مند گائیں تھیں کہ وہ تھے کہ ہندو گائیوں پر کبھی حملہ نہیں کریں گے........گائیوں کے پیچھے گول مٹول گندے گندے بچے تھے جو نڈھال ہونے کے باوجود بڑے اجول لگ رہے تھے..........اُنہیں معلوم تھا، ہندو بچوں کو بھگوان کا روپ مانتے ہیں.......سہمے ہوئے بھگوان اپنے تھکے ماندے پھولے ہوئے ننگے پیروں سے بے اذیت چل رہے تھے.........بچوں کے پیچھے نحیف بوڑھے، جن کی کانپتی ہوئی سفید ڈاڑھیوں میں پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ کا احساس ہوتا تھا.........اور ہر بوڑھے کو کوئی جوان سہارا دے رہا تھا کہ بوڑھوں پر ترس کھا کر جوانوں پر بھی کوئی ہاتھ نہیں اٹھائے گا........اور ان کے پیچھے ہائے ہو کرتی ہوئی بوڑھیاں اور چلتے پھرتے بھی بوڑھیوں کی خدمت کرتی ہوئی ان کی جوان بہو بیٹیاں.........ان خدمت گزار بہوؤں اور ان کی کوری کنواری نندوں کو کیسے کوئی میلی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے؟.........اور ان کے پیچھے ادھیڑ عمر ملے جلے مرد و زن، بلبلاتے شیر خواروں کو بازوؤں اور کندھوں پر لئے ہوئے۔ سبھوں کے گلے میں اللہ اکبر کا نعرہ اٹکا ہوا تھا جو سرحد پار کرتے ہی وہ پورا منہ کھول کر اتنے زور سے بلند کریں گے کہ واقعی کوئی معجزہ رونما ہو جانے کا گمان ہونے لگے گا.........اور........

اور........ارے!.........سب کے پیچھے کسی زار و نزار ماں کے پہلو میں اس کا بچہ اپنے کندھے پر دونوں بازوؤں میں نہایت ہوشمندی سے سمٹے ہوئے.......وہ!.........وہی ہمارا پاگل!............

دیکھئے بھائی،............میں نے بھونچکا ہو کر فوجی کو بتانا چاہا کہ وہ پگلا تو ہمارے ساتھ ادھر سے ہی آیا تھا۔

شی۔ہی۔! فوجی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارے سے مجھے اور پیچھے ہٹ جانے کی ہدایت کی۔

میری آنکھیں پگلے سے ہٹائے نہ ہٹ رہی تھیں ....مسلمان ہے؟.........نہیں، ہندو ہی تو ہے۔..........تو.........تو..........

دیکھئے بھائی............

شی۔ی!..........!

جوگندر پال (دہلی)

جاگیردار

وہ بارہ تیرہ سال کی بڑی معصوم شکل کی چھوکری تھی۔ دروازہ کھلتے ہی پہلے تو مجھے دیکھ کر اس نے اپنا ہاتھ جھٹ سے پیچھے کر لیا اور پھر جھجکتے ہوئے اسی ہاتھ کو آگے بڑھا کر بولی۔ ''یہ چٹھی!..........''

میں اس کے ہاتھ سے کاغذ کا پرزہ لے کر پڑھنے لگا۔

جناب عالی، میں آپ کے محلے میں ہی رہتا ہوں۔ کبھی بہت اچھے دن دیکھے تھے۔ آج بہت نازک صورت حال سے دوچار ہوں۔ اپنی بیٹی کو بھیج رہا ہوں، ممکن ہو تو کم سے کم پانچ روپے بھیج دیجئے تا کہ گھر میں ہانڈی پک سکے۔ آپ کے پیسے جلد ہی لوٹا دوں گا۔ شریف آدمی ہوں مگر.....

میں نے آخری دو سطریں پڑھے بغیر چٹھی لکھنے والے کا نام دیکھنے کے لیے نظر نیچے سرکا لی ....جاگیردار........اور جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

مجھے یہاں رہائش اختیار کیے پورا ایک ماہ بھی نہ ہوا تھا اور اتنے بڑے محلے کے سبھی لوگوں سے تو کیا، اپنے فوری پڑوسیوں سے بھی ابھی تک ناواقف تھا.........ہوگا کوئی غریب بے چارہ.........میں دروازہ بند کر کے واپس اندر آ گیا۔

اس واقعے کو کوئی ڈیڑھ دو ماہ ہو لیے۔ میں ایک دن سنیما کے میٹنی شو کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازے پر وہی لڑکی کھڑی تھی۔ مجھے خیال آ گیا کہ شاید پیسے لوٹانے آئی ہے۔

''یہ چھٹی!.........''

اس کے باپ نے اسی عبارت کے ساتھ پھر پانچ روپے مانگ بھیجے تھے۔ میں نے جلدی سے جیب سے دو روپے نکالے اور لڑکی سے کہا۔ ''یہی لے جاؤ۔''

لڑکی چلی گئی تو مجھے شرمندگی سی ہوئی..........کوئی ایسی مجبوری ہی ہو تو سفید پوش اس طرح ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ مجھے پانچ ہی بھیج دینا چاہیے تھے۔

اس کے بعد وہ لڑکی مجھے تین چار ماہ تک نظر نہ آئی اور پھر ایک دن دروازے پر ویسی ہی کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔

وہی لڑکی کھڑی تھی۔

''یہ چٹھی!..........''

جاگیردار نے عین اسی عبارت میں اب کے دس روپوں کا مطالبہ کیا تھا۔ میں نے مسکرا کر لڑکی کے ہاتھ میں اس دفعہ بھی دو کا نوٹ تھما دیا اور یونہی سوچنے لگا کہ بھلا آدمی اسی طرح مانگ کر وقت کاٹنے کا عادی معلوم ہوتا ہے..........چلو میں نے دو ہی تو دیئے ہیں۔ سر جھٹک کر میں اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

گزشتہ سات آٹھ ماہ کے بیشتر ایام میں نے کاروبار کے سلسلہ میں گھر کے باہر بتائے۔ اس دوران وہ لڑکی کبھی آئی ہو تو مجھے معلوم نہیں۔ آج صبح کے وقت میں دودھ والے کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی کی آواز سن کر میں برتن لے کر باہر آ گیا کہ دودھ ڈلوا لوں۔ دروازے پر دودھ والے کی بجائے ایک ادھیڑ عمر شریف پوش شخص کھڑا تھا۔

''میرا نام جاگیردار ہے۔''

''آیئے۔''

''نہیں، مختصر سی بات کرنا ہے۔یہیں کہے دیتا ہوں۔''

''کہیے۔''

اس بار لڑکی کو چٹھی دیکر نہیں بھیجا، آپ ہی حاضر ہو گیا ہوں............مجھے آپ سے یہ درخواست کرنا ہے کہ........

میں نے اسے روپیہ دو روپے دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

''نہیں، ٹھہریے، پہلے میری گزارش سن لیجئے..........میں اپنی چٹھیوں میں جو رقم لکھوں، مہربانی کر کے آپ وہی بھیجا کریں۔''میں اس کی طرف حیرت اور غصے سے دیکھنے لگا۔

''میری بیٹی اب پوری جوان ہو چکی ہے جناب، اب تو آپ کو پورے ہی پیسے چکانے ہوں گے!!''

بسے ہوئے لوگ : جوگندر پال

میرے ناول کے ہیرو اور ہیروئن دونوں مجھ سے ناراض تھے، کیونکہ جب ان کی شادی کے اسباب آپ ہی آپ عین فطری طور پر انجام پا رہے تھے تو میں نے ان کا بنا بنایا کھیل چوپٹ کر دیا اور اپنی ترجیحوں کو ناول پر لاد کر انہیں آخری صفحے تک ایک دوسرے سے جدا کرنے پر اڑا رہا۔

نہیں، میں ان دونوں کو بے حد عزیز رکھتا ہوں، مگر مشکل یہ ہے کہ اگر انہیں ایک دوسرے کے لیے جینے کا موقع فراہم کر دیتا ہے تو میری اپنی زندگی کے نشانے دھرے رہ جاتے۔ وہ بہر حال میرے کردار تھے اور جو اور جیسے تھے، میری ہی بدولت تھے اور انہیں یہی ایک چارہ تھا کہ میری زندگی کا اسباب کرتے رہیں۔

مگر وہ دونوں تو موقع کی تاک میں تھے۔ ایک دن نظریں بچا کر اچانک غائب ہو گئے۔ میں نے ناول کے مسودے کی ایک ایک سطر چھان ماری اور مقام پر انہیں اپنے ناموں کی اوٹ میں ڈھونڈتا رہا، مگر وہ وہاں ہوتے تو ملتے۔

مجھے بڑا پچھتاوا محسوس ہونے لگا۔

اگر وہ مجھے کہیں مل جاتے تو میں فوراً ان کا نکاح پڑھوا دیتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ میں منہ سر لپیٹ کر پڑ گیا۔

آپ حیران ہوں گے کہ کئی سال بعد ایک دن وہ دونوں بہ اتفاق مجھے اپنے ہی شہر میں مل گئے۔

نہیں، وہ مجھے بڑے تپاک سے ملے اور اپنے گھر لے گئے۔

میرے ناول کے پنوں سے نکلتے ہی انھوں نے اپنی شادی کی تدبیر کر لی تھی اور اتنے سال بعد اب تین پھول جیسے بچوں کے ماں باپ تھے اور ان کا گھر بار خوب آباد تھا۔

نہیں، انہیں اپنے سنسار میں اس قدر پھلتے پھولتے پا کر مجھے حوصلہ ہی نہ ہوا کہ انہیں ناول میں لوٹ آنے کو کہتا۔

رشید امجد (اسلام آباد)

سفر گشت

وہ مرشد کے ہمراہ ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی جڑیں تلاش کرنے نکلا تھا، روانہ ہوتے ہوئے اس نے کہا تھا......''حال کی صورت تو یہ ہے کہ نہ میری رائے کوئی اہمیت رکھتی ہے نہ میری محنت کے کوئی معنی ہیں، چلو دیکھیں شاید ماضی میں میری کوئی پہچان ہو۔''

مرشد بولا......''حال ٹھیک نہ ہو تو ماضی کی پہچان کوئی معنی نہیں رکھتی۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا، دونوں ساحل کے ساتھ ساتھ بادبانی کشتی میں اپنی جڑوں کی تلاش میں کہاں جا رہے تھے، اسے اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ کشتی تیز ہوا کے رقص میں کسی ایسی منزل کی طرف رواں تھی، جس کے بارے میں گمان تھا کہ اس کی جڑیں وہاں ہیں۔

برسوں پہلے اسی طرح کی کشتی میں وہ اِدھر آیا تھا، واپس جانے کے ارادے سے، لیکن وہ واپس نہیں گیا، یہیں رہ گیا اور برسوں تک یہی سمجھتا رہا کہ اب اس کی جڑیں یہیں ہیں۔

ہوا کے رقص میں ذرا ٹھہراؤ آیا تو کشتی کی رفتار سست پڑ گئی۔

مرشد بولا......''ہر قوم جس کے پاس اپنے وقت کے نئے نظریات ہوتے ہیں، اپنے حال کی تعمیر کرتی ہے اور جب یہ نظریات پرانے ہو جاتے ہیں اور وہ قوم تازہ ہواؤں کے دریچے بند کر دیتی ہے تو تاریخ کے قبرستان میں دفن ہو جاتی ہے۔''

''تاریخ کا قبرستان''اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں تاریخ کا بھی اپنا ایک قبرستان ہے،''مرشد نے کہا......''جہاں اَن گنت قومیں دفن ہیں اور ان کے ناموں کی تختیاں اب صرف تاریخی نام ہیں۔''

دونوں اس قبرستان میں گئے۔ قطار در قطار قبروں پر ناموں کی تختیاں آویزاں تھیں۔ مرشد بولا......

''یہ سب اپنے اپنے وقت میں اپنی پہچان رکھتی تھیں، لیکن انہوں نے اپنے قدم وقت کی رفتار کے ساتھ نہیں ملائے، سوان کی جگہ وہ آ گئے جو وقت کی صدا کو سن رہے تھے اور انہوں نے اس کا ساتھ دیا۔''

اسے یاد آیا، جب وہ اِدھر آیا تھا تو بے شک ایک بے سروسامانی کا عالم تھا، لیکن ان کے خیالات تازہ تھے، جینے کا جواز تھا اور بہت کچھ کرنے کا حوصلہ، انہوں نے بہت کچھ کیا بھی، لیکن ساڑھے چھ سو سال کی حکمرانی نے انہیں دیمک کی طرح اندر ہی اندر چاٹ لیا، پھر ایک طویل ریگ زار، وہاں سے نکلے تو اسی ریگ زار کی بدلی ہوئی صورت مقدر بنی، اب معلوم نہیں اس میں قصور کس کا تھا۔ ان کی تگ و دو کی سمت کا، یا نوے سال کی غلامی کا کہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہی رہے۔ وہی چند خاص آدمی خاص رہے اور وہ جو عام آدمیوں کی طرح تھا، عام آدمی ہی رہا۔ نسل در نسل عام آدمی ......جس کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے۔

تاریخ کے اس قبرستان کے ایک کونے میں کھڑے کھڑے اس نے مرشد کو دیکھا، جو تختیوں پر لکھے نام پڑھ رہا تھا۔

''وقت کیا شے ہے؟'' مرشد بڑبڑایا......''فنا کا ایک ریلا جو ہر شے کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔''

''صرف نام اور پہچان باقی رہ جاتی ہے۔'' وہ بولا......''لیکن میری تو پہچان بھی گم ہو گئی ہے اور نام......میرا نام میرے مشکوک ہونے کی علامت بن گیا ہے۔''

اسی شک کو دور کرنے وہ اپنی جڑوں کی تلاش میں نکلا تھا......اور جڑیں تو بہت دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، ساحل کے ساتھ آبادیوں میں وہ موجود تھا اور نہیں بھی تھا۔ کہیں وہ تھا لیکن قبول نہیں کیا جا رہا تھا اور کہیں قبول تھا لیکن وہ خود قبول ہونا نہیں چاہتا تھا۔

''یہ کیا اسرار ہے، میں کہاں ہوں اور کہاں نہیں ہوں۔'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

مرشد نے اس کی سوچ کو محسوس کر لیا......''تم نہ ماضی ہو نہ حال اور جن کا ماضی حال نہ ہو مستقبل بھی ان کا نہیں ہوتا۔''

وہ بہت دیر تک چپ رہا، پھر بولا......''میرے ساتھ جو ہوا سو ہوا لیکن میرے بچوں کا کیا بنے گا، ان کی پہچان کیا ہے؟

کشتی ایک جگہ رک گئی۔ سمندر کے متلاطم سینے سے ابھرتی ایک بہت بڑی صلیب انہیں اپنی طرف بلا رہی تھی، اس نے حیرت سے دیکھا اور بولا......''یہ صلیب اور یہ جگہ۔''

مرشد ہنسا......''اس کا آرکیٹکچر ان سے ہاتھ کر گیا۔''

''ان کو آخر تک معلوم نہیں ہوا؟'' اس کی حیرت اور بڑھ گئی۔

مرشد آہستہ سے بولا......''اب دیکھو نا، تیل ان کے پاس ہے لیکن اسے نکالنے کا طریقہ انہیں نہیں آتا اور نہ یہ اسے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔

''اور وہ ان سے ہر بار ہاتھ کر جاتے ہیں۔'' قدرے توقف کے بعد وہ بڑبڑایا۔

''یہ ہاتھ تو تمہارے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے مرشد کو دیکھا۔

''تمہارا شاہی محل بھی تو آٹھ کے ہندسے کی علامت ہے۔'' مرشد ہنسا۔

اسے محسوس نہ ہوا کہ اس ہنسی میں طنز ہے یا تاسّف۔ لیکن یہ تاسّف تو تاریخ کے ہر صفحہ پر موجود ہے۔

اسے سوچ میں گم دیکھ کر مرشد نے پوچھا......''کس سوچ میں گم ہو؟''

''ایک بات یاد آ گئی ہے۔''

مرشد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''جس لڑائی میں ہماری قسمت کا فیصلہ ہوا، اس کی روداد بھی عبرتناک ہے، ہمارے سپاہیوں کی تعداد اکسٹھ ہزار تھی اور ان کے پاس اکیس ہزار تھے، ان میں سے بھی چودہ ہزار کرائے کے تھے، وہ خود صرف سات ہزار تھے۔''

وہ چپ ہو گیا، بہت دیر چپ رہا، مرشد نے کچھ نہ پوچھا، وہ خود ہی بولا......''ترپال یہاں کی ایجاد ہے لیکن اُس رات بارش میں ہم بارود پر ترپال ڈالنا بھول گئے اور انہوں نے اپنا بارود ڈھک لیا، صبح بارود توپوں میں ڈالا تو......؟'' وہ پھر چپ ہو گیا۔

مرشد کچھ دیر اس کی دیکھتا رہا کہ شاید وہ کچھ کہے، لیکن جب وہ کچھ نہ بولا تو مرشد نے کہا......''بھول نہیں گئے، خیموں کی بزم آرائیوں میں اس کا خیال ہی نہیں رہا۔''

''ہزیمت......''زوال ایک دفعہ آغاز ہو جائے تو پھر ہر قدم ہزیمت کی طرف ہی اٹھتا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

دونوں کافی دیر خاموش رہے، پھر اس نے پوچھا......''یہ عروج و زوال کیا ہے؟''

''جب قومیں وقت کی آواز کو سنتی اور اس پر عمل کرتی ہیں تو یہ عروج ہے اور جب وہ وقت کی آواز کو سننے سے انکار کر دیتی ہے تو یہ زوال ہے۔'' مرشد نے کہا۔

''یہ انکار معذوری ہے یا کوتاہی؟'' اس نے پوچھا۔

''دونوں ہی'' مرشد نے جواب دیا......''دیکھو نا جیسے ہر قبر اپنا مردہ طلب کرتی ہے، تاریخ کے قبرستان کی ہر قبر بھی اپنی قوم طلب کرتی ہے۔

''تو عروج صرف ایک عرصہ ہے۔'' وہ بولا......''اوّل و آخر فنا ہی ہے۔''

اسے کچھ سکون سا ملا، ''یہ سبھوں کے ساتھ ہوتا ہے، پھر میں یہ رونا کیوں رو رہا ہوں۔''

''کیونکہ تم اپنے زوال کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر رہے۔''

''میں تو صرف اپنی جڑوں کو تلاش کر رہا ہوں کہ جان سکوں کہ میں ہوں کون اور وقت کے اس سیلِ رواں میں میرے لیے آگے کیا ہے؟''

جڑوں کی تلاش کا یہ سفر ساحلوں کی ریت چاٹتا، شہروں کی روشنیاں سمیٹتا، اب کھلے سمندر میں آنکلا تھا، چاروں طرف موجیں مارتا پانی، اوپر کھلا آسمان اور چھوٹی سی کشتی، جس میں وہ اور مرشد چپ چاپ بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کشتی نیم ڈولتی نیم چلتی بڑے سمندر سے نکل کر پانی کی ایک اور راہداری میں آگئی اور گزرتے گزرتے کالی بھوری مٹی ملی ریت کے ساتھ آلگی، رات نے ابھی اپنا بادبان کھولا ہی تھا، اس نے سر اٹھا کر دور...... بہت دور ٹمٹماتی سی روشنیوں کو دیکھا، معلوم نہیں روشنیاں تھیں بھی یا اس کا وہم تھا۔

''وہ دور ٹمٹماتے دیئے۔'' وہ بڑبڑایا۔

مرشد نے دیکھا، لیکن بتایا نہیں کہ اسے بھی یہ دیئے نظر آرہے ہیں یا نہیں۔

''یہ بھی میرا ماضی ہے۔'' وہ بولا...... ''سات سو سال ہم وہاں رہے لیکن یا عبرت!...... پھر ایک ہزار سال تک دریائے کبیر کی لہروں نے اذان کی آواز نہیں سنی۔''

''وقت کے ہر لمحہ پر عبرت کا نشان موجود ہے۔'' مرشد نے کہا...... ''لیکن صرف ان کے لیے جو اسے دیکھ سکتے ہیں۔''

''یہ میری تاریخ ہے'' اس نے جیسے خود سے کہا۔

''لیکن جغرافیہ کے بغیر تاریخ کے کوئی معنی نہیں۔'' مرشد بولا...... ''اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جغرافیہ کے باوجود تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔''

اس نے سر اٹھا کر مرشد کی طرف دیکھا، مرشد اس کی آنکھوں میں ٹمٹماتے سوال کو پڑھ لیا اور بولا......

''تاریخ گم ہوجائے تو جڑوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔''

''یہ تلاش بھی عجب شے ہے۔'' اس نے جواب دیا...... ''ہم ہمیشہ کچھ نہ کچھ تلاش کرتے رہتے ہیں، مجھے دیکھو، میں کبھی حقیقت الحقیقت کی تلاش میں تھا اور اب خود کو ڈھونڈ رہا ہوں۔''

مرشد ہنسا...... ''یہ تو بھول بھلیاں ہیں، اپنی تلاش، اس کی تلاش، سب ایک ہی سفر کے مختلف مرحلے ہیں۔''

کچھ دیر چپ رہا پھر بولا...... ''لیکن یہ اپنی جڑوں کی تلاش، اپنی تلاش نہیں بلکہ اپنے ڈولتے وجود کو سہارا دینے کی کوشش ہے۔''

''میرا وجود گملے میں نہیں اُگا، میری جڑیں زمین میں ہیں۔'' اس نے جھنجلاہٹ سے کہا...... ''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ جڑیں پھیلتے پھیلتے کہاں کہاں پہنچی ہیں، کیسے کیسے تناور درخت بنی ہیں۔''

''اور پھر یہ درخت کیسے کیسے اور کس کس خزاں کا شکار ہوئے ہیں۔'' مرشد کے لہجے میں طنز تھا۔

اس نے اس طنز کو محسوس نہیں کیا، اپنی روانی میں بولتا رہا...... ''مشرق سے مغرب تک میری نشانیاں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔''

مرشد خاموش رہا۔

سمندر کے دوسرے کنارے ٹمٹماتی روشنیاں موجود تھیں یا نہیں، لیکن اس نے انہیں دیکھا، دیکھتا رہا، پھر بولا...... ''یہ سات سو سال بھی عروج وزوال کی نہ بھولنے والی داستان ہیں، اس داستان میں بھی دو بڑے کردار ہیں، ایک کو یورپ والے لے گئے اور وہ ابوالعلم کہلایا، میں نے اسے نہیں اپنایا، جسے میں نے اپنایا اس نے مجھے کل اور جز و میں ڈال کر واہمات میں دھکیل دیا۔''

''تم نے صرف اپنے اندر جھانکا۔'' مرشد نے کہا...... ''اور باہر سے بے خبر ہوگئے۔''

''لیکن اب میں جاگ گیا ہوں۔''

''تمہارا جاگنا، ان درویشوں کا جاگنا ہے جو اپنے کتے کے ساتھ غار میں سو گئے تھے، جب جاگے تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے مرشد کی طرف دیکھا۔

''پرانے حلیہ کے ساتھ غار سے نکل کر شہر میں آؤ تو اجنبی ہوجاتے ہیں اور اجنبیوں سے ہر کوئی بدکتا ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا...... ''میں تو اپنی جڑیں تلاش کرنے نکلا تھا اور مرشد مجھے اجنبی بنانے پر تُلا ہوا ہے۔''

''میں اجنبی کیسے ہوں؟'' اس نے پوچھ ہی لیا۔

''پچھلے چھ سو سالوں سے تم نے علم کی دنیا میں ایک کومے کا بھی اضافہ نہیں کیا۔''

مرشد نے جواب دیا...... ''صرف اپنی ذات کے تالاب میں ڈوبے رہے، اس تالاب پر کتنی کائی جم چکی ہے تمہیں اس کا اندازہ ہی نہیں۔''

''تو میں ایک مینڈک ہوں جو اپنی ذات کے تالاب میں ٹرائے جا رہا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

بہت دیر خاموشی رہی، دور...... بہت دور ساحل پر ٹمٹماتی روشنیاں رات کے گہرے بادبان میں چھپ گئی تھیں، لہروں پر ڈولتی کشتی ساحل کے ساتھ لگی کچھ دیر کے لیے ساکت ہوگئی تھی۔

اس نے دیکھا، ستاروں بھرے آسمان کے نیچے، کشتی میں اس کے سامنے بیٹھا مرشد ہیولہ سا لگ رہا تھا۔

''واپس چلتے ہیں۔'' اس نے کہا...... ''میری جڑیں وہیں ہیں جہاں سے میں آیا ہوں۔''

مرشد نے اثبات میں سر ہلایا...... ''پہلے اپنے آپ کو تو ٹھیک کرلو، پھر دنیا میں انقلاب لانے نکلنا۔''

وہ خاموش رہا۔

کشتی واپسی کے سفر پر چل پڑی۔

انور زاہدی (اسلام آباد)

خواب سا دن

تنگ گلیوں میں سے ہوتا ہوا جب میں اس محلے میں پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے یا تو میں خواب دیکھ رہا ہوں یا پھر یہ جو بھی جگہ تھی میری دیکھی بھالی ہی نہیں میرے خیالوں میں کب سے آباد تھی اور میں قرنوں سے اس جگہ سے مانوس تھا۔ایک وسیع وعریض گلی بلکہ سڑک کہہ لیں ،جس کے اطراف میں دونوں طرف کئی کئی منزلہ پرانی وضع کے گھر تھے جن کے سامنے لکڑی کی بنی ہوئی بالکونیاں یا راہ داریاں تھیں اور ہر گھر اپنے برابر کے گھر سے کچھ ایسے جُڑا ہوا تھا جیسے خوف کی حالت میں قطار میں کھڑے ہوئے بچے سہم کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں۔

بیشتر بالکونیوں میں گھروں کی عورتیں لکڑی کے منقش ستونوں پر بندھی الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے سوکھنے کو پھیلا رہی تھیں یا پھر کپڑے اتارنے میں مصروف تھیں۔کچھ بالکونیوں میں کام کاج سے بے نیاز بُڈھے کرسیوں پر بیٹھے نیچے بازار کا منظر دیکھ رہے تھے۔اور وہ جو منظر دیکھ کر اوب چکے تھے۔یا حقہ نوشی میں مصروف تھے یا پرانے اخبارات کا از سر نو مطالعہ کرنے میں مشغول تھے۔کچھ بالکونیوں پر پڑی چقیں یہ تاثر دیتی تھیں کہ اُن گھروں کے مکین گھر میں نہیں ہیں۔اور ایک مکان کی بالکونی میں کھڑی ایک نوجوان لڑکی جو شاید نہا کر وہاں کھڑی اپنے شانوں پر بکھری زلفیں تولیے سے سکھا رہی تھی۔بالکل ایک خوبصورت نظم بنی پورے منظر نامے میں صبح کی پہلی کرن کی طرح نمایاں تھی۔

یا خدا یہ کون سی جگہ ہے۔۔۔؟اس قدر مانوس۔۔۔کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔۔۔؟

وسیع گلی کے اطراف میں موجود مکانوں کی نچلی منزل پر واقع سامنے والے کمروں میں سے بیشتر کمرے اب دکانوں کی شکل اختیار کر چکے تھے اور ان دکانوں میں ہر گھر کی ضرورت کا سامان فراہم تھا۔جس وقت میں اسٹیشن سے اتر کر یہاں پہنچا تو نئے دن کی ابتدا ہو رہی تھی۔لہٰذا کم و بیش ہر دکان کے سامنے گھروں سے نکلے ہوئے بچے اور بڑے اپنے اپنے گھروں کے لئے گھر کا سودا سلف لینے کو کھڑے تھے۔

گلی کے کونے میں دودھ دہی والے کندن حلوائی کی دکان دور سے نمایاں تھی، جس کی برفی، قلاقند اور پیڑے بڑے مشہور تھے لیکن جہاں مٹھائی اور دودھ دہی خریدنے والوں کے علاوہ لسی پینے کے شوقین لوگوں کا ہجوم

رہتا۔۔۔اور وہ جو لسی پینے کے شوقین تھے۔۔۔دکان میں پڑی بنچوں پر بیٹھے سلور کے بڑے بڑے گلاسوں سے لسی پینے میں مشغول نظر آتے۔۔ان میں بیشتر تعداد اُن نوجوانوں کی ہوتی جو صبح گھر سے ورزش یا پھر بھاگ دوڑ کے لئے کسی باغ یا پارک سے واپس یہاں آ کر بیٹھتے تھے۔

کندن حلوائی کی دکان کے مقابل ستار بھائی کا چائے خانہ تھا، جہاں دن بھر کڑک چائے تو چلتی ہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ناشتہ پراٹھا ستار بھائی کے چائے خانے کی خصوصیت تھا۔یہاں پر چائے پینے والوں کی دو قسمیں تھیں۔ایک کالج اور دفتروں کے آنے جانے والے بابو وضع کے لوگ جو تیز پتی والی چائے پینا پسند کرتے۔دوسرے بازار کے زیادہ تر دکاندار لوگ جن کے ہاں سارا سارا دن دودھ پتی کی چائے چلتی رہتی۔دلچسپ بات یہ تھی کہ کندن لسی والے کی دکان اور ستار بھائی کا چائے خانہ دونوں ہی اس بازار کی مصروف ترین دکانیں تھیں۔

میں پاپولیشن سروے کے محکمے میں سروے انسپکٹر کی حیثیت سے صبح یہاں پہنچنے والی پہلی ٹرین سے اترا تھا۔مجھے شام پور ضلع کے پاپولیشن پلاننگ کے دفتر میں جانا تھا۔لیکن معلوم نہیں کس طرح میرے قدم مجھے یہاں تک لے آئے اور کیسے میں اس محلے میں پہنچ گیا؟لیکن جب یہاں پہنچا تو یوں لگا جیسے میں کسی گزرے ہوئے عہد میں یہاں رہ چکا ہوں۔محلے کے مکانات۔۔مکانوں کی طرز تعمیر۔۔اور پھر ان مکانوں کے سامنے بنی ہوئی لکڑی کی قدیم لیکن جاذب نظر بالکونیاں۔۔اور بالکونیوں میں بیٹھے مرد اور کام کرتی خواتین۔۔سب جیسے میرے کسی پرانے خواب کا حصہ ہوں۔سوچا جب یہاں تک آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ ایک کپ چائے کا پی لوں۔اس ارادے سے جیسے ہی میں ستار بھائی کے چائے خانے میں داخل ہوا تو کسی نے ایک کراری آواز میں پکارا۔

''ارے ستار بھائی۔۔۔''

میں آواز کی طرف پلٹا ہی تھا کہ وہ جو ستار بھائی تھے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے دور ہی سے شور مچاتے ہوئے بولے:''عاصم بھائی۔۔۔آپ نے بھی کمال کر دیا۔۔۔بھئی کہاں رہے اتنی مدت۔۔۔؟''

میں حیران و پریشان ستار بھائی کی شکل دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔۔۔بس سامنے پڑی ہوئی ایک خالی میز کرسی پر بیٹھ گیا۔۔ابھی اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ یہ ستار بھائی کون ہیں۔۔پھر یہ جو بھی ہیں۔۔مجھے میرے نام سے کیسے جانتے ہیں۔۔۔؟اور پھر یہ ماحول بھلا کیوں مجھے جانا پہچانا لگ رہا ہے۔۔؟ کہ میرے خیالات کے تار پود کو ایک مرتبہ پھر ستار بھائی کی آواز نے بکھیر کے رکھ دیا۔۔۔

''اچھا عاصم بھائی۔باقی باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔یہ بتائیں کہ آپ کھائیں گے کیا۔۔۔؟''

میں جواب تک اس حیرت کدہ میں ہر شے کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔۔۔بمشکل یہ کہہ سکا:

''چائے مل جائے گی۔۔۔؟''

''عاصم بھائی کیسی بات کرتے ہیں۔۔۔''چائے''۔۔یہ چائے خانہ آپ کا ہے۔۔۔''اور مجھ سے

یہ کہتے ہوئے ستار بھائی نے اپنے ویٹر کو وہیں سے پکارا۔۔۔۔

''ارے چھوٹے۔۔۔جلدی سے عاصم بھائی کے لئے ایک پراٹھا۔فرائی انڈہ اور بہت عمدہ چائے بنا کر لاؤ۔۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا۔ستار بھائی کے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے پرانے گراموفون پر نجانے کن وقتوں کا ریکارڈ بجنا شروع ہو گیا۔۔۔''۔۔۔جانے گئے کہاں گئے وہ دن۔۔۔۔''

مجھے یوں لگا کہ میں حالت خمار میں کسی اور دنیا میں جا پہنچا ہوں۔میرے سامنے لکڑی کی میز پر ایک ویٹر بوائے شاید وہی چھوٹا، جسے ستار بھائی نے میرے لئے ایک پراٹھا،فرائی انڈہ اور بہت عمدہ چائے بنانے کو کہا تھا،کوئی دس منٹ میں ٹرے میں سب کچھ سجائے میرے سامنے میز پر رکھ کر،کسی دوسرے آرڈر کی تکمیل کے لئے جا چکا تھا۔

صبح کا وقت تھا اور دفتروں میں کام کرنے والے بہت سے ایسے افراد جو اکیلے تھے یا پھر جنہیں گھر کی چائے پر ستار بھائی کے چائے خانے کی چائے پسند تھی یہاں بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سگرٹوں کے مرغولے بنا رہے تھے۔میں اپنے سامنے رکھی ہوئی ٹرے میں سے چائے کی کیتلی کو سامنے رکھ کر کپ میں اپنے لئے چائے انڈیل رہا تھا کہ ستار بھائی جنہوں نے میرے چائے خانے میں داخل ہوتے ہی نعرہ لگایا تھا اور مجھے بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا تھا،میرے بالمقابل آ بیٹھے۔

''عاصم بھائی۔۔۔کیسے ہیں آپ۔۔۔؟اتنے دنوں کے بعد آئے ہیں۔۔۔کہاں جا کر بیٹھ گئے تھے۔۔۔؟بھائی۔۔یہاں سب تمہاری یاد میں پریشان تھے۔۔۔۔''

میں ابھی یہی سوچ جا رہا تھا کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو نہ صرف مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں بلکہ میری یاد میں پریشان بھی ہیں کہ ستار بھائی نے جو میرے سامنے بیٹھے ہوئے اور بغور مجھے دیکھے جا رہے تھے۔اپنا بڑھا ہوا ہاتھ مصافحے کے لئے اس خلوص سے میری طرف بڑھایا کہ میں نے بھی اپنا ہاتھ بحالت مجبوری اُن کے ہاتھ میں دے دیا لیکن ستار بھائی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں چائے خانے سے نکل کر کسی لق و دق صحرا میں پہنچ گیا ہوں اور میرے چاروں طرف گرم ریت کے بگولے رقص کر رہے ہیں۔میرے چہرے کو صحرا میں چلتی ہوئی باد سموم جھلس رہی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر یہ سب کیا ہے؟۔میں کہاں آ گیا ہوں؟۔یہ کون لوگ ہیں؟۔ستار بھائی جس طرح مجھ سے مل رہے تھے اُس سے لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے ہی نہیں بلکہ میرے ماضی اور حال سب کی خبر رکھتے ہیں۔

''عاصم بھائی آپ خاصے تھکے ہوئے لگتے ہیں پہلے کچھ کھا پی لیں۔اتنے میں ذرا کاروبار دیکھ لوں۔آپ تو جانتے ہی ہیں یہ رش کا وقت ہوتا ہے۔آپ اتنے میں آرام سے ناشتہ کریں، میں پھر واپس آ کر بیٹھتا ہوں اور آپ سے تفصیل سے بات کرتا ہوں۔''

مجھے تو شام پور کے محکمہ پاپولیشن میں جانا تھا۔یہ میں کہاں آ کر پھنس گیا ہوں۔؟کیا مجھے یہاں سے

نکل جانا چاہیئے؟یا ستار بھائی سے یا جو بھی یہ ہیں ان سے پوچھوں کہ یہ سب کیا ہے؟وہ کون ہیں؟اور مجھے کس طرح جانتے ہیں؟یا میرا اس جگہ سے کیا تعلق ہے۔؟

رات بھر کے سفر کے بعد اسٹیشن سے یہاں پہنچ کر تھکن کے علاوہ بھوک کا لگنا کوئی غیر منطقی نہ تھا ویسے بھی یہ ناشتے کا وقت تھا اور اگر اس وقت میں اپنے گھر ہوتا اور آفس نہ گیا ہوتا تو یقیناً ریحانہ کے ساتھ بیٹھا ناشتہ کر رہا ہوتا۔میری بیوی ریحانہ کو مجھ سے یہی ایک شکایت تھی کہ میرے پاس اُس کے لئے وقت نہیں ہوتا۔

وہ خود بھی بچوں کے ایک سکول میں پڑھاتی تھی۔صحیح معنوں میں پوچھیں تو وقت نہ میرے پاس تھا، نہ اُس کے پاس۔میں سارا سارا دن سروے کے لئے یا اپنے مین آفس میں فائلوں میں سر کھپاتا رہتا اور اگر فائل ورک نہ ہوتا تو ضرور میرا کوئی ٹوؤر نکل آتا۔درحقیقت مین آفس میں تو میں مہینے میں شاید ہفتہ یا زیادہ سے زیادہ دس بارہ دن ہی ہوتا تھا۔باقی کے تین ہفتے میرے پورے ضلع کے چھوٹے بڑے قصبوں اور دیہات میں گزر جاتے اور ایسا دن کبھی اتفاق ہی سے نصیب میں آتا کہ میں اور ریحانہ اکھٹے بیٹھ کر ایک دوسرے کی بات سنیں۔ایک دوسرے کو نظر بھر دیکھیں۔اور باہم مل کر کچھ کھائیں پئیں اور خوش وقت ہوں۔

ہماری شادی کو دس برس گزر چکے تھے۔لیکن ہم اولاد کی خوشی سے محروم تھے۔

''ارے عاصم بھائی۔کیا سوچ رہے ہیں، آپ کا ناشتہ تو کبھی کا ٹھنڈا ہو چکا۔نہ آپ نے چائے پی۔نہ کچھ کھایا۔خیریت ہے۔؟''

اس سے پہلے کہ میں اپنے دفاع میں کچھ کہتا۔۔۔ستار بھائی نے وہیں سے آواز لگائی۔۔۔

''چھوٹے۔۔یہ ٹرے یہاں سے اٹھالو۔۔۔اور عاصم صاحب کی میز پر ایک نیا ناشتہ لگاؤ۔۔۔''

لگتا تھا ستار بھائی جو مجھے بہت اچھی طرح سے جانتے تھے مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے اور مجھے احساس ہو چلا تھا کہ اب ستار بھائی کے چائے خانے سے میرا آنکھ بچا کر نکلنا محال ہے یہ آخر مجھے کیسے جانتے ہیں۔؟

تب اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپک گیا۔جب میری ملازمت کی نوعیت ہی ٹوؤرنگ ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اس قصبے میں اکثر آتا جاتا رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ جب میں اس محلے میں داخل ہوا تھا تو نہ تو گلی میں بیٹھے کسی کتے نے مجھے دیکھ کر احتجاج کیا تھا اور نہ ہی علاقے کے گھروں کی بالکونیوں میں بیٹھے کسی بڈھے نے مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

جیسا کہ دستور ہے کہ جب کوئی اجنبی کسی نئی آبادی یا محلے میں پہنچتا ہے تو سب سے پہلے تو علاقے کے کتے اُس کا بھونک بھونک کر استقبال کرتے ہیں اور اس کے بعد اگر وہ بچ بچا کر کسی طرح اندر علاقے میں پہنچ جاتا ہے۔تو پھر وہاں موجود لوگ بالخصوص بوڑھے افراد جو خود کو علاقے کا چوہدری سمجھتے ہیں، اس بات کو اپنا حق سمجھتے ہیں کہ وہ کسی بھی نووارد کو نہ صرف گھوریں اور بری نظر سے دیکھیں بلکہ ہو سکے تو وہیں روک کر اس کا انٹرویو لینا

شروع کردیں۔

لیکن جس ڈسٹرکٹ سے میرا چند ماہ پہلے اس ڈسٹرکٹ میں ٹرانسفر ہوا تھا اس میں تو شام پور نام کی کوئی بھی جگہ میرے حلقہ اثر میں کبھی رہی ہی نہیں پھر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں یہاں پہلی بار آ رہا تھا مگر اس کے باوجود نجانے کیوں یہ سارا ماحول۔۔ستار بھائی کا چائے خانہ۔۔کندن حلوائی کی لسی کی دکان۔۔اور وہ گھروں کی بالکونیوں میں گھر کی کام کاج کرتی ہوئی عورتیں۔۔اور نیچے گلی کے منظر کو تاڑتے ہوئے بڈھے۔۔سب کا سب ایک خوابناک ماحول کی مانند مجھے دیکھا بھالا لگتا تھا؟ اور کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس ماحول میں پہلی بار نہیں آیا بلکہ میں اس ماحول کا ایک حصہ ہوں؟

پھر بھلا کیوں ستار بھائی مجھ سے اس قدر بے تکلفی اور خلوص سے مل رہے تھے؟ ایک بار ناشتہ میرے سامنے لگوا کر ازسرِنو نئے ناشتے کا کہہ چکے تھے؟ نہ صرف یہ بلکہ وہ یہ بھی مجھ سے کہہ چکے تھے۔۔کہ وہ ذرا اپنے کاروبار سے فارغ ہو جائیں تو پھر مجھ سے تفصیلی بات کریں گے۔

اب بھوک مجھے بے حال کئے دے رہی تھی لہٰذا یہ سوچتے ہوئے کہ جلدی جلدی ناشتہ کر کے بل چکایا جائے اور ستار بھائی سے کسی بھی طرح بچ کر یہاں سے نکلا جائے، ویسے بھی مجھے محکمہ پاپولیشن کے دفتر میں جانا تھا۔ میں نے اپنے سامنے رکھی ٹرے میں سے پراٹھے کی پلیٹ اپنے نزدیک سرکائی اور ایک لقمہ توڑ کر انڈے کے ساتھ نوالہ بنا کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ ایک بچے کو جس کی عمر بمشکل چھ سات برس ہوگی اپنے پاس کھڑے پایا۔ یہ سوچ کر کہ کسی صاحب کا بچہ اپنی میز سے اٹھ کر، جیسا کہ بچوں کا انداز ہوتا ہے چائے خانے کو دیکھتا پھر رہا ہے۔ میں چائے پینے والا تھا کہ اُس بچے نے جو مجھے بڑے پیار سے دیکھے جا رہا تھا مخاطب کیا:

''ابو آپ کتنے دنوں کے بعد آئے ہیں اور گھر نہیں آئے۔امی آپ کو بلا رہی ہیں۔''

اُس ننھے سے بچے کے منہ سے یہ جملہ سن کر نوالہ جیسے میرے حلق میں پھنس گیا تھا۔۔۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر ایک منٹ میری یہی حالت رہی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ بچہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر بھاگا ہوا ستار بھائی کے پاس گیا اور چلانے لگا''ستار۔انکل۔۔ستار انکل۔۔۔۔۔دیکھیں ابو کو کیا ہو گیا ہے۔۔۔؟''

پھر مجھے یاد نہیں میرے ساتھ کیا ہوا۔؟ کسی نے میرے چہرے پر پانی کا بھرا جگ انڈیل دیا تھا۔۔۔

جب آنکھ کھلی تو میرے گرد لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ یہ جگہ ستار بھائی کا چائے خانہ نہیں تھا۔ایک پرانی وضع کا خوشنما گھر تھا۔ میں ایک سجے سجائے کمرے میں ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا اور میرے سامنے میری بیوی ریحانہ موجود تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے دوسرا جنم لیا ہو۔

''ریحانہ! تم یہاں۔۔شام پور میں کیا کر رہی ہو۔۔؟''میں نے ہوش میں آتے ہی پہلا سوال کیا۔

''ریحانہ نہیں، میں آپ کی بیوی نسرین ہوں۔لگتا ہے آپ کی طبیعت اتنی خراب ہوئی ہے کہ آپ کو

اردگرد کی کچھ خبر نہیں۔''

''نسرین۔۔کون نسرین۔؟ میری بیوی کا نام تو ریحانہ ہے، جو یہاں نہیں رہتی اور پھر وہ تو اس وقت اپنے سکول گئی ہوگی۔اگر تم نسرین ہو تو میں کون ہوں؟ اور میں کہاں ہوں؟ یہ کس کا کمرہ ہے؟ یہ گھر کس کا ہے۔؟''

لیکن ریحانہ کی ہمشکل عورت نے جو اپنا نام نسرین بتا رہی تھی۔ مجھے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔اور اپنے بچوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

''اپنے ان بچوں سے پوچھیں۔آپ کی غیر موجودگی میں ہم سب کا کیا حال رہا ہے۔؟''

''اپنے بچوں سے۔؟ مگر ہمارے تو کوئی بچے نہیں ہیں۔؟''

''یہ آپ ہی کا گھر ہے اور یہ دونوں آپ کے بچے ہیں۔عامر اور نوشی۔ ذرا دیکھیں تو سہی ان کے چہرے۔آپ کے آنے سے دونوں کس قدر خوش ہیں اور ایک آپ ہیں کہ سب کچھ بھلائے بیٹھے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں لعنت بھیجیں ایسی نوکری پر جس میں نہ گھر کا کوئی ہوش رہے نہ بیوی بچوں کی کوئی خبر۔ میں تو ستار بھائی کی مشکور ہوں کہ آپ کے پہنچتے ہی اُنہوں نے سب سے پہلے مجھے اطلاع بھجوائی جسے سنتے ہی عامر بھاگ کر آپ کے پاس پہنچ گیا۔ایک آپ ہیں کہ آپ کو کچھ یاد ہی نہیں؟''

واقعی وہ عورت جس بچے کو میرا بیٹا بتا رہی تھی۔ یہ وہی بچہ تھا جو مجھ سے ملنے ستار بھائی کے چائے خانے میں پہنچا تھا۔اور جس نے میرے پاس آ کر مجھ سے بڑے پیار سے بات کی تھی۔ اسے کوئی بھی تیسرا شخص دیکھ کر میرا ہی بچہ بتاتا۔ وہ بالکل میری ہی تصویر تھا۔ جبکہ کوئی چار پانچ برس کی بچی جسے وہ عورت میری بیٹی کہہ رہی تھی اور جس کا نام وہ نوشی بتا رہی تھی، ہو بہو اپنی ماں یعنی ریحانہ کی تصویر تھی۔

یہ کیسا جہان طلسمات تھا۔۔۔؟ میں کہاں پہنچ گیا تھا۔۔۔اور کس عہد کے سحر میں مسحور تھا۔۔۔؟

وہ عورت جو بھی تھی اور اپنے آپ کو میری بیوی نسرین بتا رہی تھی درحقیقت ریحانہ کی تصویر تھی بلکہ میرے لئے تو وہ ریحانہ ہی تھی۔ مجھ سے اُس کا باتیں کرنے کا انداز۔۔اُس کی آواز۔۔اُس کا لہجہ۔۔سب کچھ وہی تھا۔۔بس شام پور کا یہ محلّہ۔۔اُس کے گھر۔۔بازار۔۔ستار بھائی کا چائے خانہ۔۔اور پھر یہ گھر جس کے ایک سجے سجائے کمرے میں۔۔میں ایک نہایت آرام دہ بستر پر دراز تھا۔۔کمرے کے باہر کی جانب کھلتی ہوئی کھڑکیوں کے سامنے موجود بالکونی سے کمرے میں آتی ہوئی روشنی۔۔اور میرے اردگرد موجود کچھ نئے چہرے اور یہ دو معصوم بچے، میرے لئے اجنبی تھے۔ ستار بھائی مجھے یہاں پہنچا کر جا چکے تھے۔۔۔اب شاید ریحانہ اور بچوں کے علاوہ یا تو اس گھر کے کچھ افراد تھے۔۔یا پھر پڑوس کے ہمسائے تھے۔

میرا سر چکرا رہا تھا۔۔۔۔جو کچھ میری نظروں کے سامنے تھا۔۔۔۔وہ سب ناقابلِ فہم تھا۔۔۔ پھر جیسے میرے اعصاب نے جواب دے دیا اور میں تھک ہار کر اپنے اردگرد سے غافل ہو کر سو گیا تھا۔۔۔

فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی تو کمرے میں بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ کی مدھم روشنی سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔کھڑکیوں سے آتی روشنی ختم ہو چکی تھی۔میں اٹھ کر بیٹھا تو میری نظر سائیڈ ٹیبل پر لیمپ کے نیچے رکھے ہوئے ایک فریم پر پڑی،جس میں لگی ہوئی ایک تصویر میں۔۔میں ریحانہ اور وہ دونوں بچے موجود تھے۔کمرے میں اس وقت میرے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ریحانہ میرا مطلب اُس عورت سے ہے جس کا نام نسرین ہے اور جو خود کو میری بیوی بتا رہی تھی وہاں موجود نہ تھی۔بچے باہر بالکونی میں بیٹھے کھیل رہے تھے۔میری آہٹ سن کر لڑکا دوڑا ہوا اندر آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔

''ابو۔۔۔اب آپ کیسے ہیں۔۔۔آپ کو کچھ چاہیئے۔۔۔؟''

میں نے بچے سے ریحانہ کے بارے میں معلوم کیا تو بچے نے کہا۔۔۔

''امی تو اس وقت کسی کام سے باہر گئی ہیں۔۔۔آپ کو کچھ ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔۔یا میں امی کو بلا لاؤں؟

''نہیں بیٹے۔۔میں ذرا ستار بھائی کے پاس جا رہا ہوں۔۔امی سے کہنا میں ابھی واپس آتا ہوں۔۔''

یہ کہہ کر میں تیزی سے کمرے سے نکلا۔باہر کا منظر اب بدلا ہوا تھا۔شام ساری آبادی پر ایک گھٹا کی مانند اتر رہی تھی۔۔۔آسمان پر اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹتے ہوئے پرندوں کا ہجوم تھا۔۔۔نیچے بازار میں کسی کسی دکان پر روشنیاں جل رہی تھیں۔گھروں کی بالکونیوں میں بھی صبح کی طرح بیٹھے مرد اور عورتیں دکھائی نہ دیتے تھے۔صبح کی نسبت شام کا منظر دل پر غبار کی طرح چھا رہا تھا۔میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس محلے سے باہر نکل آیا۔سامنے سڑک پر موجود سواری نے مجھے تھوڑی ہی دیر میں شام پور کے اسٹیشن پر پہنچا دیا۔نصیب آباد کی طرف سے آنے والی ٹرین اتفاق سے پلیٹ فارم پر جیسے میری ہی منتظر تھی اور جونہی میں اس میں سوار ہوا وہ اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔

میرے سامنے کھڑکی میں سے شام پور کا دور ہوتا ہوا قصبہ رات کی پھیلتی تاریکی میں گم ہو رہا تھا۔۔اور میری آنکھوں میں نیند کے گہرے بادل اتر رہے تھے۔۔علی الصبح میں اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔۔اسٹیشن سے گھر پہنچا ۔۔تو خلاف معمول ریحانہ گھر پر موجود تھی۔۔اُس کے چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ رات بھر جاگتی رہی ہو۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

''آپ خیریت سے ہیں۔۔۔میں تو رات بھر نہیں سو سکی۔۔۔کیسا رہا آپ کا سفر۔۔۔؟''

ایک ہی سانس میں وہ مجھ سے کئی سوال کر گئی تھی۔۔۔لگتا تھا جیسے وہ بھی میرے سفر کے حال سے پوری طرح واقف ہو۔۔۔ادھر میں نے بھی اُس کا جواب دینے کے بجائے رکے بغیر اُس سے سوال کر دیا تھا:

''ریحانہ خیریت ہے۔۔۔تم گھر پر کیسے ہو۔۔۔۔آج اپنے سکول نہیں گئیں۔۔۔؟''

''سکول کیا جاتی۔۔۔رات ایسا خواب دیکھا تھا۔۔۔کہ میں پریشان ہو کر اٹھ بیٹھی۔۔۔رات کے تین بجے تھے ۔۔۔آپ گھر میں نہیں تھے۔۔۔میں نے کبھی خود کو اتنا تنہا نہیں سمجھا۔۔۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

کہ کیا کروں۔۔۔نہ آپ کی کوئی اطلاع تھی۔۔۔پھر یہ سوچ کر کہ آپ یقیناً اس وقت واپسی کے سفر میں ہو نگے ۔۔۔۔یہیں لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے میں نے بقایا رات آنکھوں میں کاٹ دی۔۔۔''

اُس کی بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے۔۔اُس سے نظریں چراتے ہوئے میں نے ریحانہ کو چائے بنانے کا کہا۔۔۔۔اور خود تائلٹ میں چلا گیا۔۔۔

باہر آکر سب سے پہلے اپنے ڈیپارٹمنٹ فون کر کے اپنے پہنچنے کی اطلاع کی۔۔اور پھر طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے چھٹی کی درخواست دے دی۔۔۔ریحانہ ابھی کچن میں ناشتہ بنانے میں مصروف تھی۔۔۔ویسے بھی ریحانہ کو میں کیا بتاتا۔۔۔کہ جہاں میں گیا تھا وہاں سب لوگ مجھے ایسے ملے جیسے میں وہیں کا رہنے کا والا ہوں۔۔۔اور جیسے وہ سب صدیوں سے میرے منتظر بیٹھے تھے۔۔۔یا پھر ریحانہ کو یہ بتاتا کہ میں جہاں گیا تھا۔۔۔وہاں نہ صرف میرا ایک گھر تھا۔۔۔بلکہ ایک بیوی بھی تھی۔۔۔جو بالکل اُس کی ہمشکل ہی نہیں بلکہ جیسے خود اُس کا دوسرا روپ تھی۔۔۔اور اُسی گھر میں مجھے منتظر دو بچے بھی ملے تھے۔۔۔ایک لڑکا عامر اور ایک لڑکی نوشی۔۔۔جو مجھے دیکھ کر خوشی سے بے حال تھے۔۔۔۔اور بقول نسرین کے وہ میرے ہی بچے تھے۔۔۔

کیا جگہ تھی۔۔۔کیسے ملنسار لوگ تھے۔۔۔۔۔۔۔کیسے اچھے گھر اور اُن کے مکین۔۔۔؟

سب میرے دلدادہ۔۔کوئی بھی مجھ سے شاکی نہ تھا۔۔بالکونیوں والے پرانی وضع کے گھر۔۔۔ایک محلّہ جو میرے دل میں گھر کر چکا تھا۔۔۔ستار بھائی کا چائے خانہ۔۔اور اُس کے سامنے کندن حلوائی کی لسی کی دکان۔

ریحانہ کے کچن سے باہر آنے سے پہلے میں نے جلدی جلدی ستار بھائی کے چائے خانے کا نمبر جو اُنہوں نے مجھے پہنچتے ہی دیا تھا ڈائل کیا۔۔۔۔لیکن دیر تک گھنٹی بجتی رہی اور کسی نے فون کا جواب نہ دیا۔۔۔جیسے نمبر یا تو مصروف ہو یا پھر خراب۔۔۔کافی انتظار کرنے کے بعد پھر اُس گھر میں جہاں میں چند گھنٹے ایک مہمان کی حیثیت سے گزار آیا تھا۔۔ فون کیا۔۔۔لیکن ہر بار ایکسچینج نے یہ بتا کر میری کال کو منقطع کر دیا۔۔۔۔

''معاف کیجئے۔۔آپ کا ڈائل کیا ہوا نمبر کسی کے استعمال میں نہیں۔۔۔۔''

۔۔۔معلوم نہیں نمبر خراب تھے۔۔۔یا میری انگلیاں غلط نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔۔۔۔

اُس کی ابھی آنکھ بھی نہ کھلی تھی کہ اُس نے ایک دم چیخ مار کر اپنی بیوی کو بلایا۔وہ بیچاری سراسیمگی میں دوڑی دوڑی آئی۔''کیا ہوا؟''

''اب کیا ہوگا؟''اس کا پاگل پتی اُسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا''اپنا آپ تو میں اپنے خواب میں ہی چھوڑ آیا ہوں۔''

(**جوگندر پال** کا افسانچہ **گمشدہ**)

سلیم آغا قزلباش (سرگودھا)

اکائی

اس نے اپنی جان پر کھیل کر اس لڑکی کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کی مگر جب وہ اسے دونوں ہاتھوں پر اُٹھائے کنارے پر پہنچا تو وہ دَم توڑ چکی تھی، لیکن قتل کا الزام اس کے سر تھوپ دیا گیا۔ کسی نے بھی اسے لڑکی کو بچاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ اس نے کسی پرانی رنجش کی بنا پر اسے پانی میں ڈبو کر ہلاک کیا ہے۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد قبیلے کے سرپنچوں نے متفقہ طور پر اس کے لیے یہ سزا تجویز کی کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں، پیروں میں سے کسی ایک جوڑی کو کٹوانے یا اپنی دونوں آنکھیں نکلوانے کا انتخاب خود کرے۔ اس انتخاب کے لیے اسے صرف رات بھر کی مہلت دی گئی اور وہ بھی اس کڑی شرط کے ساتھ کہ اگر اس نے پو پھٹے تک کوئی فیصلہ نہ کیا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

جب وہ اسے کوٹھڑی میں بند کر کے چلے گئے تو اس نے دو تین گہرے سانس لے کر خود کو ذہنی طور پر مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ اسے ایک حتمی فیصلے پر پہنچنا تھا اور اس فیصلے پر ہی اس کی آئندہ زندگی کا سارا دارومدار تھا۔ اس کا ایک غلط قدم اس کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لا سکتا تھا۔ یکبارگی اس کے تن بدن میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ دل سینے کی بند کوٹھڑی میں یوں دیوانہ وار ٹکرانے لگا جیسے اسے توڑ کر فرار ہو جانا چاہتا ہو۔ پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی سیلن زدہ بوجھ کونوں کھدروں سے اس کی جانب خاموشی سے سرکتا چلا آ رہا ہے۔ وہ نڈھال سا ہو کر سرکنڈوں کی بنی چٹائی پر چت لیٹ گیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں دوبارہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بے قراری سے اپنی ہتھیلیوں کو مسلنے لگا۔

یہ سوچ اسے بار بار ڈس رہی تھی کہ عجیب و غریب نوعیت کی یہ سزا آخر اس کے لیے کیوں تجویز کی گئی ہے! فردِ جرم کے بعد فیصلہ بھی سرپنچوں کو ہی سنانا چاہیے تھا۔ شاید وہ مجھے خود میرے ہاتھوں قتل کرانا چاہتے ہیں۔ انتقام لینے کا یہ کیسا بھیانک انداز ہے! یہ دوہری چال ہے، سازش ہے۔ خود اپنے لیے سزا کا تعین کرنا کتنا جان لیوا مرحلہ ہوتا ہے، اس بات کا تجربہ اسے ہو رہا تھا۔

سب سے پہلے اس کی آنکھوں نے اس لڑکی کو دریا میں غوطے کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر اس کے دونوں پاؤں اندھا دھند بھاگتے ہوئے دریا کنارے پہنچے تھے، اس کے بعد اس کے دونوں ہاتھوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر دریا میں ڈبکیاں کھاتی لڑکی کو پکڑ لیا تھا اور اسے اُٹھا کر کنارے پر لے آئے تھے۔ مطلب یہ کہ اس کی آنکھیں، ہاتھ، پاؤں سب اس عمل میں برابر کے شریک تھے مگر ان تینوں میں سے پہل کس نے کی؟ آنکھوں نے،

نہیں پیروں نے یا پھر شاید ہاتھوں نے؟ لیکن اس غلطی کی اصل ذمہ داری کس کے سر تھی؟ یقیناً اس کی آنکھوں نے اسے موت کے کنویں میں دھکیلا تھا۔ مگر آنکھیں تو بے بس تھیں۔ وہ تو صرف موقعہ کی گواہ تھیں۔ غلط قدم تو پیروں نے اُٹھایا تھا کہ ایک دَم دوڑ پڑے تھے۔ لیکن اصل کام تو ہاتھوں نے ہی انجام دیا تھا۔ مان لیا کہ آنکھوں اور پیروں سے غلطی سرزد ہو گئی تھی لیکن کم از کم ہاتھوں کو اس میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ اُس وقت رک جاتے تو آج اسے ان جانکنی کے لمحوں سے تو نہ گزرنا پڑتا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اُس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ بس اندر سے حکم ہوا تھا اور اس نے جھٹ اس کی تعمیل میں لڑکی کو بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ کون تھا یہ حکم صادر کرنے والا!۔ دوسری طرف گزرتا ہوا ہر پَل اور دل کی ہر دھڑکن اُسے صبح کی جانب دھکیل رہی تھی۔ پہلی بار اُسے صبح کے وجود سے شدید نفرت ہونے لگی۔ اس کا اندر چیخ چیخ کر واویلا کرنے لگا کہ اے کاش باہر ایسی کالی آندھی امڈ پڑے کہ صبح ملتوی ہو جائے۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا جب اس نے اپنے دونوں پیر کٹوانے کا ارادہ کر لیا اور قدرے پُرسکون ہو گیا۔ مگر جب اچانک اسے شدید پیاس لگی اور وہ کوٹھڑی کے دوسرے کونے میں دو اینٹوں پر رکھی ملگجی سی صراحی میں سے پانی پینے کے لیے اُٹھا اور چل کر وہاں تک پہنچا تو یکا یک ایک سنسناہٹ بھری لہر اس کے پیروں کے تلووں میں سے رینگتی ہوئی اس کے سارے وجود میں پھیل گئی۔ اسی پل اس کی پیاس بھی ایک معدوم ہو گئی اور وہ اُلٹے قدموں دوبارہ سرکنڈوں کی چٹائی پر آ کر ڈھیر ہو گیا اور بے اختیار اپنے دونوں پیروں کو پیار سے سہلانے لگا۔ یہ سوچ کر اس کا دَم رُکنے لگا کہ بغیر پیروں کے زندگی کیسے گزرے گی۔ فقط ایک قدم اُٹھانے کے لیے دو بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ یوں بھی جو کوئی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے اس کی مثال اس عمارت ایسی ہوتی ہے جو بنیاد کھودے بغیر کھڑی کی جا رہی ہو۔ ظاہر ہے وہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی، زمین بوس ہو جانا اس کا نوشتۂ تقدیر ہے۔

رات کا دوسرا پہر تقریباً آدھا گزر چکا تھا اور وہ انتخاب کرنے کی ادھیڑ بن میں غلطاں و پیچاں تھا، یکا یک اس نے اپنے دونوں ہاتھ کٹوانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ اس کے لیے تنے ہوئے رسے پر بغیر کسی سہارے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلنے کا مرحلہ تھا اور یہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ خوفناک شکل اختیار کر گیا تھا کہ نیچے گہراؤ تھا جس میں ناگ پھن اُٹھائے شوکریں بھر رہے تھے اور بچھو اپنے زہریلے ڈنک لہرا رہے تھے۔ معاً اسے یوں لگا جیسے سارے سانپوں اور بچھوؤں نے بیک وقت اس پر ہلّہ بول دیا ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں سے اِن موذیوں کو اپنے بدن سے نوچ نوچ کر پرے پھینکنے لگا۔ اس لمحے اسے اپنے دونوں ہاتھ کٹوا دینے کی سنگینی کا علم ہو گیا۔ ایک بار تو اس دہشت ناک تصور سے ہی اس کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے کہ ٹنڈ منڈ بازوؤں کے ساتھ آدمی کتنا بے بس اور بے یار و مددگار ہو جاتا ہے۔ ہاتھ تو دو ایسے پتوار ہیں جو وجود کی ناؤ کو زندگی کے پُرشور دریا میں سفر جاری رکھنے کے قابل بنائے رکھتے ہیں۔ ان کو کٹوانا زندگی کی ناؤ کو بے پتوار کرنے کے مترادف ہے تب دونوں ہاتھ اس کے سامنے دو ایسے ورق بن گئے جن پر اس کی آنے والی زندگی کی پوری کہانی لکھی ہوئی تھی۔ اس نے پڑھا کہ ہاتھوں کے بغیر روٹی کے ایک لقمے اور پانی کے ایک گھونٹ کے لیے بھی اسے دوسروں کا محتاج ہونا

پڑے گا۔محتاجی اور بے بسی کی ایسی زندگی آدمی کو زمین پر رینگنے والے کیچوے سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔

رات کا تیسرا پہر ہچکیاں لے رہا تھا جب اس نے اپنی دونوں آنکھیں نکلوا دینے کا حتمی فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد کیا۔اس نے سوچا کہ ہاتھوں سے ٹٹول کر زندگی کسی نہ کسی طرح گزاری جاسکتی ہے بلکہ اگر ہاتھ میں چھڑی تھام لی جائے تو آدمی گڑھوں میں گرنے سے بھی بچ جاتا ہے۔اور کچھ نہیں تو کسی کا ہاتھ تھام کر بھی یہ سفر طے ہوسکتا ہے۔کم ازکم اس فیصلے کے نتیجے میں جسم کا ظاہری ڈھانچہ تو بہر طور سلامت رہے گا۔آنکھیں تو یوں بھی بڑی بھوکی ہوتی ہیں۔ساری برائیاں،خواہشیں اور توقعات انہیں دو روزنوں کے راستے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتی ہیں۔آنکھوں کی روشنی کی بجائے دل کی روشنی سے کام لیا جاسکتا ہے۔یہ سب سوچ کر اس نے رات بھر جاگی اپنی تھکی ہاری آنکھوں کو موند لیا۔پھر شاید اس کی آنکھ لگ گئی۔تب اچانک چڑیوں کے چہچھوں نے اس کی آنکھوں کے پپوٹوں کا پردہ اُلٹ دیا اور وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔کچھ لمحوں تک وہ خالی خالی نظروں سے سامنے دیوار کی جانب ایک تار دیکھتا رہا اور جب حواس کچھ بحال ہوئے تو اس کے جی میں پو کے پھٹنے کے منظر کو دیکھنے کی شدید خواہش تڑپ کر جاگ اُٹھی۔وہ ایک عجیب سی بے خودی کے عالم میں اپنے پیروں کو گھسیٹتا ہوا کوٹھڑی کے اکلوتے روزن کی جانب بڑھا۔وہاں پہنچ کر اس نے ایڑیاں اُٹھا کر بمشکل تمام روزن میں سے باہر جھانکا تو اس کے سامنے صبح کاذب کے بعد کا سحر انگیز منظر پھیلا ہوا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے بگلوں کی سفید براق ڈار سفید جھالر کی صورت اس کے سامنے سے گزری۔یکا یک اس کا سارا اندر ایڑیاں اُٹھا کر اس کی آنکھوں کے روزنوں سے جھانکنے لگا۔چند لحظوں کے بعد نیم کے ایک گھنے درخت پر سے چڑیوں کا ایک جھنڈ یوں اوپر اُٹھا جیسے کسی نے مٹھی میں بھرے چمکتے سکّوں کو ہوا میں اچھال دیا ہو اور ٹھیک اسی لمحے اس پر یہ انکشاف ہوا کہ زندگی کی ساری رنگا رنگی،شادابی اور دلکشی ان دو روشن کھڑکیوں ہی کی عطا ہیں۔ان سے محروم ہو کر زندگی سے سمجھوتہ کرنا بہت مشکل ہے۔تب معاً دو دہکتی سلاخوں کو اپنی آنکھوں کی جانب بڑھتے تصور کرکے وہ خوف سے چیخ اُٹھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔جب اس کے آنسو تھمے تو اسے اپنے بدن سے کوئی چیز باہر کو سرکتی ہوئی صاف محسوس ہونے لگی،پھر ایک عجیب سی کپکپی نے اسے اپنے شکنجے میں کس لیا۔اس کے بعد اس کے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور حلق میں پھندا سا پڑ گیا۔اسے لگا جو چیز باہر کو آرہی تھی وہ گلے میں پہنچ کر اٹک گئی ہے۔اس کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے مردہ حروف کی صورت اُبھر آئے۔گردن کی طنابیں کھنچ گئیں اور پھر اس کا سارا وجود سُن ہو گیا۔عین اس وقت کوٹھڑی کے زنگ آلود آہنی دروازے کو کسی نے پورے زور سے پیچھے کی جانب دھکیلا۔دروازہ درد سے کراہ اُٹھا۔بھاری بھرکم جوتوں کی آہٹیں کوٹھڑی میں یکے بعد دیگرے داخل ہوئیں۔فیصلے پر عملدرآمد کرنے والوں کی سفّاک آنکھوں نے اندر آکر دیکھا کہ کوٹھڑی کے اکلوتے روزن کے بالکل نیچے،سل زدہ سنگی فرش پر گھٹنوں میں آنکھیں چھپائے،ٹانگوں کے گرد اگرد مضبوطی سے ہاتھوں کا حلقہ بنائے وہ گچھو مچھو سا گٹھڑی بنا بے حس وحرکت یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اُس کے اعضا موم کے ایک گولے کی صورت باہم جُڑ کر ایک ناقابلِ تقسیم اکائی میں ڈھل گئے ہوں۔ ☆☆☆

ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)

کوڑے جو درد سے چیختے تھے

ہوا تھوڑی سی سرسرائی اور پھر یک لخت اَن گنت ریزوں میں بٹتی چلی گئی۔بکھرے ہوئے ریزے لمحے بھر کے لیے انگاروں کی طرح دہکنے لگے مگر پھر جلد ہی خود اپنے آپ میں جل کر بھسم ہونے لگے اور باقی بچنے لگا کچھ ملگجا سا دھواں،جو تماشہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کو دھیمے دھیمے جلانے لگا مگر ساتھ ہی اُن کے دلوں کے دم بھی گھونٹنے لگا ۔۔وہاں کس کو معلوم تھا کہ ہوا کے سینے میں تو اُن کوڑوں کا درد تھا جو انجانے میں حیوانی جذبوں کی ایک ایسی دہکتی آگ سے آشنا ہو گئے تھے جو تماشہ دیکھنے والوں کے کسی وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔تالیوں اور نعروں کی گونج میں کوڑے کرب سے چیختے تھے مگر سوائے بدنصیب ہوا کے کوئی بھی نہ تھا جو اُن کے درد کی شدت کو محسوس کرتا اور پھر ہوا ہی اُس کرب کو اپنے نازک بدن پر جھیلتی اور پھر درد سے ریزہ ریزہ ہو جاتی۔

ہوا اور کوڑوں کا یہ دردناک ملاپ اُس سلگتی ہوئی دوپہر میں ہوا تھا جب ٹکٹکی پر بندھی چاند بی بی زنا کاری کے جرم میں چالیس کوڑوں کی سزاوار قرار پائی تھی۔تماشائیوں کے نعروں اور تالیوں کی گونج میں چاند بی بی کی کربناک چیخیں صرف اُن آوازوں کو شکستگی سے ڈھونڈ رہی تھی جو گناہ گار نہیں تھیں۔شروع شروع میں تو اُس کے گداز بدن کی پشت پر پڑنے والا ہر ایک کوڑا اُس کی نازک کھال کو یوں چھیلتا رہا جیسے اس کی بدکار روح کو اُس کے چھلے بدن کے کسی نہ کسی کونے سے باہر نکال کر ہی دم لے گا مگر پھر جلد ہی کوڑوں کو یوں لگنے لگا جیسے اُن کی ہر ایک ضرب خود اُن کے ہی بدن کو کاٹ کر کسی انجانے گناہ سے اُس کے کونے کونے کو بھر رہی ہے۔یہ ایک عجیب احساس تھا جس سے کوڑے اس سے قبل کبھی بھی دوچار نہیں ہوئے تھے۔وہ تو نیکی اور بدی کے تعلق سے بے نیاز ہمیشہ اپنے چلانے والے کے زورِ بازو کے غلام رہے تھے۔وہ تو کتنے ہی بار زانی اور شرابی مردوں اور عورتوں کے بدن پر جہنم کی دہکتی آگ کی طرح پڑتے رہے تھے مگر اس بار اُنہیں لگا تھا جیسے بیچ بازار یا تو خود اُن کے ساتھ ہی زنا ہو رہا ہے یا پھر وہ کسی کے ساتھ بدکاری کر رہے ہیں۔

چاند بی بی کچھ دیر میں چاند کی طرح پیلی پڑنے لگی تھی۔اب اُس کی چیخوں کی شدت میں کمی آرہی تھی۔کوڑوں کو لگنے لگا تھا جیسے چاند بی بی نے اب اپنے پر پڑنے والی بے رحم ضربوں سے ہار مان لی ہے۔اب اُن کی ہر ضرب چاند بی بی کے بدن کے لیے محض ایک خفیف سی حرکت کا سبب بننے کا سبب بن رہی تھی۔تماشہ دیکھنے والوں کے جوش خروش کی شدت میں بھی کمی آرہی تھی۔نعروں اور تالیوں کی آوازیں چاند بی بی کی سسکیوں کے بغیر

محض ایسے ڈھول کی تھاپ بنتی جارہی تھی جس کی رسیاں اب ڈھیلی ہورہی تھیں۔مگر کوڑوں کا بوجھ اب بھاری سے بھاری تر ہوتا جارہا تھا۔اُن کے بڑھتے بوجھ سے اب چاند بی بی کے بجائے، اردگرد کی ہوائیں کٹنے لگی تھیں۔وہ ریزہ ریزہ ہوکر کوڑوں سے رحم کی فریاد کرنے لگی تھیں۔کوڑوں کے اندر کی جھلستی آگ ہوا کے ریزوں کو اب بکھیر کر انگاروں کی طرح جلانے لگی تھی۔اُن سے اُٹھنے والا ملگجا دھواں تماشہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کو دھیمے دھیمے جلاتا تھا مگر ٹکٹکی پر بندھی چاند بی بی کے گداز بدن اور اُس کی پُشت پر پڑنے والی ضربوں کے سنگم سے پیدا ہونے والے کوڑوں کے منوں بوجھ کو اُنہیں دکھانے سے قطعی قاصر تھا۔

کوڑوں کا بوجھ۔۔جو اُس کے مارنے والے کی بے لگام جنسی لذت کی خواہش سے پیدا ہورہا تھا اور چاند بی بی کے نرم و گداز بدن پر پڑنے والی ہر ایک ضرب سے اُس کے لیے جنسی تسکین کا مسلسل سبب بن رہا تھا۔بے بس کوڑے جو چاند بی بی کی طرح زنا کے مرتکب ہوگئے تھے۔وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے مارنے والے کے غلیظ گناہ میں برابر کے شریک تھے اور اب اپنے کرب کا سارا بوجھ ہوا پر ڈال کر اُسے ریزہ ریزہ کررہے تھے۔

According to Shah Wali Allah the Holy Prophet has two aspects of his teaching, permanent and temporary. The basic thing which is important is the fundamental Islamic principles not their particular application. What was unique in Shah Wali Allah and which had inspired Mawlana Sindhi was his perception that the prophet had not been entirely inconsistent with the tradition and custom of the society in which he was born. Shah Wali Allah took revolutionary step and said, " Besides it that injunctions should not be strictly imposed on coming generation."

Mawlana Sindhi's pragmatic mind was attracted towards this and he suggested a reasonable and practical way, " I consider the penal injunction laid down by the Holy Quran and the Way with which certain administrative, social and economic matter have been defined and determined are not final and unalterable. They are just practical modes since the general and all embracing guidance of the Holy Quran could be manifested only in that manner at time and it did. Now they are the legal precedence for us and keeping them in view and in the light of the everlasting and universal wisdom of the Holy Quran, we can form new law in every age. In fact, according to Maulana Sindhi, 'We are entering into the industrial age and we have no recourse other than to join the march. We cannot survive as straggler. We have to give up enmity of the west. We should learn and take benefit from the intellectual treasure house of the west.' Subsequent events have proved the rational of Maulana Sindhi's vision. Muslim world has assimilated the West but it did not do so as an active force but as a passive entity due to its irrational approach and intransigent behaviour. In fact this is the illusion, which Muslim world has been harbouring for a long time that West is incapable of solving her moral and social problems.

(Extract From "The Tradition of Deoband and the Pragmatism of Ubaid Allah Sindhi" BY: NASEER AHMAD HABIB "Third Frame" Volume:1, No.3, 2008 Journal of Jamia Millia Islamia Delhi literature, culture and society.)

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

امانت

نرس نے میری گود میں تولیے سے لپٹے ہوئے ننّھے سے وجود کو ڈال دیا۔میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔آٹھ پونڈ کا ننّھا سا بچّہ مجھے اتنا ہلکا لگا جیسے بچّہ نہیں کوئی پھول ہو۔چہرہ جیسے بالکل تازہ کھلا ہوا گلاب۔اس کی خوشبو میرے بدن کی نس نس میں سرایت کرتی جارہی تھی،ہ میرے ہی بدن کا ایک حصّہ تھا، کچھ دیر قبل تک وہ میرے اندر تھا، باہر کی دنیا میں صرف میں تھی، وہ نہ تھا، اس وقت میں ہوں، اور میری بانہوں میں.......
وہ بھی ہے سارا کا سارا لپٹا ہوا بلکہ بندھا ہوا، صرف چہرہ باہر تھا۔سنہری بال، کشادہ پیشانی، آنکھیں بند ہونے کے باوجود غضب ڈھارہی تھیں اور اس پر گھنیری پلکوں کی جھالر، گلابی پھولے پھولے گال، چھوٹا سا دہانہ۔اسے دیکھ کر میں اپنی ساری تکلیف بھول گئی تھی جو میں نے اس کو جنمانے میں اٹھائی تھی میں نے سوچا' جنمانہ' یہ بھی عجیب سا مرحلہ ہے۔وہ تو میرے اندر بھی زندہ تھا، اس کا ننّھ سا دل بھی دھڑ کتا تھا۔جنمانے کا مطلب ہے' جدائی' وہ میرے اندروں سے جدا ہوگیا تھا اور ایک علیحدہ وجود کے طور پر میرے سپرد کیا گیا تھا۔عطیۂ خداوندی، میری مامتا کی تسکین کے لئے ایک تحفہ اور گھر بھر کے لیئے ایک جیتا جاگتا۔۔۔۔۔۔۔کھلونا۔

سب لوگ بہت خوش تھے، ہر کوئی اس بات پر زور دے کر خوش ہورہا تھا کہ' بیٹا' پیدا ہوا ہے۔خالہ صاحب ہما ری سب سے بڑی خالہ ہیں دل کی بری نہیں مگر برائی کی حد تک صاف گو ہیں آتے ہی بولیں۔

'' بیٹا مبارک ہو! اب تو ماشاءاللہ تین بیٹے ہوگئے''

جب میری پہلی بیٹی کے ایک سال بعد دوسری بیٹی پیدا ہوئی تھی تو سب سے پہلے خالہ صاحب ہی بولیں تھیں۔

'' اے ہے ....دوسری بھی بیٹی پیدا ہوگئی، کہیں بیٹیوں کی لائن ہی نہ لگ جائے.........ایک بات کا خیال رکھنا، نام ملتے جلتے نہ رکھنا ورنہ ثمینہ، امینہ، زرینہ، روبینہ کی لائن لگ جائے گی............''

اس وقت راشد بھی موجود تھے، وہ بولے تو کچھ بھی نہیں لیکن ان کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ انہیں بہت برا لگا ہے۔خالہ صاحب سمجھ گئیں کہ راشد کو یہ بات پسند نہیں آئی فوراً بولیں:

''بیٹیاں تو بہت اچھی ہوتی ہیں۔بس ان کے نصیب سے ڈر لگتا ہے ''

بچّے اس ننّھے منّے کھلونے کو دیکھ کر بہت خوش تھے سوائے چھوٹے بیٹے یوسف کے۔وہ اس بات سے بہت ناراض تھا کہ ماں نے اسے اپنے سے علیحدہ کر رکھا ہے ، نہ اپنے پاس سلا رہی ہے، نہ اس پر توجّہ دے رہی ہے.....

..........بچّے باری باری اسے گود میں لے رہے تھے کوئی اسے گود سے اتارنے کو تیّار نہیں تھا۔ میں نے یوسف کو پیار سے بلایا، اپنے پاس بٹھایا اور اس ننّھے منّے کھلونے کو اس کی گود میں دے دیا۔ وہ بہت خوش ہوا اور اسکی ناراضگی بھی دور ہوگئی، آہستہ آہستہ بھائی کے لئے اسکا دل بھی صاف ہوگیا۔ ایک ہفتہ کے بعد ہسپتال سے چھٹّی ملی۔ گھر پہنچتے ہی لوگوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہوگیا ، روزانہ کوئی نہ کوئی مبارکباد دینے آجاتا آنے والے چھوٹے بڑوں کا مرکز بھی دانش صاحب ہی ہوتے۔ وہ ہمارے گھر کے وی آئی پی جو ٹھہرے۔

وقت کیسے گزرا، پتہ ہی نہیں چلا۔ دانش صاحب چار مہینے کے ہوگئے، اب تو وہ اغوں ....اغوں کرکے باقاعدہ باتیں کرتے۔ کوئی ان کے نزدیک آتا تو جلدی جلدی ہاتھ پاؤں مارتے تاکہ وہ ان کو اٹھالے ، میٹھی میٹھی آنکھوں سے اس کو دیکھتے، ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر بات کرو تو خوب ہنستے، کبھی زور زور سے کلکاریاں بھی مارتے۔ وہ جیسے جیسے بڑے ہوتے جارہے تھے نہ صرف ان کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا بلکہ ان کی ادائیں بھی دل موہ لیتی تھیں۔ سبھی ان پر فریفتہ تھے۔ گھر میں جو بھی آتا ان کو گود میں لئے لئے پھرتا مگر ان کے چاہنے والوں میں سب سے آگے عمرانہ تھیں۔ عمرانہ ہمارے گھر کے سامنے رہتی تھیں، دبلی پتلی۔۔لڑکی سی۔ شادی ہوئے تین سال ہوگئے تھے مگر اب تک کوئی اولاد نہیں تھی۔ اسکے شوہر ابھی بچّے نہیں چاہتے تھے، اسکے برعکس عمرانہ کو بچّوں سے بڑا لگاؤ تھا اور دانش کی تو وہ دیوانی تھی................دانش کی کلکاریوں نے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ اب دانش سات مہینے کے ہوگئے تھے۔ اس دن عمرانہ آئیں تھوڑی دیر تک وہ دانش سے کھیلتی رہیں پھر ملتجیانہ انداز میں بولیں ''باجی آج دانش کو اپنے گھر لے جاؤں'' میں نے چونک کر اسے دیکھا ۔

''تمہارے صاحب بہادر تو چھ، سات بجے سے پہلے گھر نہیں آتے ابھی تو چار بج رہے ہیں۔ کھانا تم پکا چکی ہو۔ روٹیاں تم تازہ بنا کر پیش کروگی۔ پھر گھر جا کر کیا کروگی......؟ یہیں بیٹھو، چائے بن رہی ہے، چائے پی کر جانا۔'' میں نے ایک تقریر جھاڑ دی ۔لیکن میری تقریر بے کار گئی۔

''میری ایک کالج کی دوست نے چار بجے آنے کے لئے کہا تھا۔ مجھے چلنا ہوگا، لیکن دانش کو چھوڑ کر جانے کو مَن نہیں کررہا ہے۔۔۔۔لے جاؤں۔۔۔؟''

''تم دوست کی خاطر مدارات کروگی یا دانش کے نخرے اٹھاؤ گی'' میں نے عمرانہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دراصل میں دانش کو اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہ رہی تھی اور عمرانہ کا دل بھی نہیں توڑنا چاہ رہی تھی۔

''عابدہ میری بہت پرانی دوست ہے۔۔دیکھنا الٹا وہی میری خاطریں کرے گی۔ وہ دانش کے اور میرے نخرے اٹھائے گی'' یہ کہ کر عمرانہ دانش کو اپنے گھر لے گئی۔ میں نے باہر کا دروازہ بند کیا اور گھر کے کام کاج میں الجھ گئی۔

پتہ نہیں کتنا وقت گزرا۔۔۔۔دروازے کی گھنٹی سن کر میں دروازے کی جانب بڑھی۔ گھنٹی بجانے والا کوئی اجنبی تھا، میں ہر کسی کی گھنٹی پہچان لیتی ہوں۔ میں نے دروازہ کھولا ، ایک اجنبی لڑکی دانش کو بازوؤں میں اٹھائے کھڑی تھی۔ عمرانہ ساتھ نہیں تھی۔ میں سوچ رہی تھی شاید یہ عابدہ ہے۔ اس نے میری حیرانی کو محسوس کرلیا ، دانش کو میری طرف بڑھایا اور بولی:'' باجی عمرانہ دانش کو گود میں اٹھائے زینے سے گر پڑی ہے''

میں نے دانش کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالا اور بولی۔'' عمرانہ'' ۔۔۔۔۔

'' وہ بے ہوش پڑی ہے........زخمی۔''

میں نے دانش کو گود میں اوپر اٹھا کر دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر نشان بنا گئے تھے۔ جیسے وہ بہت رویا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔چہرہ زرد ، میں نے ہلایا جلایا۔۔۔مگر وہ تو بے ہوش تھا۔۔۔۔!

میں پریشان ہوگئی۔۔۔۔۔گھر اور بچّوں کو بوّا پر چھوڑا، اور میں دانش کو لے کر ہسپتال بھاگی۔ راشد کو آفس، موبائل پر اطلاع دی۔ مجھ سے پہلے وہ ہسپتال پہنچ گئے۔ دانش کو راشد اور ڈاکٹروں کے درمیان چھوڑ کر میں ہسپتال کی لابی میں سجدہ ریز ہوگئی۔ ایک عجیب سا خوف مجھے گھیرے جارہا تھا ۔۔۔میں دعا کررہی تھی'' میرے مالک دانش کو کچھ نہ ہو، وہ ٹھیک ہوجائے'' اچانک سردی کی ایک لہر میری کمر سے سینے کی طرف گئی اور دل میں اتر گئی، سجدے سے سر اٹھا کر میں نے چیخ چیخ کر رونا شروع کردیا تھا، مجھے کچھ ہوش نہیں تھا، پتہ نہیں کب ڈاکٹر کمرے سے نکلے۔ راشد نے مجھے اس طرح لپٹا لیا جیسے میں دانش کو لپٹا لیتی تھی ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بڑی مشکل سے وہ کہہ پائے'' دانش ہمیں چھوڑ کر چلا گیا '' ۔۔۔۔۔۔

'' ایسا کبھی نہیں ہوسکتا'' میں نے اپنے آپ کو راشد سے علیحدہ کیا اور ایک طرف دوڑی۔ دو وارڈ بوائے'' میرے دانش'' کو لے جارہے تھے۔ میں نے اسٹریچر کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دانش سے لپٹ کر بے ہوش ہوگئی۔

جب مجھے ہوش آیا۔ کمرے میں بہت سی عورتیں جمع تھیں ۔۔۔۔۔میں 'دانش' پکارتے ہوئے بھاگی۔ عورتوں نے مجھے پکڑ کر بٹھایا۔ سب مجھے اپنے اپنے طریقے سے تسلّی دے رہے تھے۔ مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا دل سینے سے باہر نکلا جارہا تھا۔ مجھے دانش کے بغیر قرار نہیں آرہا تھا مگر ۔۔۔ میری آہیں ۔۔۔ میری تڑپ۔۔۔۔میری ممتا۔۔۔۔دانش تک پہونچنے کا ہر رستہ بند تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ کاش میں نے اسے عمرانہ کے ساتھ نہ جانے دیا ہوتا۔۔کاش میں نے اسے تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے سے دور نہ کیا ہوتا ۔۔کاش۔۔!

اور پھر۔۔۔سفید کفنی میں ملبوس 'دانش' میرے سامنے لیٹا تھا۔۔۔آج بھی اس کا صرف چہرہ کھلا تھا۔ گلاب کی جگہ سفید موتی جیسا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، پلکوں کی گھنیری جھالر، سفید ہونٹ۔۔۔وہ زندگی سے کتنی دور چلا گیا تھا۔

راشد کو ان کے دوست پکڑے ہوئے تھے، وہ بھی غم سے نڈھال تھے۔ پھر کسی نے بڑھ کر 'دانش' کو اٹھالیا۔ وہ سب دانش کو لے کر چلے گئے ۔۔۔۔۔'شہرِ خموشاں' کی طرف ۔۔۔۔۔۔۔۔مجھے ہوش نہ رہا۔۔۔۔۔نیند کی دوائیں دے کر مجھے سلایا جاتا رہا۔۔۔۔۔میں جب بھی ہوش میں آتی روتی، تڑپتی، آپے سے باہر ہوجاتی۔۔۔۔ ایسا لگتا میرا کلیجہ پھٹ جائیگا۔۔۔۔۔مجھے زندہ رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، میرا دل چاہتا کہ میں بھی دانش کے پاس چلی جاؤں۔۔۔۔۔۔۔۔ اسی دوران میرے کانوں میں یہ بھی پڑتا رہا کہ عمرانہ ہسپتال میں زخموں سے چور ہے۔ اسنے دانش کو بچانے کی کوشش میں اپنے آپکو زخمی کرلیا تھا۔ اس نے ہسپتال سے ہر آنے جانے والے سے اپنے پچھتاوے بھجوائے تھے۔ اس کے شوہر نے ہمارے گھر آکر اس کی طرف سے معافی مانگی۔

یہ گھر جو دانش کے سوگ میں بھر گیا تھا۔۔۔۔خالی ہوگیا۔ ایک دن میں کرسی پر بیٹھی خلاء میں دانش کو ڈھونڈ

رہی تھی۔ میرے ہاتھ اس کو تھامنے کے لئے بے چین تھے، میری گود اس کے لمس کے لئے بے قرار تھی۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو گر رہے تھے۔۔۔میری بڑی بیٹی رِدا میرے آنسو پونچھتے ہوئے بولی:

" امّی آپ کو دانش بہت یاد آتا ہے۔۔۔مجھے بھی بہت یاد آتا ہے "

آج پورے ایک ہفتہ کے بعد میں نے اپنے بچّوں کی طرف دیکھا۔۔نہ بچّوں کے کپڑے صحیح تھے، نہ ہی بال ٹھیک سے بنے ہوئے تھے۔"یہ میں کیا کر رہی ہوں۔۔میں نے اپنے بچّوں کو کس حال میں چھوڑا ہوا ہے۔اگر میں نے اپنے آپ کو نہیں سنبھالا تو میرے بچّوں کو کون سنبھالے گا۔۔؟ شاید میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے سوال کیے۔میں نے تینوں بچّوں کو لپٹا لیا اور ڈھائی سالہ یوسف جو میری ٹانگوں سے لپٹا کھڑا تھا اسے گود میں اٹھا لیا۔"یہ دانش ہی تو ہے۔میرے آس پاس تین اور دانش موجود تھے۔چاروں میرے اپنے تھے۔ایک اور دانش شاید غلطی سے آ گیا تھا۔" میں نے سوچا اور میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔آہستہ آہستہ معمولاتِ زندگی نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ایسا نہیں تھا کہ میں دانش کو بھول گئی تھی۔۔۔۔البتّہ میں نے دانش کی یاد کو اپنے دل کی حد تک محدود کر لیا تھا۔

ایک شام عمرانہ اپنے میاں کے ساتھ ہمارے گھر آئی۔وہ ہلکا سا لنگڑا کر چل رہی تھی۔آتے ہی وہ میرے قدموں پر گر گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی، اور معافی مانگنے لگی۔میں نے اسے اپنے پیروں سے الگ کیا، اٹھا کر کھڑا کیا، صوفے پر بٹھایا، دونوں کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔جب وہ چلے گئے تو میں نے محسوس کیا کہ میں نے عمرانہ کو معاف نہیں کیا ہے۔اگر چہ کہ میں یہ جان چکی تھی کہ زینے سے گرنا محض ایک حادثہ تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ گرتے گرتے بھی اس نے دانش کی حفاظت کی تھی۔مگر میری آنکھیں اس کی صورت دیکھنے کے لئے تیّار نہیں تھیں۔مجھے اس سے میل جول ترک کرنا پڑا تھا۔وہ دونوں بھی چند ایک روز بعد کہیں اور چلے گئے تھے۔ان کے میاں کا کسی اا ور شہر میں تبادلہ ہو گیا تھا۔

اس واقعہ کو دو سال گزر چکے تھے۔ایک شام دروازے کی گھنٹی بجی۔گھنٹی اجنبی تھی۔میں یوسف کو پڑھانے کی کوشش میں لگی تھی۔راشد دروازے کی طرف گئے تھوڑی دیر بعد وہ تقریباً ایک سال کے بچّے کو گود میں اٹھائے ہوئے آئے۔میں نے بچّے کو ایک نظر دیکھا۔بچّہ کیا تھا۔۔۔حسن اور معصومیت کا شاہکار مجسّمہ۔۔۔بچہ پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد میں نے راشد کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا؟ دروازے کے باہر یہ کھڑے تھے۔۔تنہا۔۔۔

" بیٹے آپ کون ہیں" میں نے پوچھا اور بچّے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔تو وہ رونے لگا۔میرے اندر 'ممتا' کا ایک طوفان اٹھا، میں نے اسکو لپٹا لیا۔یا شاید خود ہی اس سے لپٹ گئی۔۔۔۔پھر جلد ہی میں نے اس کے منہ میں کیلے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیا، اس نے منھ کھول کر نوالہ سا لے لیا۔۔۔اس کے بعد باقی کیلا بھی اس کو کھلا دیا۔تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے بیٹے یوسف کو بالکل بھول گئی تھی۔جب مجھے یوسف کا خیال آیا اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔۔وہ اس وقت تک سب بچّوں کو اکھٹّا کر چکا تھا۔میں اس نو وارد پھول سے بچّے کو اپنے بچّوں میں گھرا چھوڑ کر راشد کی طرف متوجّہ ہوئی جو ہم سب کو بڑے پیار سے دیکھ رہے تھے۔

" دانش کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔"

"دانش۔۔؟" راشد نے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

" دانش۔۔۔؟ آپ نے اجنبی بچّے کو دانش پکارا "

"جی کیا فرمایا آپ نے؟ میں نے اجنبی لڑکے کو دانش کہا۔محترمہ سب سے پہلے دانش کا نام آپ کے منہ سے نکلا "

" کیا واقعی ۔۔۔۔؟" میں نے کہا۔

اس دوران وہ بچہ میرے اور راشد کے بیچوں بیچ آ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔جیسے اس کا نام دانش ہوا اور ہم دونوں کی زبان سے بار بار "دانش" ادا ہوتا سن کر ہمارے بیچ آ گیا ہو۔۔۔۔۔میں یہ محسوس کر کے اور سوچ کر سنّاٹے میں آ گئی۔راشد اس معاملے پر غور نہ کر سکے۔۔۔۔"یہ تو صاف بات ہے، کسی نے گھنٹی بجائی اور لڑکے کو دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا" راشد کسی قدر تامّل کے بعد بولے

"ایسا کون کر سکتا ہے۔۔۔؟ اور یہ لڑکا کس کا ہے۔۔۔۔۔۔؟ میں نے راشد کو 'سوالات' دینے کی کوشش کی۔

"تمہارے ان سوالات کا جواب تو پولس ہی دے سکتی ہے۔ہمیں لڑکے کو فوری طور پر پولس چوکی پہنچا دینا چاہئے۔ورنہ ہم خود کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔" راشد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

" راشد ڈیئر۔۔۔ایسا بھی تو کیا جا سکتا ہے کہ آپ پولس چوکی فون کر کے اطلاع دیں اور بچّے کو گھر میں ہی رہنے دیں۔" میں نے بچّے کو پولس والوں کے ہاتھوں میں لگنے سے بچانے کی کوشش کی۔

اتنے میں بچّہ روتا ہوا میری طرف آیا، میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔بچّے کو گود میں اٹھاتے ہوئے میری نظر اس کی قمیض کی جیب میں رکھے لفافے پر پڑی۔میں نے اس کی جیب سے لفافہ نکالا اور راشد کی طرف بڑھا دیا۔

لفافہ دیکھتے ہی وہ زور سے ہنس پڑے۔اور بولے "اچھّا تو یہ معاملہ تھا۔۔؟"

"کیسا معاملہ ۔۔؟" میں بولی

" کچھ نہیں۔۔۔۔بھیک مانگنے کا ایک جدید طریقہ"

"بھیک" میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"جی ہاں۔۔۔بھیک۔۔لفافے میں ایک چھپی یا خوشخط لکھی ہوئی اپیل ہو گی۔۔۔یتیم ۔۔یسیر۔۔بچّے کی مدد کرنے کی۔۔۔۔"

راشد نے یہ کہہ کر لفافے میں سے پرچہ نکالا۔۔۔۔۔جو کچھ اس پرچے میں لکھا ہوا تھا اسکو پڑھ کر راشد کو جیسے رعشہ سا طاری ہو گیا۔۔۔انہوں نے وہ پرچہ میری طرف بڑھا دیا۔میں نے پرچہ لے لیا۔لیکن راشد کا بدلا ہوا چہرہ میری نظروں میں کُھب کر رہ گیا۔۔میں نے پرچے پر ایک نظر ڈالی۔مجھے اپنی بینائی جاتی ہوئی معلوم ہوئی۔تحریر میری آنکھوں کے سامنے موجود تھی لیکن اس پر یقین کرنا ممکن نہیں تھا۔ پرچہ پر تحریر تھا۔۔۔۔۔۔۔۔:

" باجی۔سلام، ہم لوگ آپ کا "دانش" لوٹا رہے ہیں۔اس پر ہمارا حق نہیں ہے۔آپ کی امانت آپ کو مبارک ہو۔ آپکی قصوروار عمرانہ"۔

☆☆☆

محمد حامد سراج (چشمہ بیراج، میانوالی)

ریشم کے ریشے

’’ریشماں والی گلی میں ایک دکان ہے کشیدہ کاری کی۔۔۔۔کلورِیاں والی گلی!‘‘

ریشماں والی گلی کا نام میرے مانوس نہ تھا تاہم کلورِیاں والی گلی میرے دھیان میں آتے ہی ایک مہک سے جڑ گئی تھی۔میں ایک مدت بعد یہاں آیا تھا اس اسی بیچ والے عرصہ میں بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن کلورِیاں والی گلی کے ساتھ ریشماں والی گلی کا اجنبی نام آیا تو عین اسی سمے اس کی نامانوسیت معدوم ہو چکی تھی کہ اس کے ساتھ میرا بچپن جڑا ہوا تھا۔تب میں گئوشالہ پرائمری سکول میانوالی میں پانچویں کا طالب علم تھا اور میں اسی گلی سے ہو کر گزرا کرتا تھا۔کشیدہ کاری کی دکان سے مجھے ایک سوٹ لینا تھا۔

کلورِیاں والی گلی تک میں اپنے بچپن کی انگلی تھام کر پہنچ گیا اس گلی میں داخل ہو کر مجھے یوں لگا کہ کچھ بھی نہ بدلا تھا۔مانوس دیوار و در سے جا چکے وقت نے پلٹ پلٹ کر مجھے بلانا اور بہلانا شروع کر دیا تھا۔میں گلی کے اندر دور تک گھستا چلا گیا حتیٰ کہ مسجد لوھاراں کے بغل میں موجود حافظ والی ہٹی آ گئی جہاں سے ٹافیاں‘ بتاشے‘ ریوڑیاں‘ ٹانگری‘ اور مونگ پھلی لینا معمول تھا۔یہیں قلفی والی ریڑھی لگا کرتی جو شام ڈھلنے تک گلی میں موجود رہا کرتی تھی۔اس ریڑھی سے ہم ایک آنہ‘ دو آنہ کی قلفیاں لیا کرتے تھے۔کچھ آگے نکڑ پر منیاری کی دکان تھی اور پھر وہ مکان جہاں سے روزانہ شام، میں نانی اماں کے کہنے پر میں دودھ لایا کرتا تھا۔

اس سے آگے بھی گلی کلورِیاں چلتی تھی مگر میں ایک مہک کی گرفت میں آ گیا تھا جو یہاں آتے ہی میرے تعاقب میں تھی۔بھیڑ کے اندر جس میں، میں گھسا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا، ایک جھپاکے کے اندر سے اس مانوس مہک کو اٹھتا اور بھیڑ کے اندر گم ہوتا دیکھ رہا تھا۔۔اب میں اس کے تعاقب میں تھا۔ادھڑے وقت کے سارے رخنے جیسے اس مہک نے پاٹ دیے تھے۔ مہک معدوم ہو گئی یا پھر وہ گلی ختم ہو گئی تھی جو دھرم شالہ کے پاس پہنچ کر کھل جاتی تھی۔

کھلی گلی کے اجالے نے مجھے چونکایا تو مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میں بہت آگے نکل آیا تھا۔آگے نہیں، بہت پیچھے۔میں نے اپنے قدموں پر گھوم گیا۔عجلت مجھے آگے کو کھینچتی تھی کہ ہزار کام تھے جو نمٹانا تھے۔۔۔میں نے ایک راہ گیر

سے پوچھا: بھائی ریشماں والی گلی کون سی ہے۔۔۔؟

یہ سامنے ریشماں والی ہی تو ہے۔۔

اور کلورِیاں والی۔۔۔؟

وہ اس کے ختم ہوتے ہی شروع ہو جائے گی۔

مجھے یاد آیا کہ آتے ہوئے مجھے بتایا گیا تھا کہ جب کلورِیاں والی گلی ختم ہو گی تو کلورِیاں والی گلی نے آ جانا تھا۔

جہاں میں تھا وہاں سے بتائی گئی حقیقت اوندھی ہو گئی تھی۔

پہلے جس گلی کو جہاں ختم ہونا تھا وہ وہاں سے شروع ہو رہی تھی اور شروع ہونے والی ختم۔

جب میں ریشماں والی گلی میں پھر سے داخل ہوا تو مجھے یہ تخمینہ لگانے میں دیر نہ لگی تھی گلی کا یہ حصہ جو پہلے کلورِیاں والی گلی ہی تھا منیاری کپڑے اور درزیوں کی غیر معمولی دکانوں کی تعداد زیادہ ہو جانے سے ریشماں والی گلی ہو گیا تھا۔میں بچپن کی گرد جھاڑتا اپنا نام بدل لینے والی گلی کے وسط میں موجود کشیدہ کاری کی دکان میں داخل ہو گیا۔

زگ زیگ مشین پر دکان دار اپنے کام میں مگن تھا۔میں نے ہاتھ ملایا تعارف کرایا اور بیٹھ گیا۔اسے وقت پیچھے دھکیلنے میں ذرا دقت نہ ہوئی تھی۔چائے منگوائی اور بہت کچھ ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالا۔اسی دوران ایک نوجوان نے اپنی سائیکل دیوار کے سہارے کھڑی کی اور اندر داخل ہوا۔اس کی بغل میں کالی شال تھی۔نکلتا ہوا قد‘ نوکیلی مونچھیں‘ پاؤں میں میانوالی کی روائتی تِلّے والی کھیڑی‘ بوسکی کا لمبا کُرتا، لٹھے کی شلوار‘ وہ وجیہہ لگ رہا تھا۔

’’یہ میری شال ہے بہت شوق سے بنوائی تھی میں نے۔سائیکل کے پہیئے میں آ کر برباد ہو گئی۔کیا یہ مرمت ہو سکتی ہے۔۔۔؟

دکان دار نے شال کو دیکھا، پرکھا اور کہا: ’’رفو ہو جائے گی‘‘

جوان نے دکان میں چہاروں طرف نظر ڈالی۔جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔کیلنڈر پر۔دیوار پر چسپاں ایک ایکٹریس کی تصویر پر بہت دیر تک اس کی نظریں ٹکی رہیں۔جدید ملبوس سے کہیں زیادہ اس کے اندر سے چھلکتا اس کا بدن اسے لبھا رہا تھا۔اس جیسی دوسری تصاویر پر سے اس کی نظریں پھسلتی پھر اپنی شال پر آ کر ٹِک گئیں۔اس بار اس کا مخاطب میں تھا:

’’روپیہ روپیہ جوڑ کر یہ شال بنوائی ہے میں نے۔رفو کرنے سے یہ اوڑھنے کے قابل تو ہو جائے گی نا۔۔۔؟‘‘

’’ہاں بالکل۔۔۔رفو ہو کر ٹھیک ہو جائے گی۔‘‘

’’بہت سال بعد اللہ نے خواہش پوری کی، لیکن سائیکل کے پہیئے میں آ کر شال ادھڑ گئی۔‘‘

جتنی دیر شال مرمت ہوتی رہی میں وہ رفو گری کا عمل غور سے دیکھتا رہا۔

دکان کے سامنے والے تھڑے پر ایک شخص، جس کے لباس میں بے شمار پیوند تھے، بیٹھا اپنی جوتی گانٹھ رہا تھا۔وقفے

وقفے سے اس کے حلق سے حق ھُو کی آواز نکلتی جو میرا دھیان کھینچ رہی تھی۔ بوڑھا خود دنیا و مافیہا سے بے خبر جوتی گانٹھنے میں مگن تھا۔ گویا وہ گلی اور اس میں موجود بھیڑ اس کے لیے جیسے تھی ہی نہیں۔

میں، سارے منظر سے لاتعلق اپنی دنیا میں مگن اس شخص کی طرف پوری طرح متوجہ نہ ہو پا رہا تھا کہ منقسم ہونے والی گلی، ادھڑی ہوئی شال کے ریشے اور معدوم ہو جانے والی مہک بیچ میں آ کر میرا دھیان کاٹ رہے تھے۔

جوتی گانٹھتے گانٹھتے اس شخص نے سر اٹھایا، یہاں تک کہ اس کی نگاہ آسمان پر جا کر ٹک گئی۔ اس کے حلقوم سے حق ہو کی صدا نکلی۔ میری گردن تیزی سے اس کی جانب گھومی، عین اسی لمحے میں اس کی نگاہیں آسمان پر جا کر الجھ گئیں۔

اس بار حق ہو کی پکار اس کے تنے ہوئے حلق کو چیرتے ہوئے نکل کر پھٹ گئی تھی۔

ادھڑی ہوئی شال کی طرح ادھڑی ہوئی آواز نے میرے دھیان کی گٹھڑی باندھ کر اپنے پاس دھر لی تھی۔

اوپر کو اٹھا ہوا سر تیزی سے واپس اس کی جھولی میں گر گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے کٹے ہوئے حلق کے کنارے بج رہے تھے:

''عشق کیہے تساں چنگا کیتا، بوہے یار دے واڑیا سی،،

یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے اپنے دھیان کی گٹھڑی اپنی گرفت میں لے لی تھی۔ اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ گلی کٹ کر جڑی تھی یا جڑ کر کٹ گئی تھی کہ ادھڑے ہوئے وقت کی شال کے ریشے رفو ہو کر اپنی جگہ پر پھر سے بیٹھ گئے تھے اور میں ادھر ادھر سے بے نیاز اس سمت جست لگا چکا تھا جہان معدوم ہونے والی مہک کے وسیلے سے کٹنا اور جڑنا ایک سا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

میں نے جب کبھی لفظوں کی کائنات پر غور کیا ہے تو مجھے اس میں بھی دو متوازی دھارے واضح طور پر دکھائی دیئے ہیں، ان میں سے ایک دھارا تو وہ ہے جس میں الفاظ کثرتِ استعمال سے دمبدم اپنی داخلی حرارت سے محروم ہو رہے ہیں۔ یعنی مرگِ حرارت میں مبتلا ہیں اور یوں law of entropy کے تابع ہو کر نہ تو خود کو Regenerate کر سکتے ہیں اور نہ تخلیق کے عمل ہی سے بہرہ مند ہونے پر قادر ہیں۔۔۔۔۔ دوسرا دھارا ان الفاظ کا ہے جو فن کار کے ہاتھوں کے لمس سے زندہ اور بوقلموں جسموں کی طرح دھڑکنے لگتے ہیں۔۔۔۔ ایک اچھے ادیب کا کام ہے کہ وہ اپنے تخلیقی عمل میں پہلے تو لفظ کو اس کے مروّج مفہوم سے نجات دلاتا ہے اور پھر ایک جادوگر کی طرح اسے ایک نئے، تازہ اور زرخیز مفہوم سے منسلک کر دیتا ہے مگر یہ مفہوم کوئی پہلے سے طے شدہ نظریہ نہیں ہوتا بلکہ ایک پرچھائیں کے مانند ہوتا ہے جو لحظہ بہ لحظہ بڑی ہوتی چلی جاتی ہے اور اَن دیکھے، اَن چھوئے جہانوں کو صورت پذیر کرتی ہے۔

(ڈاکٹر وزیر آغا کے مضمون **علمی زبان اور ادبی زبان** سے اقتباس)

شِبہ طراز (لاہور)

ماندگی کا وقفہ

نسیمہ موتیا کی شاخیں سنوارتے ہوئے اس کے پھولوں سے مخاطب تھی۔۔

''مجھے پتہ تھا ضرور آئے گا۔۔ آخر پیدا کیا ہے اسے میں نے۔ میری محبتوں، میری دیکھ بھال کا اتنا صلہ تو دینا ہی تھا اسے۔۔۔ جیسے تُو۔۔ اپنی دیکھ بھال کے صلہ میں مجھے خوشبو دیتا ہے۔۔۔''

پھولوں نے ہنس کر اپنی خوشبو بھری پھونک اس کے چہرے پر پھینکی۔۔۔ اور دل ہی دل میں دعا کی کہ اس بوڑھی عورت کی آنکھوں میں امید کی روشن ہونے والی کرن اسی طرح جگمگاتی رہے۔۔۔

پھر وہ اپنے طوطے کے پنجرے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ہری مرچیں آدھی کھائی ہوئی پڑی تھیں۔ طوطا خوشی سے ادھر اُدھر پھدک رہا تھا۔ نسیمہ کو اپنی طرف متوجہ پا کر زور زور سے چیخنے لگا۔۔۔ ''بلال آ گیا۔۔۔ دیکھو۔۔۔ بلال آ گیا۔۔۔'' نسیمہ کے ہونٹوں سے ہنسی پھسلی اور طوطے کے پنجرے کی سلاخوں سے جھولنے لگی۔۔

وہ اسے چیختا چھوڑ کر اپنے چھوٹے لیکن صاف ستھرے باورچی خانے میں چلی آئی، جہاں برتن اوپر تلے دبے ہوئے کڑوے کڑوے منہ بنا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ، کہاں وہ کشادہ گھر تھا جہاں وہ ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر خوبصورت شیشے کی الماریوں میں سجے ہوتے تھے اور آنے والے مہمانوں کی نظریں ایک دوسرے کو ستائشی انداز میں دیکھ کر ان کی قیمتوں کا اندازہ لگاتی تھیں اور کہاں یہ تنگ سا، چھوٹا سا باورچی خانہ ہے جہاں وہ ایک دوسرے پر چڑھے پڑے ہیں۔

نسیمہ کیا کرتی۔۔۔ پچھلا گھر واقعی بہت بڑا تھا اور اس کے پائیں باغ میں نسیمہ نے قسم قسم کے پھل دار درخت اور پھول دار پودے لگائے ہوئے تھے۔ اس کا سارا دن بہت مصروف گزرتا تھا۔ بچے چھوٹے تھے، سکول جاتے تو وہ اپنے پودوں کے نوزائیدہ بچے نکال نکال کر مختلف گملوں اور کیاریوں میں لگاتی، گوڈی کرتی، پانی دیتی۔۔۔ پھل اور پھولوں کی کلیاں گنتی۔۔۔ پھر کسی نے اسے ایک چکور تحفے میں دیا۔ اس کے پاس پہلے بھی مختلف نسل کے چڑیوں اور طوطوں کے جوڑے تھے جن کو اس نے مختلف پنجروں میں اپنے باغ کے سایہ دار کونوں میں رکھا ہوا تھا۔ اپنے بچوں کے آنے تک وہ پودوں اور پرندوں سے فارغ ہو چکی ہوتی تھی۔ اسے ایک مرتبہ شوق چرایا کہ مور پالے۔ مور کے پر اسے بہت خوبصورت لگتے تھے۔ موروں کے جوڑے کو اس نے باغ میں کھلا چھوڑ دیا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے کام کرتے ہوئے وہ موروں کا نظارہ جاری رکھتی۔ بارشوں کے موسم میں کبھی کبھی جب مور اپنے پورے پر پھیلا کر ناچتا تو اس کا خود بخود شاعری کرنے کو جی چاہتا۔۔۔ لیکن وہ اس میدان میں بالکل کوری

تھی۔۔۔لکھنا تو دور کی بات وہ شاعری پڑھ بھی نہ سکتی تھی کیونکہ وہ ایک پُر امید، خوش باش گرہستن عورت تھی جس کو طرح طرح کے کھانے پکانے اور میاں اور بچوں کے لاڈ اٹھانے کے علاوہ کسی کام میں مزہ ہی نہ آتا تھا۔۔۔ کھانے پکا پکا کر وہ انہیں نئے نئے برتنوں میں سجاتی تاکہ کھانوں کا مزہ دوبالا ہو جائے۔ایک مرتبہ وہ کچھ نیا پکا کر پڑوسن کو دینے گئی تو اس نے بڑی محبت سے نسیمہ کو سمجھاتے ہوئے اسے مور پالنے سے منع کیا اور کہا کہ مور پالنے سے گھر ویران ہو جاتے ہیں۔اس نے ہنس کر اپنی پڑوسن کی بات نظر انداز کر دی تھی، پر جب کبھی مور زور زور سے چیختے تھے تو ایک لمحے کے لئے پڑوسن کے کہے ہوئے لفظ اس کے کانوں میں ہلچل مچاتے، فوراً ہی وہ یہ ہلچل اپنے دل کے نہاں خانے میں دفن کر دیتی تھی۔۔۔لیکن اُس روشن صبح کو جب اس کی آنکھوں کے سامنے یہ سن کر اندھیرا سا چھا گیا کہ بلال پڑھنے کے لئے باہر جانا چاہتا ہے۔۔۔اسے پڑوسن کی بات پر کچھ کچھ یقین آنے لگا۔۔۔بلال کے چلے جانے سے گھر تو کیا اس کی زندگی ہی ویران ہو جائیگی۔۔۔اس نے اس خوف کو سینت کر اپنے سینے سے چمٹا لیا لیکن آخر یہ انہونی ہو کر ہی ٹلی جب بلال نے مختلف زبانوں اور مضمونوں کے ٹیسٹ پاس کر لئے۔ویزا ملنے کی دیر تھی بلال نے پر عزم، روشن آنکھوں کے ساتھ اپنے کام کی چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔نسیمہ چپ اداس سی سارا دن اپنے پرندوں کے پنجروں کی صفائی میں خود کو مصروف رکھتی، اپنے پودوں سے خودرو اگنے والے ننھے ننھے گھاس کے پتوں کو نکالتی رہتی۔۔اور۔۔پھر بلال چلا گیا۔۔اب اس کا دل نہ تو چڑیوں میں لگتا نہ طوطوں میں۔۔نہ چکور ہی اسے بھاتا اور موروں سے تو اسے نفرت ہو چکی تھی۔زندگی سے اکتاہٹ کی وجہ سے اس کے پودے بھی سوکھنے لگے۔اس کی کیاریاں ویرانی اوڑھے پڑی رہتیں اور طوطے چڑیاں ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے تکتے رہتے۔

کتنے ہی سال گزر گئے۔بلال کو مزید تعلیم کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی۔۔۔اس کو گھر بیچنا پڑا۔۔۔ موروں کو اس نے چڑیا گھر والوں کو تحفتاً دے دیا۔چکور بیمار ہو کر مر چکا تھا۔نیا گھر چھوٹا بھی تھا اس لئے اس کے ساتھ صرف نارنجی چونچوں والی لالیاں اور چند آسٹریلین طوطے ہی جا سکے۔۔۔اور اس کا پیارا مٹھو جس کا نام اس نے روز یلا رکھا تھا۔۔جو ہر نئی بات خود بخود سیکھ لیتا تھا اور اکیلے میں نسیمہ کا دل بہلائے رکھتا تھا۔۔۔

کتنے ہی سال اور گزر گئے۔۔۔چھوٹی ماریا اب جوانی کی دہلیز پر آن بیٹھی تھی اور دن رات نجانے کیا سپنے دیکھا کرتی تھی۔وہ بلال کے جانے کے وقت اتنی چھوٹی تھی کہ اس کی یادداشت میں بھائی کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ ماں باپ کی آنکھوں میں انتظار اور امید کی شمعیں روشن دیکھ کر وہ نفرت اور محبت کے درمیان کسی No Man,s Land پر آ کھڑی ہوتی تھی۔کبھی بے اختیار ہو کر بھائی کے آنے کی دعائیں مانگتی اور کبھی اس کو کوستی اور پھر کسی ان دیکھی محبت کے زیرِ نگیں ہو کر اللہ سے معافی مانگتی۔

اور۔۔۔کل اچانک۔۔۔بلال آ گیا۔بغیر کوئی اطلاع دیے۔نسیمہ اپنے کریلے کی بیل کو دیوار پر پھیلاتے ہوئے ایک پرانا گانا گنگنا رہی تھی۔۔۔راجہ کی آئے گی بارات، رنگیلی ہو گی رات، مگن میں ناچوں گی۔۔۔اور یہ راجہ کبھی بلال کی شکل میں اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا کبھی ماریا کے ان دیکھے دولہا کی صورت میں جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا۔ایک تھکی ہوئی مضمحل مسکراہٹ کے ساتھ وہ بار بار گیت کے بول دوہرا رہی تھی۔۔۔کہ گھر کی

گھنٹی چیخی۔۔۔ایک کوّا منڈیر پر سے کائیں کائیں کرتا چھت پر لگی لوہے کی ریلنگ پر جا بیٹھا۔۔۔وہ مسلسل شور کر رہا تھا۔نسیمہ کا دل زور سے اچھلا اور دروازہ کھولتے ہی جیسے ملگجی اداس شام روشن ہو گئی۔۔۔وہ خوشی سے ہڑبڑا کر اندر دوڑی۔۔۔طوطے کو دیکھ کر چیخی۔۔۔ بلال آ گیا۔۔۔ بلال آ گیا۔۔۔ پھر باہر آئی۔۔۔شادیٔ مرگ کی کیفیت میں نسیمہ کو اپنے بازوؤں میں سنبھالتا بلال اندر داخل ہوا۔اوپر کے کمرے سے ماریا ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔خوشی کے مارے اس کی آنکھوں سے جھرنے رواں تھے۔۔۔طوطا حالات کا اندازہ لگا کر خوشی سے اپنے پنجرے میں ادھر اُدھر جھول رہا تھا اور چلا رہا تھا۔۔ بلال آ گیا۔۔ بلال آ گیا۔۔ پل کے پل گھر میں قہقہے گونجنے لگے۔قمقمے روشن ہو گئے۔پکوان تیار ہونے لگے۔۔۔برتن جو ایک دوسرے پر پڑے پڑے چپک چکے تھے، اب کھڑاک کھڑاک اپنی جگہیں بدل رہے تھے۔وہ اس اچانک چہل پہل پر سراسیمہ بھی تھے لیکن بہت جلدی کبابوں کی خوشبو، چٹنیوں کی کھٹاس اور کوفتوں کے ذائقوں نے ان پر ساری حقیقت کھول دی تھی۔۔وہ نئے نکور ہو کر میز پر بڑی تمکنت سے دھرے ہوئے تھے اور چھریوں کانٹوں کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔

زندگی میں وقت پر لگا کر نامحسوس طریقے سے اڑتا رہتا ہے لیکن دل کی زمینوں پر زمانے ٹھہر جاتے ہیں۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں یہ پندرہ دن پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔۔کچھ بھی طے نہ ہو سکا۔۔ماریا کے سپنوں کی حد، نسیمہ کی امیدوں کی گہرائی اور ابراہیم کی دعاؤں کی وسعت، سب کمرے میں ادھر اُدھر بکھری پڑی رہ گئیں۔سوالوں نے خود ہی ادھورے جواب آنکھوں سے چن لئے اور خیروں کے ان گنت تعویز اس کے گلے میں ڈال دیے۔

اگلی صبح بہت خاموشی سے طلوع ہوئی۔۔۔ابراہیم کو اپنی کنپٹیوں میں درد سا محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ ایک ہفتے سے اپنے کام پر نہیں جا سکا تھا۔دفتر سے بلاوے پر بلاوا آ رہا تھا۔آج تو اسے جانا ہی تھا۔۔۔ماریا کی ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ گرد سے اٹا تھا، وہ بستر پر بے سدھ پڑی پندرہ دن اور راتوں کی نیندیں پوری کر رہی تھی۔۔۔نسیمہ پودوں کو پانی دے کر اندر اپنی بوسیدہ لکڑی کی کرسی پر جھول رہی تھی جس کی چرخ چوں سے کمرے کی فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔وہ آنکھیں بند کئے تسبیح کے دانے گھما رہی تھی۔۔۔بلال ابھی سفر میں ہو گا۔۔۔نیلے پانیوں سے بہت اوپر اس کا جادو کا ہنڈولا اسے اڑائے لئے جا رہا ہو گا۔۔۔وہ سفر کی دعائیں پڑھنے کے بعد یا سلامُ کا ورد کر رہی تھی۔۔۔۔نادان طوطا۔۔۔بغیر کچھ سوچے سمجھے تھوڑی تھوڑی دیر بعد نعرہ لگا دیتا تھا۔۔۔بلال آ گیا۔۔۔ بلال آ گیا۔۔۔اور نسیمہ کے دل پر ہر مرتبہ یہ سوچ کر گھونسہ پڑتا کہ بلال تو جا چکا۔۔۔اور اگلی صبح جانے کب آئے۔۔۔پھر تسبیح کا آخری دانہ گرا۔۔۔نسیمہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا، ایک چڑیا کھلی ہوئی کھڑکی سے جانے کب اندر آ گئی تھی اور اس کو واپسی کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔۔۔دو چار مرتبہ دیواروں سے سر ٹکرانے کے بعد آخر وہ چھت کے قریب بنی کھڑکی سے پھُر سے باہر نکل گئی۔۔۔نسیمہ کی نظریں کھڑکی کی طرح کھلی تھیں۔۔۔طوطا بدستور تھوڑی تھوڑی دیر بعد نعرہ لگا رہا تھا۔۔۔نسیمہ کا ہاتھ کرسی کے ہتھے سے ٹکرایا اور تسبیح ٹوٹ کر فرش پر جا گری۔اس کے دانے دھاگہ ٹوٹنے سے فرش پر دور دور تک بکھر گئے۔طوطے نے ایک لمحے کو مڑ کر دیکھا اور کچھ بھی نہ سمجھا۔۔۔اور خاموشی سے اپنے پنجرے کی سلاخ سے چمٹ کر اگلے منظر کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

اقبال حسن آزاد (مونگیر)

آسیب

کھادی کا سفید کرتا پائجامہ، فیروزی رنگ کی ایک ہاف سوئٹر اور دوپلّی ٹوپی زیب تن کئے یتیم میاں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ دبلی پتلی کایا، درمیانہ قد، پوپلا منہہ، رخسار پر کانٹے دار داڑھی اور بڑی بڑی آنکھیں..... یا یوں کہئے کہ پھٹی پھٹی آنکھیں.....گویا اپنے حلقوں سے نکلنے کے لئے بیتاب.....عجیب سی وحشت ان کے بشرے سے ٹپک رہی تھی۔ ایک پل کو سبھی چپ ہو گئے۔ جیسے link فیل ہو جانے پر ٹی وی چلتے چلتے اچانک disconnect ہو جاتا ہے۔ پھر وہ جیسے کمرے میں داخل ہوئے تھے، ویسے ہی اُلٹے قدموں لوٹ گئے۔

''یہ بڑے میاں کون ہیں؟'' آصف صاحب نے ایک طویل سانس کو سینے سے آزاد کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارے خاندانی نوکر ہیں۔ ابا جان کے ساتھ حویلی میں رہا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے۔ بے چارے بالکل تنہا ہیں۔'' رحمت حسین نے تفصیل بتائی۔

''آپ لوگوں نے ان کی آنکھیں دیکھیں.....کیسی وحشتناک تھیں......جیسے آسیب زدہ ہوں۔'' آصف میاں نے ایک جھرجھری لے کر کہا۔

''آسیب واسیب کچھ نہیں ہوتا ہے۔ یہ سب دماغ کا وہم ہے۔'' رشید صاحب اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہوئے بولے۔ یتیم میاں ڈرائنگ روم سے نکل چکے تھے مگر ایک لفظ ان کے کانوں میں پڑ ہی گیا۔ وہ بدبدا کر رہ گئے۔ ''آسیب!'' اور ان کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی اور اس دھند میں دھندلی دھندلی یادیں ان کے ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگیں۔

''ماشاءاللہ بہت ذہین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ زندگی میں بڑی کامیابیاں حاصل کرے گا۔'' ماسٹر صغیر اکثر ان سے کہتے۔ بیٹے کی تعریف سن کر کون باپ ہوگا جس کا سینہ فخر سے نہ پھول جاتا ہو۔ سو یتیم میاں بھی پھولے پھولے پھرتے مگر کسے معلوم تھا کہ.....انہوں نے ایک سرد آہ کھینچی اور نگاہوں کے سامنے ہنستا کھیلتا انور آ گیا۔ ایک دفعہ انور کی ماں نے کہا۔ ''اک ذری پیر صاحب سے تعویذ دلوا دیجئے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔''

اور وہ ننھے انور کی انگلی تھامے پیر صاحب کی درگاہ جا پہنچے تھے۔ شہر سے باہر ایک نیچی پہاڑی پر احاطہ سے گھری درگاہ انور میاں کو بڑی پر اسرار معلوم ہوئی۔ ان کی بڑی بڑی ذہین آنکھیں حیرت اور ایک نامعلوم خوف سے چونکی سی دکھائی دینے لگیں۔ پھر دونوں باپ بیٹا لکڑی کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ پیر صاحب کی

درگاہ کے سامنے جم غفیر تھا۔ زمانے بھر کے ستائے ہوئے ننگے بُچّے لوگ، پریشان حال، سر بہ گریباں پیر صاحب کی جانب امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جو ایک اونچی کرسی پر فروکش اپنی نیلی آنکھوں سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ درمیان میں ایک نوجوان، بے ترتیب داڑھی، الجھے میلے بال، آدھے بدن سے ننگا آنکھیں بند کئے زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کا بوڑھا باپ روتا جاتا تھا اور کانپتا جاتا تھا۔

''حضور! اب کیا ہوگا؟ میرا ایک ہی لڑکا ہے۔ حضور میں تو برباد ہو گیا، لٹ گیا۔'' اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ باپ کی انگلی تھامے ننھے انور میاں نے یہ سارا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اتنے سارے لوگوں کا جماوڑا اور اس پر سے بڈھے کا رونا۔ انور میاں ذرا گھبرا سے گئے۔ انہوں نے اپنے باپ کی انگلیاں کس کر تھام لیں۔ یتیم میاں نے ایک نظر ان پر ڈالی۔

''ابا! گھر چلئے۔'' یتیم میاں نے ان کا ہاتھ دھیرے سے دبایا گویا انہیں تسلیاں دے رہے ہوں۔ پھر انہوں نے درگاہ کے ایک خادم سے دریافت کیا۔ ''اس شخص کو کیا ہوا ہے؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''آسیبی کیفیت ہے۔''

''اب کیا ہوگا؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بعض آسیب جلد پیچھا نہیں چھوڑتے، جان لے کر ہی ٹلتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر خادم پیر صاحب کی جانب بڑھ گیا تھا۔

کچن سے شاہدہ نے انہیں آواز دی تو وہ حال میں لوٹ آئے۔ دونوں گھٹنوں پر زور دیتے ہوئے اٹھے اور کچن کے دروازے سے جھانکا۔ ''کیا بات ہے بہو؟''

شاہدہ نے کچن میں چائے بنا رہی تھی اس نے ذرا نیچی آواز میں کہا۔ ''ذرا دیکھ آیئے تو! کتنے لوگ ہیں؟''

''میں دیکھ آیا ہوں۔ کل پانچ آدمی ہیں۔'' یتیم میاں نے کہا۔ شاہدہ نے کمال چابک دستی سے پانچ کپ چائے بنائی اور ایک ٹرے پر لوازمات کے ساتھ انہیں تھماتے ہوئے بولی۔ ''ذرا پہنچا دیجئے۔ کم بخت شرفو بازار گیا تو وہیں سٹ گیا۔''

یتیم میاں نے ٹرے سنبھالی اور بلی کے قدموں سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ایک لمحے کو پھر خاموشی چھا گئی۔ یتیم میاں نے سلیقے سے ٹرے میز پر رکھی اور بے آواز قدموں سے واپس مڑے۔ خدمت گزاری کا سلیقہ انہوں نے وکیل صاحب کی حویلی میں سیکھا تھا۔ وکیل صاحب کے جدِ اعلیٰ سید حمایت علی خاں اپنے علاقے کے چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ ۱۸۵۷ میں جب غدر مچا اور انگریز افسران اپنی جانیں بچا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے تو انہوں نے ایک افسر کو پناہ دی چنانچہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جب ایک جانب سرفروشانِ وطن کو پھانسیوں پر لٹکایا جا رہا تھا تو دوسری جانب نمک خواروں کو سرفراز کیا جا رہا تھا۔ سید حمایت علی بھی انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں خان بہادر کے خطاب سے نوازے گئے۔ باون گاؤں کی عملداری ان کے حصے میں آئی اور

موصوف نواب سید حمایت علی خاں کے نام نامی اسم گرامی سے مشہور ہوئے۔ نوابی ملی تو عیش وعشرت کے دروازے بھی کھل گئے۔ انہوں نے شہر سے باہر ایک پرفضا مقام پر ایک عالیشان حویلی بنوائی۔ لق ودق حویلی اچھی خاصی بستی معلوم ہوتی تھی۔ شہر کی حد جہاں ختم ہوتی تھی وہاں پر ایک پتلی سی ندی تھی۔ ندی کیا تھی بس ایک بڑا سا نالہ سمجھ لیجئے۔ اس نالے کے اوپر ایک نیچا پل تھا..... یہی کوئی دس بارہ فٹ لمبا۔ ندی کے اس پار حویلی تھی۔ شہر کے لوگ اسے پارندی کہتے تھے۔ حویلی کے کئی حصے تھے..... مردان خانہ، زنان خانہ، نوکر پیشہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں مچھلیوں سے بھرا تالاب اور ایک ہرا بھرا باغ بھی تھا جس میں آم، لیچی، امرود، شریفہ، آڑو اور گابھ کے درخت تھے۔ نواب صاحب کو گابھ کا حلوہ بے حد پسند تھا۔ کہا کرتے تھے کہ یہ پھل اسم با مسمیٰ ہے۔ اس کے کھانے سے مرد کے اندر عورت کو گھابھن کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے اور اس کے استعمال سے خلوت کی رعنائیوں میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی نواب صاحب خلوت اور جلوت دونوں جگہ مقبول تھے۔ ہر شام مردان خانے رقص وموسیقی میں محفل سجتی۔ طرح طرح کی ضیافتیں ہوتیں۔ ہر دن عید تھا اور ہر رات شب برات تھی۔ کبھی فیض آباد کی چلبلی ننھی جان بلائی جاتیں تو کبھی لکھنؤ سے توبہ شکن زہرہ بائی کو دعوت دی جاتی اور پھر منہ کا مزہ بدلنے کے لئے حویلی کی خادمائیں بھی موجود تھیں: بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

اور واقعی خدا اس خاندان پر مہربان تھا۔ اس ہنگامے کے دو سال بعد ان کے فرزند ارجمند نواب وجاہت حسین خاں نے اس جہان آب وگل میں آنکھیں کھولیں۔ جب وجاہت حسین سن شعور کو پہنچے تو ملک میں امن قائم ہو چکا تھا اور راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنے والد ماجد کی روایت کو آگے بڑھایا اور خاندان کا نام روشن کیا۔ حویلی ہر وقت چھما چھم کرتی، در و دیوار کھنکتے اور یہ کھنکتی ہوئی آواز جب گنبد نیلگوں سے ٹکراتی تو چپ کھڑا آسمان آنے والے وقت کا خیال کر کے کانپ سا جاتا۔

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو ملک میں تبدیلی کی تیز لہر چلنے لگی اور آنے والے انقلاب کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ وجاہت حسین نے خود تو اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کی لیکن اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی انہیں بڑی فکر تھی۔ خدا نے انہیں تین بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ بڑے شرافت حسین، منجھلے صولت حسین، چھوٹے کفایت حسین اور سب سے چھوٹی نفیسہ بیگم عرف بانو۔ سبھی بچے مولوی سید منظر الحق کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ تلاش معاش میں گھومتے گھامتے نواب صاحب کی حویلی تک آ پہنچے تھے۔ عربی اور فارسی پر قدرت کاملہ تھی۔ الفاظ کی ادائیگی میں حرکت اور سکون کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اونچا لمبا قد، کشادہ پیشانی، چشمے کے پیچھے بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بلند آواز کے مالک مولوی صاحب زبان کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ ادھر زیر زبر گڑ بڑایا ادھر ان کی چھڑی زیر سے زبر ہو گئی۔ نواب صاحب کا حکم تھا کہ تعلیم کے معاملے میں حویلی کے بچوں کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی جائے۔ ایک دفعہ صولت میاں نے شعر پڑھا:

قِطع نہ کیجئے تعلق ہم سے گر نہیں عشق عداوت ہی سہی

شعر سنتے ہی مولوی صاحب بھڑک اُٹھے۔

''میاں! قِطع قِطع کیا بولتے ہیں۔ قَطع نہ کیجئے تعلق ہم سے۔ قاف کے اوپر زبر ہے۔ قَطع بمعنی کاٹنا۔ سمجھے۔''

کبھی سمجھاتے۔ ''شمع نہیں شمَع کہئے: ۔۔۔ شمَع ہر رنگ میں جلتی ہے سَحر ہونے تک

سِحر بمعنی جادو اور سَحر بمعنی صبح..... اسی سے سَحری بنا ہے۔ سمجھے؟

اس وقت یتیم میاں کے والد جمن میاں نواب صاحب کی خدمت پر مامور تھے۔ انہیں مولوی صاحب کے پڑھانے کا انداز بے حد پسند تھا چنانچہ جب مولوی صاحب بچوں کو پڑھانے کے لئے بیٹھتے تو وہ کسی نہ کسی بہانے آس پاس ہی گھومتے رہتے اور اپنی اصلاح کرتے رہتے۔ اب وہ نواب صاحب سے دریافت کرتے کہ حضور سَحری کے لئے کیا بناؤں؟ نصیبن کبھی کبھی ان کی نستعلیق اردو سے چڑھ جاتی مگر جمن میاں تو مولوی صاحب کے مرید تھے اور صحیح تلفظ کے ساتھ اردو بولنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ آج مولوی صاحب ہوتے تو نمعلوم نئی نسل کی زبان سے بگڑی ہوئی اردو سن کر ان کے دل پر کیا گزرتی۔ اب تو غلط سلط اردو بولنے والے بھی مل جائیں تو غنیمت ہے۔

شرافت حسین سارے بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین تھے۔ جب انہوں نے امتیازی نمبروں سے اسکول کی تعلیم مکمل کر لی تو مولوی صاحب کے مشورے سے انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے علی گڑھ بھیجا گیا۔ شرافت حسین خاں جب نئے نئے علی گڑھ میں وارد ہوئے اور کلاس میں پروفیسر صاحب نے ان کا تعارف جاننا چاہا انہوں نے بڑی شان کے ساتھ کہا۔ ''نواب زادہ سید شرافت حسین خاں۔''

پروفیسر صاحب نے ہنس کر کہا۔ ''واہ! سید بھی اور خان بھی۔ ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں تلوار۔''

نواب زادہ سید شرافت حسین خاں نے برجستہ کہا۔

''خان بہادر کا خطاب انگریز بہادر کی جانب سے ہمارے خاندان کو ملا ہے۔ بندہ بیک وقت سید بھی ہے اور خان بھی..... ٹھیک اسی طرح جس طرح سر سید احمد خاں۔'' اور پروفیسر صاحب ہنس کر چپ ہو رہے۔

شرافت حسین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مگر عالم بے عمل کی مانند زندگی بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ بیسویں صدی اختتام پذیر ہوئی اور ایک نئی صدی طلوع ہوئی۔ ادھر جیسے جیسے بیسویں صدی کا سورج اوپر اُٹھتا گیا ویسے ویسے انگریزی حکومت کا آفتاب ڈھلنے لگا۔ پورے ملک میں ایک نئی لہر چل پڑی اور گاندھی جی کی قیادت میں آزاد ہندوستان کا خواب دیکھنے والے جانباز سر سے کفن باندھ کر سڑکوں پر اتر آئے۔ مگر نواب صاحب کی حویلی ان باتوں سے لاتعلق سی تھی۔ آنے والے وقت کی دھمک سنائی تو دیتی تھی مگر اس پر کان دھرنے کی انہوں نے کبھی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ نواب وجاہت حسین کے زمانے والی بات تو نہ رہی تھی مگر ظاہری شان وشوکت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ درخت اوپر سے تو

گھنا اور بڑا دکھائی دیتا تھا مگر اندر ہی اندر کھوکھلا ہو چکا تھا۔ پھر بھی مرا ہاتھ سوا لاکھ کا۔ شرافت حسین انگریزی تہذیب کے دلدادہ تھے اور سرسید کے ہم خیال۔ ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے ماحضر تناول فرمایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں سر اُٹھا کر جینا ہے تو انہیں جدید تعلیم سے آراستہ ہونا ہوگا۔ ان کی تین اولادیں ہوئیں۔ شفقت حسین، شوکت حسین اور عنایت حسین۔ انہوں نے نواب کا دم چھلا ہٹا دیا تھا البتہ نام کے آگے خان لگایا کرتے تھے۔ دن مزے مزے میں کٹ رہے تھے مگر ستم پیشہ آسمان کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۱۹۴۶ میں جب جگہ جگہ فسادات کی آگ بھڑکی تو جمن میاں بھی اس آگ میں جل مرے۔ اس وقت یتیم میاں مادر شکم ہی میں تھے۔ بے چارے پیدائشی یتیم تھے لہذا ان کا نام ہی یتیم میاں پڑ گیا۔ نواب صاحب کو ان سے خاصی ہمدردی تھی۔ انہوں نے بہت کوشش کی یتیم میاں بھی حویلی کے بچوں کے ساتھ چار حرف پڑھ لیں مگر یتیم میاں کے خون میں وفاداری اور طابع داری کی موجیں لہریں مار رہی تھیں چنانچہ جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو نواب صاحب کی جوتیاں سیدھی کرنے لگے۔ ہمہ وقت ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ شرافت حسین کی نظر عنایت بھی ان پر تھی اور وہ انہیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔

اس وقت بہار رخصت پذیر تھی۔ سامان سفر بندھ چکا تھا۔ پت جھڑ کی چاپ سنائی دینے لگی تھی اور درختوں سے پتے جھڑنے شروع ہو چکے تھے۔ پہلے تقسیم کا سانحہ پیش آیا، پھر زمینداری ختم ہوئی۔ لوگوں نے جُوق در جُوق ہجرت کی تو حویلیاں اُجڑ گئیں۔ کہیں راجیہ ٹرانپورٹ کا آفس کھل گیا اور کہیں جیون بیمہ نگم کا دفتر قائم ہو گیا۔ بقول شخصے جہاں چنچل ناریاں رہا کرتی تھیں وہاں انچل ادھیکاری نواس کرنے لگے۔ چونکہ شرافت حسین نے پاکستان کے نظریئے کو سرے سے خارج کر دیا تھا لہذا پارندی والی حویلی اب تک قائم تھی۔ گابھ، چھوہارے اور انڈے کا حلوہ اب بھی بنتا تھا۔ ضیافتیں بھی ہوتی تھیں اور کونڈہ بھی۔ شرافت حسین کے دوست یار، خاص طور پر مرزا طہور علی، جو کھلی موٹر میں آتے تھے اور ترکی ٹوپی زیب تن کیا کرتے تھے، اب بھی قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے۔ شرافت حسین کو خوب گرم چائے پسند تھی۔ کہا کرتے تھے کہ عورت ہو یا چائے..... گرم ہی اچھی لگتی ہے۔ چنانچہ ایک بڑے سماور میں پانی گرم کر کے رکھ دیا جاتا تھا اور پیالیاں اس میں ڈبو دی جاتی تھیں۔ گرم پیالیوں میں چائے زیادہ دیر تک گرم رہتی تھی بالکل اسی طرح جس طرح اگلے وقتوں کے لوگوں کے جسم میں زیادہ عمر تک جوانی کی گرمی رہا کرتی تھی۔ حویلی کے پاس والی ندی سوکھ چکی تھی اور پگڈنڈی کا کام دیتی تھی مگر چند مٹی مٹی نشانیاں اب تک موجود تھیں۔ پل کے اس پار ایک قدیم لیمپ پوسٹ تھا۔ ہر شام لیمپ جلانے والا ایک سیڑھی ہاتھوں میں لئے آتا دکھائی دیتا۔ وہ سیڑھی کو لیمپ پوسٹ سے ٹکا کر اوپر چڑھتا، لیمپ کا شیشہ ایک جانب ہٹاتا، لیمپ روشن کرتا اور رات کی گہری ہوتی ہوئی تاریکی میں گم ہو جاتا۔ مگر تاریکی اس وقت اور گہری ہو گئی جب شرافت حسین میدان سیاست میں کود پڑے۔ کانگریس پارٹی جوائن کی اور اسمبلی کا الکشن لڑا۔ اس وقت کانگریس پارٹی کا انتخابی نشان دو بیلوں کی جوڑی تھا۔ مخالفین نعرہ لگاتے: دو بیلوں کی جوڑی ہے اک اندھا اک کوڑھی ہے

اس انتخاب میں شرافت حسین کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی اور کمیونسٹ پارٹی کے امیدوار رام چرن کامیاب رہے تھے۔ شرافت حسین کو اپنی ہار کا قلق نہیں تھا مگر اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ الکشن کے اخراجات پورے کرنے کے لئے انہیں حویلی سے ملحق زمینوں کو فروخت کرنا پڑا تھا اور اس کے خریدار وہی لوگ تھے جن کے پروج کبھی نواب صاحب کی ڈیوڑھی پر بڑا سا پگڑ باندھے، ہاتھ میں ڈنڈا تھامے اُکڑوں بیٹھے رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ''حجو ر! تو ہار کھکھار ہمار اُدار۔''

اس وقت شرافت حسین کے بڑے صاحبزادے عنایت حسین بیس سال کے ہو چکے تھے اور مقامی کالج میں بی اے کے طالبعلم تھے۔ شفقت اور شوکت اسکول میں تھے۔ یتیم میاں انہی دنوں حویلی کی ایک کنیز سے رشتہء ازدواج سے منسلک کر دئے گئے۔ شادی کے اگلے ہی سال جب جب انور میاں نے اس دنیا میں قدم رکھا تو یتیم میاں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ جب وہ کچھ بڑا ہوا تو اسے ماسٹر صغیر کے حوالے کر دیا گیا۔ اور جس سال عنایت حسین نے لاء کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی تو اسی برس انور نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے ایک سال بعد نواب شرافت حسین نے دنیا سے پردہ کیا۔ انور اب کالج کا طالبعلم تھا۔ یتیم میاں اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ وہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھا، دل کا سکون تھا، وہ ان کے لئے روح افزا تھا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی ان کی طرح نوکر بن کر رہے لہذا انہوں نے اس کے اندر خدمت گذاری کا جذبہ ہی نہیں پیدا ہونے دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ دنیا میں سر اٹھا کر جئے اور ان کا بھی سر اونچا کرے مگر ہائے افسوس.....

عنایت حسین نے ڈسٹرکٹ کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ وکیل صاحب روز صبح کالا کوٹ پہن کر جاسوسی دنیا سنبھالتے اور رکشے پر سوار ہو کر کورٹ جا پہنچتے۔ دن بھر پان سے شوق فرماتے، چائے پیتے اور جاسوسی دنیا میں کھوئے رہتے۔ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا کلائنٹ ان کے پاس آجاتا تو کچھ آمدنی ہو جاتی ورنہ دن یوں ہی گزر جاتا۔ ان کے منجھلے بھائی شوکت حسین نے جب اپنی تعلیم مکمل کر لی تو انہیں HEC رانچی میں سپروائزر کی نوکری مل گئی۔ مگر نوکری کے دوسرے ہی سال وہاں تاریخ کا بدترین فساد ہوا۔ شوکت میاں کسی طرح جان بچا کر بھاگ آئے مگر ایک بار جو آئے تو پھر پلٹ کر نہیں گئے۔ انہوں نے حویلی میں اپنا حصہ فروخت کر دیا اور پٹنہ جا کر آباد ہو گئے۔ مگر چھوٹے بھائی شفقت حسین اتنے خوش نصیب ثابت نہ ہوئے۔ انہیں جمشید پور میں ملازمت ملی تھی۔ اور جب وہاں فساد ہوا تو وہ مع اہل و ایال شہید کر دئے گئے۔

آزادی کا سورج طلوع ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا اور برادران وطن اس کا خوب خوب فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ پرانے پتے جھڑ چکے تھے اور نئی تہذیب کی کونپل پھوٹ چکی تھی۔ آنکھ کا پانی مر چکا تھا اور دل سے مروت ختم ہو چکی تھی۔ ایک دفعہ معمولی سے واقعہ کو لے کر جب شہر کا ماحول بگڑ گیا تو آس پاس کے مسلمان وکیل صاحب کی پناہ میں آ گئے گرچہ اس وقت تک وکیل صاحب خود بے پناہ ہو چکے تھے۔ لوگ ساری رات جاگتے رہے تھے۔

ایسے میں ایک منچلا نوجوان گنگنا اُٹھا تھا: آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے

اگر اس وقت مولوی صاحب موجود ہوتے تو فوراً ٹوک دیتے کہ میاں سحر نہیں، سَحَر بولو۔

اب بہار رخصت ہو چکی تھی۔ باغ ویران تھا اور مالی سر بہ زانو۔ ماسٹر صغیر حویلی چھوڑ کر جا چکے تھے۔ گابھ کا درخت تیز آندھی کی تاب نہ لا کر زمین بوس ہو چکا تھا۔ حویلی کا بیشتر حصہ فروخت ہو چکا تھا۔ سارے نوکر چاکر ڈوبتے ہوئے جہاز کے چوہوں کی طرح ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے۔ حویلی کے اردگرد نئے لوگ آباد ہو گئے۔ دن رات لاؤڈ اسپیکر پر بھجن کیرتن ہوتا رہتا اور وکیل صاحب زیرِ لب دعائیں پڑھتے رہتے اور جب بابری مسجد کے انہدام کے بعد جب ملک کی فضا بگڑی تو انہیں صاف لفظوں میں دھمکی دی جانے لگی کہ اگر جان کی خیر چاہتے ہیں تو حویلی کا باقی ماندہ حصہ بھی اونے پونے بیچ کر کہیں اور جا بسیں مگر عنایت حسین بھی خان بہادر کی اولادوں میں سے تھے لہٰذا اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔

اکیسویں صدی کا آغاز ہوا تو وکیل صاحب کی بیگم داغِ مفارقت دے گئیں اور پھر چند ماہ بعد یتیم میاں کی بیوی بھی گزر گئیں۔ اب صرف حویلی کا مردان خانہ بچا تھا جس کی رنگ و روغن کے لئے ترستی ہوئی دیواروں کو یہ دو نفوس سہارا دئے ہوئے تھے۔ انور گجرات کی کسی فیکٹری میں سپروائزر لگ گیا تھا اور وکیل صاحب کے تینوں بیٹے مختلف شہروں میں ملازمت کرنے لگے تھے۔

وہ نومبر کا ایک اداس دن تھا جب رحمت میاں کو فون پر خبر ملی کہ ان کے والد صاحب اس جہانِ فانی سے گزر گئے۔ سارے بھائی اپنی فیملی کے ممبران کے ساتھ اس آسیب زدہ حویلی میں یکجا ہوئے اور چہلم کے بعد یہ بچا کھچا حصہ بھی فروخت کر دیا گیا اور اس طرح ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ رحمت میاں کے دوست چائے کی ہلکی ہلکی چسکیوں کے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔ یتیم میاں ڈرائنگ روم کی دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ اندر سے پھر رشید صاحب کی آواز آئی۔ وہ کسی وکیل کی طرح جرح کرنے کے انداز میں کہہ رہے تھے۔ ''میں پھر کہتا ہوں، آسیب واسیب کچھ نہیں ہوتا۔ یہ سب دماغ کا وہم ہے۔'' اچانک یتیم میاں اندر داخل ہوئے۔

''کیا کہتے ہو بابو! آسیب ہوتا ہے، ضرور ہوتا ہے۔'' یتیم میاں ویران آنکھوں سے خلا میں گھورتے ہوئے بولے۔ پھر انہوں نے نہایت پر اسرار انداز میں کہا۔ ''پہلے تو صرف اکادکا لوگوں پر آسیب سوار ہوتا تھا۔ آج تو پوری قوم پر آسیب سوار ہے۔ پورب سے پچھّم تک اور اتر سے دکھن تک۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ لوگ؟''

یتیم میاں کے کانوں میں ایک دلدوز چیخ گونجی اور نگاہوں کے سامنے خون میں تر بتر لاشہ سڑک پر تڑپتا دکھائی دیا۔ یتیم میاں کی زبان سے ایک آہ نکلی۔ ''ہائے میرا انور۔''

ڈرائنگ روم میں ایک آسیب زدہ خاموشی چھانے لگی تھی اور یتیم میاں لرزتے قدموں سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

وزیر آغا (لاہور)

واپسی

گلی بھی وہی ہے
مکاں بھی وہی ہے
وہی ہے مکاں کا پُراسرار، بے نور چہرہ
مگر چور قدموں کی بے نام آہٹ
ملائم لبادے کی محجوب سی سرسراہٹ
''ہٹو راستہ چھوڑ دو'' کی چمکتی غصیلی ادا
پھر ہنسی ضبط کرنے کی مدھم صدا
وہ صدا اب نہیں ہے، کہیں بھی نہیں ہے
کہیں کچھ نہیں ہے
خموشی کی بھیگی ہوئی التجا کے سوا!

یہ سنسان زینہ کہ صحرا کی صورت ہے پھیلا ہوا
اس کی ٹھہری ہوئی، ریت ہوتی ہوئی
سلوٹوں میں کہیں
رُت کے پھولوں کی بکھری ہوئی پتیاں
اب بھی ہوں گی
لرزتے ہوئے مکڑیوں کے پُراَسرار جالوں میں
سرگوشیاں
جھولتے نرم دھاگوں میں لپٹی ہوئی
اَن کہی داستاں کی طرح
بے زباں اب بھی ہوں گی
گھِسی اور اُکھڑی ہوئی چھوٹی اینٹوں پہ
مہندی کی سُرخی کا مدھم سا کوئی نشاں اب بھی ہوگا
مگر تازہ پھولوں کی پاگل مہک
اور مہکتے لبادے میں اجلا بدن
اور کھنکتی ہنسی
پھر ہنسی ضبط کرنے کی مدھم صدا
تیز ہوتی ہوئی دھڑکنوں کا مدُھر سلسلہ
وہ مدُھر سلسلہ اب کہاں ہے!
زمانے کے جالے میں محبوس بجھتی ہوئی یہ صدا
جس کی خاطر تو سنسان زینے کے
پہلے قدم پر کھڑا ہے
صدا تو نہیں ہے
فقط لاش ہے ایک مُردہ صدا کی!

نصرت ظہیر (دہلی)

معمول

روز اک ٹرین کی برتھ
اپنی آغوش میں لے کر مجھ کو
رات بھر محوِ سفر رہتی ہے
اور اک انجان سے اسٹیشن پر
صبح دم چھوڑ کے آ جاتی ہے!

میں اس انجان سے ویران سے اسٹیشن پر
جس کا سگنل ہے کوئی اور نہ ٹکٹ کھڑکی ہے
اور نہ مسافر خانہ
ہر طرف ڈھونڈتا رہتا ہوں تمہیں
کسی چہرے کسی ملبوس میں تم مل جاؤ
اور لے جاؤ مجھے شہر کی آبادی میں...
میں، مگر بھیڑ میں تنہا ہی کھڑا رہتا ہوں
اپنے اسباب کے ساتھ
بوکھلایا ہوا مرجھایا ہوا
اور تم بھیڑ سے چہروں کی نکلتی ہی نہیں!
سارا دن یوں ہی چلا جاتا ہے...

آخر اس ٹرین کی برتھ
پھر مرے سامنے آ جاتی ہے
اور
پھر اپنے شکنجے میں جکڑ کر مجھ کو
لا کے واپس اسی کمرے میں پٹک دیتی ہے
جس سے کل رات مجھے لے کے چلی آئی تھی...

~~~~~~~~~~~~~~~

نصرت ظہیر

عادت

سفید چادر پہ بکھرے رنگوں کے درمیاں
وہ چمکتی آنکھیں
ستارے جیسے تلاش کرتے ہوں کہکشاں میں
شہابِ ثاقب کی رہ گزاریں
وہ اس کے انفاس کی حرارت
کہ جیسے بستر کی سلوٹوں میں لپیٹ لی ہو
کسی نے گزرے حسین لمحوں کی ہر شرارت
وہ اس کے ریشم سے بھی ملائم بدن کی خوشبو
کہ جیسے لوبان کا دھواں ہو فضا میں قائم
وہ آج کی شب پھر آ گئی ہے
خفیف قدموں سے میرے کمرے میں
حسبِ عادت!
~~~~~~~~~~~~~~~

جعفر ساہنی (کولکاتا)

خوشی جیت گئی ہے

ہے آج بھی تازہ مِری نظروں میں لطافت
گزرے ہوئے اوقات کے معصوم وفا کی
رکھتی ہے مِری سوچ سلیقے سے سجا کر
پھولوں کے لبادے میں شگفتہ سی گواہی

رنگین کسی شام کا شاداب اشارہ
محفوظ مِری یاد میں مل جاتا ہے اکثر
راتوں کو تبسم کی سمیٹے ہوئے کرنیں
سینے سے لگاتا ہے کوئی نیند میں آ کر

لرزش ہے مِرے پاؤں میں اور ہاتھ میں رعشہ
ایسے میں بھی ارمان جواں خواب ہی مانگے
نازوں کا پلا شوق نہیں بدلا ذرا بھی
"رہنے دو ابھی ساغر و مینا مِرے آگے"

خوشبو میں محبت کی بسی رِیت نئی ہے
وعدے کے وسیلے سے خوشی جیت گئی ہے

اسنیٰ بدر (ہنگری)

نظم ۔۔۔

ہم بوڑھے لوگ بہت بے بس
کوئی ستر، اسی، ساٹھ برس
جینے کا تماشا کرتے ہوئے
سانسوں سے بدن کو بھرتے ہوئے
کوئی ساتھ نہیں، کوئی پاس نہیں
چہروں پہ برابر ماس نہیں
گھبرائے سے
اک سائے سے
دنیا کو برتنے کے سب حق بسرائے سے

ممنوع ہے سب ناجائز ہے
پھولوں سے کہیں اڑتی خوشبو
بارش کا کوئی مدھم لہجہ
کاجل کی نظر کا ہر جادو
بستر پہ پڑا فلمی پرچہ
ممنوع ہے سب ناجائز ہے
رنگوں سے بھرا اُجلا کرتہ
کیا جانیے کون سے بکس میں ہے
دنیا سے بچھڑنے کی خواہش
کوئی پوچھے کون سے شخص میں ہے
ہم بوڑھے لوگ بہت بے بس۔۔۔

احمد صغیر صدیقی (کراچی)

سمتیں

اُدھر
سوچ میں ایک پیمان اس کا
دلِ نارسیدہ میں ارمان اس کا
دیے سے جلاتا
بدن جگمگاتا
نفس در نفس لالہ و گل کھلاتا

اِدھر
تاک میں
اک اُدھڑتی ہوئی رُت کا طوفان کوئی
بکھرنے کا، مٹنے کا اِمکان کوئی
نشانے لگاتا
اُمیدیں اُڑاتا
گزرتا ہوا وقت چہرے پہ گہری لکیریں بناتا!

احمد صغیر صدیقی

دُھن

اِس چہرۂ گل رنگ کو
آنکھوں میں بسا لوں
اِس زلفِ گرہ گیر کو افسانہ در افسانہ بنا دوں
شانوں پہ بچھا لوں

اِن ریشمی ہونٹوں پہ دھروں ہونٹ گزر جانے کی خاطر
مر جانے کی خاطر

واروں قدِ رعنا پہ دل و جاں
سر و ساماں
نکلوں کسی چاہت میں نہ آنے کے لیے میں

پاؤں تجھے اس طور کہ اپنے کو گنوا دوں
اب اور کوئی دُھن نہیں
بس ایک ہی دُھن ہے
موقع جو ملے مجھ کو
تجھے، تجھ سے چرا لوں!

جان عالم (مانسہرہ)

آٹھواں رنگ

سرمئی شام کی اک خنک یاد نے رات
آنکھوں سے موتی چنے
وقت چلتا ہوا ایک دم سے پلٹ جاتا ہے،
اندھے کنوؤں میں گرتی ہوئی سیڑھیوں سے پھسلتا ہوا،
اپنے ماضی کے پاتال میں جا اترتا ہوں میں
زندگی اپنی شکنیں اٹھا کر گلابوں کا بستر لگا دیتی ہے،
پھر اچانک پرانے گلی کوچے تعمیر ہو جاتے ہیں

بام پر اجلے چہرے چمکتے ہیں اور،
کھڑکیاں آنکھیں بن جاتی ہیں،
میں مسرت سے خوشبو میں ڈھلتا ہوا،
رنگ بن جاتا ہوں (آٹھواں رنگ)
آٹھواں رنگ........
خوشبوئیں جس کی دھن میں چمن چھوڑ دیں،
اور دھنک آسمانوں سے منہ پھیر لے،
(پھر یہ منظر بدل جاتا ہے)

خوشبوئیں بھک سے اُڑ جاتی ہیں،
تتلیوں کے پروں سے اچانک سبھی رنگ گر جاتے ہیں
جگنوؤں سے کوئی مشعلیں چھین کر اُن کے ہاتھوں میں
بے نور تاروں کی بجھتی ہوئی راکھ رکھ دیتا ہے
زندگی ایک دم سے گلابوں کا بستر اٹھا دیتی ہے
اُڑتے اُڑتے اچانک پروں سے اُڑانیں نکل
جاتی ہیں
اور ہوا کاٹتے طائرِ جاں کی پرواز تھم جاتی ہے
رات کی بے اماں ساعتوں میں گرفتار سانسوں کو
کوئی چھڑائے
کون ہے........؟
کون ہے جو یہاں سے نکلتی کسی ساتویں سمت کا
آ کے رستہ بتائے؟

پروین شیر (کینیڈا)

جگ ساپزل

(Jig saw puzzle)

ایک پیچیدہ جگ ساپزل ہے جسے
عمر گزری ہے ترتیب دیتے ہوئے
کوششیں رائیگاں ہیں مری
اس کو ہر پل بناتے مٹاتے ہوئے
آج بھی نامکمل یہ تصویر ہے
اس کے ٹکڑے ہزاروں ہیں اک دوسرے سے الگ
ایک اک کو اٹھانا ہے اور
اپنی اپنی جگہ سب کو ترتیب سے
جوڑنا ہے انہیں / کہ مکمل یہ تصویر ہو
رنگ برنگے یہ ٹکڑے مرے سامنے ڈھیر ہیں
جوڑتی ہوں سبھی، توڑتی ہوں انہیں
اتنا پیچیدہ ہے یہ عمل ایک مدت ہوئی ہے مگر
آج تک یہ مکمل نہیں ہو سکا
ایک خانہ ابھی تک ہے خالی پڑا
جس کا حصہ نہ جانے کہاں کھو گیا
تھک کے رنجور بیٹھی ہوں اور
تک رہی ہوں ادھوری سی تصویر کو
جو فقط ایک ٹکڑے کے باعث مکمل نہیں ہو سکی
سوچتی ہوں میں اب
اس کے خالق نے کیا ایک حصے کی تخلیق کی ہی نہیں؟
زندگی کا یہ جگ ساپزل
کیا مکمل نہیں ہو سکے گا کبھی

~~~~~~~~~~~~~~

پروین شیر

یہ چاند لمحے

تو یوں ہوا ہے کہ تیرگی بے نشاں ہوئی ہے
یہ چاند لمحے، ستارہ محفل
جو تیرے پیکر سے ہیں فروزاں
یہ روشنی کی ردا میں جاں کو سمیٹتے ہیں
ہنسی کے جگنو
جو تیرے لب پر دمک رہے ہیں
اندھیری راہیں اجالتے ہیں
گلاب عارض
ہوا میں خوشبو کے نرم ریشم بکھیرتے ہیں
جو تجھ کو دیکھوں تو میری آنکھوں کی سرزمیں پر
مسرتوں کی پھوار کرتی ہے آبیاری
اسی کے نم سے
شجر یہ جاں کا ہرا بھرا ہے
جو تجھ پہ سایہ فگن ہوا ہے
وہ کس قدر تھی
حسین ساعت، رحیم ساعت، کریم ساعت
کہ جب مرے دامنِ دعا میں
عطا کیا تھا تجھے خدا نے!
~~~~~~~~~~~~~~

فیصل عظیم (امریکہ)

اک ترے جانے کے بعد

یہی ہو رہا ہے
ہر اک دن مسلسل یہی ہو رہا ہے
صبح، روز، میں تازہ دم ہو کے اُٹھوں
بہت سی توانائیوں کو سمیٹے
بہت عزم لے کے میں گھر سے چلوں بھی
مگر ایک لمحہ، وہی روز جیسا
خموشی سے مجھ میں کہیں آ کے بیٹھے
کسی کی صداؤں، اداؤں میں ڈوبا
وہ یادیں، وہ باتیں جو پھر مجھ میں گونجیں
تو یکدم تھکا ہارا اور مضمحل سا
میں خود میں سمٹ کر گنوں لمحہ لمحہ
"گزر جائے یہ دن، ڈھلے شام جلدی"
کہ جو کہنا چاہوں
کوئی، جو نہیں ہے
کوئی، جو نہ ہوگا
میں جب تک یہ سب کچھ اُسی سے نہ کہہ دوں
یہ ہوتا رہے گا
یہی ہو رہا ہے
ہر اک دن مسلسل یہی ہو رہا ہے

فیصل عظیم

انگشت بدنداں

تو پھر طے یہ کیا
میں آئینہ بردار ہو جاؤں
جنھیں مجھ سے زمانے بھر کے شکوے ہیں
انھیں دیکھوں تو چہرہ آئینے کی اوٹ میں کر لوں
مرے سب ناپسندیدہ تاثر ان کی آنکھوں ہی سے
اوجھل ہوں
مقابل اُن کے خود اُن ہی کا چہرہ ہو
جو باتیں ہوں انھی جیسی ہوں
لہجہ اُن کے جیسا ہو
مگر یہ آئنے اُن کو نہیں بھائے
انھیں ہر عکس میں میرے ہی کچھ
بگڑے ہوئے چہرے نظر آئے

معیدؔ رشیدی (دہلی)

تلاش

اِس آسماں کی وسعت میں
اِسی زمیں کی مٹّی میں
سمندروں کی لہروں میں
نحیف سی وہی آواز
صدائے بازگشت اس کی
پکارتی ہے ماضی کو......!
حویلیاں ہوئیں کھنڈر
تباہ ہو گئے منظر
بکھر گئے وہ سارے خواب
اجڑ گئے سبھی ارمان
جو مر گئے وہی احساس
جو دب گئے ہیں ملبے میں
تلاش میں وہی جذبات
کہاں گئے وہ سارے خواب؟
کہاں گئے وہ احساسات؟

معیدؔ رشیدی

زندگی

میری تقدیر میں جانے کیا ہے!
کیا ہے؟
زندہ رہنے کے سوا
چلتے رہنے کے سوا
نہ کوئی منزلِ مقصود، نہ سیدھا رستہ
بس وہی پائے مسلسل کی تھکن
بس وہی کرب، وہی مایوسی
شدّتِ دھوپ
پیاس کا صحرا
آزمائش کا سمندر/اور طوفانِ بلاخیز
آندھیاں مجھ کو ڈراتی ہیں مگر
سلسلہ خواب کا رکتا بھی نہیں
گھیر لیتی ہے مجھے تیرگی اکثر آ کر
پر کہیں سے کوئی جگنو بھی چلا آتا ہے
اور میں
باوجود اپنی اداسی کے
اک نئی راہ پہ چل پڑتا ہوں
سوچ کر یہ اکثر/کہ یہ جو کچھ ہے
زندہ رہنے کی سزا ہے شاید!
زندگی مجھ سے خفا ہے شاید!!

طاہر عدیم (جرمنی)

بس اک حسرت سی

اندھیرا ہے ہر اک جانب
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
کسی آہٹ پہ آدھی رات کو جب آنکھ کھل جائے
ہیولیٰ تیرگی کا آنکھ کے رستے بدن میں تیر ہوتا ہے
اندھیرے میں دہلتے دل سے میری انگلیاں
عینک اٹھانے کو جتن کرتیں۔۔بہت لمبا سفر کر کے
بالآخر ڈھونڈ لیتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔مری عینک
ٹکا کر ناک پر اس کو ابھی میں سوچتا ہی ہوں
کہ لائٹ آن کر دوں اور دیکھوں۔۔۔کیسی آہٹ تھی
اندھیرے میں جسے سُن کر بدن میں کپکپاہٹ تھی
یکا یک تیرگی کے دل میں خاموشی کے
بھاری پتھروں کو چیرتی دھیمی سی اک اللہ اکبر کی صدا
کانوں میں پڑتی ہے/ ہمیشہ کی طرح مَیں مسکرا کر
جاگتی آنکھیں/ ذرا سی موند لیتا ہوں
اور اپنے آپ سے کہتا ہوں۔۔آیا۔۔۔وہ ابھی آیا
یہ اک گھنٹہ۔۔۔۔۔۔مری ایکٹنگ کا ہوتا ہے
(یہی گھنٹہ بدلتے روز و شب کے پورے ان چوبیس
گھنٹوں کا ہُوا کرتا ہے حاصل)
پھر کبھی سسکی کبھی ہچکی بھری آواز کے محتاط زیر و بم
سکوتِ شب کے سینے پر اُبھرتے ہیں
ردائے تیرگی پر اک نمی سی چھوڑ جاتے ہیں
تہِ دل میں کوئی خواہش جمی سی چھوڑ جاتے ہیں
یہ زیر و بم سکوتِ شب کے سینے پر
پڑے اثرات کی چادر
بہت دھیرے سے واپس کھینچتے ہیں
اور دبے پاؤں کی اک اک چاپ میری سمت
بڑھتی۔۔اور واضح/۔۔۔اور واضح ہوتی جاتی ہے
بہت معصوم بن کے پھر بھی مَیں
سویا ہی رہتا ہوں۔۔۔۔۔۔بظاہر
اچانک ہی کہیں ہونٹوں کے چھلے سے نکلتی۔۔گھومتی
تازہ ہوا کے چند جھونکے اپنے اندر کچھ طلسماتی سے
احساسات لے کر گھیر لیتے ہیں مرا تن من
کسی کے ہونٹ چھوتے ہیں مرا ماتھا
پروتا انگلیاں ہے کوئی بالوں میں
بہت انجان بن کر مَیں ذرا سا کسمساتا ہوں
وہی محتاط پاؤں رخ بدل کر چپکے چپکے لوٹ جاتے ہیں
اُسی جانب جدھر سے آئے ہوتے ہیں

سُنا ہے باپ سے اپنے۔۔۔
ہُوا کرتا تھا اُس کے ساتھ ایسے ہی

تصور میں۔۔۔مَیں روزانہ
اسی گھنٹے کو خود پہ طاری رکھتا ہوں۔۔۔میسر تھا حقیقت
میں جو میرے باپ کو لیکن
میسر ہے تخیل میں فقط مجھ کو

بس اک حسرت سی رہتی ہے کہ روزانہ
مرے ماتھے پہ ایسے ہی کسی بوسے کا سورج روشنی بھرتا
مری ہر آنے والی صبح کا دامن
ضیائے آگہی سے بھر کے چلتا ہی چلا جائے
رگوں میں وقت کی چلتا ہر اک لمحہ
ٹھہرتا ہی چلا جائے!

سہیل اختر (بھوبنیشور)

ایک نظم

نہ دیکھی ہیں میں نے اس کی آنکھیں
نہ ہونٹ دیکھے ہیں اس کے اب تک
پڑھا ہے ای میل صرف اس کا
لکھے ہیں جتنے بھی لفظ اس نے
بہت ہی معصوم و خوبصورت
جو شاید اس کی ہی چشم و لب کی طرح حسیں ہیں

سطور کے درمیان حسرت سے دیکھتا ہوں
وہاں مرے واسطے بھی کوئی جگہ ہو شاید
جگہ کہ نم ناک ہو زمیں بارشوں میں جیسے
دھلی دھلائی سی نرم گھاسوں کے فرش جیسی
کہ سردیوں کے دھندلکوں میں ڈوبی صبح جیسی
سنہری کرنوں میں لپٹی جنگل کی شام جیسی

سطور کے درمیان اسرار ہیں بہت سے
جو لاکھ کوشش پہ بھی نہ کھل پائے مجھ پر اب تک
حروف سارے ستاروں کی طرح دور مجھ سے
تمام شب جگمگاتے رہتے ہیں آسماں پر

کبھی کبھی گرمیوں کی شب / جب
ہوائیں چلتی ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی
اور ان میں دھن کوئی تیرتی سی سنائی دے تب
کسک اک انجان سی جگاتی ہے مجھ کو پہروں
پڑا میں چھت پر/ ستاروں کو دیکھتا ہوں گھنٹوں
کبھی کوئی ٹوٹا ستارہ
لکیر روشن سی اک بناتا ہے آسماں پر
نہ جانے اس روشنی سے اک خواب
چونک پڑتا ہے نیند سے کیوں؟

ارشد خالد (اسلام آباد)

امید

اب تو ہر سو پھول کھلیں گے
دھرتی رنگ برنگی ہو گی
اور فضائیں بھر جائیں گی مہکاروں سے
مردہ جسم میں جان پڑے گی
سوئے جذبے پھر جاگیں گے
اس دھرتی کو اپنے خون سے
ہم نے اب سیراب کیا ہے!

ستیہ پال آنند (امریکہ)

اندر باہر کی نظمیں

اگنی کنڈ

آگ اندر ہے، باہر نہیں
چیختا ہوں، بہت!

میرے چاروں طرف
خیر خواہوں، رفیقوں کی اک بھیڑ ہے
جُھنڈ کے جھنڈ ہیں
کوئی آبِ مقدس کا کوزہ لیے
گنگا جل سے کوئی ایک گڑوا بھرے
ہاتھ اٹھائے ہوئے سب چھڑکنے کو تیار ہیں
تا کہ باہر کی آتش کو گلزار میں
یوں بدل دیں کہ اندر کے نمرود سے بچ سکوں

چیختا ہوں، بہت
آگ اندر ہے، باہر نہیں
پر مری بات کوئی بھی سنتا نہیں!

ستیہ پال آنند

صورت گر

کچی مٹّی
میرے اندر
خود ہی اک بُت کی صورت میں
ڈھلنے کو تیار ہے، لیکن
میرا چاک تو مجھ سے باہر گھوم رہا ہے

میں اندر کی 'ان گھڑ' مورت
خود سے باہر کیسے لاؤں؟
کیوں میں اپنی کوکھ کی جنّت سے آدم کی کچی مٹّی
اس دنیا میں اتاروں، جس میں
کوزہ گر کہلانے والا
کوئی حسنؔ تیار کھڑا ہے
جو یہ آدھی ادھوری مورت
صدیوں پرانے، ٹوٹے پھوٹے چاک پہ رکھ کر
اک وحشی حیوان کے قالب میں ڈھالے گا!

ستیہ پال آنند

جنگل میں واپسی

میں جنگل میں کبھی آباد تھا
پیڑوں کی آبادی میں ان کے سنگ اگتا تھا
جڑیں میری سلامت تھیں
مگر لاکھوں برس پہلے جڑیں ٹانگوں میں بدلیں، تو
نباتاتی حکومت نے
مجھے 'جنگل نکالا' دے کے یہ تلقین کی.... جاؤ
تم انسانوں کی بستی میں رہو، پھولو، پھلو
جنگل تمہاری نسل کا مسکن نہیں، انساں!
میں شہروں میں چلا آیا تو تھا، لیکن
میں جنگل کو بھی اپنی روح میں محفوظ رکھ کر ساتھ لایا تھا!

جڑیں جب کٹ گئی ہوں، کوئی
جنگل کو کہاں تک اپنے اندر روح میں رکھے؟
جڑوں سے ٹوٹ کر اپنی
میں اب تک تو رہا ہوں سرگراں باہر کی دنیا میں
مگر اب تھک گیا ہوں....
لوٹ جانا چاہتا ہوں اپنے جنگل میں!

ستیہ پال آنند

آلِ قابیل

''کوئی سبطِ آدم بھی ہے اور مجھ سے سوا اس جہاں میں
کہ میں اک اکیلا ہی حقدار و مختار ہوں جدِ امجد کی اس
حق رسی کا؟''
جو اندر سے میرے
یہ آواز ابھری
تو میں نے یہ چلّا کے باہر کے لوگوں سے پوچھا
اٹھائے گئے ہاتھ باہر کے لوگوں کے
اربوں میں، کھربوں میں تھے
کوئی باقی نہیں تھا کہ جو 'ابنِ آدم' تو ہو
شجرۂ نسب میں، ابویت میں مگر
سبطِ آدم نہ ہو!
جو پوچھا یہ کیوں ہے، تو خلقت سے پہلے
مرے اپنے اندر نہاں اک فرشتہ تکبّر سے بولا
سُن اے شاعر نکتہ رس، اپنے اندر کی آواز سن
یہ مانا کہ تم ایک فردِ بشر ہو، مگر
تم بھی تو خاک زادے ہو، نوری نہیں....
...آلِ ناخلفِ قابیلؔ ہو
اور قابیلؔ تو اپنے بھائی کا قاتل بھی تھا، گورکن بھی!
اسی اک حوالے سے تم سارے انسان
آدم کے پوتے ہو، بیٹے نہیں ہو!!

ستیہ پال آنند

ستیہ پال آنند اندھا ہو گیا ہے

ستیہ پال آنند اندھا ہو گیا ہے!
ذو نگاہی ۱ یوں بھی اس کی ذات کا شیوہ نہیں تھی
اپنی آنکھوں سے اسے شکوہ بہت تھا
اپنے ''اندر'' دیکھ سکنے کی صلاحیت سے عاری
صرف ''باہر'' دیکھتی تھیں
دیکھتی تھیں... کم نظر لوگوں کی کم ظرفی
تفاوت، ان کے ظاہر اور مخفی
دیدنی، نادیدنی کردار میں، گفتار میں
اس کی آنکھیں نامکمل عضو تھا اس کے بدن کا!

کوئی مابعد النظر ۲ منظر بھی ان کو
اس قدر دلکش نہیں لگتا تھا
جس کو دیکھ سکتیں
ماورا ہو کر انا سے، دور ہٹ کر!
دوسرے لوگوں سے عاری بھی تو اک دنیا ہے
اُن اندھی گپھاؤں میں بسی
جو اس کے اپنے ذہن کی گہرائیوں میں سو رہی ہے
اس کی آنکھیں (خود سے اس نے بارہا پوچھا تھا)
آخر رخ پلٹ کر

اُلٹے پاؤں گھوم کر
اندر کی جانب کیوں نہیں کھلتیں
انہیں کیا وسوسہ ہے، خوف ہے کیا؟

ستیہ پال آنند اندھا ہو گیا ہے
کس قدر خوش ہے
کہ مابعد النظر منظر بھی اس کی دسترس میں آ گیا ہے!

۱۔ double vision
۲۔ Meta vision

ستیہ پال آنند

خود کلامی

خود کلامی کی مجھے عادت نہیں ہے
دل کا شیرازہ بکھرتا ہے تو جیسے
گومگو کی کیفیت میں
کوئی مجھ سے پوچھتا جاتا ہے
باتیں۔ میرے اندر اور باہر کے سبھی قصّے پرانے
اور اسی انداز سے
حرف و ندا کے انسلاکِ باہمی سے
دوسرا کوئی
درونِ جاں کہیں بیٹھا ہوا
اُس فردِ اوّل سے
نفی اثبات میں کرتا چلا جاتا ہے
ایسی گفتگو جو
میرا سا جھا ''مَیں'' نہیں سنتا، مگر تب
گفتنی ناگفتنی پہلے سوالوں
اور اندر کے جوابوں
سے کئی نکتے ابھرتے ہیں تو میں کچھ
بولنے لگتا ہوں۔ خود سے؟
یا مرے اندر نہاں اک شخص سے، جو
میں نہیں ہوں، میرا ''میں'' ہے!

ایوب خاور (کراچی)

خزاں کو کیا ہوا ہے

خزاں کو کیا ہوا ہے
یہ مرے دل کی رگوں میں سے نکل کر
شہر کی گلیوں، محلّوں، شاہراہوں اور سڑکوں پر
بھلا کیوں دندناتی پھر رہی ہے!
میں نے تو اس کو بہت مشکل سے
اپنی دھڑکنوں کی چپ میں کس کر باندھ رکھا تھا
اور اب یوں ہے کہ میری آرزوئیں
اور سارے خواب،
پتّوں کی طرح سوکھی ہَوا کے ہاتھ میں
لاوارثی کی گرد میں لپٹے، بگولہ وار اُڑتے پھر رہے ہیں
کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ، دریچہ، کھل نہیں سکتا
مقفّل ہے
یہ شہر اندر سے باہر سے مقفّل ہے
خزاں کو کیا ہوا ہے......!

ایوب خاور

ایک نظم

[ن۔م۔راشد کی نذر]

اجل
اپنا رستہ بدل
میرے دل سے نکل
مجھ سے دو ہاتھ دوری پہ چل

اجل
مجھ کو تم سے ضروری
بہت ہی ضروری کوئی کام کرنا ہے جس کے لیے مجھ کو
بھیجا گیا ہے
ابھی جا...... کسی اور کی آرزوئیں کُچل
ابھی مجھ کو فرصت نہیں
کسی اور دن آ کے ملنا
میں اُس دن سے پہلے تمھیں خود ہی آواز دوں گا
ابھی جا
چلی جا
مرے پاس اس وقت تم کو
اپنے دلِ بے اماں کا

مہماں بنانے کی کوئی سہولت نہیں
اتنی فرصت نہیں جانِ جاں
میرے دل کی رگوں سے نکل
میرے سائے سے بھی کچھ قدم اور دُوری پہ چل
بلکہ آگے نکل
آج کے دن کے اس لمحۂ وصل میں جا، کسی اور تھل کو نگل
میرے تھل کی سلگتی ہوئی ریت میں
حبس کی کروٹیں
پیاس کی بارشیں
وقت کی سلوٹیں
اَن کھلی کونپلیں
ان سِلے خواب ہیں
اپنی تکمیل واظہار کے ایک شاداب سانچے میں
ڈھلنے کو بے تاب ہیں
ریت کی کِر کِراہٹ میں سبزہ اُگلنے کی گنجائشیں
کب نہ تھیں
اب بھی ہیں
لیکن اے جانِ جاں
آب ودانے کی
آئینہ خانے کی نعم البدل
اے اجل
عرصۂ دشتِ جاں میں
برائے دلِ عاشقاں
اے غزل میں تغزل کی نعم البدل
دیکھ ابھی میرے ہاتھوں سے، پیروں سے، پلکوں کی
شاخوں سے

ایوب خاور

اماوس

رقص کرنا تھا سمندر نے
مگر یہ چاند!
اس کو کیا ہوا!......
اس چودھویں کے چاند کو کس کی نظر کے
کالے بادل گھیر کر اپنی گپھا میں لے گئے
اے رات!
آنکھیں کھول
اک لمحے کو دیکھ
اپنے ساحل سے پرے
بوڑھا سمندر
رقص کے اِک زاویے میں منجمد ہے
منتظر ہے
چاند کو اپنی گپھا میں سے نکال
تاروں سے کہہ
بادلوں کی اوٹ سے نکلیں
ذرا سی دیر کو
اپنی جھلمل کی...... تکت، تر کٹ، تہ، دھا، تک، سے
کتھک کی لے دکھائیں
آنکھ بھر اس آسماں پر
کہکشاں ترتیب دے کر تال دیں
بوڑھا سمندر
رقص کرنے کو بہت بے تاب ہے

سینے کی دھنکی سے، سانسوں کی پھنکنی سے
اس فاحشہ زندگی کے کئی بے ثمر
خاروخس ہیں جو وحشی بگولوں کے مانند
چپکے ہوئے ہیں
اجل
جان دہشت صفت
میں ازل اور ابد کے میاں
اپنے ہونے نہ ہونے کے اک زینۂ بے نشاں کے
قدمچوں پہ
اک چھیتھڑے کی طرح کچھ لڑھکتا ہوا،
کچھ پھسلتا ہوا، کچھ اٹکتا ہوا
ایک بے عکس آئینے کی اندھی پہنائیوں
میں کہیں گونجتا جا رہا ہوں
ابھی مجھ کو فرصت نہیں ہے
ابھی میرا اپا تال مجھ سے بہت دور ہے
اجل
اپنا رستہ بدل
میرے سائے میں چل

ایوب خاور

ایک رقاصہ سے

کون سے گیت کی لَے
کون سے راگ کے سُر
کون سی تال کے وقفے میں ترا ذہنِ رسا
سانس لیتا ہے
مجھے یاد کیا کرتا ہے
مگر ایسے میں، کِسے! کون! کہاں یاد کیا کرتا ہے
سانس پر سانس چڑھی ہوتی ہے
رقص کے تیز، سُبک، گرم بہاؤ میں تجھے
دیکھنے والوں کی
وحشت میں سلگتی آنکھیں
سَر سے نوکِ کفِ پا تک
تیرے سُر تال میں بھیگے ہوئے
کم خواب صفت جسم پہ جب رینگتی ہیں
ایسے میں دُور کہیں
تیری دَہکار کی صرصر سے بہت دُور کہیں
کُنجِ تنہائی کی بُکّل میں ٹھٹھرتے ہوئے
بے رخت مسافر کو
بھلا کون! کہاں یاد کیا کرتا ہے!!

ایوب خاور

التجا

رُدھالی! سن
مجھے رونا نہیں آتا
میں اپنے سب سے پیارے خواب کے
مرنے پہ رونا چاہتا ہوں
اور مجھے رونا نہیں آتا
ردھالی!
تجھ کو رونے کی کمی کب ہے
تری زنبیل میں کیا کیا نہیں ہے
آنسوؤں کی کہکشاں ہے، درد میں ڈوبی ہوئی
سسکار کا جادو، صفاتِ گریہ سے لب ریز لفظوں
کے سبک آہو اور اُس پر ایک وحشت سے
بھری بے ربط سرگم کی فُسوں کاری
ردھالی!
تیرے سینے کی اتھاہ زنبیل میں ہر غم کا نم ہے
تُو تو سخیوں کی سخی ہے
اے سخی!
صرف ایک آنسو
ایک سسکی
اور اک وحشت بھری آواز کی بے ربط سرگم کی فسوں کاری
مرے اس خواب کی میّت کے پہلو میں سخن کر دو
مجھے رونا نہیں آتا

ایوب خاور

رفو گر!

رفو گر!
دھیان سے
یہ زخم خنجر کے نہیں
ادھڑے ہوئے وعدوں کی رسوائی کے ہیں
اِنھیں چھُونا نہیں
اِن کی تہوں میں جھانک کر
دردِ مسلسل کے دھڑکنے کو پرکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے
دل ہے آخر
اور پھر زخموں سے چھلنی ہے
کہیں سے لاؤ اُس کے لمس کا اطلس
کہیں سے لاؤ اُس کا عکسِ مہ تابی
رفو گر!
اُس کے کُنجِ لب سے کوئی مسکراہٹ کا ذرا سا شائبہ،
اک واہمہ
اُس کی گلابی انگلیوں کا رَس...... مگر...... بس
اب نہیں...... اب کچھ نہیں...... بے فائدہ ہے
کچے پکّے عشق کے مدِّ مقابل
تیسرے درجے کا کینسر!
رفو گر!
زخم رہنے دو، یہ جیسے ہیں اِنھیں ویسا ہی رہنے دو......
مگر...... بہنے نہ دو
ایسا کرو
لوہے کی تاروں سے اِنھیں آہستگی کے ساتھ سی دو
اور ملاقاتی کوئی آئے
تو باہر لکھ کے لٹکا دو
کہ چھوٹی عمر میں
اتنے بڑے اور بوڑھے زخموں والے پیشنٹ دیکھنا
اچھا نہیں ہوتا

ایوب خاور

ایک منجمد وداعی لمحہ

میں نے جُوں ہی کمرے کا دروازہ کھولا
دیکھتا کیا ہوں!
کمرے کی جو چیز جہاں تھی
ویسی کی ویسی دھری ہوئی ہے

ڈریسنگ ٹیبل کے کونے پر
سیفٹی پن کے ڈبے کا ڈھکنا بس یوں ہی گرا پڑا ہے
ہیئر برش کے دانتوں میں
کچھ بال ہیں تیرے پھنسے ہوئے
سینٹ کی شیشی کُھلی ہوئی ہے
تیرے پرس کے اندر سے اِک شخص کی فوٹو اُس کے
اُوپر گری ہوئی ہے
میری چپلیں
بالکنی کے دروازے کی اوٹ میں اُلٹی پڑی ہوئی ہیں
میری گھڑی
اور تیرا کنگن
تکیئے کے نیچے سے ہو کر فرش پہ اوندھے پڑے ہوئے ہیں
ٹی وی سیٹ بھی جب سے یوں ہی کھلا ہوا ہے
کین کے سنگل سیٹر کے اک بازو پر
میری بیلٹ کے ہُک میں تیرے
سبز دوپٹے کا اک کونا اَڑا ہوا ہے
بستر کی چادر اور تکیے
اک دوجے سے گتھم گتھا ہو کر گہری نیند کے تھل میں
دھنسے ہوئے ہیں

تُو نے جانے سے پہلے
جو منظر جامد کیا تھا، اُس میں
کمرے کا دروازہ کھول کے میں بھی شامل ہوا کھڑا ہوں
کاش!
اچانک دھم سے آ کر
تُو اِس جمے ہوئے منظر کو
اپنی آہٹ کی حدت کی آنس تو دے
مجھ سے باہر، مجھ میں شامل
اس منظر کا کوئی حصہ سانس تو لے!......

تنہا تماپوری (تماپور)

مراجعت

میں زندہ تھا
تو......
قسطوں میں مجھے
مرنا پڑا ہر دم!
کبھی بیوی کی خاطر
اور کبھی اولاد کی خاطر
کبھی مر مر کے برسوں میں نے
اپنا گھر سنوارا تھا

میں زندہ تھا تو قسطوں میں
مجھے مرنا پڑا ہر دم!!
میں ان سب کیلئے بے چین
پھر سے لوٹ آیا ہوں
بظاہر بے بدن ہوں میں
بھٹکتی روح لایا ہوں۔
میں اپنے گھر کے سب بیدار کمرے جھانک آیا ہوں
کسی کمرے میں میری یاد کا منظر نہیں باقی
میری باتوں کی اس گھر میں کوئی آہٹ نہیں زندہ
کسی کے دل میں میرے نام کی گھنٹی نہیں بجتی
اسی گھر میں کبھی میں تھا، نشانی تک نہیں ملتی
میں شائد:

اپنے گھر کا راستہ ہی بھول بیٹھا ہوں............
یہ میرا گھر نہیں ہے، میں پرائے گھر میں آیا ہوں......
حقیت میں
ابھی......کچھ دیر پہلے مر گیا ہوں میں!!!

تنہا تماپوری

ہمارا رشتہ

عدد ہوں میں
صفر ہو تم
ہمارا ایک رشتہ ہے۔
مجھے بھی دس گنا آگے نکلنے کی ضرورت ہے۔
تمھیں بھی اپنی قیمت کو
متعین کر کے جینا ہے
اکیلا ہو صفر
اسکی کوئی قیمت نہیں ہوتی
اگر بھولے سے بھی بائیں طرف
تم نے قدم رکھا
تو...... قیمت کھوگئی ساری
عدد ہوں میں، صفر ہو تم
ہمارا ایک رشتہ ہے
میری دائیں طرف تم کو
مقام اپنا بنانا ہے

تنہا تماپوری

آندھی، تنکے، آشیاں

نیند سے میری ملاقات
ابھی ہو کہ نہ ہو
کیا خبر
آج کی یہ رات کٹے یا نہ کٹے
مقتلِ شب کی طرف
جاتے ہوئے خوابوں کو
راس آئی نہیں شاید
مری یہ تیرہ شبی
مری جاگی ہوئی آنکھوں میں
سلگتے رہے گھاؤ
میں تہی دست ہوں
خوابوں کا خریدار کبھی بن نہ سکا
میں کبھی اپنی ہتھیلی میں
ہنسی رکھ نہ سکا
میری تقدیر کو راحت کی مہک
چھو نہ سکی
نیند سے میری ملاقات کا لمحہ گم ہے
صبح کی
پہلی اذان
کون سنائے گا مجھے!!!؟

تنہا تماپوری

ڈستے لمحے

کمرہ بھیڑ بھرا تھا لیکن
اک لمحے میں
دو نظریں جب ٹکرائیں تو
یوں کوئی تھیں
جیسے بھیڑ بھرے کمرے میں
وہ تنہا ہوں!

ایسے لمحے جب آتے ہیں
تب کچھ ایسا ہو جاتا ہے
اپنا سب کچھ کھو جاتا ہے۔

کوئی
ان لمحوں کو جب بھی
کھو دیتا ہے
اکثر خود کو ان لمحوں سے ڈسواتا ہے
یوں جیون بھر پچھتاتا ہے

تنہا تماپوری

آخری سفر

جب سے میں پیدا ہوا ہوں
تب سے مجھ میں جنم لے کر
جاگتی رہتی ہے موت!!

میری سانسوں میں سفر کرتی ہوئی
دم بدم ان دھڑکنوں کے ساتھ ہی چلتی ہوئی
اس کے جیسا ساتھ دینے والا اور کوئی قربت کو

میرے دل نے موت کی قربت کو
سوچا تک نہیں
اس کو میری زندگی نے پیار سے دیکھا نہیں
میں نے اسکی یاد کو، خود میں کہیں ٹانکا نہیں
پھر بھی اس نے ایک پل مجھ کو کبھی چھوڑا نہیں
منہ سے کچھ بولا نہیں!!!

آج اچانک اس نے
پہلی بار مجھ سے یوں کہا!
میں تیرے ہمراہ چل کر کھو چکی اپنا سفر
اب تجھے اپنے سفر پر ساتھ لے کر جاؤں گی
اک نئی دنیا تجھے دے کر
جدا ہو جاؤں گی......!!!

کاوش عباسی (کراچی)

کیا؟

نا۔زندگی
ایک شئے مَوت کی دُھندسی
زندگی کہہ کے ہم جو جئے جا رہے ہیں
کوئی کواب کیا اس میں رکھیں
اُمنگوں کا کیا کوئی پیکر بُنیں
وہ جو ملتا تھا اور اب نہیں ملتا ہے
اُس کی کیا آگ دل میں بھریں
جس سے لڑنا تھا اور لڑ نہ پائے
خلاف اُس کے چھوٹے بنے
اُس لڑائی کا اندر کا خوردہ کہاں جا کے پھینکیں
کہیں کیا کچھ اعجاز سا ہو
جو دیکھیں تو لہکیں
جو سُن لیں تو چہکیں
جو چھو لیں تو دہکیں
جو پی لیں
تو جی لیں!

کاوش عباسی

وہ جو کھونا ہے

وہ جو کھونا ہے، کھویا نہیں جا رہا
اور جو پانا ہے پایا نہیں جا رہا
بیچ میں مَیں اکیلا، بہت ہی اکیلا
عذاب اور خطرات میں خالی ہاتھ آدمی
ذات اور زیست کے نقشۂ سبز میں کانٹے اُگتے ہوئے
بددعاؤں کی سانسوں کے تیروں کے سائے میں
دُور، ایک شفّاف، اَبیض، محبت محل پر پہنچنے کو
مَیں آگے بڑھتا ہوا
کہیں موت کی دوسروں کی خبر
اور کہیں اکثر اپنی
قدم کانپتے، ہاتھ تو جیسے ہوں ہی نہیں
اور دل
لُوٹ کے بعد دہلا ہوا
جی نہ سکنے سا جیتا ہوا
جانے کیا سوچتا،
جانے اس کے مقدر میں کیا آگے لکھا ہے؟

کاوش عباسی

صبحِ صادق

کیا ہے یہ
آج کل جانے کیوں
پھوٹتی صبح بھی رات سی مجھ کو لگتی ہے
پَو پھٹے تو نیا دن نہیں، پھر وہی رات ہوتی ہے
میں واقعی جیسے
اک رات سے دوسری رات سے تیسری رات۔۔۔
میں ڈوبا جاتا ہوں
یہ چند لمحے اٹل کتنے لگتے ہیں
کب صبحِ صادق مِری آئے گی
میرے سورج،
مرے دن کے پُر زندگی شور میں مجھ کو نہلائے گی؟!

کاوش عباسی

ایک لوک دُھن سے متاثر ہو کر

دُور، تنہا، اُداس وادی میں
بیکراں خامشی میں عالَم کی
ایک آبادی اپنے آپ میں گم
اپنی پرچھائیوں میں لپٹی ہوئی
زار و ویران و بیکس و گمنام
زندگی اک عجیب عاجز جِنس
جاں کے بے ربط سلسلوں میں رواں
ابتدا کی خبر نہ آخر کی
فقط اک دائرہ سسکتا ہوا
ہست و بود و جمود و عسرت کا
ذہن لپکے پہ ٹوٹ کر رہ جائے
چیخ اُبھرے پہ ڈُوب کر رہ جائے

اداریتی نوٹ

ادب کے ایک سنجیدہ قاری

پروفیسر ناصر احمد

اردو میں ادب کے سنجیدہ قاری کے غائب ہونے کے مسئلہ پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور بہت کچھ کہنے کی گنجائش موجود ہے۔میری دانست میں تو خود ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں بھی ادب کے سنجیدہ قاری بہت کم ہوتے جارہے ہیں۔

پروفیسر ناصر احمد انگریزی ادبیات کے استاد تھے۔میرے ماموں بھی تھے اور میری اہلیہ کے والد بھی۔ اس لحاظ سے ان کے بارے میں میرا کچھ بھی لکھنا ایتاء ذی القرباء کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔لیکن میرے لکھے کی ادبی تصدیق ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے مضامین سے بخوبی کی جاسکتی ہے۔ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے سب سے پہلے پروفیسر ناصر احمد کا خاکہ''جدید حاتم طائی۔خدائی خدمتگار''تحریر کیا جو روزنامہ مشرق پشاور کی اشاعت ۱۳/اکتوبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا،اور ان کے خاکوں کے مجموعہ میں بھی شامل کیا گیا۔اس کے بعد انہوں نے ان کی وفات پر تعزیتی کالم لکھا۔پھر اکا دکا کسی تحریر میں ضمناً ذکر بھی ہوتا رہا لیکن اب ان کا آخری کالم تو کمال کا پس منظر رکھتا ہے۔پروفیسر ناصر احمد کے چھوٹے بھائی اور میرے چھوٹے ماموں صادق باجوہ کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا تو انہوں نے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کو اس کی ایک جلد بھیجی۔ڈاکٹر صاحب نے کتاب دیکھی اور اس پر لکھنے بیٹھے تو کتاب سے زیادہ پروفیسر ناصر احمد پر لکھ دیا۔ان کا یہ کالم (دل پشوری)''اچھے انسان مَرا نہیں کرتے''کے نام سے روزنامہ''آج''پشاور،۵/اگست ۲۰۰۸ء میں چھپ چکا ہے اور اس گوشہ میں بھی شامل کیا جارہا ہے۔

میں نے ماموں ناصر کا خاکہ''رانجھے کے ماموں''۹۲۔۱۹۹۱ء میں لکھا تھا۔یہ کراچی کے ادبی رسالہ صریر میں بھی شائع ہوا،صوبہ سرحد کے ایک اخبار میں بھی چھپا،میرے خاکوں کے مجموعہ''میری محبتیں''میں بھی شامل ہے اور میری ۱۱ کتابوں کی کلیات''عمرِ لا حاصل کا حاصل''میں بھی شامل ہے۔میرے جن چند خاکوں کو بہت سراہا گیا ان میں ماموں ناصر کا یہ خاکہ بھی شامل ہے۔اپنے اس خاکہ کو بھی اس گوشہ میں شائع کر رہا ہوں۔

پروفیسر ناصر احمد کا علمی و ادبی ذوق اتنا عمدہ تھا کہ قارئین ہی نہیں آج کے بہت سارے ادیبوں کے لیے بھی انہیں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔کسی تخلیق کی قرات کرتے ہوئے وہ جب اس کی خوشبو سے بھر جاتے تو اپنے ملنے والوں کو بھی اس خوشبو سے معطر کرنے لگتے۔انہیں بے شمار اشعار ہی زبانی یاد نہ تھے بلکہ کئی نثر پاروں کے پورے پورے اقتباس انہیں ازبر تھے۔تدریسی طور پر بھی وہ اپنے ادبی ذوق سے فائدہ اٹھاتے۔ایسے نثری

اقتباس جو ان کے نزدیک عمدہ فن پارے ہوتے تھے اور لسانی لحاظ سے بھی زبان کا کمال ظاہر کرتے تھے،وہ ایسے اقتباس اپنے شاگردوں کو یہ کہہ کر دیا کرتے تھے کہ جو ان کا ٹھیک انگریزی ترجمہ کر لے گا،وہ انگریزی سیکھنے میں پختگی حاصل کر لے گا۔

پروفیسر ناصر احمد نے اپنی زندگی میں صرف ایک شعر کہا۔میرے نام ان کے ایک طویل نجی خط میں انہوں نے وہ شعر لکھا تھا۔اب ان کی چھوٹی بیٹی بشریٰ ہما نے بھی مجھے وہی شعر ارسال کیا ہے۔یہ شعر ریکارڈ پر لا رہا ہوں۔

تو آنے والے زمانے کا غم نہ کر ناصرؔ
کہ رات اپنے ستاروں کو ساتھ لائے گی

کسی قسم کی بھی صورتحال ہو وہ ہمیشہ پُر اُمید رہتے تھے۔یہ شعر ان کے رجائی ذہن کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

پروفیسر ناصر احمد کے لیے یہ چھوٹا سا گوشہ ادب کے ان تمام سنجیدہ قارئین کے نام ہے جو مادہ پرستی کے اس برق رفتار دور میں بھی ادب کے مطالعہ کے لیے نہ صرف وقت نکالتے ہیں بلکہ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کے بھی معترف ہیں۔

مجھے بیدار مغز اور چوکنے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں، پتہ کہیں کھڑکے،کان ان کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ایسا ہی میرا ایک دوست حیدر قریشی جرمنی میں چودہ برس سے بیٹھا اردو زبان و ادب کی مسلسل خدمت کر رہا ہے۔۔۔وہ میرا استاد زادہ بھی ہے۔میرے محبوب استاد پروفیسر ناصر احمد کا داماد اور بھانجہ۔اس کا میرا غائبانہ تعارف ہی اس حوالے سے ہوا۔ناصر صاحب حیدر کی اتنی تعریفیں کرتے تھے کہ میرا جی ان سے ملنے کو بے تاب رہتا تھا۔ایک مرتبہ تو میں اور ناصر صاحب جرمنی جانے کے لیے کمر بستہ ہو بھی گئے تھے،مگر ہمیں ویزہ نہ ملا۔پھر ناصر صاحب بیمار ہو گئے اور بعد میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (**ڈاکٹر ظہور احمد اعوان** کے کالم **دل پشوری** ''ادبی ہیرا'' سے اقتباس مطبوعہ روزنامہ **آج** پشاور۔۱۲/دسمبر ۲۰۰۷ء)

شعر و شاعری سے ہماری توجہ، دلچسپی اور ذوق و شوق کا باعث ہمارے بڑے بھائی پروفیسر ناصر احمد کا وجود تھا۔انہیں بلا مبالغہ ہزاروں اشعار ازبر تھے۔وہ اکثر گھریلو ماحول میں اور احباب و اقربا کی فرمائش پر اتنے انہماک اور وجدانی کیفیت سے دوچار ہوتے ہوئے اشعار سناتے،یوں لگتا کہ وہ خود شعر کہہ رہے ہیں،جن کی آمد ایک تسلسل سے ہو رہی ہے۔سننے والے ان کے اس انداز سے بہت محظوظ ہوتے۔وہ شاعر تو نہ تھے لیکن شعراء کو سننا اور پڑھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔اچھے شعر پر دل کھول کر داد دیتے تھے۔

(**میزانِ شناسائی** کے **حرفِ اول** از **صادق باجوہ** سے اقتباس)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان (پشاور)

اچھے انسان مرا نہیں کرتے

بعض اوقات یادوں کے دریچے کھولیں تو خوشگوار معطّر ہوائیں مشّامِ جاں کا استقبال کرتی ہیں اور بعض چہرے زیادہ نکھر کر زیادہ خوبصورت بن کر نظر آتے ہیں' جن کو بار بار یاد کر کے دل مسرت وطمانیت سے بھر جاتا ہے۔ ایسے ہی میرے ایک استاد پروفیسر ناصر احمد، کہنے کو تو انہوں نے مجھے بی اے کی انگریزی پڑھائی مگر اس کے ساتھ وہ کتابِ حیات کے کتنے سبق پڑھا گئے، مجھے انسان بننے کا سلیقہ سکھا گئے، میں ان کو دیکھ کر ہی استاد بنا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر استاد ایسا ہوتا ہے تو اس سے بہتر دنیا کی کوئی چیز نہیں۔

پروفیسر ناصر احمد پہلے میرے استاد و مربی بنے پھر مانسہرہ کالج میں میرے شریکِ کار کولیگ ہو گئے مگر کسی جگہ ان کے محبت آمیز رویے میں فرق نہ آیا۔ وہ انگلی پکڑے مجھے محبت و مروت کی اونچائیوں کی طرف ہی لے جاتے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کا کوئی ذاتی مسئلہ ہے ہی نہیں، جو ہے دوسرا انسان اور اس کے مسئلے ہیں۔ بعد مدت کے کھلا کہ ان کا یہ رویہ کسی ایک فرد کے ساتھ نہیں سب انسانوں کے ساتھ ہے۔ بلا لحاظ عمر، عہدہ، زبان، علاقہ، وہ مدد کرتے ہوئے کبھی کسی سے اس کا نام، پتہ، مسلک و مذہب و علاقائی ڈومیسائیل نہیں پوچھتے تھے۔ عجیب حیران کن آدمی تھے، ملازمت رات والی اختیار کی تھی کہ دن کی روشنی کام وخدمت کیلئے مل جائے۔ ریلوے کے افسر، ٹی ٹی یا ریلوائی تھے، بھاری بھرکم مدبر، ان پر نیلی وردی سجتی تھی، رات کی ریل سے پتہ نہیں کہاں تک سفر کرتے، صبح نو دس بجے پشاور یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں بطور طالبعلم موجود ہوتے، شام کو ایک استاد بن کر غریب طلباء کی کوچنگ کرتے، ان کو ایف اے۔ بی اے کیلئے تیاری کراتے، گہری گرجدار مگر دھیمی آواز تھی جو ہزاروں آوازوں میں پہچانی جاتی تھی، لب ولہجہ مروتوں میں جو مٹھاس سے معمور تھا، مجھے ظہور بھائی ہی کہتے تھے مگر وہ تو سب کو اس کے اصل نام کے ساتھ بھائی کا لاحقہ سابقہ لگا کر اپناتے، سینے سے لگاتے۔ آپ اپنا کوئی مسئلہ بیان کر دیں بس اسی لمحے وہ مسئلہ آپ کا نہیں ان کا ہو جاتا تھا۔ وہ ایک بھاری بھرکم ڈائری ساتھ لیے پھرتے تھے جس میں فالتو کاغذ ہی کاغذ بھرے ہوتے تھے، لوگوں کی درخواستیں، سفارشوں کے کاغذ، کسی کے میڈیکل بل، کسی کے تبادلے کے کاغذات۔ کبھی انکار ان کے لبوں پر آتا ہی نہیں تھا۔ مسلسل پتلون پہنتے اور ساتھ پاؤں میں پشاوری چپل اور

ڈائری بدست سارے شہر بلکہ ملک میں گرداں، پتہ نہیں کب سوتے تھے۔ مجھے مانسہرہ میں ان کے ساتھ ایک گھر میں رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے مگر میں نے ان کو سوتے نہیں پایا، میں سوجاتا تھا وہ مسلسل کام کرتے تھے۔ طالبعلم آ رہے ہیں، کسی کو پڑھا رہے ہیں، کسی کے ذاتی مسائل حل کر رہے ہیں، کسی کی مالی امداد کر رہے ہیں۔ میں جب پوسٹنگ پر مانسہرہ گیا تو ناصر صاحب بس سٹاپ پر ایک گھنٹہ پہلے میرے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ احتیاطاً اپنے ساتھ کالج کا چپڑاسی مع ایک عدد ریڑھے کے لا کھڑا کیا تھا کہ مبادا سامان زیادہ ہو۔ مانسہرہ نشیب وفراز میں بنا ایک چھوٹا سا شہر تھا، سامان اوپر لے جانا مشکل تھا، پروفیسر ناصر صاحب، آفتاب ملازم کے ساتھ خود ریڑھا گھسیٹتے اپنے گھر کی طرف چلے، میں نے بہت کوشش کی مگر مجھے کسی چیز کو ہاتھ لگانے نہیں دیا۔

گھر پہنچے تو میرا کمرہ اور بستر سجا تھا، میز پر تازہ پھول رکھے تھے، دودھ کا تازہ گلاس اور تھکاوٹ دور کرنے کیلئے کوئی اسپرو قسم کی گولی حاضر تھی۔ میں حیران و پریشان مگر وہ خود خورسند وشاداں۔ جتنا عرصہ وہاں رہا ان کا مہمان ہی رہا۔ نہ کوئی کرایہ لیا نہ ہی خوراک کا خرچہ۔ وہ ایک دن کیلئے کہیں جاتے تو کھانے پینے کا پورا سامان رکھ کر جاتے۔ فریج وغیرہ تھے نہیں مگر موسم ٹھنڈا تھا اسلئے بڑی لجاجت سے سر جھکا کر کہتے ظہور بھائی یہ سالن ذرا گرم کر لینا۔ وہ بات ایسے کہتے جیسے کوئی جرم وگناہ کر رہے ہوں۔ میں اپنے دوسرے مشترک دوست پروفیسر زین العارفین سے کہتا تو وہ کہتے کہ بھائی اب آپ ان کے ہتھے چڑھ گئے ہیں جب تک آپ اور وہ یہاں ہیں اور ان کا گھر ہے آپ سارے غموں کو بھول جائیں۔

میں جلد سونے کا عادی تھا، دوسرے دن اٹھ کر کالج چلا جاتا، ناصر صاحب نظر نہ آتے، شام کو پوچھتا تو کہتے بس ذرا لاہور تک گیا تھا۔ مجھے مانسہرہ سے ایبٹ آباد جانے کا صرف سن کر بخار چڑھتا تھا اور ناصر صاحب راتوں رات پتہ نہیں کہاں کہاں کا سفر کر کے صبح تازہ دم کلاس میں موجود ہوتے۔ انہوں نے میرے اندر اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق جگایا، وہ کتابیں لا لا کر دیتے اور بار بار پڑھنے پر اصرار کرتے۔ ان کی اپنی یادداشت ناقابلِ یقین حد تک بڑی اور گہری تھی، کتابوں کے پورے پورے کوٹیشن، پوری غزلیں، نظمیں اور دوسری شماریات ان کو زبانی یاد ہو جاتیں۔ میں اس معاملے میں ہمیشہ سے بودا اور کھوٹا رہا ہوں۔ میں کوئی چیز گھوٹا لگا کر یاد نہیں کر سکتا۔ ناصر صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ کتابوں میں سے عمدہ باتیں، اخباروں میں سے عمدہ خبریں، رسالوں میں سے اعلیٰ کارآمد شماریات، مشاعروں کے اچھے شعر اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا کرو۔ یہ کام میں نے تب سے شروع کر رکھا ہے۔ اور اب بھی جب اپنی حوالہ جات کی ڈائری کھولتا ہوں تو ہر تراشے پر اپنے پروفیسر ناصر صاحب کی تصویر مسکراتی نظر آتی ہے۔ وہ مجھ سے ہمکلام رہتے ہیں۔ ناصر صاحب اپنی کسی کاوش وکامیابی کا ذکر نہ کرتے آج مجھے ان کے بھائی صادق باجوہ کے نام سے پتہ چلا کہ وہ باجوہ تھے۔ جٹ تھے مگر دوسروں کا ذکر بڑھا چڑھا کر دوستوں اور رشتہ داروں میں اندر ہی اندر کرتے رہتے۔ انہوں نے میرا ذکر اپنے عزیزوں میں اس قدر کر رکھا تھا کہ گویا

میں ان کے لئے ہاؤس ہولڈ نام بن گیا تھا۔ان کے بعض بچوں اور رشتہ داروں سے میں کبھی نہیں ملا مگر وہ مجھے لنڈن، جرمنی اور امریکہ سے فون کرتے، میرا احوال پوچھتے، میں ان کو فون کرتا۔دو سال پہلے کی بات ہے لنڈن میں ایک اردو کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا، کسی حوالے سے میرا نام وہاں پکارا گیا تو ایک نوجوان خوبصورت لڑکا میرے پاس بعد میں آیا اور اپنا تعارف پروفیسر ناصر صاحب کے کسی بھانجے، بھتیجے یا اس کے دوست رشتہ دار کی حیثیت سے کرایا اور اصرار کیا کہ ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر اس کے ساتھ اس کے گھر چلوں۔میں نے پیار سے منع کیا کیونکہ میرا جانا ممکن نہ تھا۔ناصر صاحب جب تک زندہ رہے وہ میرے پاس اپنی تاریخی ڈائری اٹھائے آتے رہے۔وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اول نوشہرہ اور پھر لاہور میں جا کر بس گئے تھے مگر میرے ساتھ رابطہ نہ چھوڑا تھا نہ توڑا تھا۔میں حیران ہوتا کہ یا اللہ یہ کس مٹی کے بنے ہوئے انسان ہیں۔آدمی ہیں، جن و بھوت یا فرشتہ۔وہ جو بھی تھے میرے لئے مافوق الفطرت انسان تھے۔اعلیٰ ارفع اور سچی انسانیت کی منہ بولتی تصویر۔انہوں نے مجھے سکھایا مگر منہ سے کبھی نہیں کہا بلکہ کر کے دکھایا کہ ظہور بھائی محبت لینے کا نہیں دینے کا نام ہے۔ان کے کردار سے ہی مجھے یہ سبق ملا کہ دوسروں کیلئے آسانیاں پیدا کرو، اللہ تمہارے لئے آسانیاں پیدا کرے گا۔میں نے غیر محسوس طریقے سے یہ باتیں اور ان کے کردار و عمل کی یہ خوبیاں اپنے اندر حتی المقدور بسالیں، اپنے اوپر طاری کرلیں۔ان کا کہنا تھا کہ خبردار! تمہارے قلم، قدم اور کرم یعنی کام سے کسی کو زک نہ پہنچے، ایک چیونٹی تمہارے پاؤں کے نیچے آ کر نہ مرے۔وہ مجھے کہتے ظہور بھائی مجھے تو قلم اٹھانے کی ہمت نہیں نہ میرے پاس مسلسل حرکت و عمل کی وجہ سے وقت ہے، تم کو اللہ نے ان صلاحیتوں سے نوازا ہے تم لکھو اور مسلسل لکھو۔مزے کی بات ہے کہ وہ مجھے اس زمانے میں کہہ رہے تھے جب میں نے کچھ لکھا ہی نہ تھا نہ بطور قلم کار اپنے آپ سے واقف تھا۔مگر ناصر صاحب یہ سب جان چکے تھے۔آج جو میرا قلم چلا ہے، چل رہا ہے ان کے قدموں اور کرموں کے طفیل ہے، میرا سر ان کے ذکر کے سامنے فرطِ محبت و احترام سے جھک جاتا ہے اور میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔جرمنی میں ان کی بیٹی اور داماد سے ملاقات ہوئی تو ان میں وہی محبت و اپنائیت پائی۔اب بھی جرمنی کے ممتاز ترین ادیب و شاعر حیدر قریشی سے فون پر بات ہوتی ہے تو وہ مجھے اپنے ماموں جیسا جانتا ہے، ناصر صاحب کی بیٹی میں مجھے ان کا پیار جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔مجھے معلوم نہ تھا کہ ان کا ایک بھائی صادق باجوہ امریکہ میں مقیم ہے، میری لینڈ میں ہوتا ہے اور شاعر بھی ہے۔کل پرسوں دلی سے ان کی شاعری کا ایک مجموعہ "میزانِ شناسائی" کے نام سے ملا اور اس میں اس کا انتساب ان کے بڑے بھائی پروفیسر ناصر احمد کے نام کا نظر آیا تو یادوں کے سارے دریچے میری آنکھوں کی نمی کو لئے ایک بار پھر پوری طرح کھل گئے اور صادق باجوہ صاحب کا یہ شعر اس وقت میرا حسبِ حال بنا آنکھوں میں جھلملا رہا ہے

آنکھیں خوشیوں سے بھیگتی ہیں ضرور
جب کوئی بھولا غم گسار آئے

''میزانِ شناسائی'' تقریباً سوا سو صفحات پر مشتمل خوبصورت غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے اور ایک

ایسے شاعر کا ہے جسے اپنا شاعر ہونا یاد ہی نہ تھا، کبھی کبھار غزلیں کہہ کر وہ گھڑے میں ڈال دیا کرتے تھے۔اب دوستوں کے اصرار پر اسے "میزانِ شناسائی" کے نام سے دلی سے چھپوا کر اپنے اور ناصر صاحب کے دوستوں اور شاگردوں میں تقسیم کیا ہے۔آجکل لوگ اپنی کتابیں بھارت سے چھپوا کر وہیں سے بذریعہ ڈاک دنیا بھر میں بھجواتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بھارت میں کتابت، طباعت، کاغذ اور ڈاک کا خرچہ انتہائی سستا ہے۔پاکستان میں محکمہ ڈاک الٹی چھری سے ذبح کرتا ہے۔مجھے جو کتاب بھارت کے 20 روپئے کے ٹکٹ پر آتی ہے وہ میں نے اپنے ڈاکخانے میں جا کر تلوا کر دوبئی بھجوانی چاہی تو خرچہ 480 روپئے بتایا گیا۔دراصل میں نے صادق باجوہ صاحب کی کتاب پر یہ کالم لکھنا تھا مگر بیچ میں ناصر صاحب کی یادوں کے چراغ اس طرح روشن ہوئے کہ میری آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔باجوہ صاحب کے ایک دو شعروں پر اکتفا کرتا ہوں۔

جب بجھی یادوں کی شمعیں ضوفشاں ہو جائیں گی
آنسوؤں کی آبجوئیں بھی رواں ہو جائیں گی

کتنی محدود ہو گئی دنیا
حسنِ ایجاد کی پذیرائی

ظلمت کدۂ دہر میں نفرت تھی کارگر
گلپوش پھر بھی نخلِ محبت سدا ہوئے

آہ مظلوم کی جب بھی نکلے
عرش تک حشر بپا ہو جائے

"میزانِ شناسائی" سادہ معصوم جذبات کی معصوم سی غیر رسمی آبجو ہے، شاعر نے لفظوں کے موتی محبت کی لڑی میں پرو کر پیش کئے ہیں اور میرے دل میں اپنے استاد کی محبت کے پھول ایک بار پھر مہکا دئے ہیں۔

(مطبوعہ 'روزنامہ **آج**' پشاور۔ ۵/اگست ۲۰۰۸ء۔)

''اپنے ابتدائی بچپن میں ادبی اثرات جذب کرنے کے حوالے سے میں نے مختلف اوقات میں جن قریبی عزیز شخصیات کا ذکر کیا ہے، ان میں ابا جی کا میرے اسکول جانے سے پہلے مجھے اردو پڑھنا، لکھنا سکھانا، امی جی کا اردو ناول شوق سے پڑھنا اور ایک طویل پنجابی نظم لکھنا، ماموں ناصر کی گفتگو میں ادب کا گہرا تاثر ملنا شامل ہیں۔ تاہم ماموں صادق میرے ننھیالی خاندان میں واحد شخصیت ہیں جن کو میں نے بچپن میں ہی شاعر کے طور پر دیکھا اور ان کی شاعری سمجھ میں آئی یا نہیں آئی لیکن ان سے متاثر رہا۔اس حوالے سے میں مختلف اوقات میں ان کا ذکر کر چکا ہوں۔۔۔میرے اس لکھے کا اتنا فائدہ ہوا کہ صادق باجوہ کے نام سے لکھنے والے میرے ماموں صادق کو تھوڑی تحریک ہوئی۔میرے مسلسل اصرار کے بعد انہوں نے پاکستان سے اپنی بعض پرانی ڈائریاں تلاش کرائیں، یوں مجھے ان کی شاعری تک رسائی کا موقعہ ملا۔۔۔میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ ماموں صادق نے نہ صرف اپنی پرانی شاعری تلاش کر کے مجھے فراہم کر دی بلکہ اب وہ کچھ نئی نظمیں اور غزلیں بھی کہنے لگ گئے ہیں''

(میرا پہلا ادبی حوالہ از حیدر قریشی مطبوعہ جدید ادب جرمنی۔شمارہ:۳، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۴ء)

صادق باجوہ (میری لینڈ۔امریکہ)

ایک انسان دوست شخصیت

برادرم پروفیسر ناصر احمد کی ہمہ تن انسان دوست شخصیت کے بارے میں، ان کی عادات واطوار اور اوصاف وخصائل پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے اور جب تک ان سے استفادہ کرنے والے شاگرد اور احباب زندہ ہیں شاید مزید لکھا جاتا رہے۔ حال ہی میں معروف کالم نگار جناب ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے میری کتاب " میزانِ شناسائی" پر تبصرہ کے دوران ناصر صاحب مرحوم کا ذکرِ خیر بہت عمدہ الفاظ میں کیا ہے۔ جو ایک شاگرد اور شریکِ کار کے قریبی اور دیرینہ تعلقاتِ محبت وعقیدت اور قربت کے اظہار کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر اعوان صاحب نے ان کے اوصاف، انسانی رشتوں اور عادات واطوار پر مؤثر اور دلکش انداز میں روشنی ڈال کر آنے والی نسلوں کو واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ اپنی ذات کو مٹا کر محض انسانیت کے تعلق کو نبھانے والے انسان مرا نہیں کرتے۔ ڈاکٹر اعوان صاحب کا مضمون " اچھے انسان مرا نہیں کرتے" کے عنوان سے روزنامہ 'آواز' پشاور کے اگست ۲۰۰۸ء کے پہلے ہفتہ میں "دل پشوری " کالم کے تحت شائع ہوا ہے۔ قبل ازیں ڈاکٹر صاحب موصوف نے ۱۹۹۳ء میں جبکہ ناصر صاحب ابھی حیات تھے انہیں 'حاتم طائی' کے لقب سے نوازتے ہوئے ایک مفصل مضمون بعنوان "حاتم طائی خدائی خدمتگار۔ پروفیسر ناصر احمد" سپرد قلم کیا تھا جو اس وقت روزنامہ مشرق پشاور میں ۱۳/اکتوبر ۱۹۹۳ء کے پرچہ میں شائع ہوا تھا۔ اسی طرح عزیزم حیدر قریشی مدیر "جدید ادب" جرمنی نے اپنے بعض خاکوں اور یادوں کے ابواب میں اور انٹرویوز میں ناصر صاحب کی زندگی کے مختلف واقعات کا ذکر کیا ہے۔ میں ان واقعات کو دہرانے کی بجائے کچھ ایسے واقعات ومشاہدات کا ذکر کروں گا جو ان کے بھائی ہونے کے ناطے ساتھ رہتے ہوئے نظر سے گزرے اور بہت سے احباب کے علم میں نہیں۔ ہمارے والد بزرگوار میاں سراج الدین سے مشورہ کے بعد بھائی جان ناصر میٹرک کے بعد مجھے اپنے پاس پشاور لے گئے تاکہ میں ان کی نگرانی میں تعلیم حاصل کر سکوں۔ چنانچہ میں نے ایف ایس سی سے ایم ایس سی تک کا عرصہ ان کے ساتھ گزارا۔

بچپن سے انہیں مترنّم، متاثّر اور خوبصورت آواز میں نظمیں پڑھتے دیکھتے آئے تھے۔ غالباً ہم ساتویں جماعت میں تھے جب ہمیں بھی شاعری کا شوق ہوا۔ ایک دن ہم نے پُر امید انداز سے بھائی جان سے درخواست کی کہ وہ ہمیں کوئی نظم لکھ کر دیں۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے ایک نظم ہمارے ہاتھ میں تھما دی۔ جس کی ردیف 'جی

چاہتا ہے' تھی۔ یہ نظم پا کر ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ہر ایک کو یوں سناتے پھر رہے تھے جیسے ہم نے خود کہی ہو۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ایک دن اسکول کے ایک خالی پیریڈ میں کچھ ہم جماعت ایک استاد کے بارے میں الٹے سیدھے شعر پڑھ رہے تھے۔ جانے کیا سوجھی کہ ہم نے ایک نظم لکھ کر لانے کا وعدہ کر لیا۔ دوسرے دن ہم کلاس میں ایک نظم سنا رہے تھے جو بھائی جان کی لکھی ہوئی نظم کے ہم قافیہ تھی۔ سب دوست بہت خوش تھے اور ہماری نظم شوق سے پڑھ رہے تھے۔ ایک لڑکے نے شرارتاً وہ نظم اس استاد کی خدمت میں پیش کر دی جس کے بارے میں نظم لکھی گئی تھی۔ ہم بہت پریشان ہوئے کیوں اس کا ردعمل کسی بھی قسم کی سزا کی صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا۔ لیکن حیرت ہوئی کہ انہوں نے ہمیں کچھ نہ کہا۔ شام کو والد صاحب کی ڈانٹ اور استاد کی عزت وتکریم پر لیکچر سن کر علم ہوا کہ شکایت اور تنبیہ کے رنگ میں نظم والد صاحب تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں پس منظر کے طور پر ایک اور واقعے کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ ہمارے اسی استاد نے ایک ضعیف العمر شخص کے بارے میں (جسے لوگ چڑانے کے لئے بابا بھنڈی کہتے تھے) ایک مزاحیہ نظم لکھی۔ ستم ظریفی یہ کہ انہوں نے نہ صرف وہ نظم عام لوگوں کے سامنے پڑھی بلکہ اس بزرگ کو بھی سنا دی۔ ہمیں بہت برا لگا۔ ہمارے اندر ہمدردئ انسان کا خوابیدہ جذبہ، جو قدرت نے ابتدا ہی سے ودیعت کر رکھا تھا، جاگ پڑا اور ایک حد تک ہماری پہلی نظم اسی کا ردعمل تھا۔ بعد میں یہی جذبہ ایک اہم جزو بن کر زندگی بھر کارفرما رہا اور ہماری شاعری پر اس کی گہری چھاپ رہی ہے۔

والد صاحب نے ڈانٹنے کے بعد اپنی اس حیرت کو دباتے ہوئے کہ ان کا بیٹا شاعر بن رہا ہے مجھ سے پوچھا کہ آخر تم نے کیا سوچ کر یہ نظم لکھی ہے۔ میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے جب اپنے استاد والی نظم کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے کہ تمہیں کیا پڑی تھی کہ نظم لکھتے پھرو۔ وہ بابا تمہارا لگتا کیا ہے۔ تم بہرحال استادوں کی عزت کیا کرو۔ ہم یہ تو نہ کہہ سکے کہ آخر وہ بھی تو انسان ہے جس کے جذبات مجروح کئے گئے۔ غالباً وہ بھی سمجھ چکے تھے کہ میری نظم اپنے استاد کے خلاف نہیں بلکہ جذبۂ ہمدردی کے تحت لکھی گئی ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے ان کا لہجہ نرم ہو چکا تھا۔

میں نے اپنے شعری مجموعے "میزانِ شناسائی" کو ناصر صاحب کے نام منسوب کیا ہے۔ نیز حرفِ اول میں لکھا ہے:۔ شعروشاعری سے ہماری توجہ، دلچسپی اور ذوق وشوق کا باعث ہمارے بڑے بھائی پروفیسر احمد کا وجود تھا۔ انہیں بلا مبالغہ ہزاروں اشعار ازبر تھے۔ وہ اکثر گھریلو ماحول میں اور احباب واقربا کی فرمائش پر اتنے انہماک اور وجدانی کیفیت سے دوچار ہوتے ہوئے اشعار سناتے یوں لگتا کہ وہ خود شعر کہہ رہے ہیں جن کی آمد ایک تسلسل سے ہو رہی ہے۔ سننے والے ان کے اس انداز سے بہت محظوظ ہوتے۔ وہ شاعر تو نہ تھے لیکن شعراء کو سننا اور پڑھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اچھے شعر پر دل کھول کر داد دیتے" **(میزانِ شناسائی صفحہ 7)**
ہماری یہ تحریر سوائے اظہارِ حقیقت کے کچھ نہیں۔

اگرچہ ہم نے اسکول کے زمانے سے شعر کہنے شروع کر دئے تھے اور اساتذہ اور بہت سے دیگر شعرا کے

اشعار ہمیں بھی یاد تھے اور موقع محل دیکھ کر شعر چسپاں کر دیتے تھے لیکن بھائی جان ناصر کی یادداشت کو ہم نے ہمیشہ تعجب کی نظر سے دیکھا ہے۔ کہ کس طرح لمبی لمبی نظمیں انہیں از بر تھیں جو وہ ماحول و سامعین کو دیکھ کر ان کے مزاج کے مطابق سنایا کرتے تھے۔ حمدیں، نعتیں، منقبتیں، غزلیں، ماہیے اور مزاحیہ نظمیں خوب یاد تھیں۔ الغرض شاعری کی تمام اقسام سے ناقابلِ بیان حد تک شناسائی تھی۔ کہیں غالب، ذوق، آتش، مومن اور اقبال کے اشعار ہیں تو کہیں ہمعصر شعرا کا کلام سنایا جا رہا ہے۔ کبھی ظریف جبلپوری کی مزاح نگاری سے محفل کو زعفران زار بنا رہے ہیں تو کبھی مجید لاہوری کے نمکدان سے ٹوٹکے سنائے جا رہے ہیں۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے اسی کے ہو جاتے اور لوگ مدتوں یاد رکھتے۔ دو تین سال قبل نیویارک سے آنے والے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں جب انہیں علم ہوا کہ میں ناصر صاحب کا بھائی ہوں تو انہوں نے بہت پرانی باتیں سنانی شروع کر دیں کہ کس طرح ایک محفل میں ملاقات کے بعد وہ ناصر صاحب کے مداح بن گئے تھے۔ اور اب تک انہیں اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔

شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے علاوہ بھی گھریلو ماحول میں چھوٹے بڑے تمام عزیز و اقارب اس انتظار میں ہوتے کہ کب آئیں اور محفل گرم ہو۔ ان کے کام کی نوعیت اور گوناگوں مصروفیت دیکھ کر اندازہ نہ ہوتا کہ میلانِ طبع اس حد تک شاعری کی تمام اصناف سے نہ صرف مانوس ہے بلکہ مؤثر بیان پر بھی خوب دسترس ہے۔ راقم الحروف سے بھی فرمائش کر کے غزلیں سنا کرتے اور اچھے اشعار پر داد دیتے۔

ناصر صاحب کی اردو شعر و شاعری اور ادب کے گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب پر بھی خوب دسترس تھی۔ انگریزی کے استاد تھے۔ بہت سی کتب کے بے شمار اقتباسات ہر وقت یاد ہوتے۔ ان کے پڑھانے کا طریق بھی منفرد ہوتا۔ اس انداز سے مضمون میں ڈوب کر پڑھاتے کہ طلباء کو یاد رہتا۔ اور اکثر انہیں عزت و تکریم سے یاد کرتے۔ تعلیم کے بعد بھی دوستی کا تعلق نہ صرف برقرار رکھتے بلکہ ان کے شاگرد ہونے پر فخر محسوس کرتے۔

ہر ملنے والا اور عزیز خوب جانتا تھا کہ ناصر صاحب کے ذہن و دماغ میں انکار نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہیں۔ جس نے مانگا، جب مانگا، جو مانگا مہیا ہو جاتا۔ مانگنے والا شاید سوچتا بھی نہ تھا کہ اس شخص کی محدود آمدنی ہے گھریلو اخراجات بھی ہیں اس نے کہاں سے دیا ہے، کہاں سے آئے گا اور کیسے پورا کرے گا۔ دریا دلی تھی کہ بحرِ ناپیدا کنار کی طرح موجزن تھی۔ بہت سے شاطر لوگ اس کمزوری سے ناجائز فوائد بھی حاصل کرتے رہے۔ مثلاً ضرورت بتا کر قرض مانگا اور واپس نہ کیا۔ بھائی جان ناصر ایسی باتوں کا کسی سے ذکر نہ کرتے لیکن ساتھ رہتے ہوئے بعض دفعہ مجھے بھی علم ہو جاتا۔ بہت پرانی بات ہے کہ ایک صاحب لاہور سے کسی کام کے سلسلے میں پشاور آئے اور کچھ دن ہمارے ہاں قیام کیا۔ جاتے ہوئے یکصد روپیہ قرض اس وعدہ پر لیا کہ لاہور جاتے ہی منی آرڈر کر دیں گے۔ لیکن منی آرڈر نہ آنا تھا نہ آیا۔ حالانکہ یہ صاحب بہت اچھے عہدے پر فائز تھے۔ کچھ دنوں بعد بھائی جان ناصر لاہور جانے لگے تو میں نے یاد دلایا کہ ان صاحب سے قرض واپس لینا نہ بھولئے۔ واپسی پر جب

میں نے پوچھا کہ کیا وہ آدمی آپ کو ملا تھا تو ہنستے ہوئے کہنے لگا ہاں ملا تھا اور کہتا بھی تھا کہ میں نے آپ کا قرض دینا ہے لیکن دیا نہیں۔ بعد میں بھی وہ صاحب متعدد بار ملے لیکن قرض واپس نہ کیا۔ اسی طرح ان کا ایک شاگرد گاؤں سے کسی کام سے پشاور آیا اور ہمارے ہاں ٹھہرا۔ ہماری بھابی نے نیا بستر بچھایا۔ جاتے ہوئے وہ ایک چادر اٹھا کر ساتھ لے گیا۔ جب بھابی صاحبہ نے شکایت کی تو جواب ملا۔ کوئی بات نہیں وہ زیادہ ضرورتمند ہوگا۔ فکر نہ کرو اللہ اور چادر دے دے گا۔

پروفیسر ناصر احمد کا حافظہ
ان کی بیٹی کی ڈائری سے ایک نثری اقتباس

''ایک بار ابو نے خواجہ حسن نظامی کی ایک تحریر جو اُنہیں زبانی یاد تھی، بتائی، میں نے اسی وقت نوٹ کر لی۔ بہت دلچسپ تھی، وہ لکھے دیتی ہوں۔ آپ تو ابو کے ادبی ذوق کو مجھ سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں مگر میں جب اسے اپنی ڈائری سے پڑھتی ہوں، یہ سوچ کر مزہ لیتی ہوں کہ انہیں کیسے کیسے منفرد نثری اقتباس بھی زبانی یاد تھے۔ خواجہ حسن نظامی کی تحریر کا اقتباس یہ ہے:

آپ کون؟

ناچیز تنکا

اسم شریف؟

دیا سلائی کہتے ہیں۔

دولت خانہ؟

نہ دولت، نہ خانہ، اصلی گھر جنگل میں تھا مگر چند روز سے احمد آباد میں بستی بسائی ہے اور سچ پوچھئے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل جو آپ کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے، میرا موجودہ ٹھکانہ ہے۔

کیا احمد آباد، ناروے یا سویڈن میں ہے؟ کیونکہ آپ لوگوں کی بستیاں انہی علاقوں میں سنی جاتی ہیں۔

نہیں جناب! احمد آباد ہندوستان میں ہے، آپ دیکھتے نہیں میرا رنگ سانولا ہے۔ یہ اس ملک کی نشانی ہے۔ ناروے اور سویڈن کی دیا سلائی گوری چٹی ہوتی ہے۔ مجھ غریب کو اس سے کیا نسبت۔

تو آہا آپ ہمارے ملک کی دیا سلائی ہیں تبھی تو آپ کا رنگ سانولا ہے مگر ہماری نگاہ میں دیا سلائیوں کی رانی ہو۔

جناب والا مجھے رانی نہ کہیو بیگم کہیو۔ میں نے مسلمانوں کے گھر جنم لیا ہے۔

اچھا میاں تنکے! ناراض نہ ہو۔ تم کو بھی یہ دن لگے کہ رانی اور بیگم میں تمیز کرتے ہو۔

(**پروفیسر ناصر احمد صاحب** کی چھوٹی صاحبزادی **بشریٰ ہما** (لندن) کے ایک خط بنام حیدر قریشی سے اقتباس)

حیدر قریشی

رانجھے کے ماموں

(ماموں ناصر)

ہرا سکتا نہ تھا ویسے تو کوئی بھی مگر مجھ کو
کسی کی کامیابی کے لئے ناکام ہونا تھا

میرے والد سرائیکی تھے سو میں نسلاً سرائیکی ہوں۔ میری والدہ پنجابی تھیں اس لحاظ سے سرائیکی النسل ہونے کے باوجود میری مادری زبان پنجابی ہے۔ پنجابی زبان میں ماں کا نام دوبار لینے سے ماموں کا رشتہ بنتا ہے یعنی ''ماں ماں'' (لکھنے میں تو شاید ماماں سے ہی کام چل جاتا ہے لیکن الفاظ کی ادائیگی میں ماں ماں کہنا ہوتا ہے) سو ماموں کا رشتہ بڑا اہم اور معتبر رشتہ ہے۔ میرے پانچ ماموں ہیں۔ عمروں کے لحاظ سے ان کی ترتیب یوں ہے: پہلا نمبر عطاء اللہ کلیم صاحب۔ دوسرا نمبر پروفیسر ناصر احمد صاحب۔ تیسرا نمبر حمید اللہ کوثر باجوہ صاحب۔ چوتھا نمبر ڈاکٹر سمیع اللہ ریاض صاحب۔ پانچواں نمبر حبیب اللہ صادق صاحب۔ اگر مجھ سے میری ذاتی پسند کے بارے میں پوچھا جائے تو پھر میرے ماموؤں کی ترتیب یوں ہوگی: پہلا نمبر ماموں ناصر۔ دوسرا نمبر ماموں ناصر۔ تیسرا نمبر ماموں ناصر۔ چوتھا نمبر ماموں سمیع اور پانچواں نمبر ماموں صادق۔

یہ قطعاً میری ذاتی پسند کی ترتیب ہے جس سے اختلاف کا ہر عزیز کو حق حاصل ہے۔ اس ترتیب سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ماموں ناصر میرے لئے ایسے ماموں ہیں جو ماں کا نام دوبار لینے سے نہیں بلکہ چھ بار لینے سے پورے ہوتے ہیں اس سے میرے لئے ان کی محبت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ماموں ناصر کی محبت بڑی ظالم شے ہے اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر ہوگی۔

ماموں ناصر کے ساتھ میری محبت دراصل ''بچپن کی محبت'' ہے میں نے ابتدائی عمر میں ہی دیکھا کہ ماموں ناصر کو اپنی بہنوں میں میری امی جی سے خاص محبت تھی۔ اتنی خاص کہ دوسری بہنوں کے لئے بھی بعض اوقات غصے کا موجب بن جاتی۔ بے جی (نانی جان) بھی کبھی کبھی جھلا جاتیں۔ امی جی کے تعلق سے یہ محبت ابا جی تک بھی پہنچی ماموں ناصر ابا جی کا بے حد احترام کرتے۔ رحیم یار خان میں تنگی کے دنوں میں جب بھی ماموں ناصر سے قرض مانگا

انہوں نے فوراً فراہم کیا، چاہے خود بھی کہیں سے قرض ہی کیوں نہ لیا ہو لیکن ابا جی کے کام میں تاخیر نہیں ہونے دی۔۔ ایک موقعہ پر بہت سارے عزیز و اقارب جمع تھے۔ ابا جی اپنے جوتوں کی مرمت اور پالش کرانے کے لئے کسی بچے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ جب تک کوئی بچہ ملتا ماموں ناصر بتائے بنا خود ابا جی کے جوتے لے کر چلے گئے اور مرمت کرا کے، پالش کرا کے لے آئے۔۔ امی جی اور ابا جی کے ساتھ ماموں ناصر کے ایسے محبتی رویّے کی متعدد مثالیں ہیں۔ اسی وجہ سے بچپن میں ہی مجھے ماموں ناصر سے محبت ہوگئی۔ مبارکہ کے ساتھ میری شادی ہونے میں میری پسند کے علاوہ امی جی اور ماموں ناصر کی گہری محبت کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

ماموں ناصر بنیادی طور پر سیلف میڈ انسان ہیں کم عمری میں میٹرک کا امتحان پاس کرتے ہی انہوں نے سارے خاندان کا بوجھ اٹھانے کے لئے نوکری کر لی۔ نوکری کے ساتھ پرائیویٹ طور پر تعلیم کے حصول کا سلسلہ جاری رکھا۔ ریلوے کی ملازمت سے لے کر انگلش کی پروفیسری تک انہوں نے ان تھک محنت کی۔ خاندان کے تقریباً ہر فرد پر احسانات کئے اور تقریباً ہر فرد سے ان احسانات کی مناسب سزا پائی۔ ماموں ناصر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اپنوں میں سے جو انہیں زیادہ عزیز ہوتے ہیں ان کی سفارش پر دوسروں کے مشکل سے مشکل کام کروا دیتے ہیں مگر خود اس عزیز کا کام کبھی نہیں کرائیں گے جس سے انہیں محبت ہوگی۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ ماموں ناصر کی محبت بڑی ظالم شے ہے اور اس محبت کے بڑے شکاروں میں سے ایک میں ہوں۔

ماموں جی کی پہلی شادی ماں کی اطاعت میں ہوئی اس خاندانی فیصلے کی قیمت ممانی مجیدہ نے ادا کی۔ سرخ و سفید رنگت والی ممانی مجیدہ سے لے کر ٹی بی کا شکار ممانی مجیدہ تک دکھوں کا ایک سفر تھا۔ ممانی مجیدہ نے ۳۲ برس کی عمر میں یہ سفر طے کر لیا اور اپنی یادگار ایک بیٹا اور تین بیٹیاں چھوڑ گئیں۔

میری شادی اپریل ۱۹۷۱ء میں ہوئی اسی سال میں اور مبارکہ گرمیوں کے دنوں میں ماموں ناصر کے پاس مانسہرہ گئے۔ وہاں ایک دن ریڈیو پر مہندر کپور کا گیت نشر ہوا:

تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو میں یونہی مست نغمے لٹا تا رہوں

میں نے دیکھا ماموں ناصر عالم جذب میں پہنچے ہوئے تھے۔ ممانی مجیدہ کو فوت ہوئے چار برس ہو چکے تھے اور ان کی زندگی کے آخری تین برس بھی سنگین بیماری کے باعث شجر ممنوعہ کے طور پر بسر ہوئے تھے۔ گویا سات برس کا وقفہ تھا۔ بیٹیوں کی شادی کے بعد جیسے ہی انہیں سبکساری کا احساس ہوا زندگی پھر سے انگڑائیاں لینے لگی۔ مہندر کپور گا رہا تھا:

میں اکیلا بہت دیر چلتا رہا اب سفر زندگانی کا کٹتا نہیں
جب تلک کوئی رنگیں سہارا نہ ہو وقت کافر جوانی کا کٹتا نہیں

میں نے اس دن مہندر کپور کے گیت کا لفظ لفظ ماموں ناصر کے روم روم میں اترتے دیکھا۔

خانپور واپس آ کر امی جی کو اپنے ''مشاہدہ'' کا حال سنایا۔امی جی نے فوراً رشتوں کی تلاش شروع کر دی۔دو سال کی دوڑ دھوپ کے بعد مطلوبہ رشتہ ملا۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔۔ممانی آصفہ کو ملتان سے بیاہ کر خانپور لایا گیا۔دو چار دن شادی کی گہما گہمی رہی پھر ماموں، ممانی پشاور چلے گئے۔گھر آباد ہو گیا۔

ماموں ناصر انگریزی ادبیات کے استاد ہیں مگر اُردو ادب سے بے خبر نہیں ہیں اردو کے کلاسیکی ادب سے تو گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ برجستہ اشعار پڑھنے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ایک دفعہ مرحومہ ممانی مجیدہ نے کہا کہ مجھے تھوڑا اسا دبا دیں۔فوراً غالب کا یہ شعر پڑھنے لگے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے، ذرا میرے پاؤں داب تو دے

ہزارہ میں ڈاڈر کے علاقے سے دریائے سرّن گزرتا ہے۔دریا کا صاف پانی اور چاروں طرف ہریالی۔۔میں اس منظر کو حیرت اور مسرت سے دیکھ رہا تھا کہ ماموں ناصر نے معمولی سے تصرف کے ساتھ علامہ اقبال کے یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے:

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہیں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہے
ہے دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہے
پانی کو چھو رہی ہے جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہے

دل کی ایسی جادوئی حالت تھی جیسے علامہ اقبال کے اشعار الہام کی طرح نازل ہو رہے ہوں یہ ماموں ناصر کی برجستگی کا کمال بھی تھا۔

گھر کی شادی بیاہ کی محفلوں میں جب صرف خاندان کے افراد موجود ہوتے ماموں ناصر کوئی نہ کوئی غزل اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ سناتے۔ بہادر شاہ ظفر کی غزل ''تا در جاناں ہمیں اول تو جانا ہے منع'' اور سراج دکنی کی غزل ''خبر تحیرّ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی''۔۔ماموں ناصر ایسی خوبصورتی سے سناتے کہ یہ اصل شاعروں کی بجائے ماموں ناصر کا کلام لگنے لگا۔

طبعاً ماموں ناصر مذہبی انسان ہیں مگر مذہبی تعصّبات سے دور۔۔حالانکہ میرے عزیزوں میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے کٹر پن کے باعث اپنے تعصّبات سے پاک نہیں ہو سکے۔یورپ اور امریکہ کا کشادہ ماحول بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔۔مذہبی ہونے کے باوجود ماموں ناصر خلاف شرع تھوک لینے کو عیب نہیں سمجھتے اسی

لئے اندھیرا، اجالا ان کا مسئلہ نہیں ہے۔۔ماموں ناصر کی خوش ذوقی اور شگفتہ مزاجی کے باعث مجھے ہمیشہ ٹوہ رہی کہ ماموں ناصر کی کسی پرانی محبت کو دریافت کروں اس میں کوئی واضح کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن اتنا سراضرور ہاتھ آیا ہے کہ کسی زمانے میں ماموں ناصر کی فیصل آباد کے ایک میر صاحب سے بہت دوستی تھی۔ان کی بیگم، بہن، بچے۔۔گھر کے سب افراد ماموں ناصر کے لئے چشم براہ رہتے۔انہیں دیکھ کر ماموں ناصر کے چہرے پر بھی شگفتگی پھیل جاتی۔ بعد میں یکا یک یہ تعلق ٹوٹ گیا۔میرا اندازہ ہے کہ ماموں ناصر کی موجودہ شگفتہ مزاجی اسی دور کی عطا ہے۔واللہ اعلم باالصواب!

مجھے شاعری کا شوق ہوا تو ماموں ناصر نے میری اصلاح کے لئے ایک استاد قسم کے شاعر جناب اختر بے خودرام پوری (یا کوئی اور پوری) کو بلا لیا۔انہوں نے میری وہ اصلاح فرمائی کہ شاعری سے تائب ہونے میں بس تھوڑی سی کسر رہ گئی۔عام زندگی میں مجھے راہ راست پر لانے کے لئے ماموں ناصر کسی نہ کسی جناب اختر بے خودرام پوری کو مجھ پر مسلّط کر دیتے ہیں۔شاید انہیں میری اصلاح کا گر معلوم ہو گیا ہے۔

ہر انسان کی زندگی عام معمولات کے مطابق بسر ہوتی ہے لیکن ایک ڈگر پر چلتے چلتے اس میں کبھی کبھار کوئی موڑ بھی آ جاتا ہے۔کوئی پراسرار، محیر العقول یا روحانی تجربہ یا پھر کوئی ایسا واقعہ، سانحہ ہو جاتا ہے جس سے زندگی عام ڈگر سے ہٹ جاتی ہے۔ماموں ناصر کی زندگی میں بعض ایسے واقعات رونما ہوئے۔قیام پاکستان کے ایاّم میں مشرقی پنجاب میں بم کے ایک دھماکے کے نتیجہ میں ماموں ناصر زخمی ہو گئے۔موت انہیں چھو کر گزر گئی۔بم کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی ضرب کا نشان ماموں ناصر کے جسم پر آج بھی موجود ہے۔اس تجربے سے انہیں زندگی کی اہمیت اور موت کی حقیقت دونوں کا ادراک ہوا۔

ریلوے ملازمت کے دوران ماموں ناصر غالباً کوہاٹ میں مقیم تھے۔وہاں ایک دفعہ موسم بہار میں ایک سانپ نکل آیا۔ریلوے کے ایک دو ملازموں نے مل کر سانپ کو ہلاک کر دیا۔ماموں ناصر کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ بھی جائے واردات پر تماشائی کی حیثیت سے موجود تھے۔فلمی کہانیوں کے عین مطابق مردہ سانپ کی آنکھوں میں ماموں ناصر کا عکس بھی محفوظ ہو گیا۔پھر اس سانپ کی مادہ کے انتقام کی سٹوری شروع ہو گئی ماموں ناصر سے اس ناگن نے عجیب انتقام لیا۔ ہر سال بہار کے موسم میں آتی اور ان کے پیروں کو سونگھ کر چلی جاتی۔اگلی صبح پاؤں اس طرح ہوتے جیسے کسی نے ساری کھال اتار لی ہو۔ماموں ناصر اس دوران ریلوے کی ملازمت چھوڑ کر محکمہ تعلیم میں آ گئے مگر محکمے کی تبدیلی کا بھی اس ناگن نے کوئی اثر نہیں لیا۔ماموں اس موسم میں پشاور میں ہوتے یا کوہاٹ میں، میران شاہ میں ہوتے یا ڈیرہ اسماعیل خاں میں۔۔اپنے پیار کی آگ میں جلتی اور انتقام کی آگ میں سلگتی، غلط فہمی کی ماری وہ ناگن وہیں پہنچ جاتی، ان کے پاؤں سونگھتی اور انہیں اذیت میں مبتلا کر کے لوٹ جاتی۔آفرین ہے اس ناگن کی اخلاقیات پر کہ اس نے ماموں کے پاؤں سونگھنے سے کبھی تجاوز نہیں کیا یہ الگ بات کہ اسی حرکت سے ہی

ماموں کے پیروں کا ماس الگ ہو جاتا تھا۔ شاید وہ ان کے ماس ہی کو ان کے جسم سے الگ کرنا چاہتی تھی۔ ڈیرہ اسماعیل خاں میں قیام کے دوران جب وہ ناگن اپنے مُقرّرہ وقت پر پہنچی تو اتفاق سے ماموں صادق اور چند سٹوڈنٹس بھی وہیں موجود تھے۔ ماموں ناصر تو اس ناگن کو دیکھتے ہی سحر زدہ سے ہو گئے مگر ان کے شاگردوں اور ماموں صادق نے مل کر اس ناگن کا کام تمام کر دیا۔ یوں ''ناگن کا انتقام'' کی کہانی اپنے انجام کو پہنچی لیکن یہ کہانی کسی فلم کی سٹوری یا کسی قدیم مائتھالوجی سے اخذ کی ہوئی نہیں تھی۔ ماموں ناصر نے فلمی ہیرو کے برعکس زندگی کے ہیرو کی طرح اپنا پارٹ پلے کیا۔ فلمی ہیرو کی طرح مصنوعی کرب خود پر طاری نہیں کیا بلکہ واقعہ کی پوری اذیّت بھوگی اور سالہا سال موت سے معانقہ کر کے نیا جنم لیتے رہے۔۔ بم دھماکے اور غلط فہمی کی شکار منتقم مزاج ناگن کے واقعات کے بعد تیسرا اہم واقعہ ماموں ناصر کی ممانی آصفہ کے ساتھ شادی کا ہوا۔ یہ شادی ان کی زندگی کی ڈگر کو یکسر تبدیل کر گئی۔ ممانی آصفہ کے ذریعہ ہمارے ننھال میں زندگی کا ایسا طریقہ سامنے آیا جس کی پہلے ہمارے ننھال میں کوئی مثال موجود نہ تھی۔ ممانی آصفہ کے پاس بیٹھے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ''شیدا پستول'' جینٹری میں آ گیا ہو۔ بلکہ کبھی کبھی تو ماموں ناصر کی حالت بھی کچھ ایسی ہی دکھائی دینے لگتی ہے۔

مرحومہ ممانی مجیدہ سے ماموں ناصر کے چار بچے ہیں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔۔ مُبارکہ، وحیدہ، غزالہ☆، مُبشّر احمد خالد۔۔ ممانی آصفہ سے دو بیٹیاں ہیں۔۔ عائشہ، بُشریٰ۔۔ ممانی مجیدہ کی ساری اولاد شادی شدہ ہے بڑی بیٹی مبارکہ میری بیوی ہے۔ اس سے چھوٹی وحیدہ کے شوہر بشیر احمد شاہد عمر میں مجھ سے چھ ماہ بڑے ہیں اور سب سے چھوٹی غزالہ کے شوہر محمود عمر میں مجھ سے دو سال بڑے ہیں۔ یوں میں رشتہ کے لحاظ سے اس طرح ماموں ناصر کا سب سے بڑا داماد ہوں کہ ان کی بڑی بیٹی کا شوہر ہوں اور اس لحاظ سے اب تک کا سب سے چھوٹا داماد ہوں کہ دونوں چھوٹے داماد عمر میں مجھ سے بڑے ہیں ؎ ایں سعادت بزورِ بازو نیست

میرے بعض بھائیوں کو ایک دو ماموؤں سے شدید شکایتیں ہیں۔ ایک دفعہ میں انہیں سمجھا رہا تھا کہ ہر شخص کے اپنے حالات ہوتے ہیں، اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں، ترجیحات ہوتی ہیں۔ اب ہمیں کسی ماموں کا شکوہ کرنے کی بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اپنے بھانجوں بھانجیوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ تاکہ ہمیں بھی کل کلاں ان سے ویسے ہی ریمارکس نہ سننا پڑیں جیسے آج بعض ماموؤں کے بارے میں ہم دے رہے ہیں۔ شکوے شکایتیں تو رشتہ داری کا حصہ ہیں۔ ایک حد تک رہیں تو ان سے بھی محبت گہری ہوتی ہے۔ ویسے بحیثیت رشتہ ماموں کا رشتہ ماموں کا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے بھانجوں کا ماموں ہو یا ہمارا ماموں، ہیر کا ماموں ہو یا رانجھے کا ماموں۔۔ بہن کو بھائی سے اور بھائی کو بہن سے سچی محبت ہو تو سارے ''مامے'' ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ماموں ناصر میرے لئے ''رانجھے کا ماموں'' ثابت ہوئے ہیں۔ رانجھے کا ماموں باقی دنیا کے ماموؤں جیسا ہوتے ہوئے بھی ان سے تھوڑا مختلف ہے۔ رانجھے کا ماموں اسے خود بانسری لے کر دیتا ہے۔ بھینسیں پلے سے خرید کر دیتا ہے۔ رومینٹک فضا پیدا

کرنے میں ہر ممکن مدد کرتا ہے۔ کھیڑوں سے مقابلہ کرتا ہے اور پھر رانجھے کی ساری مشقتیں خود اٹھا کر اسے ہیر عطا کراتا ہے۔ مجھے یقین ہے اگر ماموں ناصر پہلے رانجھے کے دور میں اس کے ماموں ہوتے تو ہیر سے اس کی شادی کرا کے رہتے۔ دراصل ماموں ناصر طبعاً مذہبی ہونے کے باوجود صلح جو، انسان دوست اور محبتی انسان ہیں۔

عالمی امن کے لئے موجودہ دور کے بڑے ممالک جس طرح ''ہیر کے مامے'' بن کر دہائی دے رہے ہیں اگر رانجھے کے ماموں کو موقعہ دیں تو بہت سے جھگڑے فوراً ختم ہو سکتے ہیں، مثلاً اگر افغان مسئلہ پر مفاہمت کے لئے ماموں ناصر کو ذمہ داری سونپی جائے تو ماموں، جنرل نجیب سے یوں بات کریں گے: افغان عبوری حکومت کے تمام ارکان ذاتی طور پر آپ سے دلی محبت رکھتے ہیں مگر بین الاقوامی مداخلت کے باعث مجبور ہیں۔۔ پھر افغان عبوری حکومت سے یوں بات کریں گے: جنرل نجیب تو آپ سب کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ بیان سے باہر ہے مگر روسی دباؤ کے باعث ان کی پیش نہیں جا رہی۔ اس لئے آپ اپنے رویے میں تھوڑی لچک پیدا کر کے ان کی مدد کریں۔۔ یوں چند ملاقاتوں کے بعد افغان مجاہدین اور جنرل نجیب کی مشترکہ حکومت قائم ہو جاتی۔ افغانستان میں امن و امان ہو جاتا اور ساری بیرونی طاقتیں منہ دیکھتی رہ جاتیں۔

اس مثال سے ماموں ناصر کی ہمدرد، صلح جو اور محبتی طبیعت کو واضح کرنا مقصود تھا۔ اس وقت عالمی امن کی خرابی میں سارا قصور ان بڑے ملکوں کا ہے جو خوامخواہ ''ہیر کے مامے'' بنے پھرتے ہیں جبکہ دنیا کو اس وقت خاص طور پر رانجھے کے ماموؤں کی ضرورت ہے۔ ماموں ناصر جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

☆ افسوس یہ خاکہ رسالہ ''صریر'' میں چھپنے کے بعد غزالہ اور محمود میں علیحدگی ہو گئی۔ پتہ نہیں یہ اس خاکے کا اثر تھا یا محمود کی اپنی خاک کا۔۔۔ غزالہ اب محمد اجمل پاشا کی بیوی ہے۔ خدا ان دونوں کو خوش رکھے آباد رکھے ؎ اور درویش کی دعا کیا ہے۔

''حیدر قریشی شاعر، افسانہ نگار اور انشائیہ نگار بھی ہیں اور ان کی یہ تینوں خصوصیات ان خاکوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ ان میں جا بجا بہت سے چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور خیال انگیز افسانے بھی مل جاتے ہیں جیسے انہوں نے اپنے ماموں ناصر کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کہیں بھی ہوتے ہر سال بہار کے دنوں میں انہیں ڈسنے کے لئے ایک ناگن آیا کرتی تھی جس کے محبوب (سانپ) کو ان کے ملازموں نے ہلاک کر دیا تھا۔ یوں بھی اس واقعہ میں بلا کی افسانویت تھی مگر ان کے اندازِ نگارش نے اسے اور بھی دل آویز بنا دیا۔'' (**منشا یاد** کے مضمون **میری محبتیں** سے اقتباس۔ مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس** اسلام آباد۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ ص ۴۴)

ستیہ پال آنند (کینیڈا)

شوکت صدیقی۔ ایک سوانحی مونتاژ

•(اس مونتاژ کے لیے مواد شوکت صدیقی کے ساتھ تین انٹرویو (جو راقم الحروف کی ادارت میں چھپنے والے ماہنامہ ''راہی'' دہلی میں 56-1955ء میں شامل اشاعت ہوئے،) شوکت کے راقم الحروف کے نام 1952 - 1967ء کے ذاتی خطوط اور دیگر احباب کی ان کے بارے میں تحریروں سے اکٹھا کیا گیا۔ **ستیہ پال آنند**)

ہندوستان

•1928 ء۔۔۔منظر۔ چار ساڑھے چار برس کا لڑکا۔ اودھی اور ہند اسلامی تہذیب کے گہوارے لکھنؤ میں موسم گرما کی ایک صبح، اپنے بڑے بھائی کی انگلی پکڑے ہوئے، اسکی رفتار کے ساتھ اپنے قدم ملاتا ہوا چل رہا ہے۔ لٹھے کا پائجامہ اور کرتا، پاؤں میں چپل، ہاتھ میں ایک پُچی ہوئی تختی اور اردو کا قاعدہ۔ اس کی منزل مدرسۂ فرقانیہ ہے، جو گھر سے کچھ دوری پر ہے۔ مقصد حصول تعلیم کا ہے، ناظرہ اور قرآن پاک کے چند سپارے حفظ کرنے کا ہے۔

•**1928** ء۔۔۔منظر۔ یہی لڑکا، کھلتا ہوا رنگ، چپل کی جگہ باٹا کے ربڑ کے بوٹ، ویسا ہی کُرتا، بے داغ دھُلا ہوا، اور پائجامہ...اپنے بڑے بھائی حامد حسین صدّیقی کے ساتھ۔ آج وہ یحیٰی گنج ورنیکولر اسکول میں داخلے کے لیے گامزن ہے۔ چہرے پر بشاشت ہے۔ آنے والے دنوں کی خوش بختی کے واضح نشان ہیں۔

• **1930**ء۔۔۔منظر۔ اسکول کا جلسۂ تقسیم انعامات۔ اس کا نام لے کر پکارا جاتا ہے۔ وہ اپنی جماعت یعنی درجۂ سوئم میں اوّل آیا ہے۔ اسٹیج پر آنے کے بعد اسے ایک چھوٹا سا مٹھائی کا ڈبّہ اور ایک سند دی جاتی ہے۔ اب یہ لڑکا خوشی خوشی گھر کی جانب رواں ہے۔ اب اسے گورنمنٹ ورنیکولر اسکول میں داخلے کے لیے زیادہ تردّد نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے ربڑ کے بوٹ گھس چکے ہیں۔ تلووں میں کہیں کہیں سوراخ بھی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ گورنمنٹ ورنیکولر جوبلی اسکوؔل گھر سے کچھ زیادہ دوری پر ہے۔ چلنا بھی دور تک پڑے گا۔ ربڑ کے

بوٹوں کے گھس جانے اور چھوٹا ہو جانے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بڑے بھائی صاحب کے گھر کی مالی حالت ٹھیک نہیں ہے۔

• **1934**ء۔۔۔منظر۔ ساتویں درجے تک کی تعلیم کے لیے اندھیرا پڑ جانے پر گھر میں مٹی کا لالٹین جلا کر پڑھنا ایک مشکل امر ہے کیونکہ گھر میں ایک ہی لالٹین ہے اور اگر دوسرا ہو بھی تو۔۔؟ وہی لالٹین اٹھائے اٹھائے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جانا پڑتا ہے۔ Moving Montage - Flashes Back and Forth••

•**--1938- 1934** نویں درجے تک جوں توں کر کے تعلیم۔ کوئی ریکارڈ نہیں ملتا کہ کسی مضمون میں اوّل آیا ہو، یا کھیلوں میں کوئی انعام یا تمغہ حاصل کیا ہو۔ کوئی تحریر کردہ حوالہ نہیں کہ کتابوں، کاپیوں، سلیٹوں، پنسلوں کی خرید کے لیے پیسہ کہاں سے آیا... یا نہیں آیا!

•**تیرہ برس** کی عمر میں ہی محکمہ ڈاک اور تار میں ''پورٹر بوائے''، کے طور پر جز وقتی ملازمت۔ یعنی ڈاک سے بھرے ہوئے تھیلے اٹھا کر ٹھیلوں پر لادنے کا کام۔ کُل آمدنی۔ دس سے بارہ روپے ماہانہ تک۔ لیکن گھر کی خستہ حالت کے حوالے سے یہ بھی بے حد کارآمد!

•**ایک عجیب وغریب منظر**۔ ماسٹر جگت نارائن سکسینہ کا دو کمروں کا مکان۔ دالان میں تین لڑکے فرش پر بیٹھے ہیں، ان میں سے ایک شوکت ہے، ماسٹر صاحب خود موڑھے پر براجمان ہیں۔ شعر وشاعری ہو رہی ہے! جی ہاں، شعر وشاعری ہو رہی ہے!! سبھی اپنی اپنی ''نگارشات'' پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ شوکت، جی ہاں، تیرہ برس کا شوکت، اپنا ایک مصرع پڑھتا ہے۔ ''اس نے کہا، میں نے سنا، اک پل میں باتیں ہوگئیں!'' دوسرا مصرع پڑھنے سے پہلے ماسٹر جگت نارائن سکسینہ کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے۔ وہاں حیرت اور انبساط کا ایک رنگ آتا ہے، ایک رنگ جاتا ہے۔ تب شوکت دوسرا مصرع پڑھتا ہے۔ ''پھر وصل کے دن چل دیے، ہجر کی راتیں ہوگئیں!'' ماسٹر صاحب کے چہرے پر خفگی تو نہیں، البتہ مایوسی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ''برخوردار، دوسرا مصرع بحر سے خارج ہے۔ اسے درست کرو اور اگلی نشست میں پھر سناؤ!''۔۔۔ ماسٹر جگت نارائن سکسینہ کی صحبت میں اردو ادب کی کلاسیکی اور نیم کلاسیکی روایت سے تعارف۔ شوکت (مرحوم) راقم الحروف کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں۔ (۲۱ر جنواری ۵۵۹۱ء) ''مرنجاں مرنج آدمی تھے لیکن غالب سے بھی زیادہ میر تقی میؔر کے رسیا تھے۔ ایک بار، نہ معلوم کہاں سے دو چار روپے ادھار مانگ کر ایک اچھی گلوکارہ کے کوٹھے پر گئے جسے ایک رقعے کے ساتھ میر تقی میؔر کی ایک غزل بھجوا چکے تھے۔ اس نے دیگر شائقین کی موجودگی میں غزل گا کر سنائی۔ آواز کا جادو چلا تو سب نے داد دی، لیکن ماسٹر صاحب چپکے بیٹھے رہے اور پھر چپکے سے ہی سیڑھیاں اتر کر واپس آ گئے۔ دوسرے دن پیغام بھجوایا، ''بائی صاحبہ، اپنا تلفّظ صحیح کر لیں۔ میؔر اگر آپ کی آواز میں اپنی غزل سنتا تو بے چارے کی روح تڑپ جاتی!''

• **1928**ء **تا 1938**ء۔۔۔ دس یا گیارہ برس ایک حساس لڑکے کو زندگی کا تلخ سبق سکھانے کے لیے کافی

ہوتے ہیں۔فاقے کی نوبت تو شاید نہ آتی ہو لیکن اگر شوکت صدیقی کی کچھ کہانیوں میں سوانحی عنصر تلاش کیا جائے تو صرف دو کرتے اور دو پائجامے ہونے اور صرف ایک جوڑ ا ربڑ کے سلیپر نما بوٹ ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ بھائی کے گھر میں اپنے اور بھائی کے بچوں کے کپڑے دھونے اور گھر کے کام کاج میں بڑی بھابھی کا ہاتھ بٹانے کی کچھ سُو بُو ملتی ہے۔ جیب خرچ کے بالکل نہ ہونے اور آدھی چھٹی کے وقت جب دیگر لڑکے خوانچہ فروشوں کے گرد جمگھٹ لگا کر چٹپٹی چیزیں خرید رہے ہوتے تھے تو ان سے دور کھڑے ہو کر گلی میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر گُم صُم رہنے کی خبر ملتی ہے۔

• 1928ء سے 1938ء تک کچھ جز وقتی نوکریاں، پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے انٹر میڈیٹ کے امتحان میں کامیابی۔کرسچین کالج میں داخلہ۔ بی اے میں ناکامی۔ حالات نہایت ناموافق۔ 1944ء میں بی اے پاس کرنے کی دوسری کوشش میں بھی ناکامی!

•سرسوتی دیوی کیسے ایک نوجوان پر مہربان ہوتی ہے، اس کا ذکر تو آگے آئے گا۔ پہلے یہ دیکھ لیں کہ دولت کی دیوی لکشمی اور علم وفن کی دیوی سرسوتی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ جب آپ سرسوتی کے عابد بنتے ہیں، تو عمر بھر کی معاشی تنگ ودو کا بیع نامہ لکھ کر اپنے دستخط ثبت کر دیتے ہیں اور پھر آپ اس تصدیق شدہ حلف نامے سے واپس دولت اور جاہ حشم کی دیوی لکشمی کی طرف مراجعت نہیں کر سکتے۔

•تو صاحبو، ہمارے شوکت صدیقی اٹھارہ برس کی عمر میں ہی ادب سے ایسے وابستہ ہوئے کہ ادب ہی اوڑھنا اور بچھونا ہو کر رہ گیا۔ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی۔اس کم عمری میں ہی پہلے بھوپال اور پھر لکھنو واپس آنے کے بعد اس وقت کے معروف ترین اہل قلم میں اٹھنے بیٹھنے لگے۔لیکن ادبی سفر کی ابتدا ۲۰/برس کی عمر میں، یعنی ۱۹۴۳ء میں ہوئی جب مظہر رضوی کے اشتراک سے ادبی ماہنامے ''ترکش'' کا اجراء کیا۔نہ معلون کن صعوبتوں سے گذر کر دو برسوں میں ''ترکش'' نے آٹھ دس شمارے شائع کیے۔خریدار تو ویسے ہی مفقود تھے۔ادبی رسالوں اور وہ بھی اردو ادبی رسالوں میں کمرشل اشتہاروں کا رواج ہی نہیں تھا۔ لے دے کے ہمدرد دواخانے والے ایک صفحے کا اشتہار دے دیتے تھے۔

•لکھنو عجیب شہر تھا۔ جیسے کہ مجاز نے کہا ہے، شہر دانشوراں، شہر نگاراں، شہر خوباں! اسی لیے تو اس البیلے شاعر نے لکنو کے اپنے مختصر قیام کے دوران، اس شکایت پر کہ حسینان لکھنو اپنے مقامی عاشقوں کو چھوڑ کر ان کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں، کہا تھا:

ے کچھ روز کا مسافر و مہماں ہوں، اور کیا
کیوں بدگماں ہیں یوسف کنعان لکھنو؟

•لکھنو عجیب شہر تھا۔ پنڈت کشن پرشاد کول تھے۔نواب جعفر علی خان آثر تھے۔ پروفیسر احتشام حسین تھے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم تھے اور نیاز فتحپوری تھے جن کے قلم کی روانی اور شعلہ بیانی کے سامنے کوئی نہیں ٹکتا تھا۔

•ان کے ساتھ مستقل اٹھنے بیٹھنے کی عادت نے جہاں طبیعت کو صیقل کیا، وہاں کچھ کرنے اور کر دکھانے کی ہمّت بھی دی۔اس وقت کے سرگرم ادبی احاطے انڈیا کافی ہاؤس اور دانش محل تھے۔صبح جانا اور شام کو لوٹنا۔کبھی کوئی 'فین' (یار لوگ آپسی بات چیت میں اسے 'کبوتر' کہتے تھے!) آ جاتا تو کافی کے آرڈر کے علاوہ بھی کچھ منگوالیا جاتا، جیسے کہ ایک دوسا یا ایک پلیٹ بڑا۔اگر کوئی نہ آتا تو ایک فرلانگ کی دوری پر نانبائی کی دکان تھی جہاں مستقل اُدھار چلتا تھا، وہاں سے نان اور سالن!

•تب دو رسالوں کے ساتھ اورانسلاک ہوا۔خلیق ابراہیم کے ساتھ ایک رسالے کی ادارت میں شامل ہوئے (نام بھول گیا ہوں!) اور حیرت گورکھ پوری کی زیر ادارت دوماہی رسالے ''جدید ادب'' میں ڈیڑھ برس ملازمت کی۔تنخواہ سے زیادہ ایڈوانس لے لینا دستور تھا۔

•کانپور پھر لوٹے۔نواب گنج ہائی اسکول میں تاریخ پڑھانے کی عارضی اسامی ملی۔تبھی یہ خیال آیا کہ تعلیم مکمل کرنا ضروری ہے۔چار برس لگے، لیکن ۱۹۴۸ء میں بالآخر ایم اے کر ہی لیا۔

•ادبی کارکردگی کی تاریخ بھی ایسی ہی خلط ملط ہے، جیسے کہ زندگی۔شاعری سے آغاز کیا لیکن چل نہیں پائے۔ ایک استاد شاعر خواجہ عبدالرؤف عشرت سے اصلاح سخن لی، لیکن بالآخر ترک سخن اور نثر کی طرف مراجعت۔لگ بھگ پچاس ساٹھ کے قریب سماجی، رومانی، عشقیہ افسانے لکھے جو ہفتہ وار ''پیام'' لاہور اور اسی ادارے کے دیگر رسالوں میں چھپے۔''شاعر'' آگرہ میں اور دوماہی ''نیادور'' میں بھی لکھا

راقم الحروف کو ایک خط (بتاریخ سات اکتوبر 1957ء) میں لکھتے ہیں۔'' آپ کہتے ہیں کہ بیس برس کی عمر سے لے کر اب تک، یعنی ستائیس برس کی عمر تک آپ نے نان ونمک کے لیے نام بدل بدل کر بیس تیس جاسوسی ناول لکھے ہیں، ساٹھ سے اوپر افسانے لکھے ہیں اور دو نہایت سنجیدہ ناول لکھے ہیں اور یہ کہ آپ دس دس گھنٹے روز لکھتے ہیں...بھئی، آپ کو سلام! میں تو اتنا کام نہیں کر سکتا! درست ہے آپ کو اپنے علاوہ بیوہ ماں اور دو چھوٹے بہن بھائیوں کا پیٹ بھی تو پالنا ہے!)

•انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ بطور سکہ بند ممبر وابستگی آخر رنگ لائی۔گرفتاریاں ہوئیں تو یہ بھی دھر لئے گئے۔دو ماہ کی جیل ہوئی۔مشروط رہائی ہوئی کہ اب وہ اس تنظیم سے کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے۔خیال آیا، خیال کیا آیا، سرحد پار کے دوست بار بار پیغام بھیجتے تھے کہ کراچی اردو والوں کے لیے ایک جنّت نشان شہر ہے۔'' آجاؤ، یہاں تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے، جس کے لیے تم مارے مارے پھر رہے ہو۔''

•آخر پرمٹ کے ذریعے اپریل ۱۹۵۰ء میں پاکستان کو روانگی۔ پہلے لاہور پہنچے۔ کچھ ماہ یہاں قیام کیا۔ مدّتوں بعد ایک خط میں مجھے لکھا،''لاہور میرے لیے بنا ہی نہیں تھا، نہ ہی میں لاہور کے لیے بنا تھا۔'' اور پھر سرگوشی کے سے لہجے میں ایک بریکٹ ڈال کر لکھتے ہیں۔(قاسمی صاحب کے گھر پہنچنے پر ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے

بھی شاید یہی محسوس کیا ہو!) لاہور والے ''غیر لاہوریوں'' کو کب خاطر میں لاتے ہیں؟

ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان

• ایک بار میں نے شوکت کو کچھ اس قسم کا خط لکھا، '' آپ مجھ سے آٹھ برس بڑے ہیں، لیکن مجھے لگتا ہے کو قدرت نے ہمیں جڑواں بھائی بنایا ہے۔ جن صبر آزما حالات سے آپ ۶۲ برس کی عمر میں پاکستان جا کر نبرد آزما ہوئے، سترہ برس کی عمر میں پاکستان سے ہندوستان آ کر میں نے خود کو ایسے ہی حالات سے دوچار پایا۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرا بچپن ایک sheltered childhood تھا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، لیکن تقسیم وطن کے وقت جبری نقل مکانی، ہندوستان کو روانگی، اور راستے میں ٹرین پر بلوائیوں کے ہاتھوں اڑتالیس برس کی عمر میں باپ کا قتل اور بڑا بیٹا ہونے کے ناتے سے بیوہ ماں اور دو چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری نے مجھے وقت سے پہلے ہی جوانی اور جوانی سے بھی آگے، ادھیڑ عمر کی دہلیز پر لا کھڑا کیا ہے۔۔۔ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ آپ مجھ سے زیادہ خوش قسمت رہے ہیں؟'' جواب ایک مصرعے کی شکل میں تھا۔ '' دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر!'' ۔۔۔۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ادب اگر ایک شوقیہ مشغلہ ہو، تو یقیناً ادیب کے بھلے کی بات ہے، لیکن اگر آپ اس کو ذریعہ معاش بنا کر اس سے دال روٹی کا بندوبست کرنا چاہیں، تو بارہ بارہ گھنٹے روزانہ قلم گھسانے کے باوجود آپ چپڑی ہوئی روٹی نہیں کھا سکتے۔

• شوکت یقیناً مجھ سے کم بدقسمت تھے، لیکن کراچی میں ان کے شروع کے برس بے حد تکلیف دہ تھے۔ رہنے کے لیے مکان نہیں تھا۔ کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم کارکن کے طور پر حکومت وقت کی نظر میں کھٹکتے تھے۔ تب پچاس روپے تک ایک افسانے کا معاوضہ مل جاتا تھا، لیکن کچھ رسائل سے ہی، اور وہ بھی بار بار کے تقاضے کے بعد۔ اسی پر گذر اوقات تھی۔ 1952ء میں ایک مجموعہ ''تیسرا آدمی'' چھپا۔ سرفہرست وہی کہانی تھی جو پہلے احمد راہیؔ کی ادارت میں چھپنے والے مجلّے ''سویرا'' میں شائع ہوئی تھی اور اہل نقد و نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی تھی۔

• کچھ حالات نے کروٹ لی یا کیا ہوا کہ اگست 1952ء میں شادی کے بعد اپنے خسر ڈاکٹر سعید خان کی کمال مہربانی سے تین کمروں کا ایک مکان بطور ہدیہ مل گیا اور ایک غیر ملکی فرم میں ملازمت بھی۔ لیکن طبیعت کلرکی کی طرف مائل نہیں تھی۔ اس لیے ملازمت چھوڑ دی۔ اب یکے بعد دیگرے اردو اور انگریزی روزناموں اور ہفتہ وار رسالوں سے وابستگی، علیحدگی، اور دوبارہ وابستگی کا ایک طویل سلسہ چل نکلا۔ ایڈیٹر اور نیوز ایڈیٹر کے طور پر

''پاکستان اسٹینڈرڈ''، ''ٹائیمز آف کراچی''، ''مارننگ نیوز''، دوبارہ ٹائیمز آف کراچی سے بطور قائم مقام ایڈیٹر انسلاک، پھر ''انجام'' کراچی کے میگزین ایڈیٹر، 1969ء میں ہفت روزہ ''الفتح'' کے نگران۔ 1972 میں روزانہ ''مساوات'' کے پہلے ایڈیٹر۔ ''مساوات'' پیپلز پارٹی کا اخبار تھا، لیکن شوکت صاحب نے کالم نگاری تک ہی اپنی سرگرمیاں محدود رکھیں۔ 1984ء کے لگ بھگ صحافت سے کنارہ کشی۔

• تو صاحبو، جس شخص کے بارے میں ایک بار کسی نے کہا تھا کو وہ سوتے ہوئے بھی ایک قلم سرہانے، ایک قلم ٹیبل لیمپ کے ساتھ اور ایک کان میں اٹکا کر رکھتا ہے، اس کے لیے کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ اپنے گوناگوں صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تخلیقی کام بھی جاری رکھتا؟

کسب کمال کی جادوگری

• ان برسوں میں افسانوں کے چار مجموعے چھپے۔ ''تیسرا آدمی'' 1952ء، ''اندھیرا اور اندھیرا'' 1955ء، ''راتوں کا شہر'' 1956ء اور ''کیمیا گر'' 1984ء۔

• ناول ''خدا کی بستی'' 1958ء میں شائع ہوا۔۔۔ اس کی بھی ایک داستان ہے، جو صرف میرے حوالے سے ہے۔ ان دنوں پاکستانی کتابوں کے pirated edition ہندوستان میں اور ہندوستانی اردو کتابوں کے پاکستان میں عموماً چھپتے رہتے تھے اور کوئی کسی کو رائلٹی تو کجا، ایک جلد کتاب کی بھی نہیں بھیجتا تھا۔ میں ان دنوں تنگ دستی کی وجہ سے اردو افسانوں اور ناولوں کے ہندی میں ترجمے کیا کرتا تھا، جو اشاعتی اداروں ''ساہیتہ سنگم'' اور ''ساہیتہ پرکاشن'' مالی واڑہ، نئی سڑک، دہلی سے چھپتے تھے۔ جب ''خدا کی بستی'' کا ایک مسروقہ اردو ایڈیشن دہلی سے چھپا تو مجھے پنڈت یگیہ دت شرما، مالک ساہیتہ پرکاشن نے پیشکش کی کہ میں ایک ہزار روپے کے عوض اس کا ہندی میں انوواد کر دوں۔ میں نے دن رات محنت کر کے ایک ماہ میں کام مکمل کر دیا اور خدا کی بستی کا ہندی ایڈیشن اسی عنوان سے چھپ گیا۔ تب شوکت 'ٹائمز آف کراچی' سے منسلک تھے میں نے انہیں وہاں اطلاع دی اور مطبوعہ کتاب کی ایک جلد بھی بھیج دی۔ ایک دن مجھے کراچی سے ایک لفافہ موصول ہوا، جس میں ساہتیہ پرکاشن کی طرف سے شوکت صدیقی کے نام ایک ہزار روپے کا چیک تھا جو یگیہ دت شرما نے انہیں رائلٹی کے طور پر بھیجا تھا، ساتھ یہ شوکت صاحب کا مختصر رقعہ تھا کہ یہ چیک وہ وہاں کیش نہیں کروا سکتے اور میں اس رقم کو پبلشر سے لے کر اپنے کام میں لاؤں۔ پنڈت جی سے بات کرنے کے بعد انہوں نے بمشکل تمام مجھے سات سو روپے دیے۔ میں یہ رقم شوکت صاحب کو نہ بھیج سکا اور بات وہیں ختم ہوگئی.... یہ ایک دوسری کہانی ہے کہ 2000ء میں جب میں کچھ دنوں کے لیے

کراچی پہنچا تو جمیل الدین عالی صاحب نے کلب میں میرے لیے ایک پارٹی دی۔شوکت وہاں موجود تھے اور بیتابی سے میرے آنے کا انتظار کررہے تھے۔(میں ڈاکٹر فہیم اعظمی ، مدیر ''صریر'' کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور وہی مجھے لے کر گئے تھے) ۔باتوں باتوں میں میری ہندی میں لکھنے کی بات ہوئی اور میں نے شوکت صاحب کو یاد دلایا کہ میں ان کا سات سو روپوں کا مقروض ہوں۔کیا میں یہاں آپ کو وہ روپے پیش کردوں؟ ہم لوگ اس پر بہت ہنسے اور تب میں نے ساری کہانی دوستوں کے گوش گذار کی۔

•تین دیگر ناول جو شائع ہوئے ان میں ''کمین گاہ'' کی پہلی اشاعت ساٹھ کی دہائی میں ہوئی لیکن مکمل ناول 1984ء میں چھپا۔''جانگلوس'' جو قسط وار ''سب رس'' میں چھپتا رہا، بارہ برسوں میں مکمل ہوا۔ایک اور نامکمل ناول ''چاردیواری'' کی تکمیل 1990ء ہوئی۔تنقید نگاروں کے مطابق یہ ان کی ایک کمزور تخلیق ہے۔فکشن کے ایک ناقد نے تو یہاں تک لکھا:''شوکت صدیقی میں تخلیقی نمو اب ختم ہو چکی ہے۔'' اگر تخلیقی نمو سے اس محترم نقاد کا مطلب creative urge ہے،تو یہ بات غلط ہے، کیونکہ شوکت صدیقی نے اس ناول کے بعد بھی ،اور اس کے زیرِ قلم ہونے کے وقفے میں بھی، اور بہت کچھ لکھا اور اس میں ''تخلیقی نموٗ'' کی کمی نہیں ہے!

''حقیقت نگار''؟ نہیں، ''سچ نگار''!

چلو میاں آنند، میں خود سے کہتا ہوں، آؤ دیکھیں کہ قلم کے اس دھنی کو اس کی کون سی خصوصیات اس کے ہم عصروں سے ممتاز بناتی ہیں۔کیا وجہ ہے کہ ساٹھ برسوں کے اس تخلیقی سفر میں اس کے پاؤں پڑاؤ پر پڑاؤ طے کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے رہے ہیں۔کچھ لوگ چپوؤں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں کہ اب محنت کی ضرورت نہیں ہے۔کچھ لوگ آخری سانس تک فعال رہتے ہیں۔

•پہلی بات جو شوکت صدیقی کے بارے میں وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے حقیقت نگاری کا دامن کبھی ترک نہیں کیا۔زندگی؟ ہاں زندگی! لیکن وہ زندگی جو کہ ہے،یعنی وہ زندگی جو لمحہ مُوجود میں لوگ جی رہے ہیں، نہ کہ وہ زندگی جو اشتراکیت کے حامی ترقی پسند تحریک کے دیگر اہل قلم کے موقف کی بنیاد پرُ ہونی چاہیے،لیکن نہیں ہے۔' اس معاملے میں وہ کرشن چندر سے اتنا ہی دور ہے جتنا ایک افق دوسرے افق سے ہوتا ہے، کوئی idealism نہیں ہے، نثر میں شاعری کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہے۔کرداروں کی بُنت ، واقعات کا تسلسل، زبان و بیان ، یعنی اسلوب ۔۔تینوں سطحوں پر شوکت صدیقی اپنے دھیمے لہجے میں واقعات بیان کرتا ہوا، یا کرداروں کے منہ سے ان کا لیکھا جوکھا کہلواتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔کہیں تندی، تلخی نہیں، کہیں ترشی نہیں۔سیدھا سادہ، لیکن سپاٹ

ہو جانے سے بچتا ہوا، نرم آنچ کی طرح کا لہجہ ہے، کرشن چندر کی رومانیت نہیں، خواجہ احمد عباس کی ڈرامہ سازی نہیں۔آس پاس، بلکہ آس پڑوس کی زندگی کی تلخیاں، نامرادیاں، بے حوصلگیاں،۔۔سب رفتہ رفتہ، دھیمے لہجے میں بیانیے کی سرحد کو چھوتی ہیں۔شعوری یا لاشعوری رو کی طرح سطح کو چیر کر نیچے نہیں اترتیں۔قاری کو ایک غواص کی طرع معنی کے موتی تلاش کرنے میں غوطہ خوری نہیں کرنی پڑتی۔رمزیت اور علامت نگاری پر انحصار نہیں ہے،لیکن مصنف کو اپنی بات اس شدت اور تاثر سے کہنے کا ڈھنگ آتا ہے، کہ اس میں غم و غصہ نہیں ہے، رومان کی چاشنی نہیں ہے، ڈرامائی اتار چڑھاؤ کی بناوٹ نہیں ہے۔

•تو صاحبو، یہ طرز تحریر آرائش و زیبائش کا دشمن ہے اور ہمیشہ یہی خدشہ لاحق رہتا ہے کہ بیانیہ سپاٹ اور عامیانہ نہ ہو جائے۔لیکن شوکت صدیقی ایک منجھا ہوا کہانی کار ہے اور زرنگاری سے پرہیز کے باوجود وہ کہانی کو سپاٹ نہیں ہونے دیتا۔کہانی کا اسٹرکچر مضبوط رہتا ہے۔کردار زندہ اشخاص کی طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ماحول وہی جیتا جاگتا، دائیں بائیں، دیکھا بھالا ہوا ہے، جو ہم روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں۔

•رومانیت کی اس کمی کو محسوس بھی کیا گیا۔قرۃ العین حیدر کے ''آگ کا دریا''، اور ''میرے بھی صنم خانے'' چھپنے کے بعد یہ خیال کیا جانے لگا تھا، کہ اب اردو میں اشاریت، علامت نگاری، فلسفیانہ بحث و مباحثے کے بغیر کوئی ناول بڑا نہیں کہلائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔''خدا کی بستی'' کے لاتعداد ایڈیشن چھپے۔''تیسرا آدمی'' کو اردو کی دس بہترین کہانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔''خدا کی بستی'' کو PTV نے دوبار فلمایا اور نشر کیا۔کہا جاتا ہے کہ جس شام اس کی قسط ٹیلے کاسٹ کی جاتی تھی، لوگ گھروں میں ٹی وی سکرین کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔مجھے تو علم نہیں کہ ''جانگلوس'' اور PTV کے مابین کیا جھگڑا ہوا لیکن اسے شروع کر کے چند اقساط کے بعد ہی بالائے طاق رکھ دیا گیا۔شاید کچھ لوگوں کے چہرے بے نقاب ہو جانے کا ڈر تھا!

•شوکت صدیقی کے فن کی سب سے بڑی خوبی اس کا سچ ہے۔حقیقت نگاری ایک مہمل اصطلاح ہے کیونکہ پریم چند کے بعد ترقی پسندوں نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔کیا 'سچ نگاری' ایک اصطلاح کے طور پر نہیں برتی جا سکتی؟ یعنی اگر ناسخ کی روح کو تکلیف نہ ہو، تو ایک ہندوستانی اور ایک فارسی لفظ کو اکٹھا کر دیا جائے۔''سچ''، جمع ''نگاری''۔واللہ کیا خوبصورت اصطلاح ہے! اور ہم اس اصطلاح سے شوکت صدیقی کے فن کو اپنے مٹھی میں لے کر کہہ سکتے ہیں، کہ یہ ''سچ نگاری'' ہے اور اس طرح ہم شوکت صدیقی کو بجائے حقیقت نگار کہنے کے ''سچ نگار'' کہہ سکتے ہیں!

(شوکت صدیقی کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے ۸۱/فروری ۲۰۰۷ء کو آرٹس سینٹر، (مسی ساگا، کینیڈا) میں کی گئی ایک تقریر)

کالم **نمی دانم**

نصرت ظہیر (دہلی)

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

محترم قارئین، جب سے یہ کالم (نمی دانم) خادم کی تصویر کے ساتھ شائع ہونے لگا ہے تبھی سے کچھ عجیب سی باتیں ذہن میں آنے لگی ہیں، اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ یا تو یہ سلسلہ یہیں روک دیا جائے یا پھر تصویر پر نظرِ ثانی کر کے کوئی اور صورت اختیار کر لینی چاہیے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ راقم کے نام میں جو ذرا سی تانیثیت ہے اس کی بنا پر دل پھینک حضرات کی ایک معتد بہ اکثریت عرصہ دراز سے طرح طرح کی رومانی خوش فہمیوں میں مبتلا رہتی چلی آ رہی ہے۔ اور ہر چند کہ اس بارے میں کئی مضمون بھی مکمل وضاحت کے ساتھ لکھے، کئی کتابوں میں اپنی نمایاں تصاویر شائع کیں (بلکہ سچ پوچھئے تو کتابیں چھاپی ہی اس مقصد سے گئیں کہ لائق مصنف کے لئے اپنی تصویر چھاپنے کا جواز پیدا ہو جائے، ورنہ اگر صرف تصویر چھاپی جاتی اور ساتھ میں مصنف کی تصنیف نہ ہوتی تو صرف مصنف دیکھ کر قارئین کو کتنا عجیب اور awkword لگتا، بالخصوص مرد قارئین کو!) لیکن خوش فہموں کی غلط فہمیوں میں کمی نہ آئی۔ یا یوں کہئے کہ صاحبانِ خوش فہم کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ شائد ایسا اس لئے ہوا کہ ایک وضاحتی مضمون پڑھنے کے بعد جو حضرات نالائق مصنف کو پڑھنے سے تائب ہو جاتے ان کی جگہ نئے قارئین لے لیتے اور اگلا وضاحتی مضمون پڑھنے تک ڈٹے رہتے۔

خوش فہم قارئین کی مقدار کا یہ quotient ابھی تک قائم ہے اس کا اندازہ کمترین کو حال ہی میں تب ہوا جب اس کالم کے ساتھ کالم نگار کے ای میل آئی ڈی چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ امید تھی کہ تعریف بھرے خطوط اب عام ڈاک کی بجائے انٹرنیٹ کے ذریعے موصول ہونے لگیں گے۔ لیکن پہلے ہی روز ایک صاحب کی طرف سے جو پہلا ای میل کالم کی تعریف میں ملا اس کا پہلا جملہ پڑھتے ہی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ان صاحب نے اپنے انگریزی مکتوب کی ابتدائی سطر میں تحریر کیا تھا:

I am confused.Are you male or female?Or just an email.

خوش قسمتی سے اس مقفیٰ و مسجع انگریزی جملے کا بامحاورہ اردو زبان میں صحیح ترجمہ کرنا تقریباً ناممکن ہے تاہم میل

male (نر) اور فی میل female (مادہ) کا قافیہ ای میل سے بھڑا کر جو توہین آمیز اشارہ اُن حضرت نے کیا تھا اسے سمجھنا اپنے آپ میں اس قدر آسان تھا کہ آج کل کے اردو پروفیسر بھی اسے ترجمے کے بغیر بخوبی سمجھ جائیں گے۔ بعد میں اگر چہ مکتوب نگار نے کالم نگاری کی تعریف بھی کی تھی لیکن پہلی سطر میں کئے گئے اشارے کی نوعیت اتنی سنگین تھی کہ مارے غصے کے خون خشک ہو گیا اور آنکھوں میں ترمرے سے اڑنے لگے۔ جی چاہا کہ کپڑے پھاڑ کر شہر سے نکل جاؤں اور جنگل کی راہ پکڑلوں۔ نیز باقی کی زندگی حق ہو، حق ہو، کرتے ہوئے یادِ خدا میں بسر کر دوں اور پندرہ بیس برس بعد جب کسی پہونچے ہوئے بزرگ سفید ریش کی صورت اختیار کر چکوں تو بھٹکے ہوئے راہگیروں کو پکڑ پکڑ کر اور اپنی ریشِ مبارک دکھا دکھا کر بزبانِ غالب ترنم سے قوّالی سنایا کروں کہ مجھ کو سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہو، اور میاں دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

ایک دن خود ہی اپنے اس تصور پر حال آیا چاہتا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور دفتر کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اپنی کوئی اچھی سی تصویر بھیج دیجئے تا کہ اسے کالم کے ساتھ چھاپا جا سکے۔ ارشاد کیا تھا گویا اندھی سرنگ میں روشنی کا اشارہ تھا جس سے دل و دماغ روشن ہو گئے۔ مطلب صاف تھا کہ اب ہر ہفتے تصویر چھپے گی جس سے ہر ہفتہ خادم کے حق میں خوش فہمیوں کے ازالے کا ہفتہ بن جائے گا اور عشاق کی تعداد انشا اللہ دو ہفتوں میں نہیں تو تین ہفتوں میں ضرور درجۂ صفر کو پہونچ جائے گی۔

مسئلہ صرف یہ تھا کہ دفتر والوں نے کوئی اچھی سی تصویر مانگی تھی اور ناچیز کے پاس کوئی تصویر ایسی نہیں تھی جسے اصل صورت سے بہتر کہا جا سکے۔ کئی فوٹوگرافروں کا خیال ہے کہ راقم کو قدرت نے ایک ایسی صورت عطا کی ہے جس کے اصلی حسن کو دنیا کے کسی کیمرے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ ایک صاحب نے اپنا ردِعمل کئی تصویریں الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد ان لفظوں میں ظاہر کیا کہ بھائی صاحب یہ آپ نے ہر تصویر میں نیگیٹو کیوں پرنٹ کرا لیا ہے؟ میاں عبدالقدوس نے تو یہاں تک کہہ رکھا ہے کہ تم صرف لائیو live ہی اچھے لگتے ہو۔ اس جملے کا مطلب دریافت کرنے پر فرمایا کہ تمہاری شکل صرف براہ راست نشر کرنے کے لائق ہے کہ اس پر کسی کا زور نہیں چلتا اور چاروناچار دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ اب یہ بتانا یہاں غیر ضروری ہے کہ اس مکالمے کے بعد کتنے عرصے تک ہمارے باہمی مذاکرات موقوف رہے۔

خیر، کسی طرح ایک ایسی تصویر ڈھونڈ ہی لی جو کم از کم پہلی نظر میں ضرور پازیٹو لگتی تھی۔ کالم کے ساتھ چھپنے پر ناقص طباعت نے تصویر کے حسن میں مزید اضافہ اس طرح کر دیا کہ اس کے بیش تر عیب واضح نہیں ہو پائے۔ اس صورتِ حال سے کچھ امید بندھی کہ نہ صرف مذکر قارئین کے علم میں اضافہ ہو جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے مونث حلقوں کی نظر بھی پڑنے لگے اور کیا پتہ کسی دن عطر میں بسے وہ محبت نامے بھی موصول ہونے لگیں جن میں احقر کو محترم اور جناب کہہ کر مخاطب کیا گیا ہو۔

مگر تین ہفتے بعد جب ایک دن میاں عبدالقدوس سے ملاقات ہوئی تو ساری خوش فہمیاں ہوا ہو گئیں۔حضرت کے چہرے پر بے زاری کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔سبب پوچھا تو مزید بے زاری سے فرمایا:

''یار اب تمہاری تحریر میں وہ بات نہیں رہی۔دوسرے جملے سے ہی جماہیاں آنے لگتی ہیں۔''

''کیا مطلب!؟''میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''مطلب یہ کہ پہلے تمہاری فضولیات بھی بھلی لگتی تھیں۔لفظوں کے چناؤ میں ایک سلیقہ نظر آتا تھا۔مضمون کی ہر سطر موضوعِ سخن کے ساتھ انصاف کرتی محسوس ہوتی تھی۔جملوں میں جمالیاتی حسن، لہجے میں ترنم، بیان میں غنائیت ...یہ تمام تاثرات تمہارے نام کی نسائیت سے اور فزوں ہو جاتے تھے۔لیکن اب تصویر پر نظر پڑتے ہی بھک سے اُڑ جاتے ہیں۔اب تمہاری وہی تحریریں پڑھنے والے یا والی کے دل و دماغ پر وہی اثر ڈالتی ہیں جو جے این یو یا دہلی یونی ورسٹی کے کسی اردو پروفیسر کی تنقیدی کتاب میں پایا جاتا ہے۔قاری خواہ کیسی بھی بے خوابی کا مریض ہوا ایسی کتابوں کا پہلا صفحہ پڑھتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور دوسرے صفحے سے تو باقاعدہ خرّاٹے شروع ہو جاتے ہیں۔اردو کا کوئی بک ڈپو ایسا نہیں جہاں تمہیں ان پروفیسروں کی کتابیں ڈھول چاٹتی نہ مل جائیں۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کتابوں کو بک ڈپو کی بجائے میڈیکل اسٹور پر کیوں نہیں بیچا جاتا۔سچ کہتا ہوں۔اگر اردو کی تنقیدی کتابیں دواخانوں پر دستیاب ہونے لگیں تو نیند کی گولیاں بنانے والی کئی کمپنیوں کا دھندا چوپٹ ہو جائے۔اور اب مجھے لگتا ہے کہ تمہارا کالم بھی اسی صنف میں داخل ہونے والا ہے...''

''اور یہ صرف اس لئے کہ میری تصویر اس کے ساتھ چھپنے لگی ہے؟''میں نے غصّے سے کانپتے ہوئے فرمایا۔

''برا نہ مانو یار! میرا مقصد تمہاری توہین کرنا نہیں ہے۔صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نام سے تم برائے نام ہی سہی کچھ تو حسین لگتے ہو!''

اس کے بعد یہ خاں صاحب کی خوش قسمتی ہی تھی کہ مجھے آس پاس کوئی اینٹ یا پتھر کا ٹکڑا پڑا ہوا نہیں ملا۔■■

انشائیہ

سیّد تحسین گیلانی

جِھڑکیاں

تاریخِ انسانی میں جِھڑکیوں کا آغاز یقیناً انسان کی ابتداء سے ہی ہو گیا۔مگر میں ان کی ترقی کے ضمن میں اتنا ہی کہوں گا کہ ایک یہی کام ہے جو تمام عمر اِنہوں نے کیا یعنی اِن میں میں ترقی کرنے کا بے حد جنوں رہا ہے......ہاں یہ بات اور ہے کہ ان کی ترقی نے انسانی زندگی پہ ہمیشہ دو طرح کے اثرات مرتب کئے! یعنی دو واضح تبدیلیاں ہمیشہ "جِھڑکیوں" کی بدولت انسان کے اندر رونما ہوئیں اور ان کی تبدیلیوں کی وجہ سے انسان نے خود کو مٹایا بھی ......اور ...... بنایا بھی ......مٹا لینے کی بھی دو معنوی حیثیتیں ہیں اور وہ دونوں حیثیتیں خود ایک دوسرے کی مخالف ہیں یعنی "جذب" کر لینا اور "جذب نہ کر پانا"............جی ہاں یہ دو حالتیں ہی اہم ہیں ......یعنی جذب کر لینے والا بھی خود کو "مٹا" لیتا ہے اور جو جذب نہ کر پائے وہ بھی خود کو مٹا ہی لیتا ہے۔

جِھڑکیاں ذاتی طور پر بُری نہیں ہیں ہاں ان کی وجہ سے دو شخصیتوں کی پہچان میں کافی حد تک مدد ملتی ہے۔دیکھئے جِھڑکیاں ہمیشہ طرفین اور جانبین کے درمیان کسی فعل کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتی ہے......جی ہاں اگر کوئی تیسرا ذی شعور وہاں موجود ہو تو وہ تمام حالات و واقعات کو مدِنظر رکھتے ہوئے دونوں میں سے اصل قصور وار کا اندازہ اپنے تائیں لگا سکتا ہے......!اب بات ہو ہی رہی ہے تو میں بھی کچھ فلسفہ جھاڑتا ہوں۔اس بارے مَیں تو یہی کہوں گا کہ جِھڑکیاں دینے والا چاہے جس قدر بھی معزز، معتبر اور وضع دار شہری ہو جب وہ اِس نازیبا فعل کا مرتب ہوتا ہے تو اُس کی شخصیت کے بہت سے خفیہ پرت اپنے آپ کُھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔مثلاً ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص جو ڈانٹ پلا رہا ہے اس میں برداشت کا مادہ نہ ہونے کے برابر ہے یا یہ کہیں کہ اُس فرد کی اِس خامی کو کل لوگ بطور ہتھیار بھی استعمال کر سکتے ہیں۔مثلاً جان بوجھ کر اس کا نقصان کرنا اور اس کی جِھڑکیوں کی طویل فہرست سننا اور پھر اچھا خاصہ تماشا لگا کر معذرت خواہانہ روّیہ اختیار کر لینا......اور پھر بار بار اس کی زندگی میں اس ہتھیار کو استعمال کر کے اُس کی اِس کمزوری سے فائدہ اٹھانا۔ہاں کچھ جِھڑکیاں برمحل بھی ہوتی ہیں۔مثلاً......والدین کی اولاد کیلئے "جِھڑکیاں"......اساتذہ کی طلبہ کیلئے "جِھڑکیاں"......لیکن بات پھر وہی کہ دو قسم کی

صورتیں ہمیشہ جھڑکیوں کی وجہ سے سامنے آئی ہیں۔

مثلاً میرا دوست "الف" بہت فطین ہے۔ میں اُس کی قابلیت کا قائل ہوں اور میں نے اس کی لائقی اور تیزی کو بارہا پرکھا اور وہ ہر امتحان میں کامیاب رہا...... میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کیوں BSc نہ کرسکا۔ جبکہ اس میں کوئی کمی بھی نہ تھی...... اُس نے بتایا کہ جھڑکیوں نے کِس طرح اس کی زندگی کو ایک بہترین رستے سے ہٹادیا۔ جبکہ اب بھی وہ دو ماسٹر ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد بطور ٹیچر اپنے فرائض نبھا رہا ہے...... مگر ان جھڑکیوں نے اسے بہت آگے جانے والے راستے سے ہٹا کر رکھ دیا...... اس نے بتایا ہمارے ایک لیکچرار تھے وہ مجھے کلاس میں کھڑا کرلیتے اور میری جسمانی ساخت میری کم گوئی اور میری شرافت کو مدِنظر رکھتے ہوئے مجھے تقریباً ڈانٹنے کے انداز میں کہتے (اوے توں کدی وی BSc نہیں کرسکدا اے بڑا اوکھا کم آ، اے تیرے وس وچ نئیں)" بھئی تم کبھی بھی BSc نہیں کرسکتے یہ بڑا مشکل کام ہے اور یہ یہ تمہارے بس کا نہیں" کیونکہ وہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ کوئی سوچ بھی اپنی نہیں ہوتی اور نہ ہی اندر پختگی ہوتی ہے ہر چیز حالات کے مطابق اثر کرتی ہے کیونکہ میں اپنی محنت سے اور اپنے خرچے پر ہی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے اس لئے میں ڈر گیا اور ڈپریشن کا شکار ہوکر گھر بیٹھ گیا...... اور اِن جھڑکیوں نے میری زندگی میں طوفان برپا کردیا یہ میرے ارادوں کو اُکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گئیں لہٰذا میں BSc نہ کرسکا...... یہ تو ایک واقع ہے...... مگر نہ جانے کتنے واقعات روزانہ ہمارے اِردگرد رونما ہوتے ہیں جو شاید اس سے بھی بڑھ کر ہوں...... لیکن نہیں...... اصل یہ نہیں ہے اس کے آگے بھی کچھ ہے...... اب آپ کہیں گے وہ کیا؟...... تو وہ یہ کہ گذشتہ روز مجھے ایک ایسے نوجوان سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کا مدّعا تقریباً میرے دوست "الف" سے ملتا جلتا تھا مگر اس کے نتائج حیران کن طور پر الٹ تھے۔ میرے اس دوست نے اپنی زندگی کا سفر بڑی کامیابی سے طے کیا اور طے کرتا جارہا ہے...... بس حیران کن بات یہ تھی کہ جب میں نے اس سے پوچھا کہ تمہاری زندگی میں اس قدر کامیابیاں کیسے آئیں اور ان سب کی بڑی وجہ کیا ہے تو وہ پہلے تو ہنسا پھر کہنے لگا...... جھڑکیاں...... میں بہت حیران ہوا اور میں نے ایک ہی سانس میں اس سے کئی سوال کرڈالے...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟...... جھڑکیاں کسی کو ایسے کامیابی دلاسکتی ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ تو وہ بولا...... بھئی...... یہ ہو بھی سکتا ہے...... "جھڑکیاں" کامیابیاں دلا بھی سکتی ہیں...... یہ ممکن بھی ہے؟ تو سنو وہ ایسے کہ جب بھی مجھے کوئی "جھڑکیاں" دیتا یا ڈانٹتا تو میرے...... اور تو میرے اندر بیٹھی ہوئی کوئی طاقت مجھے پہلے سے بھی زیادہ کام کرنے اور دوبارہ ایسی صورتِ حال سے بچنے کی ترغیب دیتی۔ یعنی میرے اندر ایک مادہ چھلاوہ بن جاتا اور میں انسان سے مشین بن جاتا میرے اندر ماورائی طاقتیں جنم لیتیں اور مجھے کام کام اور زیادہ کام پر مجبور کرتیں اور میں اڑتا چلا جاتا...... آگے ہی آگے...... آج ان جھڑکیاں کا ہی ثمر ہے کہ میں آج ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کامیاب زندگی گزار رہا ہوں چونکہ میں خاندانی طور پر آسودہ حال تھا اس لئے میری زندگی پہلے سے زیادہ کامیاب ہوگی...... لیکن میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ "جھڑکیاں" زیادہ تر سننے والے کیلئے بمباری ثابت ہوتی ہیں اور دوسرا یعنی

سننے والا خود کو کمتر سمجھتے ہوئے خود میں سمٹنا شروع ہوجاتا ہے اور آخر کار وہ اپنے ہی نیچے ایک دن دَب کر مرجاتا ہے چونکہ مشرق میں یہ روایت عام ہے...... اسلئے میں جھڑکیوں کو کسی بھی پھلتی پھولتی قوم کی راہ کا سب سے بڑا پتھر تصوّر کرتا ہوں............ آپ مشاہدہ کریں تو آپ کو پتہ چلے کہ کتنے لوگ آسودحال ہیں!!!

لیکن بہت سوچنے اور مشاہدہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ یہ دوسری قسم کی صورتِ حال بہت کم کم وقوع پذیر ہوتی ہے جبکہ پہلی قسم کے لوگ زیادہ ہیں اور یہی وجہ ہے جھڑکیوں کی وجہ سے کئی افراد اندرونی طور پر تہس نہس ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری طور پر بھی عدم تحفظ کا شکار ہوگئے مگر یہ سوال اپنی جگہ پہ قائم ہے کہ ان سب حالات کا سبب بنیادی طور "جھڑکیاں" خالصتاً صرف "جھڑکیاں" ہی ہیں یا اصل اسکے پیچھے خود انسان کھڑا ہے اور یہ روّیہ برے رویّوں میں سب سے اونچے درجے پر فائز ہوگیا ہے رویّے کسی بھی تہذیب کا بنیادی حصہ ہوتے ہیں ان کا ہونا افراد کیلئے ان کی پہچان کا باعث ہوتا ہے مگر اِن کا اچھا بُرا ہونا اُن افراد کیلئے باعثِ عزت اور باعثِ ذلت دونوں کا مؤجب بھی ہوسکتا ہے ہم سب چونکہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں اور سب اپنی ہی کھودی ہوئی قبروں کے دہانے پر کھڑے ہیں اس لئے ہمارے رویّے بھی بدتہذیبی کا شکار ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ مرچ کے پودے سے انگور کی توقع کی جائے۔ "جھڑکیاں" اصل میں تشدّد کی پہلی سیڑھی ہیں۔ لیکن اصلاً یہ تشدد سے بھی کچھ بڑھ کر ہیں۔ کیونکہ ظلم کی انتہا تشدد ہے اُس سے آگے تو کچھ نہیں لیکن "جھڑکیاں" عملاً دوسرے آدمی کیلئے ذہنی انتشار کا باعث ہوتیں ہیں______ جب سکون ہی برباد ہوگیا تو کیا بچا! یقیناً سکون دنیا کی سب سے بہترین شے ہے جس کے پاس یہ دولت ہے وہ دنیا کا سُکھی ترین انسان ہے اور "جھڑکیاں" کسی بھی انسان کو اِس فہرست سے خارج کرنے کا آسان ترین ذریعہ ہیں۔

جو قومیں اس طرح کی انتشاری ذہنی کیفیت میں تا دیر مبتلا رہیں اور جن کیلئے یہ معمول کی بات ہو وہ پہلے تو کسی کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور اگر وہ سامنے آ بھی جائیں تو اُن میں اعتماد کی اتنی کمی ہوتی ہیں کہ وہ خود کو گِرتا گِرتا محسوس کرتے ہیں اور اُن کے اندر کی فضا میں خوف کا عنصر اِس قدر نمایاں اور اِس قدر تیزی کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے کہ وہ شخصیت ادھوری اور اکھری رہ جاتی ہے___ ہمارے ہاں عموماً بچوں کی بچپن سے ہی "جھڑکیوں" کا سامنا کرنا پڑتا ہے___ یہ کرو___ یہ نہ کرو___ ادھر مت جاؤ___ یہ مت کھاؤ___ یہ کیوں توڑا___ ایسا کیوں ہوا___ وغیرہ جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں ایسا نہیں ہوتا___ وہ بچے کو مکمل تحفظ اور اعتماد سے بھرپور زندگی گزارنے کا موقع دیتے ہیں جس کی بدولت وہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جارہے ہیں۔ مگر ہم میں ایسے کتنے ہیں جو "جھڑکیوں" کے مقابل خود کو کھڑا کرنے کے متحمل ہوسکتے ہیں___؟ یہ ایک سوال ہے جو میرا اور آپ کا مشترکہ ہے؟

میں نے کیا کہا اپنی جگہ! اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کیا کہتے ہیں؟

امین خیال (جاپان) کے ماہیے

شاہوں کا اجارا ہے
طوقِ غلامی کا
کب ہم نے اتارا ہے

علت کے علائم کے
بند کرو سارے
اڈے یہ جرائم کے

دائم ٹھکراتے ہو
ووٹ کی خاطر تم
کیا خوب بناتے ہو

یہ ریل عوامی ہے
قوم کی قسمت میں
کب تک یہ غلامی ہے

گوروں کی، کالوں کی
دھونس رہی ہم پر
نت وردی والوں کی

کم ذات نہیں بدلے
چہرے بدلے ہیں
حالات نہیں بدلے

پل پل افتاد آئے
عید کے دن سارے
بچھڑے ہوئے یاد آئے

خوشیوں کا سال آیا
عید جو آئی تو
ماہیے کا خیال آیا

دل کو ناشاد کیا
عید کے دن بھی تو
کب آپ نے یاد کیا

اس سے جا کر کہہ دو
عید کا دن آیا
تمہیں عید مبارک ہو

یہ کرم حضور کرو
عید مبارک ہی
میری منظور کرو

کوئی چیز نہیں بھاتی
آپ جو آ جاتے
تو عید بھی ہو جاتی

مکھ عید کی شانوں کا
تکتا رہا اس کو
وہ چاند اسمانوں کا

احسان مزید کرو
مدت بیت گئی
گھر آ کے عید کرو

مت دن اب گن ڈھولا
عید مبارک ہے
ترے وصل کا دن ڈھولا

پھولوں کی کیاری ہے
سامنے تو ہے تو
اب عید ہماری ہے

اب ڈال نہ چھن ماہیا
مل لے آج گلے
ہے عید کا دن ماہیا

ہے تو بھی شئے ماہیا
لگ جا آج گلے
دن عید کا ہے ماہیا

امین خیال کے ماہیے

کیوں خود سے الجھتا ہے
اللہ کی حکمت
کب کوئی سمجھتا ہے

لُوں لُوں میں رستا ہے
ہر اک سے مخفی
ہر اک میں بستا ہے

کس کس کے یہاں جاؤں
گھر ہے کہاں تیرا
میں تجھ کو کہاں پاؤں

کیا اس کا جادو ہے
آپ ہی پھول بنا
اور آپ ہی خوشبو ہے

اس کا تو جاپ ہی ہے
آپ ہی ذرہ ہے
اور مہر بھی آپ ہی ہے

پڑھ اللہ ہُو سائیں
لا، سے نہیں ہوں میں
ہے تُو ہی تُو سائیں

مفلس کا تُو والی
شکر ترا مولا
تو نے ہی بلا ٹالی

بے پر کو شہپر دے
دے دے عشقِ نبیؐ
اک یہ احساں کر دے

پُرنور سویرا ہے
ذکرِ محمدؐ سے
منہ میٹھا میرا ہے

والفجر سا مکھڑا ہے
جہل سیاہی میں
وہ نُور کا ٹکڑا ہے

حصہ ایمان کا ہے
مکھ اُس دلبرؐ کا
صفحہ قرآن سا ہے

سُن میری صدا شاہا
کون سنے دل کی
اب تیرے سوا شاہا!

امید جگاتا ہے
دل میں جو رہتا ہے
ڈھارس وہ بندھاتا ہے

جز فرقت سہتا ہے
گُل سے ملنے کو
بے چین سا رہتا ہے

کایا کی چھایا ہے
میں تجھ میں ہوں تو
تو مجھ میں سمایا ہے

تنہا کس قابل ہوں
مجھ میں شامل تو
میں تجھ میں شامل ہوں

کس پار سے آتے ہیں
دنیا میں انساں
کس پار کو جاتے ہیں

جو پیار کہانی ہے
زندہ رہے گی وہ
باقی سب فانی ہے

نذیر فتح پوری (پونہ) کے ماہیے

ممتا بھری لوری کی
یاد ستاتی ہے
پھر دودھ کٹوری کی

یہ شہر محبت ہے
آگے قدم مت رکھ
جب دل میں کدورت ہے

کہنے کو پرانی ہے
عمرِ گزشتہ کی
ہر یاد سہانی ہے

موسم ہے جل تھل کا
سوکھی زمینوں پر
رتھ اترا ہے بادل کا

رنجیت ہیں یہ کیسے
تیر چلاتے ہیں
ترکش بھی نہیں رکھتے

جو بام سے اتری ہے
درد کے آنگن میں
وہ دھوپ کنواری ہے

کس کس کو جگاتی ہے
رات کی نوٹنکی
کیا کھیل دکھاتی ہے

ماتھے پہ نہیں بندیاں
گاؤں کی گوری سے
کیا روٹھ گئے سیّاں

یہ کار نہیں کرتے
دل کی عمارت کو
مسمار نہیں کرتے

لٹ جانے کا ڈر بھی ہے
دور ہے منزل بھی
صحرا کا سفر بھی ہے

سوغات ہے سپنوں کی
نیند کے آنگن میں
بارات ہے سپنوں کی

احساس جگاتے ہیں
شعر ہوں سچے تو
مُردوں کو جِلاتے ہیں

کیا درد کے منظر ہیں
پانی کی بوندیں
پیاسوں کا مقدر ہیں

شمشیر بکف آیا
کیسا مسیحا ہے
مرہم نہ دوا لایا

کیا خوب جیالا ہے
کوئی بھی موسم ہو
سر نیزے پہ رکھتا ہے

یہ بھی تو مقدر ہے
جانا ہے جس جانب
بے آب سمندر ہے

ہم یوں بھی نبھا لیں گے
ایک کلی سے ہی
گلزار بنا لیں گے

کیا کس سے کہا جائے
دل کا تقاضہ ہے
خاموش رہا جائے

طاہر عدیم (جرمنی) کے ماہیے

ماحول ساطاری ہے
آج گیا ہے وہ
کل میری باری ہے

رہتے ہیں آپے میں
اور کریں بھی کیا
ہم لوگ بڑھاپے میں

اک نام میں لیتا ہوں
پانی یادوں کو
اشکوں کا دیتا ہوں

وہ شخص دعا سا ہے
صورت بھولی سی
اور نام بھلا سا ہے

سب پنچھی بھول گئے
لوٹ نہیں آئے
کر گلشن دھول گئے

دل آخر تاک ہوا
روز یہ مرنے کا
قصہ ہی پاک ہوا

ملنے سے قاصر ہیں
ہم دونوں اک ہی
کشتی کے مسافر ہیں

دکھ درد ہزاروں میں
دل دروازے پر
بیٹھے ہیں قطاروں میں

یہ ہجر بچھونا ہے
اب تو قسمت میں
عمروں کا رونا ہے

اک سانس کہ جاری ہے
غافل جو گذرے
وہ بے حد بھاری ہے

یہ دامن خالی ہے
بیٹھا صدیوں سے
چوکھٹ پہ سوالی ہے

میں پیار نبھاؤں گا
اس کے رستے میں
دل اپنا بچھاؤں گا

اک فرض نبھانا ہے
سب کو دنیا میں
آ کر چلے جانا ہے

تم اپنے گھر جاؤ
دل ویرانہ ہے
ایسا نہ ہو ڈر جاؤ

آنکھوں کو کھٹکتا ہے
لیکن دل بن کر
سینے میں دھڑکتا ہے

بُت ریت کے لگتے ہیں
لوگ اپنا سینہ
جب تان کے چلتے ہیں

آنکھوں کو جگاتا ہوں
تیری یادوں کے
پودوں کو لگاتا ہوں

میری ہر کروٹ میں
کون ہوا زخمی
بستر کی سلوٹ میں

مبشر سعید (فرانس) کے ماہیے

تہذیب سِکھا جاتے
لوگ پیمبر سے
انسان بنا جاتے
☆
پوشاک تو اُونی تھی
شوخ دسمبر کی
ہر شام بھی سُونی تھی
☆
گُمنام ستارا ہوں
عشق محبت کی
ہر جنگ میں ہارا ہوں
☆
اب جسم پہ آنچل کر
دیکھ، زمانے کو
مت جان کے پاگل کر
☆
آنکھوں میں اُداسی ہے
یار نہیں کوئی
ہر شخص سیاسی ہے
☆
خوشبو کا بدل لکھوں
چاند سی لڑکی پر
ہر رات غزل لکھوں
☆

رانجھوں کا نہ ہیروں کا
شہرِ ملتان مرا
تو شہر ہے پیروں کا
☆
دنیا کو جلاتی ہو
ہاتھوں پہ اب بھی
کیا مہندی لگاتی ہو
☆
کُچھ پھول ہیں کلیاں ہیں
اب تک یادوں میں
مُجھ دیس کی گلیاں ہیں
☆
ادراک کے درپن میں
خوب رُلاتے ہیں
جو خواب ہیں اکھین میں
☆
کم ظرف سا لگتا ہے
فوج کی وردی کو
جو کھال سمجھتا ہے
☆
ہر دُکھ کو اب سہنا
لوٹ کے آؤں گا
مت رو میری بہنا
☆

یہ سانس تو فرضی ہے
تُم بن میری جاں
جینا خود غرضی ہے
☆
تُجھ نام لگانی ہے
ویسے بھی دلبر
یہ جان تو جانی ہے
☆
دل جان جگر ماہیا
ساتھ چلو دلبر
مشکل ہے سفر ماہیا
☆
پیتل کا کٹورا ہے
یار نے میرا دل
خود جان کے توڑا ہے
☆
یہ عشق چنیدہ ہے
دل کا حسیں دامن
برسوں سے دریدہ ہے
☆
دریا کے کنارے تھے
دور رہے خود سے
ہم ہجر کے مارے تھے
☆

ماہیے
حسن عباس
(کامٹی، انڈیا)

پیغام مرے دل کا
بادِ صبا جا کر
تو اُن کو سنا دینا

ترا روپ کنول جیسا
ہر انداز ترا
ہے میری غزل جیسا

ہر رنگ میں ڈھلنا ہے
شمع کی قسمت میں
ہر حال میں جلنا ہے

سچ بول زمانے میں
جینا چاہے اگر
بے خوف زمانے میں

رو کے سے نہیں رکتی
تلواروں سے کبھی
سچائی نہیں مرتی

طیبہ میں حضوری ہو
خواہش یہ میری
کب دیکھئے پوری ہو

شرارتی ماہیے

چینی ہے نہ آٹا ہے
شادی رچانے میں
گھاٹا ہی گھاٹا ہے

پھر دل پہ راج کرو
پہلے گوری تم
مجھ کو سرتاج کرو

باتیں ہیں نہ قصہ ہے
جھوٹ سیاست کا
اک لازمی حصہ ہے

پلّو کو بھگوتے ہیں
پھیر کے گالوں پہ
منہ اپنا دھوتے ہیں

یہ رسمِ زمانہ ہے
کیوں نہ لُوں رشوت
گھر بھی تو چلانا ہے

کس بات کا رولا ہے
پاس مرے سجنا
جب ''کھوتا کرولا'' ہے

امین بابر
(رحیم یار خاں)

معصوم، بچارا دل
تھر تھر کانپا ہے
جب بجلی کا دیکھا بل

ایمان تو تازہ تھا
اس کے گالوں پر
جب تک نہ غازہ تھا

پٹنے کا ارادہ ہے
پیار میں عاشق کے
کچھ جوش زیادہ ہے

دامن جو پھاڑا ہے
قیس کو لیلیٰ نے
کس زور سے جھاڑا ہے

وہ گال گلابی ہیں
اس کے بھائیوں کے
حملے بھی عذابی ہیں

کب اس میں معافی ہے
گفٹ بنا بابر
یہ عشق ناکافی ہے

جدید ادب شمارہ: ۱۳، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۹ء

ماہیے: رانا اختر (لاہور)

یہ پلکیں بچھا دیں گے
سرکارؐ کے قدموں میں
گھر بار لٹا دیں گے

دل میں کوئی ہل چل ہے
تو مل یا نہ مل
تری یاد تو پل پل ہے

تحریر مٹا دوں گا
ظلم کا ہر پتھر
ٹھوکر سے ہٹا دوں گا

بے نُور سویرا تھا
آپؐ سے پہلے تو
ہر سمت اندھیرا تھا

جیب تراشی ہے
اپنی سیاست تو
الزام تراشی ہے

تقریر پہ مرتے ہیں
عقل کے سب اندھے
تصویر پہ مرتے ہیں

اس کے ہی سہارے ہیں
رحمتِ مولا نے
سب کام سنوارے ہیں

بے ربط تسلسل ہے
زندگی اپنی تو
اک جبر مسلسل ہے

یاروں کا گلہ کرنا
ان کی عادت ہے
دشمن سے ملا کرنا

صدیق نہیں کرتے
تحقیق بنا ہرگز
تصدیق نہیں کرتے

موسم کا گلہ کرتے
بس میں اگر ہوتا
ہر روز ملا کرتے

تقلید نہیں کرنی
بے بنیاد کبھی
تنقید نہیں کرنی

پنگھٹ سے بھرے پانی
گاؤں بھر میں کہاں
گوری کا کوئی ثانی

اظہار تو کر دیکھو
پیار ہے کیا جاناں
اک بار تو کر دیکھو

مٹی کا ڈھیلا ہے
طالب تو ہیں بہت
پر چاند اکیلا ہے

پانی سے بھرو گاگر
ہم ڈوب چلے ان میں
دو نین ہیں یا ساگر

بھوک ہے، فاقے ہیں
ظلم کی حد دیکھو
گلیوں میں دھماکے ہیں

حالات سے ڈرتے ہیں
بم دھماکوں میں
معصوم ہی مرتے ہیں

کتاب گھر

کتاب میلہ تعارف: حیدر قریشی

سعادت (حمد و نعت) شاعر: خواجہ محمد عارف

صفحات: 232 **قیمت**: 200 **روپے** **ناشر**: تعبیر پبلی کیشنز۔ سیکٹر B - 1 ۔ میر پور

خواجہ محمد عارف میر پور کے رہنے والے ہیں اور اب انگلینڈ کے شہر برمنگھم میں آباد ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'سعادت' ان کی حمدیہ، دعائیہ اور نعتیہ شاعری پر مبنی ہے۔ مناقبِ صحابہؓ، متفرق ملی نظمیں اور چند قطعات بھی مجموعہ میں شامل ہیں۔ چونکہ ان سب کا پس منظر بھی مذہبی ہے اس لیے مجموعہ کا مجموعی تاثر قائم رہتا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ عقیدت میں ڈوبی ہوئی شاعری میں فنی کمالات نہیں دیکھے جاتے، جذبے اور خلوص کو دیکھا جاتا ہے۔ تاہم خواجہ محمد عارف کا یہ مجموعہ فنی لحاظ سے بھی مناسب ہے۔ اس شاعری میں آج کے سیاسی اور سماجی مسائل بھی پس منظر سے صاف دکھائی دیتے ہیں، بلکہ دعائیہ شاعری کا محرک ہی یہی حالات ہیں۔ اس لحاظ سے خواجہ محمد عارف کی دعائیں ان کے دل کی آواز ہیں۔ حمد و نعت میں ادب کے مقامات اور تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ حمد و نعت سے خصوصی دلچسپی رکھنے والوں کے لیے 'سعادت' ایک عمدہ تحفہ ہے۔

صدائیں ساتھ رہتی ہیں (غزلیں) شاعر: ارشاد قمر

صفحات: 142 **قیمت**: 150 **روپے** **ناشر**: بیلا پبلی کیشنز۔ اسلام آباد

ہالینڈ میں مقیم ارشاد قمر کا شعری مجموعہ 'صدائیں ساتھ رہتی ہیں' ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کے تعین میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس مجموعہ میں ۵۹ غزلیں شامل ہیں، مصنف کے اپنے ''عرض ارشاد'' کے علاوہ ارشاد قمر کی شاعری کے حوالے سے گیارہ ادیبوں کے تاثرات اور سات ادیبوں کے مضامین شاملِ کتاب ہیں۔ ارشاد قمر کے بارے میں دو شعراء کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری کے ساتھ ان کے فن اور شخصیت کے بارے میں بھی کافی مواد جمع ہو گیا ہے۔ غزلوں کا عمومی انداز ٹھیک ہے تاہم کہیں کہیں (غالباً) پروف ریڈنگ کی کوتاہی کی وجہ سے اشعار وزن سے باہر بھی ہو رہے ہیں۔ صرف ایک مثال:

اک سفر تھا بے ارادہ جانے کیسے کٹ گیا — کہ ہم تھے ایک بنجارے جو در بدر ہوتے رہے

توقع کی جانی چاہیے کہ اس مجموعہ کے اگلے ایڈیشن میں پروف ریڈنگ کی ایسی غلطیوں کو دور کر لیا جائے گا۔

ابنِ بطوطہ کے خطوط (سفر نامہ) تصنیف: ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

صفحات: 438 **قیمت**: 625 **روپے** **ناشر**: الوقار پبلی کیشنز، ۳۳۵۔ کے ٹو، واپڈا ٹاؤن۔ لاہور

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اردو کے ممتاز ادیب اور صحافی ہیں۔ سفر نامے، خاکے، رپورتاژ، کالم نگاری، اقبالیات و پاکستانیات، تنقید و تراجم، پشوریات پر ان کی مجموعی طور پر ۴۹ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیرِ نظر سفر نامہ ابنِ بطوطہ کے خطوط کے ساتھ ان کی کتابوں کی ہاف سنچری مکمل ہو رہی ہے۔ اس میں صرف تین کتابیں ترجمہ سے متعلق ہیں جبکہ ساری کتابیں اوریجنل ورک کے ذیل میں آتی ہیں۔ آج کے دور میں جب کسی اونچی دوکان والے نام کی ساٹھ کتابوں کی حقیقت کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اوریجنل ورک کہلانے والی تو مشکل سے پانچ کتابیں نکلی ہیں۔ باقی سب قینچی ورک کی مختلف اشکال ہیں۔ کہیں ترتیب، کہیں تدوین، کہیں ترجمہ اور کہیں سرقہ۔ ایسے ماحول میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے دامن میں پچاس کے لگ بھگ اوریجنل ورک والی کتابوں کا ہونا بجائے خود ایک اعزاز ہے۔

ابنِ بطوطہ کے خطوط میں ہالینڈ، جرمنی، فرانس، برطانیہ، امریکہ اور ترکی کے سفر کا احوال درج ہے۔ ۸/ جولائی ۲۰۰۷ء سے لے کر ۲۹ اگست ۲۰۰۷ء تک کے عرصہ پر محیط اس سفر کی روداد کو ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے اپنے سابقہ سفر ناموں سے مختلف انداز میں لکھا ہے۔ انہوں نے مختلف ملکوں کے شہروں سے اپنے مختلف عزیزوں اور دوستوں کو خطوط لکھے، جن میں اپنے سفر کی روداد ساتھ ساتھ بیان کرتے گئے۔ یوں یہ سفر انہوں نے اکیلے نہیں کیا بلکہ ان کے وہ سارے عزیز و اقارب اور دوست احباب بھی ایک رنگ میں اس سفر میں ان کے ساتھ رہے جنہیں وہ ساتھ کے ساتھ اپنی روداد لکھ کر بھیج رہے تھے۔ اس اندازِ تحریر نے اس سفر نامہ کو ایک انفرادیت بھی عطا کر دی ہے۔

اس سفر نامہ میں متعلقہ ممالک کے بارے میں اعداد و شمار والی معلومات سے زیادہ ڈاکٹر اعوان کے ذاتی تجربات، مشاہدات نے سفر کی روداد کو بے حد دلچسپ بنا دیا ہے۔ انہوں نے مغربی ممالک کے خوبصورت اور قابلِ تقلید رویوں کو بھی اجاگر کیا ہے اور ان معاشروں کے منفی اثرات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ یورپ کے مقابلہ میں انہیں امریکہ زیادہ اچھا لگا لیکن یورپ کی کوبیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ترکی کی روداد میں ان کے جذبات کا بہاؤ کئی بار ماضی اور حال میں مدغم ہوتا رہا۔ جرمنی میں جن دنوں میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان تشریف لائے، اُن دنوں میں جرمنی میں گزشتہ بیس برسوں میں سب سے زیادہ گرمی پڑ رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے جرمنی کا نام گرمنی رکھ دیا اور اب جب میں یہ تبصرہ لکھ رہا ہوں، ۷/ جنوری ۲۰۰۹ء کو جرمنی میں ہمارے علاقہ میں ٹمپریچر منفی سولہ ڈگری تک پہنچ چکا ہے۔ انہوں نے چار دنوں کا تجربہ لکھ دیا ہم پندرہ برسوں کے تجربات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ سفر نامہ اپنے انوکھے اندازِ تحریر کے ساتھ اپنے دلچسپ، معلوماتی اور خوبصورت تجربات و مشاہدات کی بنا پر خصوصی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ مغربی ممالک کی سفر نامہ نگاری میں ''ابنِ بطوطہ کے خطوط'' کو ایک منفرد و اہم حیثیت حاصل رہے گی۔

گلِ موسمِ خزاں (**صفحات**:230، **قیمت**:150روپے)

تمھیں جانے کی جلدی تھی (**صفحات**:159، **قیمت**:100روپے)

شاعر: **ایوب خاور** **ناشر**:الحمد پبلی کیشنز۔چوک پرانی انارکلی۔لاہور

ایوب خاور تازہ کار اور خوش فکر شاعر ہیں۔ٹیلی ویژن کی دنیا کی مصروفیات نے ان کے اندر کے شاعر کے اظہار میں کچھ نہ کچھ رکاوٹیں تو ڈالیں لیکن وہ شاعر نہ زندہ رہا بلکہ اپنی آن بان اور شان کے ساتھ زندہ رہا۔اس شاعر کی زندگی کے ثبوت کے طور پر ان کے دو شعری مجموعے ''گلِ موسمِ خزاں'' اور ''تمھیں جانے کی جلدی تھی'' پیش کیے جاسکتے ہیں۔ایوب خاور بنیادی طور پر نظم کے نہایت شاندار شاعر ہیں لیکن ان کی غزل بھی اتنی کَسی ہوئی اور بھرپور ہوتی ہے کہ انہیں صرف نظم کا شاندار شاعر کہہ دینا ان کی غزل کے ساتھ ناانصافی ہو جاتا ہے۔ان کی نظم ''ماں'' جدید ادب میں خانپور کے زمانہ میں شائع ہوئی تھی۔اس نظم کا ایک بڑا اقتباس میری والدہ کے خاکہ ''مائے نی میں کنوں آکھاں'' کے اختتام میں اس طور سمایا ہے کہ اسے اس خاکے سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔شاید اس لیے بھی کہ ہم جیسوں کی مائیں ایک جیسی تھیں۔میں ایوب خاور کی نظم کا ایسا خاموش قاری ہوں جو خود ہی اس سے لطف کشید کرتا رہتا ہوں۔''گلِ موسمِ خزاں'' کی نظم ''گھروں میں ایک گھر ایسا بھی تھا'' پڑھتے ہوئے مجھے لگا کہ اس میں سے چند سطریں غائب ہیں:''زمانہ ایک بنئے کی طرح چالاک ہے/ہونی کو انہونی میں، انہونی کو ہونی میں کچھ ایسے ہی بدلتا ہے/کہ جس کے دکھ میں آنکھوں کے بھرے ساون پیالے ٹوٹ جاتے ہیں''۔۔۔ان سطور کے بعد نظم کا یہ حصہ غائب ہے:''ہوا سوچوں میں گرہیں ڈال دے تو روح کے اندر اترنے والے ساتھی چھوٹ جاتے ہیں''

میں ربع صدی پیشتر پڑھی ہوئی مذکورہ نظم کے بارے میں اپنی یادداشت کے بل پر یہ نشاندہی کر رہا ہوں، ایوب خاور کتاب کے نئے ایڈیشن میں نظم کو دوبارہ چیک کرلیں تو اچھا ہے۔

غزلوں میں سے کسی انتخاب کے بغیر چند اشعار پیش ہیں۔ایوب خاور کا یہ عمومی انداز بھی بہت خاص ہے۔

ہوا کو اپنے لیے بادبان میں نے کیا — حدِ نظر سے پرے، آسمان میں نے کیا

تیری آنکھیں میری آنکھیں لگتی ہیں — سوچ رہا ہوں کون یہ تجھ سا مجھ میں ہے

وہ نیند اپنے بچپنے کی راہ میں اجڑ گئی — اس آنکھ نے بھی معجزوں کے سو جہان کھو دیئے

تیرے بِنا جو عمر بِتائی بیت گئی — اب اس عمر کا باقی حصہ تیرے نام

یاد رکھنے کے لیے اور نہ بھلانے کے لیے — اب وہ ملتا ہے تو بس رسم نبھانے کے لیے

حُسن اور عشق کے مابین ٹھنی ہے اب کے — اس لڑائی میں کسی ایک کا سر جائے گا

تیسرے مجموعے کی اشاعت کے بعد ایوب خاور تینوں مجموعے ایک جلد میں لائیں تاکہ ان کی مجموعی شعری قدر و قیمت سامنے آسکے۔

اسطوری فکر و فلسفہ (اردو شاعری میں) **تصنیف**:**ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط**

صفحات:182 **قیمت**: 220 **روپے** **ناشر**:اصول پبلی کیشنز۔مدنی گرافکس انامئے بلڈنگ، پونہ

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اس کتاب میں اردو شاعری میں بیان ہونے والے اسطوری فکر و فلسفہ کا کچھ احاطہ کرنے کی کاوش ہے۔اساطیر کے انتخاب میں انہوں نے ہندو، سکھ، بدھ، مسیحی، اسلامی اور یہودی مذاہب کی روایات سے استفادہ کیا ہے۔یوں ان کی کتاب فکر و فلسفہ کی بجائے مذہبی فکر اور شاعری کی سطح پر رہتی ہے۔فلسفہ کا اس میں عمل دخل بہت کم ہو جاتا ہے۔قدیم مذہبی اساطیر کی بازیافت میں یحییٰ نشیط نے بڑی محنت سے کام کیا ہے اور کئی عمدہ اور خوبصورت روایات کو نہ صرف سامنے لائے ہیں بلکہ اردو شاعری میں ان کے ذکر کی نوعیت کو بھی عمدگی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ہندو دیومالا تو ویسے بھی اپنے ایسے سرمائے کے لحاظ سے بے حد زرخیز ہے۔سکھ اور بدھ مت کی اساطیر بھی کافی دلچسپی کی حامل ہیں۔

مسیحی، یہودی اور اسلامی روایات کا اصل منبع (ابراہیمی) چونکہ ایک ہی ہے اس لیے یہاں بہت کچھ جانا پہچانا ہی ہے۔کہیں کہیں بعض تسامحات بھی راہ پا گئے ہیں۔مثلاً یحییٰ نشیط نے ایک جگہ 'کوہِ طُور' کو عیسائیوں کے نزدیک مقدس پہاڑ قرار دیا ہے(ص ۹)۔جبکہ اسطوری سطح پر بھی اور کتبِ مقدسہ کے حوالے سے بھی کوہِ طُور یہودی، مسیحی اور اسلامی تینوں مذاہب کے لیے مقدس پہاڑ کے طَور پر مذکور ہے۔

یحییٰ نشیط نے فلسفے کی آزادہ روی کو اختیار کرنے کی بجائے مذہبی فکر کی پناہوں میں اپنا علمی سفر طے کیا ہے، اسی لیے وہ اساطیر میں مذہب ہی کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔افراد کے اجتماعی حافظے سے بات ماقبل تاریخ تک لے جائی جاسکتی ہے، تاہم مذہب الارواح میں بھی مذہبی احساس تو بہرحال کارفرما رہا تھا۔مجھے سمیری دیومالا کی ایک بلا ''تیامت'' یاد آرہی ہے۔یہ بلا جب نازل ہوتی ہے تو جہاں سے گزرتی ہے وہاں تباہی مچا دیتی ہے۔اپنی ہولناکی کے ساتھ وہ اپنا احترام بھی جبراً کرواتی ہے۔ہمارے ہاں ''قیامت'' کا جو عقیدہ ہے اس میں بھی مکمل تباہی کے ساتھ ''قیامت'' پر ایمان (احترام) بھی لازمی ہے۔اب خدا جانے اجتماعی حافظے کے سفر کے دوران یہ محض ت اور ق کا فرق ہے، یا سمیری دیومالا کے عقب میں بھی کہیں کوئی مذہبی عقیدہ موجود تھا۔مجھے اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں یاد آئی ہیں لیکن ان کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

بعض سیدھی سادی مذہبی روایات اور عقائد کے اردو شاعری میں ذکر کو بھی یحییٰ نشیط نے اسطوری رنگ میں پیش کیا ہے۔جبکہ شاعری میں بھی سیدھے سبھاؤ ذکر والی مثالیں پیش کی ہیں۔چونکہ ان کے پیش نظر ایسا ہی تھا سو انہوں نے اس حوالے سے اچھی محنت کی ہے۔تاہم اس کتاب کے مطالعہ کے بعد احساس ہو رہا ہے کہ یحییٰ نشیط صاحب کو اللہ تعالیٰ ہمت اور توفیق دے تو وہ اساطیر کی تہذیبی و ثقافتی سطح تک رہتے ہوئے اور اردو شاعری میں (بلکہ اردو کی تخلیقی نثر میں بھی) علامتی اور استعاراتی رنگ میں مذکور اساطیر کو دریافت کریں۔ایک وسیع میدان اُن کا منتظر ہے!

شاخِ صنوبر (شاعری) شاعر: کرامت علی کرامت

صفحات: 256 **قیمت:** 200 روپے **ناشر:** کامران پبلی کیشنز۔دیوان بازار، کٹک ۷۵۳۰۰۱۔اڑیسہ

کرامت علی کرامت کا پہلا شعری مجموعہ ''شعاعوں کی صلیب'' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔اس کے چونتیس برس بعد دوسرا شعری مجموعہ ''شاخِ صنوبر'' منظرِ عام پر آیا ہے۔اس مجموعہ کو ''لفظ لفظ جستجو'' اور ''خواب خواب لمحہ'' کے زیرِ عنوان دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔اول الذکر کے تحت نظمیں، رباعیات، قطعات، ہائیکو، کہہ مکرنیاں اور آزاد غزلیں شامل کی گئی ہیں جبکہ دوسرے حصہ میں غزلوں کو شامل کیا گیا ہے۔غزلوں کا حصہ مجموعہ کی بجائے دیوان کہلانے کا مستحق ہے کہ اس میں ردیف 'الف' تا ردیف 'ی' تک طبع آزمائی کی گئی ہے۔ابتدا میں ایک دعائیہ ''بارگاہِ الٰہی میں'' اور تین نعتیں شامل ہیں۔نظموں کے حصہ میں بعض نظموں میں علامہ اقبال کا انداز صاف جھلکتا ہے۔آزاد نظم میں ''منظوم خط۔۔'' جیسی چند نظمیں اپنے اکہرے پن کے باعث کوئی اچھا تاثر نہیں قائم کرتیں تاہم مجموعی طور پر آزاد نظم میں وہ اپنی شناخت قائم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔کتاب کے آخر میں پہلے مجموعہ ''شعاعوں کی صلیب'' پر معاصرین کی آراء کو درج کیا گیا ہے۔ان آراء کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کرامت علی کرامت نے اپنے پہلے مجموعہ کی چند نظمیں ''شاخِ صنوبر'' میں بھی شامل رکھی ہیں۔مثلاً تناسخ، سرگزشتِ سفر، اور بے وزنی کا احساس۔اس میں کوئی حرج نہیں ہے تاہم کتاب کے شروع میں ''ایک خط اپنے نادیدہ قاری کے نام'' میں اس کا ذکر کر دیا جاتا تو ریکارڈ کی درستی یا وضاحت ہو جاتی۔کرامت علی کرامت کی شاعری کے بارے میں عام طور پر ان کے معاصرین نے اچھی رائے دی ہے تاہم شمس الرحمٰن فاروقی، چودھری محمد نعیم اور ڈاکٹر لطف الرحمٰن کے تاثرات میں خاصے تحفظات کا اظہار ملتا ہے۔

ردیف وار غزلیں کہنے کی مہارت کی ایک جھلک کے طور پر ''شاخِ صنوبر'' میں سے چند اشعار پیش ہیں۔

میری بولی بولتا تھا، ہم زباں اپنا نہ تھا — مثلِ طوطا شعر پڑھتا تھا، بیاں اپنا نہ تھا

ناکام حسرتوں کا مقدر لئے پھرا — یوں میں شکستِ خواب کا منظر لئے پھرا

مختارِ کُل ہے، لکِ بصیرت کا، اے ادیب — کیوں اپنے آپ کو تو سمجھنے لگا غریب

کیا مجھ کو دیکھو ہو جناب — میں ہوں کھلی سی اک کتاب

باغوں میں شور وغُل ہے مگر عندلیب چپ — کیا بات ہے کہ میرا شگفتہ نصیب چپ

پتہ کھڑک اُٹھا تو میں چونکا ہوں نیند سے — جھونکا شکستِ خواب کا لاتی رہی ہے رات

یوں ہے مسموم فضا کیا باعث — منظرِ کرب وبلا کیا باعث

پہنا ہے آسمان نے سورج کا جب سے تاج — لینے لگا زمیں سے پہاڑوں کا وہ خراج

کرامت علی کرامت کی غزلوں کے ان چند اشعار ہی سے ان کی غزلگوئی کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے!

ایک آواز (نثری نظمیں) مصنف: سلیم آغا قزلباش

صفحات: 88 **قیمت:** 100 روپے **ناشر:** کاغذی پیرہن۔عظیم مینشن۔رائل پارک۔لاہور

میری ادبی زندگی کی دو اہم شخصیات ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کی اگلی نسل کے حوالے سے مجھے دو انوکھے تجربے ہوئے۔انور سدید کے صاحبزادے مسعود انور سے جب ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو پتہ چلا وہ ادب میں ترقی پسند تخلیق کاروں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔وزیر آغا کے صاحبزادے سلیم آغا کی نثری نظم میں گہری دلچسپی کو بھی میں اسی تجربہ کے طور پر دیکھتا ہوں۔اس سے دونوں بڑی شخصیات کے گھروں میں آزادیٔ اظہار کا مثبت رویہ دیکھا جا سکتا ہے۔زیرِ نظر کتاب سلیم آغا قزلباش کی نثری نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے۔اب لوگ باگ نثری نظم کے تخلیقی امکانات کی بات زیادہ کرتے ہیں۔جب ڈاکٹر وزیر آغا شعری مواد اور شاعری کے فرق کو واضح کر کے، نثری نظم کے شعری مواد کا اعتراف کر کے اسے شاعری تسلیم نہیں کرتے تھے، میں تب بھی ان کے خیالات سے متفق تھا اور اب بھی اُسی بات کا قائل ہوں۔کتاب کے نام ''ایک آواز'' پر مبنی ایک نثری نظم مجموعہ کے آخر میں شامل ہے۔اس میں والدہ کی وفات پر دلی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔لیکن مجھے یہ نثری نظم پڑھتے ہی وزیر آغا کی والدہ مرحومہ کی وفات پر لکھی ہوئی دونوں نظمیں شدت کے ساتھ یاد آئیں۔ان کے ساتھ ''آدھی صدی کے بعد'' کے وہ خوبصورت حصے یاد آئے جس میں ماں بیٹے کی یادوں کا خزانہ بھرا ہوا ہے۔

اس مجموعہ کا پیش لفظ ناصر عباس نیر نے لکھا ہے۔اس میں سلیم آغا کی نثری نظم ''نیا شہر'' کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے مابعد جدید کلچر کے حوالے سے اور ''بُت شکن'' کا ذکر کرتے ہوئے عالمی مارکیٹ اکانومی کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، وہ سب پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ان کی باتوں کا نچوڑ اس اعتراف میں آجاتا ہے: ''کرۂ ارض کی واحد عالمی طاقت نے اکیسویں صدی میں کمزور ملکوں پر ڈسکورس ہی کی بنیاد پر جنگیں مسلط کی ہیں: پہلے اُن ملکوں سے متعلق ڈسکورس تشکیل دیے، اُنہیں میڈیا کے ذریعے پھیلایا اور باور کرایا، اور پھر ہر کھڑی عمارت اور ثابت و سالم شے کو اکھاڑ پچھاڑ دیا۔اس ڈسکورس میں کہیں نہ کہیں، مذہبی عُنصر ضرور شامل رہا'' **(ایک آواز: ص ۱۱)**

جدید ادب جرمنی کے شمارہ اول کے اداریہ کی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے شمارہ دو میں وزیر آغا، ناصر عباس نیر اور میرے درمیان ایک مکالمہ ہوا تھا۔مجھے ناصر عباس نیر کے مذکورہ نتائج اخذ کرنے میں اُسی مکالمہ کی توسیع دکھائی دی ہے، اسی لیے مجھے اس سے دلی خوشی ہوئی ہے اور پہلے سے زیادہ ان کی علم وادب سے وابستگی کا معترف ہو گیا ہوں۔ نثری نظم اور آزاد نظم کی بحث میں اپنا واضح موقف رکھنے کے باعث نثری نظم کے تئیں میرے تحفظات بہت واضح ہیں، تاہم اس صنف کے امکانات کو آزما لینے میں کوئی حرج نہیں۔نثری نظم کے جو مجموعے ان امکانات پر گفتگو کی گنجائش پیدا کریں گے، ان میں ''ایک آواز'' بھی شامل رہے گا۔کیونکہ ''ایک آواز'' کی نثری نظمیں اپنے شعری مواد کے لحاظ سے قابلِ توصیف ہیں۔

محمد اسلم رسول پوری (جام پور)

تاثر اور تنقید۔۔۔ ایک مطالعہ

تاثر اور تنقید جناب عبدالرب استاد کے تاثراتی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جناب عبدالرب استاد کا تعلق بھارت کی ریاست کرناٹک کے شعبہ تدریس سے ہے۔تاثر اور تنقید مختلف موضوعات پر گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ایک ادبی نقاد کے لئے کچھ خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔جن میں وسیع مطالعہ تجزیے کی صلاحیت اور اظہارِ بیان پر قدرت شامل ہیں۔خوش قسمتی سے جناب عبدالرب استاد کو قدرت نے یہ خوبیاں عنایت کی ہوئی ہیں۔اس لئے ان کے مضامین پڑھنے والے کو اس کے تمام مطالبوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

ان مضامین میں عبدالرب استاد نے نثر اور نظم کے حوالے سے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ابتدا میں ان کا مضمون تحریک آزادی میں اردو ادب کے حوالے سے ہے۔بلاشبہ یہ ایک اہم مضمون ہے جس پر بہت تفصیل سے لکھا جا سکتا ہے۔لیکن عبدالرب استاد کا یہ مضمون مختصر ہونے کے ساتھ جامع بھی ہے۔انہوں نے تحریک آزادی کو ۱۷۵۷ کی جنگ پلاسی سے شروع کیا ہے۔جس پر سراج الدولہ نے انگریزوں کے بنگال پر قبضے کے خلاف مزاحمت کی تھی۔باقاعدہ طور پر یہ جنگ ۱۸۵۷ میں لڑی گئی۔جس کے بعد انگریزوں نے پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔اس کے بعد ہندوستان کی آزادی تک جو نوے سال کا عرصہ بنتا ہے۔اس میں دو بڑی ادبی تحریکیں شروع ہوئیں۔ایک سرسید احمد خان کی اور دوسری ترقی پسند تحریک۔عبدالرب استاد نے ان دونوں تحریکوں کا جائزہ لیا۔۱۸۵۷ کی جنگ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر لڑی تھی۔اور یہ ہندو مسلم اتحاد کا شاندار نمونہ تھی۔اور بعد میں انگریزوں نے اس اتحاد سے خوف زدہ ہو کر مسلمانوں اور ہندوؤں کو تقسیم کرنے فیصلہ کیا اور اس کے نتیجے میں زبان کو بھی تقسیم کرنے کی کوشش کی۔اور اسے ہندی اردو لسانی جھگڑے میں مبتلا کیا۔عبدارب استاد نے انگریزوں کی اس سازش کو بے نقاب کیا ہے۔اس طرح سرسید احمد خان کے دو قومی نظریے پر بھی ایک نظر ڈالی ہے۔اور ڈاکٹر تاراچند کے حوالے سے بتایا ہے کہ سرسید احمد خان کے کانگرس سے سیاسی اختلاف تھے۔عبدالرب استاد نے اپنے اس مضمون میں جن بنیادی سوالات کو چھیڑا ہے وہ آئندہ کے محققین کیلئے ریسرچ کا ایک موضوع بن سکتے ہیں۔

مولانا حالی کی ادبی خدمات سے انکار ممکن نہیں ہے۔عبدالرب استاد نے اس دوسرے مضمون میں مولانا حالی کی

شاعری اور مسدس کے ساتھ ان کی نثری تصانیف کو بنیادی اہمیت دی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے یادگارِ غالب حیاتِ سعدی اور حیاتِ جاوید کو خصوصی طور پر اپنا موضوع بنایا ہے۔یادگارِ غالب جو غالب کی زندگی اور شاعری کے بارے میں بنیادی کتاب ہے کی اہمیت کو عبدالرب استاد نے بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے اور بالکل درست طور پر کہا ہے کہ غالب کا کوئی سوانح نگار یادگارِ غالب سے استفادہ کئے بغیر قلم نہیں اٹھا سکتا۔اس طرح انہوں نے حیاتِ جاوید پر بھی لکھا۔انہوں نے مولانا شبلی کا حیاتِ جاوید کو مدلل مداحی کہنے کا دفاع کیا ہے۔

مولانا حالی کا مسدس پر جو مقدمہ ہے وہ اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔اس کی اہمیت کو عبدالرب استاد نے پوری طرح نمایاں کیا ہے۔اور حالی نے شعر کی جو تعریف سادگی حقیقت پسندی اور جذبے کے حوالے سے کی ہے اس پر وقت نے مہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔تاہم انہوں نے مولانا حالی کے ناول مجالسِ النسا کا صرف تذکرہ کیا ہے۔اس پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔پھر بھی یہ مضمون حالی کی ادبی خدمات کو بڑے جامع انداز میں قاری کے سامنے لاتا ہے۔

پریم چند اور خطبہ صدارت کے حوالے سے عبدالرب استاد کا مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اگرچہ پریم چند پر بہت کام ہوا ہے لیکن ان کے خطبہ پر خاطر خواہ نہیں لکھا گیا۔ادبی حوالے سے استاد نے پریم چند کی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ان کا خطبہ صدارت جو ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے دیا گیا ادب کی حیثیت کو متعین کرنے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے بجا طور پر لکھا ہے جس طرح حالی کا مقدمہ شاعری پر تھا اس طرح یہ صدارتی خطبہ پریم چند کے فکشن کا مقدمہ معلوم ہوتا ہے۔

عبدالرب استاد نے پریم چند کے خطبے کے مختلف اقتباسات پیش کر کے انہیں ادب کی ایک کسوٹی قرار دیا ہے۔اور اس طور اس خطبے کی جو بنیادی اہمیت ہے وہ کھل کر سامنے آتی ہے۔یوں پریم چند کی فکری اور ادبی رسائی کے بارے میں ہم بہتر طور پر جان سکتے ہیں جس میں ان کا سیاسی شعور بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔

بلاشبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایک بڑا نام ہے۔اور ان کی ادبی خدمات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ڈاکٹر زور کی کتاب ہندوستانی لسانیات سب سے پہلے میری نظر سے گذری تھی اور ایک واقت تک میں انہیں صرف ماہرِ لسانیات ہی سمجھتا رہا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی دوسری بہت سی خدمات سامنے آتی رہیں مگر عبدالرب استاد کے اس مضمون نے تمام کمیوں کو پورا کر دیا۔اور ڈاکٹر زور ایک بڑے محقق کے طور پر سامنے آئے۔یہ مضمون ڈاکٹر زور کی تمام خدمات کا بھرپور جائزہ لیتا ہے۔یقیناً یہ ایک معلوماتی مضمون ہے۔

دکن کے ایک با کمال شاعر سلیمان خطیب سے میں پہلی بار عبدالرب استاد کی معرفت متعارف ہوا ہوں۔میں نے اس مضمون کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور خطیب کی زبان پر خصوصی توجہ دی کیونکہ کہیں کہیں وہ میرے لئے اجنبی تھی مگر عبدالرب استاد کی وضاحتوں سے خطیب کے شعروں نے دل کو گہرائیوں تک جا لیا۔یہ مضمون نہ

صرف خطیب کی شاعری کا تعارف کراتا ہے بلکہ وہاں کی تہذیب اور سماجی زندگی کی پرتیں بھی الٹتا رہتا ہے۔ساس بہو کے بارے میں سلیمان خطیب کی نظم بڑی متاثر کن ہے۔ایسے ہی ساس بہو کے جھگڑے کے بارے میں ایک سرائیکی نظم بچپن میں سنی تھی جواب تک دل پر اثر کرتی ہے۔

حیدر قریشی کا نام اردو ادب میں زندہ رہنے والا نام ہے۔انہوں نے اردو کی ہر صنفِ ادب میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کیا ہے۔نثر میں افسانہ انشائیہ تنقید اور سفر نامہ کے ساتھ شاعری میں نظم غزل اور ماہیا میں بھی ان کی قدرتِ کلام اپنے تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔۔آج کا اردو ماہیا تو تقریباً ان کے نام منسوب ہے۔انہوں نے اسے عام قسم کے بے وزن لوک گیتوں سے نکال کر ایک بڑی ادبی صنف بنا دیا ہے۔اور اس کے لئے جس جدوجہد کا مظاہرہ کیا ہے اس کی جدید اردو ادب میں مثال ملنی محال ہے۔یہی وجہ ہے اردو ادب کے معروف نقاد ڈاکٹر وزیر آغا ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اس حوالے سے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔جناب عبدالرب استاد نے اپنے مضمون اردو ماہیا اور حیدر قریشی میں ان سب کا جائزہ لیا ہے۔اور ماہیا کے سلسلے میں جناب حیدر قریشی کی تمام کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔اور ماہیے کو ادبی صنف بنانے کے علاوہ اس کے مزاج کو متعین کرنے اور وزن کے تعین کرنے کی کوششوں کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔جناب حیدر قریشی نے صرف ماہیے کی تاریخ اس کے اوزان اور مزاج پر مضامین نہیں لکھے بلکہ خود بھی تین سو سے زائد ماہیے بھی لکھے ہیں۔ عبدالرب استاد نے اپنے مضمون میں حیدر قریشی کی ان کوششوں کے ساتھ ان کے ماہیوں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ حیدر قریشی نے ماہیے کے موضوعات کو جو وسعت دی ہے۔عبدالرب استاد نے انہیں موضوعات کے حوالے سے کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔حمد، دھرتی، رشتے، حسن و عشق، منظر نگاری وغیرہ کے ساتھ ان کے فنی حسن پر بھی نظر ڈالی ہے۔محاکات تلمیحات اور تشبیہات کے استعمال سے حیدر قریشی نے اپنے ماہیوں میں جو شاعرانہ حسن پیدا کیا ہے۔اس پر عبدالرب استاد نے تفصیل سے لکھا ہے استاد کا یہ مضمون حیدر قریشی کے ماہیے کا ایک بھرپور تعارفی مضمون ہے۔جس سے حیدر قریشی کی عملی جدوجہد کے ساتھ فنی رسائی سے ہماری مکمل واقفیت ہوتی ہے۔تاہم استاد صاحب نے ماہیوں کے بارے میں حیدر قریشی کی اتنی گہری دلچسپی کا نفسیاتی جائزہ نہ لیا ہے۔ جناب حیدر قریشی کا تعلق سرائیکی وسیب (جنوبی پنجاب پاکستان) سے ہے ۔اور ماہیے کے بارے میں میرا نکتہ نظر یہ ہے۔کہ ماہیا دراصل لفظ ماہی سے بنا ہے جو سرائیکی زبان کا لفظ ہے اور جس کا مطلب محبوب ہے اور عشق و محبت کے حوالے سے مختصر قسم کا شاعرانہ اظہار ماہی کے حوالے سے ماہیا کے نام سے مشہور ہے۔چونکہ سرائیکی زبان سرائیکی وسیب (جنوبی پنجاب۔پاکستان) میں بولی جاتی ہے اس لئے عام طور پر یہ سرائیکی صنف شاعری ہے۔(سرائیکی زبان کو مخصوص مفادات کے تحت پنجابی زبان کا لہجہ سمجھا جاتا ہے اس لئے ماہیا کو بھی پنجابی صنف قرار دیا جاتا ہے) میرے خیال میں جناب حیدر قریشی کی ماہیے سے دلچسپی سرائیکی وسیب اور سرائیکی زبان کی وجہ سے ہے۔سرائیکی

زبان ماہیوں سے بھری پڑی ہے۔

ککراں تے پھل ماہیا۔اساں پردیسی ہئیں ۔ساڈے پچھوں نہ رل ماہیا

(کیکروں پر پھول آ گئے ہیں۔دوست ہم تو پردیسی ہیں ہمارے پیچھے نہ آوارہ گھوم)

ہٹیاں تے کھنڈ ویٹی۔ہک تاں غریبی اے۔ڈوجھا سجناں کنڈ کیتی

(دکانوں پر چینی بکھری پڑی ہے۔ایک طرف تو غربت ہے دوسری طرف دوست نے بھی پیٹھ پھیر لی ہے)

درمیان میں اس وضاحت کے آجانے کی وجہ سے میں اپنے موضوع سے کسی قدر ہٹ گیا ہوں۔

اس کتاب میں حیدر قرشی کے انشائیوں کے بارے میں بھی ایک مضمون ہے۔حیدر قریشی جیسا کہ میں اوپر عرض کر آیا ہوں ایک ہمہ جہت لکھاری ہیں انشائیہ بھی انہوں نے خوب لکھا ہے۔اس مضمون میں استاد صاحب نے صرف دو انشائیوں خاموشی اور نقاب کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا ہے۔اور فن انشائیہ پر حیدر قریشی کی دسترس کو ان کے ان انشائیوں کے اقتباسات پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ حیدر قریشی کتنا اچھا انشائیہ نگار ہے۔انہوں نے حیدر قریشی کے ان انشائیوں سے فقرہ ہائے بذلہ سنجی بھی منتخب کئے ہیں۔اور اس طرح حیدر قریشی کی ذہانت مزاح پر قدرت اور تجربے کی داد دی ہے۔نمونے کے طور پر: ”خاموشی خیر کی علامت ہے جبکہ شور شر کا مظہر ہے۔“ اور ”نقاب معلوم اور نا معلوم کی جنت کے درمیان عالم برزخ ہے۔اس طرح۔انسانی جسم بھی ایک نقاب ہے جسے روح نے اوڑھ رکھا ہے۔وغیرہ“ اس مضمون کو عبدالرب استاد نے اس خوبی سے لکھا ہے کہ حیدر قریشی میں ایک اچھے انشائیہ نگار ہونے کی تمام خوبیاں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

کرناٹک میں اردو غزل۔پر اس کتاب میں ایک تفصیلی مضمون شامل ہے۔جس میں بہت سے غزل گو شعرا کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔اور ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس مضمون کے ذریعے مجھے عبدالرب استاد کی وسعت علم اور موضوع پر گرفت کا احساس ہوتا ہے۔یہ مضمون قاری کو کرناٹک میں اردو غزل کی موجودہ صورت حال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔اس کتاب میں تین ایسے مضمون بھی شامل ہیں جو تجزیاتی ہیں۔ایک مضمون میں انتظار حسین کے زرد کتا کا تجزیہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ دیگر دو تجزیوں میں ایک حمید سہروردی کے افسانے کہانی در کہانی اور دوسرا ان کی نظم صفر کا تجزیہ شامل ہے۔متن کے مطالعے کے سلسلے میں آج نت نئے نظریات نے ہمارا گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔اس لئے کسی بھی متن کا مطالعہ کئی حوالوں سے کیا جا سکتا ہے۔عبدالرب استاد نے ان تخلیقات کا مطالعہ کسی خاص نظریے کے تحت نہیں کیا بلکہ اپنی تنقیدی رویوں کے تحت کیا ہے آپ ان تجزیوں سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر استاد صاحب کی کوشش بھرپور اور عمدہ ہے۔جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

عبدالرب استاد کی اس تصنیف سے مجھے ان کے وسیع مطالعے، تنقیدی صلاحیت اور اظہار بیان پر قدرت نے متاثر کیا ہے۔یہ کتاب اپنے حوالے سے ایک قابل قدر اور لائق مطالعہ کتاب ہے۔

فریدہ بیگم (گلبرگہ)

مقدمہ شعروشاعری

ے نو ر کے ہم نے گلے دیکھے ہیں اے حالیؔ مگر
رنگ کچھ تیری الا پو ں میں نیا پا تے ہیں ہم

بڑا فنکار جب انسان کے اخلاقی مسائل کوادب میں برتتا ہےتوشکسپیئر کے المیےاوردوستووسکی کے ناول جنم لیتے ہیں۔اسی طرح حالیؔ کی تصویر جب سامنے آتی ہےتوایک معلم ایک نقاد۔ایک مصلحِ قوم کے خدوخال ابھرتے ہیں ۔حالیؔ کوشعروادب سے فطری مناسبت تھی ۔اس سلسلہ میں ان کا اہم ترین کارنامہ ’’مقدمہ شعرو شاعری‘‘ ہےاس کتاب سے اردو میں تنقید کا باضابطہ آغاز ہوتا ہےحالیؔ اردو کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے ایک منظّم اورمربوط شکل میں تنقیدی نظریات کوپیش کیا۔حالیؔ سے قبل بھی اردو میں تنقیدی شعورموجود تھالیکن اسکی حیثیت ادنیٰ درجہ کی تھی ۔معیاروذوق اوروجدان کوسمجھا جاتا تھا۔جو چیز پسند آتی تھی وہ اچھی تھی ۔جو پسند نہیں وہ ادنیٰ درجہ کی تھی۔ لیکن ان کی بھی تفصیل پیش کرنے کی ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ے مشہور زمانے میں ہے نام حالیؔ
معمور ہے ہےحق سے ہے جام حالیؔ
ے میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلام حالیؔ (اقبالؔ)

حالیؔ صرف ادب یا شاعری میں دلچسپی نہیں تھی ۔انہیں اپنی قوم اپنے سماج اپنی تاریخ اپنی مذہبی روایات اورتہذیبی قدروں میں جو دلچسپی تھی اسکی آئینہ داری ان کی شاعری اوران کے مختلف تصانیف کرتی ہے ۔حالی کی نظرادب پراسطرح تھی کہ

’’حالی کواعتراض عشق پرنہیں عیاشی پر ہے۔مسرت پرنہیں بلکہ مزیداری پر‘مشغلے پرنہیں بلکہ بے کاری پرسلیقہ مندی پرنہیں بازاری پن پر۔۔۔انہوں نے ابتذال کے زمانے میں مذاق سلیم کی بات کی ہزل اورٹھٹھول کے زمانے میں شائستہ مزاج پرزوردیا۔ہوس پرستوں کے بیچ محبت کے ارفع جذبات کا ذکرکیا‘‘۔(**وارث علوی**)

یہ وہ زمانہ تھا کہ تنقید منظّم اورمربوط شکل میں موجود نہیں تھی اور جوموجود تھی اسکواعلیٰ درجے کی تنقید نہیں کہا جاسکتا۔حالی نے سب سے معقول اورجاندار قسم کی تنقید کی ابتدا کی حالی کا زمانہ وہ زمانہ تھا۔جس میں معقولیت پسندی کا زندگی کے ہرشعبے میں غلبہ تھا۔ ہرطرف اصلاح کی کوشش کی جارہی تھی۔اس کے اثرات ادب پربھی نمایاں ہوئے۔ادب میں اصلاح کرنے کا خیال پیدا ہوا۔اورجب اس خیال کو عام کرنے کی کوشش کی تو تنقید کا بیج پھوٹ نکلا۔حالی اس میں سب سے زیادہ پیش پیش نظر آئے۔اوراسی وجہ سے وہ نئی تنقید کے علمبردار کہلائے۔

حالیؔ کے دورمیں خاص کرشاعری میں جھوٹ اورمبالغہ عروج پرتھا۔ بلکہ مبالغہ کوایک ضروری جزسمجھا جانے لگا تھا۔شعرا جھوٹ اورمبالغہ کوشاعری کا زیور سمجھنے لگے تھے حالی لکھتے ہیں

’’یہ سچ ہے کہ ہماری شاعری میں خلفائے عباسینہ کے زمانے سے لے کرآج تک جھوٹ اورمبالغہ برابرترقی کرتا چلا آرہاہے۔اورشاعری کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں رکھا گیا۔ بلکہ اسکوشاعری کا زیور سمجھا گیا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جب سے ہماری شاعری میں جھوٹ اورمبالغہ داخل ہوااس وقت سے تنزل شروع ہوا‘‘۔

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاعری کے حسن میں اضافے کی نظر سے مبالغہ کااس حدتک استعمال ضروری ہے۔جس حدتک شعری تاثر سلب نہ ہوجائے اورمعنوی انداز میں شعربے اثر ہوکررہ جائے انہوں نے ماحول اورحالات و واقعات کے پیش نظرادب کا جائزہ لیا۔دوسرے ممالک کی جاندارخصوصیات اپنے سامنے رکھیں اورپھر چند نظریات پیش کئے ۔انہوں نے سادگی‘ اصلیت اورجوش کوشاعری کے لئے ضروری قراردیا۔کیونکہ اس زمانے میں شاعری مبالغہ آرائی ہوکررہ گئی تھی ۔تکلف اورنفع اپنے شباب پرتھا حالی نے اس طلسم کوتوڑا۔

حالی نے نثرونظم میں اوربھی بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جن کی بنیاد پران کی تنقیدی بصیرت زیربحث لائی جاسکتی ہے لیکن یہ مقدمہ ان کے مربوط اورمبسوط خیالات کا آئینہ ہے یہ کتاب حالی کی نثرکی کتابون میں سب سے زیادہ مشہوراورمقبول ہے۔حالیؔ نے 1893ء میں جب اپنی قدیم اورجدید غزلوں اورمتفرق کلام کا مجموعہ اس مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔اس مقدمہ کو دوحصوں میں تقسیم کیا۔ایک حصہ میں اصول کی روشنی اورتصورات کی تشکیل اوردوسرے میں اصول کی روشنی میں اردوشاعری کے اہم اصناف سخن کا جائزہ اوراصلاح کے متعلق مشورے ۔یہ مقدمہ جب شائع ہوا تو ہرطرف سے شورتحسین اورمخالفت کا شور بلند ہوا۔لکھنؤ اسکول میں تو آگ ہی لگ گئی کیونکہ اس مقدمے نےفنِ تنقید کی جونئی راہ نکالی تھی اسکی کسوٹی پرکسے جانے کے بعداس زمانے کے بیشترشعراء کا کلام نکّما ثابت ہوتا تھا۔

حالیؔ سے پہلے شعرکوعروض کی کسوٹی پرکسنا‘ اس کےلفظوں‘ ترکیبوں اورمحاوروں پراساتذہ کی سندلانا اورتذکیروتانیث کی بحثوں میں الجھناہی شعرکی تنقید سمجھا جاتا تھا۔حالیؔ نے اس راہ کوچھوڑکرشعرکے بنیادی اصولوں سے بحث کی کہ شاعری کا اصل مقصد کیا ہےاردوشاعری اسے کہاں تک پورا کرتی ہے۔اس مقدمہ کے تعلق سے مختلف لوگوں کی مختلف رائے ہیں۔ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں

’’یہ مقدمہ ان کے حسن ذوق اوروسعت نظراورجدتِ خیال کا آئینہ ہے۔جب کوئی غیرشاعرشعرکی

تنقید پر قلم اٹھاتا ہے تو عموماً منطقی بحثوں میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے مگر حالی خود شاعر ہیں اس لیے انہوں نے اصولی مسائل کے ساتھ ساتھ فن کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھایا ہے اردو میں حالی سے پہلے شعر کی تنقید کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ لفظوں اور ترکیبوں کو اساتذہ کے کلام کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں۔ حالی ہی نے پہلے پہل یہ بحث چھیڑی کہ شاعری کی روح کیا ہے اور وہ شعر میں کیسے پیدا ہوتی ہے''۔

'یادِ ایام' میں محمد عبدالرزاق کانپوری لکھتے ہیں

''مقدمۂ شعر و شاعری ادباء و شعراء کے لئے ایک مستقل ضابطہ ہے''

'محشر خیال' میں سجاد انصاری لکھتے ہیں

''اردو میں فن تنقیدی کی اگر تاریخ لکھی جائے تو اس میں حالی کا نام سب سے بلند نظر آئے گا''۔

ترقی پسند ادب میں عزیز احمد لکھتے ہیں:

'حالی کا مقدمہ شعر و شاعری اردو تنقید کے جدید دور کا اور ان کا کلام اردو شاعری کے نئے دور کا باقاعدہ آغاز کرتا ہے''۔

'باقیاتِ بجنوری' میں عبدالرحمٰن بجنوری فرماتے ہیں:

''دیوان حالی کا مقدمہ فن شاعری اور اردو شاعری پر زبان اردو میں سب سے اعلیٰ پایہ کی تنقید ہے''۔

'اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ' میں عبدالشکور لکھتے ہیں

''حالؔی نے ایک نئے اور نہایت اہم فن یعنی فنِ تنقید کی بنیادیں استوار کیں اور ان پر ایسی عمارت تعمیر کی جو آج بھی مسرت، اطمینان اور فخر و ناز سے دیکھی جاتی ہے''۔

اس کتاب کا مقدمہ حالی کے نزدیک معاشرے کی اصلاح تھا۔ اس میں حالی نے شعر و شاعری کی بنیادی خصوصیات سے بحث کی ہے۔ حالی شاعری کو مسرت کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسکے لیے مقصدیت اور افادیت کے قائل تھے۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ دل گداز تو

شعر و شاعری حالی کے خیال میں سوسائٹی کے تابع ہوتی ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عموماً شاعری سوسائٹی سے متاثر ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ شاعری کا اثر سوسائٹی پر بھی پڑتا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ حالی کا یہ نظریہ اردو میں بالکل نیا ہے۔ اور اسکو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ مغرب کے اثرات اور وہاں کے تنقیدی نظریات نے حالی کو بدلنے پر مجبور کیا۔ اور اردو ادب کا بھی یہی تقاضا تھا۔

انگریزی ادب سے استفادہ کی سب سے اہم مثال، وہ خیالات ہیں جن کو انہوں نے ملٹن کے حوالے سے شعر کی تین خوبیاں بیان کرتے ہیں (۱) سادگی (۲) اصلیت اور (۳) جوش

یہاں وہ مغرب سے کھل کر استفادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''اب وہ خصوصیتیں بیان کرنی ہیں جو دنیا کے تمام مقبول شاعروں کے کلام میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ ملٹن نے ان کو چند مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو جوش سے بھرا ہوا اور اصلیت پر مبنی ہو''

حالؔی کے نزدیک سادگی کا معیار یہ ہے۔

سادگی:۔ زبان روزمرہ بول چال کے قریب ہو۔ ایک عام آدمی بلند خیال کو ہموار کرنے کے باوجود بھی سمجھ نہیں سکتا۔ دو باتوں خیال رکھنا ضروری ہے الفاظ اور شعر کیسا ہی بلند اور دقیق کیوں نہ ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو شعر فہمی کی صلاحیت ہر شخص میں نہیں ہوتی ہے

اصلیت:۔

۱) ایسی چیز جس کے بارے میں شاعر خیال پیش کر رہا ہے اگر حقیقتاً موجود نہ ہو تو کم سے کم عقیدے میں ضرور ہو۔

۲) لوگوں کو معلوم ہو نہ ہو شاعر کے خیال کے مطابق ہو۔

۳) جو چیز حقیقتاً موجود ہے اس میں شاعر اضافہ کرے کم از کم لوگ قیاس کر سکیں کہ اسکا وجود ممکن ہے۔

''اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں کہ ہر شعر کا مضمون نفس الامر پر مبنی ہونا چاہیے بلکہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی وہ نفس الامر بیں یا لوگوں کے عقیدے میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہے نیز اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ بھی مقصود نہیں کہ بیان میں اصلیت سے سرنو تجاوز نہ ہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ تر اصلیت ہونی چاہیئے''۔ **(حالؔی)**

حالی دبی زبان سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اصلیت کے بغیر حقِ شاعری ادا نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی تنقید پیش کی جا سکتی ہے۔ ہم اصلیت کے عنصر پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو شعری حقیقت کو برقرار رکھنا چاہیے اور اس میں جھوٹ غیر معمولی مبالغہ کا سہارا نہیں لینا چاہئے مبالغہ صرف وہیں تک جائز ہے جہاں تک وہ کلام کے اثر میں اضافہ نہ کر سکے۔ مبالغہ جب بڑھ جائے تو اصلیت ختم ہو جاتی ہے۔

جوش:۔ ''جوش سے مراد اثر انگیزی کی قوت جو شیلے الفاظ نہیں بلکہ الفاظ سے زیادہ تخیل کا کام کرے۔ الفاظ نرم تاثر بے پناہ ہو۔ جوش سے مراد ہے کہ مضمون ایسے بے ساختہ الفاظ اور موثر پیرائے میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادہ سے یہ مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر کے اپنے تئیں اس سے بندھوایا ہے''۔ **(حالؔی)**

حالی کی نیچرل شاعری بھی مغربی ادب کے مسلح خانہ سے نکلی ہوئی شمشیر ہے جسکی کاٹ سے ہر کس و ناکس زخمی ہے مگر لذت زخم سے ناآشنا۔ حالی کے دور میں اس لفظ کا استعمال اس کثرت سے ہوا کہ حد نہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں

''نیچرل مضمون مولانا حالی کا مقصود ایسے مضامین ہیں جو اولاً انسانی نیچر کے مطابق ہوں ثانیاً'' قانون قدرت کے مطابق ہوں۔ ثالثاً ''عقل انسانی کی حد ادراک میں ہوں۔ نیچرل بیان سے ان کی مراد وہ بیان

ہے جو عام فہم اور سادہ ہو جو بے ساختہ طور پر طبیعت یا نیچر سے ثابت ہوا ہو اور طبیعت کے قدرتی بہاؤ کے مطابق ہو اور ایسی زبان میں ہو جو اجتماع انسانی کے اس حصہ کے لئے (جس میں وہ زبان بولی جاتی ہو) نیچرل ہو''۔

حالؔی نے حکیمانہ انداز اور فلسفیانہ نظر سے شعر کی اصلی اور بنیادی صفات پر مفصل اور مدلل بحث کر کے یہ ثابت کیا کہ شاعری کا مقصد محض لفظوں سے کھیلنا اور خیالی طلسم بنانا نہیں بلکہ اس سے بہت بلند و برتر ہے۔ شعر کا کام سچے وارداتِ قلب کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ وہ سننے والے کے دل میں اتر جائیں اور وہ بے اختیار پکار اٹھے۔

ے دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور شعر کا کام قوم کو اصلاح کی طرف متوجہ کرنا اور اسکو پستی سے نکال کر ترقی کی راہ پر ڈالنا۔ اس میں اچھا ذوق اور اچھے کام کی قدر پیدا کرنا بھی ہے۔ شعر کی تعریف کے بعد وہ شاعر کی تعریف اسطرح کرتے ہیں اچھا شاعر ہونے کے لئے وہ تین شرطوں کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ (۱) تخیل (۲) کائنات کا مطالعہ (۳) تفحص الفاظ

تخیل کی قوت خداداد ہوتی ہے۔ اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتی لیکن یہ شاعر کے لئے بہت ضروری ہے۔ تخیل کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے۔ یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اسکو الفاظ کے ایسے دل کش پیرایے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے''۔

تخیل کے بغیر شاعری کا تصور ممکن نہیں۔ تخیل ہی احساسات کی ادائیگی کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرتا ہے صرف موزونیت موزوں طبیعت کافی نہیں بلکہ تخیل کی بلندی نزاکت کی باریکی نہایت ضروری ہے منجملہ حالی کے تخیل کا مفہوم اس شعر سے پورا ہوتا ہے۔

ے ذہن میں پہلے کسی سوچ کی آہٹ تو ملے خود بنا لیتے ہیں اظہار کے سانچے الفاظ

شعر میں اثر جادو اور نثری کیفیت اس وقت آتی ہے جب جذبہ کو مناسب لفظوں میں ڈھالا جائے۔

تخیل کے علاوہ کائنات کا مطالعہ بھی ان کے نزدیک ضروری ہے لیکن کائنات کے مطالعہ سے ان کا مقصد صرف فطرت یا نیچر کا مطالعہ ہی نہیں بلکہ فطرت انسانی اور نفسیات انسانی سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ شاعری میں اس پہلو کی اہمیت تو ظاہر ہی ہے۔ مطالعہ گہرا ہو اور وسیع ہو جس کے دائرے میں خیال کو وسعت ملے۔

عبادت بریلوی لکھتے ہیں

''حالی کا یہ خیال صحیح ہے کہ اگر اسکا خیال نہ رکھا جائے تو قوت متخیلہ بھی کام نہیں کر سکتی''۔

تیسری خصوصیت الفاظ کا صحیح استعمال ہے کیوں کہ بغیر اسکا خیال رکھے شاعر اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح پیش نہیں کر سکتا۔ شاعری ہو کہ نثر الفاظ سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ایک اچھا شاعر خوبصورت نقش نگار الفاظ کے پیالہ میں معنویت کی مئے پیش کرتا ہے تبھی وہ متاثر کن ہوتی ہے۔

حالی لکھتے ہیں: ''شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اس قدر معانی پر نہیں معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کئے جائیں گے ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے''۔

حالی کی یہ تینوں شرطیں جو انہوں نے شاعر کے لئے ضروری قرار دی ہیں بہت اہم ہیں۔ اگرچہ تنقید بہت زیادہ آگے بڑھ چکی ہے۔ لیکن آج بھی انہیں خیالات پر زور دیا جا رہا ہے۔

حالی کے تنقیدی نظریات بہت اہم ہیں ان میں مشرق و مغرب کے تنقیدی نظریات کا امتزاج موجود ہے۔ ان دونوں کا مقابلہ بھی کیا ہے لیکن ترجیح انہوں نے مغربی نظریات کو دی ہے۔ کیونکہ ان کے اندر انہیں جامعیت نظر آتی ہے۔ ان کے تنقیدی خیالات و نظریات گہری سوچ کا نتیجہ ہیں ان میں خلوص ہے سچائی ہے بے تکلفی ہے تصنع اور بناوٹ سے وہ بالکل پاک ہیں۔ شعر کے لئے جن عناصر کو ضروری قرار دیا ہے شعر کی ماہیت اور اسکی ضرورت پر جو روشنی ڈالی ہے ان سب سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ شعر کی صحیح اسپرٹ سے واقف تھے۔ ان کو اسکی اہمیت اور ضرورت کا بخوبی اندازہ تھا اور اسی وجہ سے انہوں نے یہ اصول قائم کئے۔ تا کہ ان کو صحیح طریقے سے سمجھا اور پرکھا جا سکے۔ اور ادب میں اچھے شاعر پیدا ہو سکیں۔

اس مقدمہ میں انہوں نے غزل، مثنوی، قصیدے، مرثیہ، رباعی وغیرہ پر الگ الگ اور مفصل بحث کی ہے اور ان سب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے ان کی ضرورت ان کا صحیح مقام سمجھا یا ہے اور بتایا ہے کہ ان سے کیسے اور کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ وہ غزل پر کڑی تنقید کرتے ہیں حالؔی غزل کے رسمی موضوعات مبالغہ آمیزی، غیر اخلاقی تصورات سے بیزار تھے اس میں جدت پیدا کرنا چاہتے تھے نئے نئے مضامین پر طبع آزمائی پر زور دیتے تھے۔ دراصل وہ اس رنگ کے خلاف ہیں جو متاخرین نے غزل کا کر دیا تھا۔ وہ زمانے کے لحاظ سے خوب سے خوب تر کی تلاش میں تھے

ے ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

وہ غزل کو اعلیٰ جذبات اور بلند اخلاق کا پابند بنانا چاہتے تھے۔ دراصل حالی نے غزل کے ذریعے درس و تدریس اور واعظ و نصیحت کی باتیں کرنا چاہتے تھے غزل کو خیالی میدان سے نکال کر زندگی سے قریب کر دیا گیا۔ اس طرح اسکا دامن وسیع ہو گیا۔

آل احمد سرور کا خیال ہے کہ

''ان کا اعتراض لکھنو اسکول پر ہے جس نے شاعری کو غزل میں اور غزل کو رعایت لفظی اور نازک خیالی میں محدود کر دیا۔ انہوں نے قدما کی اس وجہ سے تعریف کی ہے کہ وہ الفاظ کے طلسم سے نہیں بلکہ دل کی بات سنا کر انسان کو مسحور کرتے ہیں۔ قصیدے سے چونکہ مبالغہ، جھوٹ اور خوشامد کی عادتوں کی ترقی ہوتی ہے اور ان سے قوموں میں ضعف پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے حالی اسکی مذمت کرتے ہیں اور یہ مرثیہ اور مثنوی نے چونکہ اردو شاعری میں رزمیہ اور بزمیہ دونوں رنگ پیدا کیے اس لیے انہیں سراہتے ہیں''۔

حالی اس کٹھن منزل سے گذر رہے تھے کہ اس زمانے میں لوگ طرز کہن کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور آئین نو کو اپنانا نہیں چاہتے تھے بقول اقبال

ے

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا　　منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

قصیدہ میں مبالغہ اور غلو آمیز مدح سرائی سے پرہیز کیا اور مدح میں خوشامد کا شائبہ پیدا نہیں ہونے دیا ۔مولانا اس کو بے کار صنف سمجھتے نہیں تھے بلکہ اس سے بھی بہت سارے کام لیے جاسکتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ کوئی شخص جس میں اچھے اوصاف ہوں اسکی تعریف میں بھی قصیدہ لکھا جاسکتا ہے۔ اسطرح تعریف کرنے سے اچھے اوصاف کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور لوگوں کو نیکی اور بھلائی کرنے کی ترغیب بھی ہوتی ہے۔

مرثیہ کے تعلق سے کہتے ہیں کہ اس نئی طرز کی صنف نظم سے اردو شاعری میں بہت وسعت پیدا ہوگئی ہے لیکن نئے مرثیے میں وہ بہت سے ان پہلوؤں کو چھڑا دینا چاہتے ہیں جنہیں میر انیسؔ اور دوسرے مرثیہ گو نے کمال فن قرار دیا تھا۔ حالی سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ مرثیہ کو صرف واقعہ کربلا تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس میں وسعت ہونی چاہیے محض بہ نیت حصول ثواب ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ بلکہ شاعر جو کہ قوم کی زبان ہوتا ہے اسکا یہ فرض ہونا چاہیے کہ جب کسی کی موت سے اسکے یا اس کی قوم خاندان کے دل کو فی الواقع صدمہ پہنچے اس کیفیت یا حالت کو جہاں تک ممکن ہو۔ درد اور سوز کے ساتھ شعر کے لباس میں جلوہ گر کرے انہوں نے شخصی مرثیہ پر زور دیا انہوں نے خود غالب کا مرثیہ' سرسید' ملکہ وکٹوریہ' لکھا۔

مثنویوں میں تسلسل خیال کو فطری طور پر برقرار رکھنے کی جو خوبی ہے حالی اسکی وجہ سے مثنوی کو سب سے زیادہ کارآمد صنف شاعری قرار دیتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اسے وسعت دی جائے اور مفید مضامین کے لیے استعمال کی جائے۔ چنانچہ حالی نے خود حُبِ وطن۔ برکھارت۔ مثنوی اولاد اور مناجات بیوہ لکھی بقول اقبالؔ

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹادو

جب انہوں نے جدید شاعر کے کوچے میں قدم رکھا۔ قوم کی بہبودی اور فلاح دوستی اخلاق اور اقتضائے زمانے کی موافقت کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا تو مختلف حلقوں سے ان کی مخالفت ہوئی۔ جو سرسید کے مخالف تھے انہوں نے ان کی شاعری کو سرسید کے مشن کا پروپگنڈہ قرار دے کر رد کر دیا جو قدیم شاعری کے چٹخارے کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اسے خشکی اور بے کیفی کی بنا پر رد کر دیا۔ اور جو شاعری کو محض لفاظی قرار دیتے تھے۔ انہوں نے الفاظ کی نئی معنویت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لامحالہ حالی کو اس سے تکلیف تھی کہ ان کی ساری کوشش رد کی جارہی ہے۔ لیکن وہ یہ سوچ کر کسی حد تک مطمئن تھے کہ آج نہیں تو کل ان کی محنت کی داد ضرور ملے گی۔ حالی کا یہ اندازہ غلط تھا اور گو کہ مختلف وجوہ سے ان کے نقطۂ نظر کی مخالفت آج بھی کی جارہی ہے۔ لیکن جس سمت وہ شعرو ادب کو لے جانا چاہتے تھے اسکی مخالفت اب تقریباً ناممکن ہوگئی ہے حالی کا یہ مقدمہ اردو شاعری کی تنقید میں ایک عہد آفریں کارنامہ ہے آج کے دور کے شعراء کیلئے بھی یہ لازمی ہے کہ وہ اس مقدمہ کو سامنے رکھ کر اپنی اصلاح کریں کیونکہ شعرو شاعری کے ذریعہ قوم کی اصلاح کا بہترین کام لیا جاسکتا ہے آج کے شاعر کو اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے بقول مسعود حسن رضوی ''انسان اخلاق کی تکمیل کے لئے شعرو شاعری کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اس حقیقت کا اقرار بھی ضروری ہے کہ جو شاعری بعض مخصوص جذبات کو ابھارے اور باقی کو دبائے۔ اسکا اثر

اخلاق پر کچھ اچھا نہ ہوگا۔ ہمارے شاعروں کے دیوان زیادہ تر رنج وغم' حسرت و یاس کے دفتر ہیں، اور اگر کسی شاعر کا دکھ بھرا دل درد والم کے دریا بہائے تو بھی کچھ نقصان نہیں۔ ہاں اگر ہر شاعر آہ وزاری اضطراب و بیقراری ہی کو موضوعِ شاعری سمجھ لے تو ضرور قوم کا دل افسردہ اور طبیعت مردہ ہو کر اسکی قوت عمل میں کمزوری آجائے گی۔

مگر اب ضرورت ہے ایسے شاعروں کی جو خود ہنس کر دوسروں کو ہنسائیں جو ہمدردی اور رواداری کے جذبات کو ابھاریں اور ملک میں حب وطن اور قوم پرستی کی روح پھونکیں اور ایسی شاعری کریں جو سوتے احساس کو جگاتی ہے۔ مردہ جذبات کو جلاتی ہے۔ دلوں کو گرماتی ہے حوصلوں کو بڑھاتی ہے۔ مصیبت میں تسکین دیتی ہے۔ مشکل میں استقلال سکھاتی ہے۔ بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے۔ اور گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے۔

غرض یہ کہ حالی کی شاعری اور ان کی تنقید نے اردو ادب میں ایک نئی لہر دوڑا دی۔ انکا یہ احسان اردو زبان کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

کلیم الدین احمد لکھتے ہیں　''یہ بات ایک حد تک صحیح ہے کہ مقدمہ میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ حالی پوری عربی' فارسی اور اردو شاعری پر حاوی نظر آتے ہیں لیکن انگریزی ادب سے حالی کی واقفیت محدود تھی''۔

حالی نے شاعری کی اصلاح کے لئے جو راہ نکالی وہی آج تک 'سند' کا کام کرتی ہے جو لوگ اسکی حقیقت کو نہیں سمجھے وہ یا تو اپنے متن کی خوش فہمیوں کی دلدل میں پھنسے یا پھر نقاد کے ہاتھوں مجرم قرار دئے گئے شاعری کوئی الفاظ کی بازیگری نہیں جس کا جی جسطرح چاہیے کھیل سکے۔ آل احمد سرور نے سچ کہا ہے:

''حالی سے پہلے ہماری شاعری دل والوں کی دنیا تھی۔ حالی نے مقدمہ شعرو شاعری کے ذریعے اسے ایک ذہن دیا۔ بیسویں صدی کی تنقید حالی کی اسی ذہنی قیادت کے سہارے پر ابھی چل رہی ہے''

حالیؔ کی نظر ہمیشہ اصلاحی رہی وہ اردو کے چمن کو پھلا پھولا رکھنا چاہتے تھے۔

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا　　جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

حیدر قریشی

احمد حسین مجاہد کی کتاب

صفحۂ خاک

احمد حسین مجاہد ہزارہ میں اردو کے اہم شاعر ہیں۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو ہزارہ، کشمیر اور دوسرے ملحقہ علاقہ جات میں جو قیامت خیز زلزلہ آیا تھا، وہ اس کے چشم دید گواہ تھے۔ ان کا اپنا شہر بالاکوٹ اس زلزلہ میں صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ اپنی اس گواہی کو انہوں نے ''صفحۂ خاک'' کے نام سے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا ہے۔ ابتدا میں ہزارہ کی قدیم تاریخ کے کچھ اشارے دیئے گئے ہیں۔ پھر سکھوں کے دورِ حکومت اور سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کے سکھوں کے خلاف معرکوں کا ذکر ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے زمانے کے بالاکوٹ کی بھی کچھ تصویر کشی کی گئی ہے۔ بالاکوٹ کی وجۂ تسمیہ سے لے کر وہاں کی معروف مساجد، ہسپتالوں اور ہائی اسکول کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ عمارات اس زلزلہ میں بے نشان ہو گئیں۔ اس زلزلہ کی نذر ہو جانے والے اپنے عزیزوں، دوستوں اور جاننے والوں کا ذکر کرتے ہوئے احمد حسین مجاہد کے جذبات نے نثر میں ایک خاص قسم کی سوگوار شعریت بھر دی ہے۔ یہی صورتحال بالاکوٹ کے گلی کوچوں اور دیکھی بھالی عمارتوں کے ذکر میں دکھائی دیتی ہے۔ یہاں جذباتیت تو ہے لیکن پوری حقیقت اور واقعیت کے ساتھ۔

بالاکوٹ کی تباہی کے باب میں انہوں نے اپنے مشاہدات کے ساتھ دوسرے ذرائع ابلاغ کی رپورٹس سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان سب کے پورے حوالے درج کیے ہیں۔ زلزلہ کی توجیہات کے تحت انہوں نے مذہبی علماء کے موقف کا تھوڑا سا ذکر کیا ہے، جبکہ ارضیاتی سائنس کے علماء کے موقف کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مذہبی علماء کے طرزِ استدلال کے تحت خود انہیں ملزم کرنا مقصود ہوتا تو پاکستان کے تب کے ایک دن پہلے کے سانحہ اور بین قرآنی آیات کی روشنی میں بڑی آسانی سے ایسا کیا جا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں عوام کو تنبیہ کرنے والے خود مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے دکھائی دیتے۔ احمد حسین مجاہد کا ذہن اس طرف نہیں گیا یا انہوں نے دانستہ اس سے گریز کیا وہی بہتر جانتے ہیں۔ ویسے ذاتی طور میں بھی زلزلہ کے ارضیاتی حوالوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں، تاہم کبھی کبھی مذہبی حوالے بھی معتبر لگتے ہیں، خصوصاً جب مذہبی لوگ ان کی زد میں آ رہے ہوں۔

وہ جو دوسروں کو مذہبی حوالے دے کر ڈرانے دھمکانے میں لگے رہتے ہیں جب خود ویسی صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں تو ان کی تاویلیں عجیب ہو جاتی ہیں۔

صفحہ نمبر ۱۲۲ پر زلزلوں کی مختصر تاریخ کا گوشوارہ دیا گیا ہے۔ ۲۴/جون ۱۸۵۲ء میں بلوچستان کے زلزلہ کے ذکر کے بعد ۲۰/اکتوبر ۱۹۲۹ء کے زلزلوں کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ ۱۸۵۲ء سے ۱۹۲۹ء کے درمیان بعض شدید قسم کے زلزلے برصغیر پاک و ہند میں آئے تھے۔ ان میں ایک زلزلہ تو ایسا بھی تھا جو گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال کا سب سے بڑا زلزلہ تھا۔ زلزلہ کی مختصر تاریخ میں اس قسم کی اکا دکا خامیاں ہلکا سا کھٹکتی ہیں۔

زلزلہ کے بعد جن ملکی و غیر ملکی تنظیموں اور اداروں نے بلا امتیاز مذہب و ملت انسانیت کی گرانقدر خدمت کی، ان سب کا احمد حسین مجاہد نے کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ نام بنام ذکر کیا ہے۔ زلزلہ کے معاً بعد بعض انسانیت سوز جرائم کی تکلیف دہ خبریں بھی سامنے آئی تھیں، جن میں بعض بچیوں کو اغوا کرنے اور کوٹھوں تک پہنچانے کی ہولناک وارداتیں بھی شامل تھیں۔ بعض سیاسی افراد امدادی سامان کے ٹرک اپنے ڈیروں پر لے گئے تھے۔ احمد حسین مجاہد نے ایسے المناک منفی رویوں کو نظر انداز کیا ہے اور صرف قدرتی آفت کا احوال اور اس پر مثبت امدادی جدوجہد ہی کو بیان کیا ہے۔ احمد حسین مجاہد نے اس کتاب میں متعدد تصویریں بھی شامل کی ہیں اور اپنی نثر کے ساتھ متعدد برمحل اشعار اور نظمیں بھی شامل کی ہیں۔ تاہم ان کا ایک شعر بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ۹۹-۱۹۹۸ء میں ان کی ایک غزل شائع ہوئی تھی، جس میں یہ شعر شامل تھا۔

زباں سمجھتا ہوں میں ٹوٹتے ستاروں کی ۔۔۔ یہ شہر مجھ کو اجڑتا دکھائی دیتا ہے

انہوں نے اسے بجا طور پر اپنی شاعرانہ پیش گوئی لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جینوئن شاعروں کا شعری وجدان، الہام سے کچھ ملتا جلتا ہو جاتا ہے۔ اس بات کو ''شاعری جزوِ پیغمبری است'' کے تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ سو کسی بھی جینوئن شاعر بلکہ کسی بھی جینوئن تخلیق کار کی تخلیق (نظم و نثر دونوں) میں اس طرح کی وجدانی پیش گوئیاں موجود ہو سکتی ہیں۔ اس کا تعلق کسی قسم کی ولایت سے نہیں بس یہ تخلیق کار کے وجدان کی روشنی کا ایک جلوہ ہے۔

مجموعی طور پر احمد حسین مجاہد نے ''صفحۂ خاک'' کو زبان و بیان کے لحاظ سے ایک قابلِ قدر ادبی اور بالاکوٹ کے حوالے سے دستاویزی حیثیت دے دی ہے۔ بالاکوٹ جو صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے احمد حسین مجاہد کے صفحۂ خاک میں اپنی پوری تاریخ اور پوری زندگی کے ساتھ آباد ہے۔ ایک معروف امدادی تنظیم S.R.S.P. نے اس کتاب کی اشاعت کا سامان کیا ہے۔ دکھوں کی داستان کو اتنا دیدہ زیب شائع کیا گیا ہے کہ آنکھوں میں نمی کے ساتھ بالاکوٹ کے باسیوں کے اچھے مستقبل کی امید سے خوشی کی چمک بھی آ جاتی ہے۔ مجھے یہ کتاب ۷/اکتوبر ۲۰۰۸ء کو موصول ہوئی، اور میں نے آج ۸/اکتوبر ۲۰۰۸ء کو اس کا مطالعہ کرنے کے ساتھ اپنی یہ رائے تحریر کی ہے۔ آج مذکورہ زلزلہ کو آئے ہوئے تین سال پورے ہو چکے ہیں۔

آپ کے خطوط، ای میلز، تاثرات

جدید ادب کا شمارہ نمبر۱۲ موصول ہوا۔ ہاتھ میں لے کر ہی چند منٹ اس کو دیکھنے میں گزر گئے۔ پھر اس کی ضخامت کا احساس ہوا۔ ماشاءاللہ آپ کی محنت اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے یہ جریدہ اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ آپ کا اداریہ ہر شمارہ میں قاری کو چونکاتا اور دعوتِ فکر دیتا ہے۔ **الھم زد فزد**

نصرت ظہیر کا مضمون حالاتِ حاضرہ بلکہ ہماری مشترکہ تہذیب اور زبان کے قیام کے لیے بروقت ہے۔ اس میں بعض تلخ حقائق کو نصرت ظہیر نے اپنے انداز میں بیان کیا ہے اور بعض خوش آئند جملوں سے قاری کے دل کو چند لمحوں کے لیے فرحت بھی پہنچائی ہے۔ زیرِ نظر شمارہ کے تمام مضامین حسبِ سابق اعلیٰ اور معیاری ہیں۔ گوشۂ مظفر حنفی اور گوشۂ احمد حسین مجاہد خاصہ کی چیز ہیں۔ غرض کہ رسالہ کا ہے کو ہے علم و ادب کا خزانہ ہے جس میں ہر طبقۂ فکر کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ **ڈاکٹر رضیہ حامد**۔ بھوپال

آپ کی طرف سے ارسال کردہ رسالہ جدید ادب شمارہ ۱۲ موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ **فخر زمان**۔ اسلام آباد

آپ کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا ''جدید ادب'' جرمنی، شمارہ نمبر۱۲ ملا۔ کرم فرمائی کا شکرگزار ہوں۔ انشاءاللہ میں بھی پڑھوں گا اور دیگر احباب اور رفقا بھی فیض یاب ہوں گے۔ **افتخار عارف**۔ اسلام آباد

آج جدید ادب کا اشو نمبر۱۲ ملا۔ ابھی مکمل طور پر پڑھ تو نہیں سکا مگر سارا دیکھ لیا ہے۔ بھائی! کمال ہے، ہر ورق چمن، ہر سطر جگنو! لکھائی، چھپائی، سرورق، اور کاغذ سب اچھا، نفیس اور منہ سے بولتا ہوا۔ اگر اجازت ہو تو آپ کے الفاظ چرالوں؟ میں کہوں گا آپ نے واقعی سنہری کرنوں میں دودھیا موتی پروئے ہیں۔ ماشاءاللہ!

مقصود الٰہی شیخ۔ بریڈفورڈ، انگلینڈ

جرمنی سے ایک جامع، مستند ادبی رسالہ ''جدید ادب'' کے نام سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ جو بھارت، پاکستان، امریکہ، کینیڈا، مشرقِ وسطیٰ، اور یورپی ممالک میں جہاں اردو پڑھنے لکھنے والے موجود ہیں، پڑھا جاتا ہے۔ اس وقت تین سو کے لگ بھگ قیمتی صفحات پر محیط رسالے کا بارہواں شمارہ میرے سامنے رکھا ہے۔ اس میں لکھنے والے

علماء و شعرائے ادب کے نام ہی پڑھیں تو سانس پھولنے لگتی ہے۔۔۔۔اس کے مدیر ہیں ہمارے برخوردار حیدر قریشی۔ میں انہیں مغربی دنیا میں اردو کا سب سے بڑا ادیب مانتا ہوں اور ان کی صلاحیتوں کے سامنے اپنی ہیچ مدانی کا اعتراف کرتا ہوں۔ حیدر، ون مین ادبی رائٹنگ کی انڈسٹری ہیں۔ پورا رسالہ کمپیوٹر پر ہی بیٹھ کر مرتب کرتے ہیں۔۔ میرے برخوردار ہیں۔ مجھ سے عمر میں دس برس کم، لیکن کام و صلاحیت میں سو سال بڑے۔ حیدر قریشی سے میرا سب سے بڑا رشتہ و تعلق یہ ہے کہ وہ میرے سب سے عزیز استاد اور دوست پروفیسر ناصر احمد کے بھانجے اور داماد ہیں۔ اسی رشتے نے مجھے ان کے پاس جرمنی پہنچایا۔ پھر ان کی علمی و ادبی فتوحات کے درجہ و دائرہ کو دیکھا تو ماننا پڑا کہ ہم تو ساری عمر گھاس ہی کاٹتے رہے ہیں۔ **ڈاکٹر ظہور احمد اعوان** (پشاور)

(**ڈاکٹر ظہور احمد اعوان** کے کالم ''دل پشوری'' میں **جدید ادب** پر لکھے گئے تبصرہ کا اقتباس۔

مطبوعہ روزنامہ آج پشاور۔ یکم جنوری ۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر صاحب! آپ کی محبت اور عنایت کے لیے شکرگزار ہوں۔ لیکن آپ نے اتنی زیادہ تعریف کر دی ہے کہ میرے لیے آپ کے پانچ کالمی تبصرہ کا ایک کالمی حصہ شامل کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ دعا کریں کہ آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس کا اہل بھی ثابت ہو سکوں۔ **ح۔ق**)

گوشہ یقیناً بہت اچھا ہے اور آپ نے درست کہا کہ تبصروں کا انتخاب آپ نے اُسی مواد سے کیا ہے جو پرویزؔ اور عنبرؔ شمیم نے فراہم کیا تھا۔ نئے مضامین کی کمی نہیں تھی، ان لوگوں کو وہ تبصرے اور مقالات آپ کو بھیجنے چاہیے تھے جو گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں شائع شدہ میری درجنوں کتابوں سے متعلق تھے۔ بہر حال یہ خط شائع فرما دیجیے تاکہ گوشے کے قارئین کو اس حقیقت سے آگاہی ہو جائے کہ گوشے کے وہ سب تبصرے میری بالکل ابتدائی کتابوں پر ہیں جو آج سے کم از کم چالیس برس پہلے منظرِ عام پر آئی تھیں۔ آپ نے جس بےلوث جذبے کے ساتھ ہیچمدان پر یہ گوشہ چھاپا ہے اس کے لیے تہہِ دل سے شکریہ، ورنہ آج کل تو مدیرانِ رسائل نے گوشوں کی اشاعت کو آمدنی کا آسان ذریعہ بنا لیا ہے۔ ہم جیسے بے نیازوں کی طرف لوگوں کی نگاہ کم کم ہی جاتی ہے۔ **مظفر حنفی** (دہلی)

بیرون ملک سے واپسی پر جدید ادب شمارہ 12 کو تحفہ دوست کی صورت میں منتظر پایا۔ حالیہ کچھ شماروں سے جدید ادب عمدہ طباعت، نفیس کاغذ اور بے مثل مشمولات کی وجہ سے صف اول کا ادبی جریدہ بن گیا ہے۔ اردو دنیا سے اتنی دور اردو ادب کا یہ روشن چراغ کسی معجزے سے کم نہیں۔ گفتگو میں آپ نے اردو کی ادبی دنیا اور ادبی رسائل کے مسائل کی جانب اہل علم کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس حوالے سے میرا ذاتی تجربہ ہے کہ شرح خواندگی کے حساب سے ادب کے قارئین کی تعداد میں اضافہ نہ ہونے کی ایک وجہ بڑی تعداد میں ادبی جرائد کے شائع ہونے کے باوجود قاری تک اسکی عدم رسائی ہے۔ مجھ جیسے بہت سے قاری ادبی جرائد کی متلاشی رہتے ہیں لیکن وہ دستیاب نہیں ہوتے۔ مدیران جرائد انہیں قاری تک پہنچانے کیلئے بھرپور کوشش نہیں کرتے جو پرچے معروف بک شاپ

پر دستیاب ہیں انکی فروخت قابل ذکر ہے۔جن میں ''نقاط''،''سمبل''،''مونتاج''،''آج''،''دنیازاد'' اور بھارت کا''نیاورق'' شامل ہیں۔حال ہی میں کراچی سے نئے ادبی جریدے''سخن زار'' کا اجراء ہوالیکن یہ پرچہ کراچی میں کہیں دستیاب نہیں،کراچی میں رہنے کے باوجود میں نے سخت کوشش کے بعد ایک دوست کے ذریعے اسے حاصل کیا۔آپ نے بجا لکھا ہے کہ مصنفین اپنی اور چند دوستوں کی تخلیقات کے سوا کچھ اور نہیں پڑھتے۔میں اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ ہمارے ادیب وشعراء موجودہ رفتارادب سے آگاہ ہی نہیں ہیں اور انہیں نئی مطبوعات کے بارے میں کچھ علم نہیں ۔ چندماہ قبل افسانہ نگار،سفرنامہ نگار،ناول نگار اور کالم نگار رئیس فاطمہ نے ''ایکسپریس''میں اپنے کالم ایک سوبارہ صفحات پر مبنی چیتھڑہ نما''افسانہ'' کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے میں ملادیے۔کالم نگار نے ادبی جرائد کے ختم ہونے کا مرثیہ لکھتے ہوئے اس رسالے کو جس میں کوئی بھی نئی تحریر شامل نہیں تھی ،نقوش، ہمایوں،ادبی دنیا اور مخزن جیسے تاریخ ساز پرچوں سے ملاڈالا۔اس مدح سرائی کی وجہ محض یہ تھی پرچہ انہیں مفت مل گیا تھا انہیں یہ تک علم نہیں کہ یہ''افسانہ'' کا ساتواں شمارہ ہے نہ ہی وہ اردو کے دیگر جرائد کے بارے میں کچھ جانتی ہیں۔اس کالم کے حوالے سے میں نے محترمہ کو ایک طویل خط میں دنیا بھر سے شائع ہونے والے اردو کے معیاری ادبی جرائد کی تفصیل بتائی جسے وہ گول کرگئیں میں نے یہ خط ایڈیٹر کی ڈاک میں بھیجا اور چونکہ خود بھی ایکسپریس میں دس سال کام کر چکا ہوں ایڈیٹر صاحب سے اسے شائع کرنے کی بات کی جسکا چند روز میں انہوں نے مجھے جواب دیا کہ وہ اپنی کالم نگار کو ناراض نہیں کر سکتے۔

جدیدادب بارہ کے آغاز میں اس بار صبا اکبرآبادی کی کمی محسوس ہوئی لیکن فراغ راہوی،فرحت حسین خوشدل اور صادق باجوہ کی حمدونعت دل نواز ہیں۔خواجہ محمد عارف کی مناجات نے بھی دل چھولیا۔مدیرادب ساز نصرت ظہیر کا مقابلہ اردو کا تہذیبی پل اور ماس میڈیا گہری دل سوزی لئے ہوئے ہیں اور انہوں آخر میں بجا کہا ہے کہ اردو زبان کا تہذیبی پل تمام باہمی جھگڑوں کو ختم نہیں کریگا لیکن دونوں ممالک کے درمیان سیاسی مفاد پرستی ضرور کم ہوگی۔ڈاکٹر شہناز نبی گذشتہ کئی شماروں سے جدیدادب پر چھائی ہوئی ہیں۔انکے دونوں مضامین عمدہ ہیں۔ مبشراحمد میر کے مضمون نے میرے اس خیال کی تصدیق کی کہ فارسی زبان سے دوری اردوادب کا معیار بری طرح متاثر ہوا ہے۔محمد اسلم رسولپوری کا مضمون پڑھ کر صادق باجوہ کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔محمد خالد انجم عثمانی نے انیسویں صدی کے نثری اسالیب میں دریا کو کوزے میں بند کر دکھایا ہے۔

موجودہ شمارے کا اختصاص ڈاکٹر مظفرحنفی اور احمد حسین مجاہد کے گوشے ہیں۔ پاکستان میں بھارتی کتب دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اکثر تبصرے پڑھتے ہوئے محرومی کا احساس ہوتا ہے اور اسی طرح کئی اچھے ادیب وشعراء سے اچھی طرح تعارف نہیں ہوسکا۔ڈاکٹر مظفرحنفی کو میں نے اس سے قبل سرسری پڑھا تھا۔جدیدادب کے گوشے نے ان سے بخوبی متعارف کرایا ہے۔نظم ونثر دونوں میں کیا خوب انداز ہے۔انورسدید،شمس الرحمٰن فاروقی اور دیگر افراد نے انکی شخصیت کے بھی مختلف گوشے عیاں کئے ہیں۔مظفرحنفی کی غزل نے بہت زیادہ متاثر کیا اور اتنے عمدہ شاعر سے اب تک لاعلم رہنے کا کچھ افسوس ہوا۔خاص طور پر درج ذیل اشعار ناقابل فراموش ہیں

بستی جلانے والو تمہیں کیا بتاؤں میں　　مدت سے میرے گھر میں دھواں بھی نہیں اٹھا

ہم دم بخود تھے اور اُدھر لٹ رہے تھے گھر　　جب ہم کٹے تو شور وہاں بھی نہیں اٹھا

شاخ کانٹوں بھری سہی لیکن　　ہاتھ اس نے ادھر بڑھایا تو

نہ ایسے سست ہوں بادل کہ فصلیں زرد ہوجائیں　　نہ موجوں کو سنامی جیسی بے حد تیز گامی دے

وہ بھڑکتا ہے میرے سینے میں شعلے جیسا　　پھر اسی آگ کو گلزار کیا کرتا ہے

اشعار لکھنے لگوں تو خط بہت طویل ہوجائیگا۔احمد حسین مجاہد کی دلسوزی دل میں گھر کرتی ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے ادب کے مراکز سے دور بھی کیا کیا دیئے روشن ہیں۔حصہ غزل میں نصرت ظہیر،عبدالاحد ساز،فیصل عظیم ،اکبرحمیدی،شہناز نبی اور فروغ روہوی کی تخلیقات متاثر کن ہیں۔عبداللہ جاوید میرے پسندیدہ شاعر ہیں انکی نثری تحریر''اللہ میاں'' نے مسجد کا ایک بالکل نیا اور انوکھا تصور دیا جو بہت ہی اچھا لگا۔علی محسن کا افسانہ سب سے اچھا ہے یہ افسانہ شائد گذشتہ برس انکے شائع ہونیوالے مجموعے میں بھی شامل ہے۔ڈاکٹر بلند اقبال کے''تمغہ جرات'' نے ایک بالکل نیا پہلو دکھایا ہے۔

اس بار آپ کی کھٹی میٹھی یادوں کی دوقسطوں نے مزہ دیا۔ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا کے مصداق تصویر کائنات میں رنگ کا ذکر دلچسپ ہے۔کشورناہید کی حاضر جوابی اور جملہ بازی،امرتا پریتم اور ثریا شہاب کے بعض نئے گوشے اجاگر ہوئے۔ریحانہ قمر کی ادبی بددیانتی کے بارے میں کافی کچھ سنا تھا اسکی تصدیق ہوگئی۔ثمینہ راجہ بہت اچھی شاعرہ ہیں ان سے میری ذاتی ملاقات بھی ہوچکی ہے۔ثمینہ راجہ نے فیصل عجمی کے جریدے''آثار'' کی مدیر کی حیثیت سے بھی قابل ذکر ہیں آثار کے صرف دس شمارے شائع ہوئے لیکن اسکا شمار اردو کے بہترین ادبی جرائد میں کیا جائیگا۔

ماہیے جدیدادب کی جان ہیں اس بار بھی یہ حصہ بھرپور ہے۔رات جدیدادب شروع کیا تو صبح تک پورا پڑھ ڈالا اور فوری طور پر آپ کو خراج تحسین پیش کرنا ضروری سمجھا۔ بلاشبہ جدیدادب کا شمار اردو کے بہترین ادبی رسائل میں کیا جائیگا۔اللہ کرے آپ اسے جرمنی سے شائع کرنے میں کامیاب ہوں اور سنسرشپ کے مسائل سے چھٹکارا حاصل کرسکیں۔

نعیم الرحمٰن (کراچی)

جدید ادب جرمنی کا شمارہ: ۱۲ شائع ہو گیا

حیدرقریشی کی ادارت میں ادبی جریدہ جدیدادب جرمنی کا شمارہ نمبر۱۲ بابت جنوری تا جون ۲۰۰۹ء اپنے وقت سے ایک ماہ پہلے ہی ریلیز کر دیا گیا ہے۔۲۸۸ صفحات پر مشتمل اس شمارہ میں جدیدادب کے معمول کے سارے مندرجات شامل ہیں۔حمدونعت کے حصہ میں فراغ روہوی،فرحت حسین خوشدل،صادق باجوہ،کرامت علی کرامت ، ناصر ملک اور خواجہ محمد عارف کی نگارشات شامل ہیں۔مضامین کے حصہ میں نصرت ظہیر،ڈاکٹر شہناز نبی ،ڈاکٹر حامد اشرف ،مبشراحمد میر ،اسلم رسولپوری، محمد خالد انجم عثمانی کے مضامین اور عبداللہ جاوید کا ایک تفصیلی خط

بنام حیدر قریشی شامل ہیں۔ڈاکٹر مظفر حنفی کے فن کے حوالے سے ایک گوشہ سجایا گیا ہے۔اس میں محمد حسن،محمود ہاشمی،احتشام حسین،انور سدید،شمس الرحمٰن فاروقی،ندا فاضلی،ڈاکٹر رشید امجد،عنبر شمیم،فاروق ارگلی اور ظفر احمد نظامی کے مضامین شامل ہیں۔آفرین حسین اور مشتاق احمد حامی کے مظفر حنفی سے لیے گئے ایک انٹرویو اور ''ہمارے مشاعرے'' کے زیرِ عنوان مظفر حنفی کے مضمون سے ان کے خیالات کے بارے میں بہتر آگاہی ہوتی ہے۔اس گوشہ میں مظفر حنفی کی چوبیس غزلیں اور سات نظمیں شامل کی گئی ہیں۔اس طرح ان کے بارے میں ایک بھرپور تاثر سامنے آتا ہے۔پاکستان سے نوجوان شاعر احمد حسین مجاہد کے لیے بھی ایک گوشہ مختص کیا گیا ہے۔اس گوشہ میں ضیا المصطفیٰ ترک،محمد اظہار الحق،جان عالم اور شبہ طراز کے مضامین میں احمد حسین مجاہد کی تخلیقی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔احمد ندیم قاسمی،قتیل شفائی،ساقی فاروقی،افتخار عارف،خاور اعجاز،ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور متعدد دیگر لکھنے والوں کے مختصر تاثرات سے بھی اس گوشہ کو سجایا گیا ہے۔احمد حسین مجاہد کی بارہ غزلیں اور چھ نظمیں ان کی شعری شخصیت کو بہتر طور پر سامنے لاتی ہیں۔

غزلوں کے سیکشن میں عتیق احمد عتیق،قیصر شمیم،حامدی کاشمیری،نصرت ظہیر،عنبر شمیم،عبدالاحد ساز،صادق باجوہ،فیصل عظیم،ارشد کمال،ارشاد قمر،سلیمان جاذب،ناصر ملک،حیدر قریشی اور متعدد دیگر شعراء کی غزلیں شامل ہیں،جبکہ اکبر حمیدی،شہناز نبی،خاور اعجاز،ظفر اللہ محمود،طاہر عدیم اور معید رشیدی کی پانچ سے سات تک غزلیں شامل کی گئی ہیں۔افسانوں کے حصہ میں احمد ہمیش،عبداللہ جاوید،شہناز خانم عابدی،قیصر اقبال،بلند اقبال اور علی محسن کے افسانے شائع کیے گئے ہیں۔نظموں کے حصہ میں مجید امجد کے تبرک کے ساتھ نصرت ظہیر،عبداللہ جاوید،نیّر جہاں،خاور اعجاز،عبدالاحد ساز،حمیدہ معین رضوی،طاہر عدیم،فیصل عظیم،پروین شیر،ارشد خالد اور دیگر شعراء کی تخلیقات شامل ہیں۔جبکہ ستیہ پال آنند کی چار اور تنہا تماپوری کی سات نظمیں بھی شامل ہیں۔

خصوصی مطالعہ کے تحت ستیہ پال آنند کا مضمون ''مولانا رومی:ایران سے چل کر ہالی ووڈ تک کی زیارت'' اور حیدر قریشی کی یادوں کے دو نئے باب شامل ہیں۔ماہیوں کے حصہ میں نذیر فتح پوری،احمد حسین مجاہد،امین بابر،سعید رحمانی،اشرف علی اشرف اور وسیم عالم کے ماہیے شامل ہیں جبکہ امین خیال اور فراغ روہوی کے ڈھیر سارے ماہیے شائع کیے گئے ہیں۔کتاب گھر میں اقبال آفاقی،شمیم حنفی،جمیل الرحمٰن،شہناز نبی،بلراج کومل اور جاوید ندیم کی کتابوں کا تعارف دیا گیا ہے جبکہ انور زاہدی کے افسانوی مجموعہ مندر والی گلی پر منشا یاد کا مضمون،اردو لغت (مدیر اعلیٰ فرمان فتح پوری) پر ڈاکٹر عبدالرشید کا مضمون،ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوی مجموعہ فرشتے کے آنسو پر جاوید انور کا مضمون،طاہر عدیم کے شعری مجموعہ بامِ بقاء پر عبدالرب استاد کا مضمون،اور محمد عظیم الدین بخش کے مضامین کے مجموعہ فکرِ عظیم پر ڈاکٹر حامد اشرف کا مضمون شامل ہیں۔

خطوط اور ای میلز کے حصہ میں پروفیسر شمیم حنفی،فتح محمد ملک،افتخار عارف،ارشد خالد،سلیم آغا قزلباش،مقصود الٰہی شیخ،پروین شیر،عبدالاحد ساز،ارشد کمال،اسلم رسولپوری،علی احمد فاطمی،اکبر حمیدی،رفیق شاہین،ستیہ پال آنند،صبیحہ خورشید،شہناز خانم،تنہا تماپوری اور حامدی کاشمیری کے خطوط شامل ہیں۔شمارہ کے آخر

میں شامل نوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حمیدہ معین رضوی اور علی جاوید کے خطوط حذف کرائے گئے اور بعض دوسرے خطوط میں سے چند سطور حذف کرائی گئیں۔یہ کیا ماجرا ہوا ہے؟اس بارے میں حقائق تب سامنے آئیں گے جب حیدر قریشی کھل کر حقائق کو سامنے لائیں گے۔

ار**شد خالد** (اسلام آباد)

(یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے ۲/دسمبر ۲۰۰۸ء کو ریلیز کی گئی)

'جدید ادب' کا شمارہ ۱۲ انٹرنٹ پر دیکھنے کو ملا۔جستہ جستہ شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔مشمولات حسب سابق پسند آئے۔خصوصی مطالعہ کے تحت مولانا رومؔی کے سلسلے میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی تحریر خاصی دلچسپ ہے اور جیسا کہ آپ نے لکھا ہے اس مضمون سے مغرب کے عوامی مزاج اور ذوق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔آپ کی اپنی تحریر ....'ادبی کائنات میں ہے رنگ' میں کچھ کم معروف بلکہ غیر معروف خواتین کے تذکرے بھی در آئے ہیں تاہم تحریر اتنی دلچسپ ہے کہ قاری کو اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔آپ نے اچھا کیا کہ افتخار نسیم کو بھی اسی مضمون میں سمیٹ لیا اور ایسا کرنے کی توجیہ بھی پوری صراحت سے پیش کر دی۔ویسے موصوف کے قابل لحاظ شاعر ہونے میں دو رائے نہیں ہو سکتی۔

گوشۂ مظفر حنفی میں شاعر موصوف کی کچھ غزلیں اور نظمیں ایک ساتھ پڑھنے کو ملیں اور مزہ دے گئیں۔ان سے لیا گیا انٹرویو بھی خاصا دلچسپ ہے۔حنفی صاحب نے اپنی روایتی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے خدا لگتی باتیں کی ہیں۔امید ہے کہ مغربی بنگال،خصوصاً شہر کلکتہ کے اردو علقے میں یہ انٹرویو پوری دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے یہ پوچھنے پر کہ حنفی صاحب! کلکتہ میں تین سال بیت جانے کے بعد آپ کو بنگلہ زبان تو آ گئی ہوگی،حنفی صاحب کا یہ کہنا کہ 'جناب میں اپنی اردو بچانے میں لگا رہتا ہوں،بنگلہ کب اور کیسے سیکھتا؟' بہت ہی معنی خیز جملہ ہے جس کی گہرائی اور گیرائی کو اہل کلکتہ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے!(اس ناچیز کی طالب علمی کا دور بھی کلکتہ میں گزرا ہے)۔شعری حصے میں عتیق احمد عتیقؔ،قیصر شمیم،عبدالاحد سازؔ،عنبر شمیم،اکبر حمیدی اور شہناز نبی کی غزلوں کے متعدد اشعار پسند آئے۔صادق باجوہ کی غزل کے اس مصرعے

یاروغم تو کھا جاتے ہیں خوشیوں کے لمحاتوں کو

میں لفظ 'لمحاتوں' کا کیا جواز ہے؟ کیا آپ بھی اس قسم کی لسانی توڑ پھوڑ کو 'سب چلتا ہے' کے ذیل میں رکھتے ہیں؟ رسالے کے آخری صفحے پر آپ نے جس 'ناگفتنی' کا ذکر کیا ہے اس کا سارا ماجرا میری سمجھ میں تو آ گیا،تاہم اردو عوام کے سامنے بھی اس کی پوری روداد آنی چاہیے۔

ار**شد کمال** (نئی دہلی)

تازہ شمارہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے پُرکشش ہے۔جدید ادب میں گوشے شائع کرنے کا سلسلہ ایک مستحسن اقدام ہے۔اس سے ہمیں مختلف شعراء و ادباء کے فکر و فن کو سمجھنے کا موقع میسر آتا ہے۔دوسری طرف یہ سلسلہ نوجوان قلم کاروں کو ادبی دنیا میں متعارف کرانے اور ان میں خود کو مزید صیقل کرنے کے جذبے کو مہمیز لگاتا

ہے۔ دیارِ غیر امیں رہ کر ادبی مجلّہ نکالنا اور اہلِ قلم سے رابطہ استوار رکھنا ایک محنت طلب کام ہے اور ظاہر ہے یہ کام وہی شخص پوری ایمانداری سے انجام دے سکتا ہے جس کے نہاں خانۂ دل میں اردو ادب کی خدمت کا جذبہ پوری طرح موجزن ہو۔

تازہ شمارے کے اداریے میں جس مسئلے کی نشاندہی کی گئی ہے وہ ہم سب کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ اردو زبان کا وجود بول چال کی حد تک قائم رہنے کے امکانات تو موجود ہیں لیکن ادب کے حوالے سے اسے خاصے نامساعد حالات کا سامنا ہے۔ آبادی کے تناسب سے اردو ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد خاصی کم ہو چکی ہے نیز اردو ادب کا مطالعہ اب شعرا و ادبا تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ عام پڑھے لکھے لوگوں کی دلچسپیوں کے محور تبدیل ہو چکے ہیں۔ دورِ حاضر کے متنوع ذرائع ابلاغ کی زائیدہ ترغیبات نے آج کی نوجوان نسل کے ہاتھوں سے کتاب چھین کر موبائل اور ماؤس تھما دیا ہے۔ نتیجۃً اطلاعات کا بے بہا خزانہ تو اس کے ہاتھ آ گیا ہے مگر دوسری طرف وہ ادبی ذوق و شوق سے بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے۔ اردو کے ادیب مختلف ادبی دھڑوں میں بٹ چکے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ چھوٹے چھوٹے جزیروں میں مقید ہو کر رہ گئے ہوں۔ یہ رجحان اردو ادب کے لیے نیک فال ہرگز نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں از سرِ نو اس ساری صورتحال کا سنجیدگی سے جائزہ لینا ہوگا اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کوئی جامع حکمتِ عملی وضع کرنے کی کوشش بھی کرنا پڑے گی، بصورتِ دیگر ہم فقط جرسِ ناقۂ لیلیٰ کی آواز میں ہی محو ہو کر رہ جائیں گے۔

سلیم آغا قزلباش (سرگودھا)

جدید ادب کا شمارہ: ۱۲ میرے پیشِ نظر ہے۔ اس میں سب سے پہلے میں نے آپ کی تحریر کھٹی میٹھی یادیں پڑھا اور خوب لطف اندوز ہوا۔ مضامین میں مجھے محمد خالد انجم کا مضمون اچھا لگا۔ مظفر حنفی صاحب کا مضمون جو مشاعروں پر تھا، خوب ہے۔ ان کی شاعری بے شک ذرا مختلف قسم کی ہے۔ اکثر وہ اچھے شعر نکالتے ہیں مگر زیادہ تر نہیں۔ ان کی شاعری مجھے ترنگ کی شاعری لگتی ہے۔ جو شعر ان پر جس طرح وارد ہوتا ہے وہ شاید اسی طرح لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ تھوڑی سی توجہ سے وہ چاہیں تو کمزور اشعار کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اب یہی مصرعہ دیکھیں:

''کشتی میں اک حبابِ رواں تک نہیں اُٹھا'' انہوں نے یہ تک نہیں سوچا کہ حباب پانی میں اُٹھتے ہیں، کشتی میں کیسے اُٹھتے؟ اسی طرح ان کا ایک شعر دیکھیے:

فنا کے مسافر لگے چیخنے   جو کھڑکی ذرا بند کر دی گئی

یہ شعر ویسے بھی نہ حُسن کا حامل ہے نہ تاثر کا۔ مگر ذرا سی توجہ یہ چمک سکتا تھا۔ ذرا اس کا پہلا مصرع بدلتے ہیں۔

ہوا، احتجاجاً چلی دیر تک   جو کھڑکی ذرا بند کر دی گئی

دیکھیں اس تبدیلی سے شعر میں کتنا فرق پڑا ہے۔ اصلی صورت میں اس شعر میں کہا گیا ہے کہ کھڑکی بند کیے جانے سے فنا کے مسافروں نے چیخنا شروع کر دیا۔ کس قدر غیر منطقی بات ہے۔ کھڑکی بند کرنے سے تو فنا کے مسافروں کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ ہوا نہیں آئے گی اور وہ جلد فنا کی منزل حاصل کر لیں گے۔ اب ذرا بدلی ہوئی شکل میں شعر کو

دیکھیں، آپ کو فرق صاف محسوس ہوگا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ''استادی'' دکھا رہا ہوں، بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ حنفی صاحب توجہ نہیں دیتے۔ اور یہی سبب ہے کہ ان کی غزلیں بھرپور Impact نہیں دے پاتیں۔ افسانہ کے نام پر احمد ہمیش کی ایک تحریر ''روایت بے روایت'' دیکھی۔ آُ کا ہی دل گردہ تھا کہ اسے آپ نے ''افسانہ'' قرار دیا۔

احمد صغیر صدیقی۔ کراچی

جدید ادب'' شمارہ نمبر 12 بتاریخ ۲ دسمبر کو وصول ہو۔ جسے پا کر بے پناہ مسرت ہوئی آپ کی اس کرم فرمائی اور عنایات کا بصمیم قلب منمون ہوں۔ ۲۸۸ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ بے شمار تخلیقات نظم و نثر کا حامل ہے۔ جو آپ کی بے پناہ اردو دوستی کا بین ثبوت ہے۔ دیارِ غیر میں اپنی شب و روز کی ذمہ داریوں کے باجود اتنے معیاری اور خوبصورت رسالے کو کمپیوٹر کمپوزنگ اور فوٹو آفیسٹ کی دیدہ زیب طباعت سے آراستہ کرنا آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ رسالہ کی ترتیب و تہذیب اور آرٹ پیپر پر نفس طباعت کے سلسلہ میں کثیر مصارف کو برداشت کر کے اردو دنیا کے خاص عام تک رسالہ کی ترسیل بڑی محنت اور جگر کاوی کا عمل ہے۔ اور یہ کام آپ جیسے بے لوث فرزانوں ہی کا عشق ہے۔ اس سلسلہ میں جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ میری جانب سے پر خلوص خراج تحسین قبول فرمایں۔ رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ انشااللہ تفصیل سے اپنے تاثرات بذریعہ ای میل روانہ کروں گا۔

عبد الرحیم ارمان (جالنا)

جدید ادب کا ہر شمارہ اپنی مشمولات کی بنا پر من حیث المجموع اچھوتا اور انوکھا تو ہوتا ہی ہے، لیکن تازہ شمارہ اپنی نگارشات کی طرفگی اور افادیت کے سبب سابقہ شماروں سے آگے بڑھ کر اپنی انتہائی منزلیں بھی طے کر گیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کا اندازِ پیش کش بھی نرالا ہے۔ جسے ہر صاحبِ علم آپ کی ''صحافتی بلوغت'' پر دال ہی گردانے گا۔

عتیق احمد عتیق۔ مدیر توازن، مالے گاؤں

(**عتیق صاحب!** آپ کی حوصلہ افزائی کے لیے شکر گزار ہوں لیکن ''انتہائی منزلیں'' طے کر جانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر تو **جدید ادب** کے مزید اجرا کی ضرورت نہ رہے گی۔ سو دعا فرمایئے کہ جب تک زندگی ہے، ہمت موجود اور وسائل دستیاب ہیں، زیادہ سے زیادہ اچھا کام کرنے کی توفیق ملتی چلی جائے۔ **ح۔ق**)

جدید ادب 12 موصول ہوا۔ ورق گردانی کے بعد زیرِ مطالعہ ہے۔ آپ کی بات مان لینے میں حرج ہی کیا ہے کہ ادبی جراید کی فراوانی ہے اور قاری ناپید ہے۔ بہت سے جراید غالب کے سبزۂ بیگانہ کی طرح اُگ آئے ہیں۔ ان میں اکثریت ایسے جراید کی ہے جو نا کام ادیبوں اور شاعروں نے شوقِ ناموری میں نکالے ہیں۔ جب ایک قلم کار تخلیقی سطح پر ایسا کام نہیں کر پاتا جو اسے نام دے تو وہ پھر بیساکھیوں کا سہارا لیتا ہے۔ ورق گردانی کر کے جریدہ ایک طرف ڈال دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے جراید کا قد ہی نہیں ہے۔ ان میں موجود تخلیقی مواد کا

معیار قاری کی اس ذہنی سطح کو نہیں چھو پاتا جو طویل مطالعاتی سفر کا حاصل ہوتا ہے۔قاری مایوس ہو کر جریدہ رکھ دیتا ہے۔ایسے جراید میں ڈالر،پاؤنڈ،یورو،درہم اور دینار کے زور پر گوشے بھی شامل ہوتے ہیں جن کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہوتی۔یہ وہ قلم کار ہین جن کی اردو زبان و ادب میں کوئی Contribution نہیں ہے۔حیدر قریشی میرے محترم کیا آپ ان جراید سے آگاہ نہیں ہیں۔جدید ادب کو آپ نے اس قباحت سے ابھی تک محفوظ رکھا ہوا ہے جس کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔اس کا بیّن ثبوت حالیہ شمارے میں گوشۂ مظفر حنفی اور گوشۂ احمد حسین مجاہد ہیں۔یہ دونوں گوشے ڈالر،پاؤنڈ،یورو،درہم اور دینار کے زور پر شامل نہیں ہوئے بل کہ اپنی تخلیقی رفعت کی بنیاد پر شامل ہیں۔ایک بات آپ نے عجیب کہی۔۔۔**کیا ایسے بھی قلم کار ہیں جو اپنی تخلیقات بِنا کسی مکتوب کے بھیجتے ہیں۔کیا ہم اخلاقی طور پر اتنا گر چکے ہیں کہ مدیر سے ہم کلام ہوئے بغیر تخلیق کی فائل Email کر دیتے ہیں۔حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی**۔۔۔ایک بار عذرا اصغر صاحبہ نے ایک بات کہی تھی جو مجھے اچھی لگی کہ ''تجدیدِ نو'' کے لیے جو تخلیقات موصول ہوتی ہیں اگر ان کے ساتھ خط نہ ہو تو ہم ایسی تخلیقات ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتے ہیں''

محمد حامد سراج (چشمہ بیراج۔میانوالی)

مجھے آج جدید ادب (جنوری۔جون **۲۰۰۹**ء/شمارہ:۱۲) موصول ہوا۔زندگی اشاعتی مراحل سے آج تک جیسے تیسے گزرتی آئی ہے،مگر یقیناً آج تک کسی بھی اشاعت سے اتنی خوشی کشید نہیں ہوئی،جتنی جدید ادب نے بہم پہنچائی۔خوب صورت سرورق،عمدہ طباعت اور پُر اسلوب انتخاب؛ کہیں بھی سقم نہیں،کہیں بھی تشنگی نہیں......(ڈاکٹر) مظفر حنفی اور احمد حسین مجاہد کے ادب و ہنر کے دو گوشے؛ ظفر اللہ حمید،شہناز نبی،اکبر حمیدی اور حیدر قریشی کے خوب صورت شاہ پارے؛ نصرت رسول،(ڈاکٹر) حامد اشرف،اور (ڈاکٹر) انور سدید کے نادر مراسلے؛ جان عالم کی پُرسوچ باتیں؛ رواں نظمیں اور ماہیے جیسی اصناف نے سخن کی ارفع پیش کاری سے جی موہا۔ بلاشبہ سطر سطر پر غیر معمولی دھیان اور توجہگی کا توانا احساس ہوا۔پروف ریڈنگ اور معیار قابلِ ستائش اور قابلِ تقلید معلوم ہوا۔شاید جدید ادب کی روایات اتنی ہی مضبوط ہیں اور یقیناً معیار کی اِس منزل تک رسائی ایک دن یا ایک اشاعتی مرحلے کی بات نہیں ہے۔میرے لیے جدید ادب کی اتنی خوب صورت اشاعت شاید اِس لیے حیرانی کا سبب بنی کہ میں نے اِسے پہلی مرتبہ دیکھا،پڑھا اور محسوس کیا ہے۔میں غیر رسمی انداز میں تشنگانِ ادب و فیض کے لیے مرتب کیے گئے اِس فقید المثال جریدے کی اشاعت پر آپ اور آپ سے منسلک افراد کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ناصر ملک (ضلع لیہ)

شمارہ نمبر ۱۲ موصول ہوا،شکریہ۔رسالے کا معیار ہر اعتبار سے اعلیٰ ہے،نیز انٹرنیٹ پر دستیابی نے اسے دو آتشہ کر دیا ہے۔آپ کی خصوصی توجہ اور کاوشوں کا نتیجہ ہے،ورنہ اس دور میں اردو رسائل کو ایسی عالمی شہرت و مقبولیت کہاں نصیب ہوتی ہے۔خدا ''جدید ادب'' کو نظرِ بد سے بچائے رکھے۔ **منظور ندیم** (جلگاؤں)

جدید ادب کا شمارہ ۱۲ ہمدست ہوا،حسبِ معمول بے تابانہ انتظار تھا۔شوق اور لگن سے مطالعہ کیا۔دونوں گوشے خوب ہیں۔احمد حسین مجاہد کی شخصیت اور فن سے میں پہلی بار متعارف ہوا۔ڈاکٹر مظفر حنفی کا گوشہ بے حد شوق سے پڑھا،اس لیے کہ یہ میرے پسندیدہ شاعر و ادیب ہیں۔دیگر مشمولاتِ نظم و نثر بھی حسبِ معمول معیاری و قابلِ مطالعہ ہیں۔ایک ساتھ نظم و نثر کا خوبصورت اور ضخیم پڑھ کر طبیعت عش عش کر اُٹھتی ہے۔تمام اہلِ اردو آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں اور ہمہ وقتی ادبی خدمات کے معترف ہیں۔آپ کی جستجو اور لگن قابلِ رشک ہے۔

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول (اودگیر)

تازہ جدید ادب ملا۔پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔مضامین کا حصہ بہت پر معنی ہے مگر ڈاکٹر شہناز نبی نے اکبر آلہ آبادی پر پہلی بار نئے زاویے سے نظر ڈالی ہے۔۔ ہمارے ہاں اکبر آبادی کو بھی اور سر سید کو بھی ایک ہی ترازو میں ڈال دیا جاتا ہے۔اکبرالہٰ آبادی ایک رجعت پسند اور قدامت پرست شاعر تھے۔جو زمانے کی رو سے ایک متضاد سمت میں زور آزمائی کرتے رہے۔اور قوم کو آگے بڑھنے اور زمانے کے دوش بدوش چلنے سے روکتے رہے۔ڈاکٹر صاحبہ نے بہت اچھا جائزہ پیش کیا ہے۔دراصل ہر ہیرو کے ساتھ ایک ولن بھی لگا ہوتا ہے۔سر سید کے ساتھ یہ حضرت تھے۔سر سید کی وفات پر کہا۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا نہ بھولو فرق جو ہے کرنے والے کہنے والے میں

مگر اس اعتراف کا اب کیا فائدہ ہوا۔۔۔صادق باجوہ صاحب تو بہت اچھے شاعر تھے ہم انہیں رواروی ہی میں پڑھتے رہے۔اسلم رسول پوری نے انہیں بڑے سلیقے اور اچھے شعری انتخاب کے ساتھ پیش کیا ہے۔مبارکباد۔۔۔ ٹائٹل پر ماہیا پڑھ پڑھ کر اب میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو ''بابائے ماہیا'' کا خطاب عطا فرماؤں۔آخر میں آپ کی غزلیں ایک اچھا دلکش اور پر لطف تحفہ ہے۔غزلیں نظمیں سب اچھی ہیں اور جدید ادب اپنے گٹ اپ کے لحاظ سے سب پرچوں سے آگے ہے۔

اکبر حمیدی۔اسلام آباد

زیر نظر شمارے کے بے کم و کاست سبھی مشمولات شعری،نثری۔تخلیقات،تنقیدات،تحقیقات،تجزیات،تبصرات حتّیٰ کہ مراسلات تک قابلِ مطالعہ اور لائق صد تحسین و ستائش لگے۔تاہم نصرت ظہیر کا ''اردو کا تہذیبی پُل اور ماس میڈیا'' اپنی حقیقت پسندی کی بنا پر،ندیر جدید ادب کے نام عبداللہ جاوید کا مراسلہ سابقہ شمارے پر ڈالی گئی سیر حاصل روشنی کی بنا پر،حیدر قریشی کی ''۔ادبی کائنات میں رنگ'' اور ''چند پرانی اور نئی یادیں'' کے تحت کھٹی میٹھی باتیں اپنی کھٹائی آمیز مٹھاس کی بنا پر مجھے نسبتاً زیادہ پسند آئیں۔جدید ادب کا مظفر حنفی کا گوشہ اس اعتبار سے اپنے اندر انفرادیت کا جواز رکھتا ہے کہ اس میں مظفر صاحب کی بالخصوص ان کتابوں پر اکابرین ادب کے تجزیاتی مضامین یا تبصرے شامل کیے گئے ہیں جن کا تعلق موصوف کی تخلیقی زندگی کے نصف اول سے ہے اور آج کے بیشتر قارئین تو کجا قلمکار بھی جن کتابوں کے ناموں سے واقف نہیں ہیں۔۔۔آپ نے مظفر صاحب کے ادبی ماضی کو تو اس

گوشے کے وسیلے سے روشن کر دیا ہے لیکن حال پر پردہ پڑا رہ گیا ہے۔ مزید کچھ نہ کرتے بس یہی کرتے کہ کسی مختصر تعارفی مضمون یا گوشوارے کے ذریعے مظفر صاحب کی از اول تا حال تمام تر ادبی خدمات کا ایک مفصل اور جامع خاکہ قارئین کے روبرو پیش کر دیتے۔ **ڈاکٹر محبوب** راہی (اکولہ)

اداریہ میں آپ نے منفرد انداز میں اردو کی ادبی دنیا کی صورت حال کے مثبت اور منفی دونوں اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کی طرف بہت کم لوگوں کی شاید اب تک نظر گئی ہو۔ اس اداریہ کا جو NUT-SHELL ہے وہ میری دانست میں یہ ہے: ''اس میں یہ افسوسناک صورت بھی نمایاں ہوئی کہ خود ادب سے وابستہ افراد کو مجموعی ادبی صورتحال سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اپنی تخلیقات اور پھر اپنے چند دوستوں کی تخلیقات کے مطالعہ کے بعد عام طور پر رسالہ بند کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ ادبی مسائل پر مکالمہ بہت کم ہوتا ہے''۔۔ پہلی بار اس نکتے پر آپ کی نظر پڑی ہے۔ اس کا مشاہدہ مجھے بھی ہوا ہے۔ لیکن یہ بات ہر کس و ناکس کے لیے نہیں کہی جا سکتی۔ ''جدید ادب'' پہلی بار پڑھنے کو ملا ہے، ایک ہفتہ میں میں نے اس کے بیشتر حصہ کا مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی پارکھ نظر کا مدّاح ہو گیا۔ حیرت تو تب ہوئی جب آپ کے رسالہ میں قیمت کا کوئی کالم نظر نہیں آیا۔ صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے یہ شمارہ نہ صرف جاذبِ نظر ہے بلکہ ہر مضمون اور منظوم تخلیق اہمیت کی حامل ہے۔

اس سے قبل آپ کا ایک افسانہ ''مباحثہ'' میں پڑھا تھا۔ اس کے مطالعے سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کی علمی و تخلیقی استعداد کیا ہے۔ اب جدید ادب میں آپ کی نثری و شعری تخلیقات نظر سے گزری ہیں تو آپ کے قد و قامت کا مزید اندازہ ہوا۔ اللہ نے آپ کے اندر بہت ساری خوبیاں مجتمع کر دی ہیں۔ کھٹی میٹھی یادیں اپنی اہلیہ کو بھی پڑھوایا۔

مضامین کی فہرست میں تمام تر مضمون معیاری نوعیت کے ہیں۔ نصرت ظہیر کا مضمون اس رسالہ کے مضمون میں سر فہرست نظر آتا ہے۔ آپ کی تینوں غزلوں نے متاثر کیا۔ خاص طور پر ایک غزل کا یہ شعر:

لازم ہے سنا جائے کھلے ذہن سے سب کو — اپنے ہی خیالات میں اَٹ کر نہیں رہنا

فرحت حسین خوشدل۔ (ہزاری باغ)

تازہ ''اثبات'' (تھانے، ممبئی) میں جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ کی کہانی پڑھ کر یاد آیا کہ آپ کے نیازمندوں کے حلقے میں کبھی میں بھی ہوا کرتا تھا۔ دو تین دفعہ آپ کو ای میل بھی کیا لیکن اب آپ کے نام سے اور جدید ادب کے ویب سائٹ کی ہمہ گیری کی وجہ سے شاید میرا ای میل آپ تک پہنچ نہیں پایا۔ اب سوچا کہ خط ہی لکھوں۔ ویسے آپ کی گفتگو آج تک سماعتوں کا اثاثہ ہے۔ جدید ادب شمارہ ۱۲ کی کہانی پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ بڑے لوگوں کو تو بے نیاز دیکھا ہے۔ مگر اس قدر نوٹس لیتے کم ہی دیکھا۔ آپ نے اپنے رسالے سے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ اس سے پہلے آپ نے سمندر پار کے ادیبوں شاعروں کے سرقہ و توارد کا حال لکھا تھا۔ **رؤف خیر** (حیدر آباد دکن)

گزشتہ دنوں جدید ادب شمارہ 12 ملا حمد، نعت اور غزلیں شاملِ اشاعت کرنے پر شکریہ۔ 'انسانی اقدار کی شاعری' کے عنوان سے جناب محمد اسلم رسولپوری صاحب کا میرے مجموعہ کلام 'میزانِ شناسائی' پر گراں قدر مضمون و تبصرہ ان کی حوصلہ افزائی ہے۔ میں ان کا ممنون و شکر گزار ہوں۔ لیکن مضمون میں بعض اشعار سہوِ کتابت سے قارئین کی طبائع پر کچھ غلط اثرات مرتب کرنے کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔ چند اشعار میں کچھ غلطیاں ہیں جنہیں درست کرنا ضروری ہے۔ **صفحہ ۴۸ پر:** پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں **'اس کے'** کی بجائے **'اسی کے'**۔۔۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں 'بھی' غائب ہے مصرعہ یوں ہے: 'خود اپنے آپ سے بھی دور کر دیا اس نے'۔۔۔ چوتھے شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں 'نہیں' کی بجائے 'کہاں' ہونا چاہئے۔

گیارویں شعر کے پہلے مصرعے میں 'ہیں' زائد ہے۔ مصرعہ یوں ہے: 'نویدِ صبح مسرت کے منتظر صادق'

تیرھویں شعر کے آخر میں 'کا' کی بجائے 'کی' ہے۔ **صفحہ ۴۹ پر:** پہلے مصرعے میں 'ہیں' غنیمت کے بعد نہیں پہلے ہے درست مصرعہ یوں ہے: 'چند لمحاتِ مسرت ہیں غنیمت صادق'۔۔۔ نویں شعر کے دوسرے مصرعے میں 'کوئی' غائب ہے درست اس طرح ہے 'ہر بار اس نے کوئی بہانہ بنا لیا'۔۔ آخری مصرعہ میں 'جو' درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ مصرعہ اس طرح ہے 'نارِ بغض و کیں میں جو جلتے رہے'۔۔ **صفحہ ۵۰ پر:** چھٹے شعر کے دوسرے مصرعے میں 'تو' نہیں لکھا۔ اصل یوں ہے 'پھر تو دل کچھ ڈرا ڈرا سا رہا'۔۔ ساتویں شعر کے شروع میں 'سب' نہیں لکھا گیا۔ یعنی 'سب جہاں پا لیا تو کچھ بھی نہیں'۔ **صادق باجوہ**۔ (امریکہ)

انٹرنیٹ پر بھی دیکھا جانے والا پرچہ ''جدید ادب'' شمارہ نمبر ۱۲ وصول ہوا۔ نوازش۔ میں بے حد شکر گذار ہوں کہ آپ کو میری نظمیں پسند آئیں اور ان کو ستیہ پال آنند جی کی نظموں کے ساتھ شامل کر کے مجھے جو عزت بخشی ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ آپ نے میرا خط ''اِثبات'' میں بھی شائع کرا دیا۔ مہربانی۔۔ محترمہ پروملا آنند کے انتقال کا غم اور کینسر جیسی بیماری کو برداشت کرتے ہوئے، مایوسی کے عالم میں جو نظمیں تخلیق کی گئی ہیں وہ ذہن کو جھنجوڑ کے رکھ دیتی ہیں۔ خدا اُنھیں مکمل تندرستی اور سکون نصیب کرے۔ آمین۔۔۔۔۔۔ مغربی دنیا میں عمر خیام اور مولانا روم کو کن نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں کس قسم کی شہرت اور مقبولیت نصیب ہو رہی ہے اسکے لئے ستیہ پال آنند کا مضمون بے حد اہم ہے۔ اسی شمارے میں برادرم ڈاکٹر حامد اشرف کا مضمون ''عمر خیام۔ حقیقت کا طلبگار'' شامل کر کے آپ نے جس مدیرانہ صلاحیت کا ثبوت دیا ہے وہ بے حد قابل تعریف ہے۔ آپ کی کھٹی میٹھی یادوں میں امرتا پریتم اور اِمروز کا ذکر آیا تو اِن دونوں سے میری طویل ملاقات کی بہت سی خوشگوار یادیں تازہ ہو گئیں مبارکباد۔ عبدالرب استاد کا مضمون ''بامِ بقاء'' اور ڈاکٹر حامد اشرف کا مضمون ''فکرِ عظیم'' پڑھنے کے بعد ان حضرات سے میری بہترین توقعات وابستہ ہو گئی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ! **تنہا تما پوری** (تماپور)